بنگال مشن

احمد بک اسٹال اینڈ
ایجوکیشنرز
اے ایم 2 [illegible]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محمود ، فاروق ، فرزانہ ، انسپکٹر جمشید
آفتاب ، آصف ، فرحت ، انسپکٹر کامران مرزا
اور شوکی برادرز کا مشترکہ چودہواں خاص نمبر

متفرق سلسلہ نمبر ۵۰
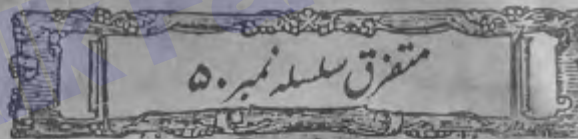
بنگال مشن

اشتیاق احمد

احادیث مبارکہ

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
میرے پاس جبریل علیہ السلام آئے تو میں
نے دریافت کیا، میرے ساتھ کون ہجرت
کرے گا، فرمایا، ابو بکر رضی اللہ عنہ اور وہی
آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم
کی اُمّت کے خلیفہ ہوں گے اور وہ آپ کے
بعد ساری اُمّت سے افضل ہیں ـــ
(کنز، صہ ۱۳۸، جلد ۶)

حضرت ابو دردا رضی اللہ عنہ سے روایت ہے
کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ای ابو دردا رضی اللہ عنہ ، کیا تم اس شخص
سے آگے چلتے ہو جو تم سے دنیا اور آخرت
میں افضل ہے ، یاد رکھو کہ نبیین اور مرسلین
کے بعد پورے دورِ شمسی یعنی زمانے میں
ابو بکر رضی اللہ عنہ سے افضل کوئی نہیں ہے۔

(کنز، صہ ۱۴۰ ، جلد ۶)

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :
اس امت کے نبی کے بعد ساری اُمّت
سے افضل ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہم ہیں۔
(روایت کیا اس کو ابن عساکر نے)

(کنز، صہ ۱۴۳ ، جلد ۶)

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں

کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :
میرے بعد میری اُمّت میں سب سے بہتر
ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہم ہیں ۔

(ابن عساکر)

(کنز، صہ ۱۴۲ ، جلد ۶)

نوٹ : ان تمام احادیثِ مبارکہ کا مطلب یہ
ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ تمام امتِ محمدیہ
میں افضل انسان ہیں ، اور جب کہ وہ نبی نہیں
ہیں تو اس اُمّت میں کوئی نبی پیدا نہیں ہو
سکتا ۔ کیوں کہ غیر نبی ، نبی سے افضل نہیں
ہو سکتا ۔

السلام علیکم !

یہود اور نصاریٰ مسلمانوں کے دوست نہیں، یہ فیصلہ قرآن کا ہے اور اسی طرح تمام غیر مسلم طاقتیں مسلمانوں کی دوست نہیں ہو سکتیں۔ اس کے ثبوت وقتاً فوقتاً ہمیں ملتے رہتے ہیں۔ حال ہی میں ایک واقعہ پیش آیا ہے۔ آپ بھی پڑھ لیں۔

جاپان کے دارالحکومت ٹوکیو میں شیطان سلمان رشدی کی کتاب کے پبلشر نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخانہ الفاظ استعمال کیے۔ اس وقت موقعے پر ایک پاکستانی عدنان رشید موجود تھا، اس کی غیرتِ ایمانی نے جوش مارا اور اس نے اس پبلشر کی زبردست پٹائی کر دی۔ بعد میں پولیس نے عدنان رشید کو گرفتار کر کے جیل بھجوا دیا۔

پاکستان میں یہ خبر بہت رنج اور غم کے ساتھ پڑھی گئی اور سنائی گئی اور جاپان کی حکومت کے رویے کو افسوس ناک قرار دیا گیا۔

ایک طرف تو حالات یہ ہیں، دوسری طرف ہمارے ملک کے حالات یہ ہیں۔ یہاں غیر مسلموں کو تبلیغ کی بھی کھلے بندوں اجازت ہے، جب کہ ایک اسلامی ملک میں اس کی کوئی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ صرف یہی نہیں کہ انھیں کھلے بندوں اجازت ہے، بلکہ ان لوگوں کو فوج میں بھی بھرتی کیا جا رہا ہے، ان کا حصّہ مخصوص کیا جا رہا ہے، پولیس میں بھی ہندو ملازم رکھے جا رہے ہیں۔ نصابی کتب میں انبیاءِ کرام علیہ السلام، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور اسلام کے نامور سپوتوں کے کارنامے نکالے جا رہے ہیں، مثلاً سلطان ٹیپو شہید پر مضمون نکال دیا گیا، وغیرہ۔

ان حالات میں ہم کیا کریں، کیا کر سکتے ہیں، یہ ہم سب کے سوچنے کی بات ہے۔ نہ صرف سوچنے کی۔ بلکہ عملی طور پر کچھ کام کرنے کی بھی۔ کم از کم آپ احتجاج تو کر ہی سکتے

ہیں ۔ تو پھر لکھیے نا وزارتِ مذہبی امور اسلام آباد
کو ایک ایک خط ۔ اس جھیل میں ایک ننھا
سا کنکر ہی سہی ۔ پھینکیے تو سہی ۔

چودھویں خاص نمبر بیگال مشن کی دو باتیں
حاضر ہیں ، آپ ان کے لیے شاید ناولوں سے
بھی زیادہ بے تاب ہوں گے ، ہو سکتا ہے ، میرا
خیال غلط ہو اور آپ ان کے لیے ناولوں سے
کم بے چین ہوں ؛ تاہم اس سے کوئی فرق
نہیں پڑتا ۔ میں تو بس آپ کو بے چین دیکھنا
چاہتا ہوں ۔ بُرا سا منہ نہ بنائیے ، یہ کام اپنے
کرداروں کے لیے چھوڑ دیجیے ، بے چین رہنا
صحت کے لیے مضر نہیں ۔ جن لوگوں میں
دین کی تڑپ ہوتی ہے ، وہ مرتے دم تک
بے چین رہتے ہیں ۔ علامہ اقبال رحمتہ اللہ علیہ کے اشعار
بھی آپ کو دین کی تڑپ کا درس دے
رہے ہیں ۔

بہت دنوں سے ناولوں کے پیچھے ایک اشتہار
شائع ہو رہا ہے ، اشتیاق احمد کی زندگی کا
سب سے بڑا ناول ، جزیرے کا سمندر ۔

اشتیاق احمد شاید اس سے بڑا ناول آئندہ زندگی
میں نہ لکھ سکیں ۔ آپ نے یہ اشتہار کئی مرتبہ
پڑھا ہوگا ، میرے کچھ قاری اس اشتہار
پر تلملائے ، بھنّائے اور سٹپٹائے بغیر نہیں
رہے ، انھوں نے اپنے خطوط میں لکھا ، یہ کیا
بات ہوئی ۔ ہم تو آپ سے آئندہ خاص نمبر
ایک ہزار صفحات کا لکھوانا چاہتے ہیں ۔ ادھر
اشتہار کی اشاعت ۔ نتیجہ یہ کہ میں اُلجھن کا شکار
ہو گیا ، آپ تو جانتے ہی ہوں گے ، جب
انسان اُلجھن کا شکار ہو جائے تو کہیں کا نہیں
رہتا ۔ میں سوچ رہا تھا ، کروں تو کیا کروں ۔
آخر میں نے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ
دیا ۔ اوہ معاف کیجیے گا ، غلط لکھ گیا ، حالات
کے نہیں ، بیگال مشن کے دھارے پر چھوڑ
دیا ۔ میں یہ بھول گیا کہ مجھے ناول کتنے
صفحات کا لکھنا ہے ۔ بس میں نے یہ فیصلہ کر لیا
کہ جتنے صفحات کا بھی یہ خود بخود بن گیا ،
آپ کی خدمت میں پیش کر دوں گا ، اپنی
طرف سے نہ تو اسے گھٹانے کی کوشش کروں

گا اور نہ بڑھانے کی ۔ چنانچہ ناول کے اختتام تک میں اسی فیصلے پر کاربند رہا ۔ اب نتیجہ دیکھیے ۔ یا اسے حیرت انگیز اتفاق کہیے کہ یہ بالکل جزیرے کے سمندر جتنا ہوگیا ۔ چند صفحات کم یا زیادہ ہونا کوئی بات نہیں ۔ اور اسی لحاظ سے اِس کی قیمت بھی اُس کے برابر رکھ دی گئی ۔ حالاں کہ گزشتہ سال کی نسبت کاغذ بھی مہنگا ہے اور دُوسرے تمام اخراجات بڑھ چکے ہیں ۔ دُوسرے یہ کہ مارکیٹ میں اتنی ضخامت کا ناول اتنی قیمت میں نہیں ملے گا ۔ مَیں نے تو یہ دیکھا ہے کہ صفحات ۱۸۰ اور قیمت ۲۰ روپے ۔ اب اس حساب سے دیکھا جائے تو یہ ۱۸۰ کا پانچ گنا ہے ، گویا قیمت ۱۰۰ روپے ہونی چاہیے ۔ مطلب یہ کہ دُوسرے ادارے اتنے صفحات آپ تک ۱۰۰ روپے میں پہنچا رہے ہیں ۔ میرا خیال ہے اس وضاحت کے بعد میرا ایک بھی قاری یہ نہیں کہہ سکے گا کہ خاص نمبر کی قیمت زیادہ رکھی گئی ہے ۔ اور اگر کسی ایک قاری نے بھی یہ لکھ دیا تو پھر میرے

لیے اپنا سر پیٹ لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ جائے گا ۔ اب اگر مَیں نے عملی طور پر اپنا سر پیٹ لیا تو آیندہ ناول لکھنے کے قابل نہیں رہ جاؤں گا ۔ اس لیے کوشش کروں گا کہ صرف محاورۃً سر پیٹوں اور جگر کو روؤں ۔ خاص نمبر کی اس مرتبہ سلائی کرائی گئی ہے ۔ اُمید ہے آپ مطمئن ہوں گے ۔ سلائی پر ڈیڑھ گنا خرچ ہوا ، لیکن قیمت پھر بھی زیادہ نہیں ۔

بعض لوگ حددرجے بے ہودہ ، اخلاق سے گرے ہوئے اور لچر زبان پر مشتمل خطوط لکھتے ہیں اور یہ بھی اعلان کرتے ہیں کہ ہمت ہے تو ہمارا خط ناول میں شائع کرکے دکھائیں ۔ غیرت ہے تو اسے شائع کریں ، لیکن ہم جانتے ہیں ، آپ میں ہمت اور غیرت نام کی کوئی چیز نہیں ہے ۔ اس لیے آپ اس خط کو شائع نہیں کریں گے ۔ ایسے قارئین میں مرزائی حضرات پیش پیش ہیں ۔ ان کی خدمت میں التماس ہے کہ شائستہ زبان والے خطوط ہی ناولوں میں

شائع کیے جا سکتے ہیں۔ بصورتِ دیگر آپ مجھے
کچھ بھی کہہ لیں، میں اپنے قارئین کو بدمزہ
نہیں کر سکتا۔ میں آپ کے خطوط شائع کرنے
سے نہیں گھبراتا۔ منزہ جبیں کا خط اس بات کا
ثبوت ہے۔ تہذیب کے دائرے میں رہ کر دیکھیے۔
مسئلہ ختم نبوت کا استقبال والہانہ انداز میں ہوا
ہے۔ اور اس سے اندازہ ہوا کہ ہم نبیٔ کریم
صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری نبی ہونے پر کس قدر
پختہ یقین رکھتے ہیں، بے شمار قارئین نے ان
الفاظ پر مشتمل خط لکھے ہیں کہ آپ ناولوں
میں ایک سو کے قریب صفحات ختم نبوت کے
لیے مخصوص کر دیجیے، جن میں ختم نبوت کے
منکروں کی کفریات کا ذکر کیا جائے۔ آپ کو
اس کام میں گھبرانے کی ضرورت نہیں، ہم
سب آپ کے ساتھ ہیں، جہاں آپ کا پسینہ گرے
گا، وہاں ہمارا خون گرے گا۔ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم
کی عظمت پر آنچ نہیں آنے دیں گے۔

ایسے خطوط پڑھ کر میرا خون کئی گنا بڑھ جاتا ہے۔
اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ان گم کردہ راہوں کو ہدایت

نصیب فرمائے، آمین ثم آمین!

خاص نمبر کے بارے میں میں کچھ نہیں کہوں
گا۔ یہ آپ کو کیسا لگا۔ آپ کے معیار پر پورا
اترا، معیار سے نیچے گر گیا یا اونچا اٹھ گیا، آپ اس
کے واقعات کے ساتھ ایک تنکے کی طرح بہے
یا نہیں، اس کی تیزی اور روانی کا ساتھ دے
سکے یا نہیں۔ تیزی اس میں تھی بھی یا نہیں،
یا بہت تھی۔ آپ نے خود کو ہر لمحے اپنے
محبوب کرداروں کے ساتھ محسوس کیا یا نہیں۔
ہر آن آپ کا دل دھڑکا یا نہیں۔ رگوں میں
خون کی گردش تیز ہوئی یا نہیں۔ اوپر کا
سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہا یا نہیں، مارے
سسپنس کے برا حال ہوا یا نہیں۔ باتوں
کے ڈھنگ، محاورات کے لحاظ آپ کو اپنی
پلیٹ میں لے سکے یا نہیں، آپ کے منہ سے
اکثر اوقات بے ساختہ انداز میں اوہ، ارے۔
کیا۔ ہائیں۔ نکلا یا نہیں۔ یہ سب باتیں
آپ مجھے اپنے خطوط میں لکھ بھیج دیں گے،
لہٰذا میں کیوں ان پر تبصرہ کروں۔ میں

تو بس ایک بات جانتا ہوں — اور وہ یہ کہ آپ بیگال مشن پڑھنے کے لیے بُری طرح بے چین ہیں اور انتظار نے آپ کو ادھ مُوا کر رکھا ہے — لہٰذا اسے دیکھ کر آپ کی جان میں جان ضرور آ گئی ہو گی، سوکھے دھانوں پر پانی ضرور پڑ گیا ہو گا — اور تلوں میں تیل پیدا ہو گیا ہو گا، آپ اس قابل بھی ہو گئے ہوں گے کہ تیل دیکھ سکیں اور تیل کی دھار دیکھ سکیں — لیجیے — محاورات میرا گھیراؤ کرنے کے درپے ہیں — ان ہی الفاظ پر اکتفا کرتے ہوئے اجازت چاہوں گا — اب آپ بیگال مشن کے سمندر میں گم ہو جائیے — یہی درویش کی صدا ہے —

اشتیاق

*

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ

○

ان کی جمعیت کا ہے مُلک و نسب پر انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تیری

○

دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

(علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ)

آدھا پونا صفحہ

فرزانہ نے حیرت زدہ انداز میں پلکیں جھپکائیں اور جھک کر محمود کے کان میں بولی:

"محمود! اس لڑکی کو دیکھ رہے ہو۔"

"نہیں! میں صرف کھانے پینے کی چیزوں کو دیکھ رہا ہوں جو بجلی کی سی تیزی سے غائب ہوتی جا رہی ہیں، آخر ہم اس قدر افراتفری کے عالم میں کیوں کھاتے پیتے ہیں۔" اس نے منہ بنایا۔

"کھانے پینے کی طرف دیکھنے کے لیے تو عمر پڑی ہے۔ فی الحال اس لڑکی کی طرف دیکھو۔" فرزانہ نے بھی برا سا منہ بنایا۔

"تم نے غلط کہا فرزانہ۔ ہماری عمریں کھانے پینے کے لیے نہیں، کیس حل کرنے کے لیے پڑی ہیں۔" فاروق منمنایا۔

"میں تم سے بھی درخواست کرتی ہوں۔ اس لڑکی کی طرف دیکھو۔"

"بُری بات ہے، میں تو نہیں دیکھوں گا اس کی طرف، اور اس کی طرف کیا۔ کسی کی طرف بھی نہیں دیکھنا چاہیے۔ لوگ کیا خیال کریں گے، ہم دعوت میں شرکت کرنے آئے ہیں یا دُوسروں کو دیکھنے اور پھر ہمارے میزبان ہمارے بارے میں کیا سوچیں گے۔ دوسرے یہ کہ میں ڈرتا ہوں۔ اگر میں نے اس لڑکی کی طرف دیکھ لیا تو کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں، مطلب یہ کہ کوئی کیس نہ گلے پڑ جائے۔ اور اگر اس طرح کوئی کیس ہمارے پلّے نہ پڑ گیا تو یہ آ بیل مجھے مار والی بات ہو گی۔ جب کہ ہم ان دنوں کسی بھی قسم کا کوئی کیس مول تو کیا، مفت لینے کے لیے بھی تیار نہیں، اس لیے کہ ابّا جان بیگال مشن کی اجازت صدر صاحب سے لے چکے ہیں اور وہاں جانے کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ پروفیسر انکل سے بھی ان کی بات ہو چکی ہے۔ لہٰذا میں نہیں چاہتا۔ ان کی تیاریاں کھٹائی میں پڑ جائیں۔ اتنا ہی کافی ہے یا کچھ اور بھی کہوں۔" فاروق رُکے بغیر کہتا چلا گیا۔

"انکل۔ آپ نے کبھی کسی درزی یا نائی کو قینچی چلاتے دیکھا ہے۔" فرزانہ بھنّا کر خان رحمان کی طرف مُڑی۔

"ہاں بھئی۔ اکثر اتفاق ہوتا رہتا ہے۔ مجھے بال بھی کٹوانے پڑتے ہیں اور کپڑے بھی سلواتا رہتا ہوں۔" خان رحمان بولے۔

"لیکن یہاں نائی اور درزی کہاں سے ٹپک پڑے۔" محمود نے حیران ہو کر کہا۔

"فاروق کی مختصر سی بات سُن کر یاد آ گئے تھے۔ خیر تم لوگ نہیں دیکھنا چاہتے، نہ سہی۔ لیکن اتنا سُن لو کہ کچھ دنوں پہلے اس لڑکی کی خبریں دھوم دھام سے شائع ہوئی تھیں۔ یہ ہمارے مُلک سے فرار ہو گئی تھی۔ انکل کامران مرزا کی طرف اس نے کوئی گُل کھلایا تھا۔ آخر یہ یہاں کیا کر رہی ہے۔ ہمارے میزبان کی اس محفل میں اس کا کیا کام۔"

"اوہ۔ تمھارا مطلب ہے۔ یہ۔ یہ ریوٹا ہے۔" فاروق نے بوکھلا کر کہا۔

"ہاں! اگرچہ میک اپ میں ہے اور میک اپ بہت مہارت سے کیا گیا ہے، لیکن اس کے باوجود میں آنکھوں کی بناوٹ کی بنا پر اسے پہچان چکی ہوں۔ اس کی بہت واضح تصاویر شائع ہوئی تھیں۔"

"اگر یہ ریوٹا ہے تو معاملہ ضرور گڑبڑ ہے۔ اور ہمیں ابّا جان کو اطلاع دینا ہو گی۔"

"اور وہ اپنی تیاریوں کے چکر میں یہاں آئے نہیں۔"

"بھئی یہ تم نے کیا کھسر پھسر شروع کر دی۔" سرے پر بیٹھے پروفیسر داؤد نے منہ بنا کر کہا۔

" اوہ! معاف کیجیے گا انکل - ہم نے آپ کو تو اس کھسر پھسر میں شامل کیا ہی نہیں - آئیے - آپ بھی شریک ہو جائیے۔" فرزانہ مسکرائی۔

" نہیں بھئی - مجھے تو معاف ہی رکھو۔" وہ بوکھلا اٹھے۔

" کیوں انکل - خیر تو ہے۔"

" میں ان دنوں تیاریوں میں اُلجھا ہوا ہوں - یہاں آنا بھی میرے لیے بہت اُلجھن کا باعث بنا ہے، لیکن آفاقی صاحب سے پرانے تعلقات کی بنا پر آنا پڑا۔"

" جی - جیسے آپ کی مرضی - میں ذرا ابا جان کو فون کر آؤں - یوں کام نہیں چلے گا۔" فرزانہ نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

وہ کچھ نہ بولے - فرزانہ کی سنجیدگی نے انھیں اس لڑکی کی طرف دیکھنے پر مجبور کر دیا - وہ سفید سلک کے لباس میں بہت معصوم نظر آ رہی تھی - پُرسکون انداز میں کھانے پینے میں مصروف تھی - اس کے ساتھ ایک نوجوان موجود تھا، کبھی کبھی وُہ ایک دوسرے کے کان میں کوئی بات کر کر مسکرانے لگتے -

" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فرزانہ کا خیال ٹھیک ہی ہے۔" محمود بڑبڑایا۔

" اوہ - تب تو میں چلتا ہوں۔" پروفیسر داؤد گھبرا گئے۔

" اوہو انکل - ایسی بھی کیا پریشانی۔"

" نہیں بھئی - میں کہیں اُلجھ نہ جاؤں۔" پروفیسر داؤد نے اُٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

عین اسی وقت ایک بھاری بھرکم آدمی اُٹھ کھڑے ہوئے اور بلند آواز میں کہنے لگے:

" معزز مہمانو! آپ نے اس دعوت میں شرکت کی - میں آپ لوگوں کا شکر گزار ہوں، لیکن ابھی تک میں نے یہ نہیں بتایا کہ یہ دعوت کس خوشی میں دی جا رہی ہے اور نہ آپ نے پوچھا - سو میں آپ سب کو بتاتا ہوں - میرے ہاں ایک ماہ پہلے دو بھائی بہن مہمان آئے تھے - یہ ہمارے پڑوسی مُلک سے تشریف لائے تھے - اور میرے ایک قریبی دوست کا رقعہ ساتھ لائے تھے - قریبی دوست نے درخواست کی تھی کہ میں ان دونوں کو ایک ماہ کے لیے اپنے ہاں ٹھہرا لوں - یہ ہمارے مُلک کی سیاحت کے لیے آئے ہیں - چنانچہ میں نے انھیں یہاں ٹھہرا لیا، لیکن اب یہ دونوں مجھے اپنے بچّوں کی طرح عزیز ہو چکے ہیں - انھوں نے ایک ماہ کے دوران تین بار میری جان بچائی - ایک بار ایک سیاہ ناگ سے بچایا -

دونوں نے اپنی جان پر کھیل کر اسے مارا۔ ورنہ وہ
مجھے ڈس لیتا۔ ایک دن ایک ڈاکو گھر میں گھس آیا،
وہ مجھے جان سے مار ڈالنے پر تُلا ہوا تھا۔
ان دونوں نے اس سے ٹکر لی۔ اور تیسرا موقع
وہ تھا جب میرے کپڑوں کو آگ لگ گئی تھی۔
ایسا سگار کی وجہ سے ہوا۔ کمرہ دھوئیں سے بھر
گیا تھا۔ بستر جلنے لگا تھا۔ ان دونوں نے مجھے
اس کمرے سے نکالا۔ ان احسانات کی بنا پر یہ
مجھے بہت عزیز ہو گئے ہیں، اب یہ اپنے ملک
جا رہے ہیں، گویا آج کی دعوت ان کی الوداعی
پارٹی کے طور پر دی گئی ہے۔ امید ہے۔ آپ لوگ
بھی ان سے مل کر خوش ہوں گے۔ اب ان کے
یہاں قیام میں بہت تھوڑا وقت رہ گیا ہے۔ لہٰذا میں
ان دونوں سے درخواست کرتا ہوں کہ یہ کھڑے ہو
کر آپ سب سے ایک ہی نظر میں ملاقات کر لیں
اور آپ بھی ان سے اسی طرح ملاقات کر لیں۔"
اتنا کہہ کر میزبان بیٹھ گئے۔ اور وہی لڑکی اور اس کے
ساتھ بیٹھا نوجوان اٹھ کھڑے ہوئے۔ لوگوں نے انہیں دیکھ
کر تالیاں بجائیں اور وہ مسکراتے ہوئے بیٹھ گئے۔ اسی وقت

[illegible] آتی نظر آئی۔ اس کے چہرے پر اُلجھن کے آثار تھے:
"کیوں خیر تو ہے۔ شکل پر اڑھائی کیوں بج رہے ہیں۔"
"ابا جان میٹنگ روم میں ہیں اور وہاں فون کرنے کی
کسی کو اجازت نہیں۔ سُنا ہے کوئی بہت ہی اہم معاملہ
ہے۔"
"خیر کوئی بات نہیں۔ ہم خود ہی نبٹ لیں گے۔
ابھی ابھی ہمارے میزبان آفاقی صاحب نے اس لڑکی اور
اس کے بھائی کا تعارف کروایا ہے۔" یہ کہہ کر محمود نے
اس تعارف کی تفصیل سُنا دی:
"بھائی۔ اس کا کوئی بھائی بھی ہے۔ اچھا۔" فرزانہ نے
حیرت زدہ لہجے میں کہا اور بھائی پر نظریں جما دیں۔
"نن۔ نہیں۔ نہیں۔" اچانک اس نے کہا۔
"کیا مطلب۔ یہ نن نہیں کہاں سے ٹپک پڑا۔"
"ایک منٹ ٹھہرو۔ میں ابھی آئی۔" فرزانہ نے جلدی سے
کہا اور تیز تیز قدم اُٹھاتی کوٹھی کے اندرونی حصّے کی طرف
چلی گئی۔
"اب تو مجھ سے بھی نہیں رہا جاتا۔" محمود نے کہا اور اس
کے پیچھے لپکا۔
"تو میں بھی یہاں رُک کر کیا کروں گا۔" فاروق بھی

اُٹھ کھڑا ہوا۔

"اچھی بات ہے۔ جب تم سے رہا جانے لگے تو واپس آ جانا۔" خان رحمان نے منہ بنایا۔

"عجیب ہیں یہ تینوں۔" پروفیسر داؤد بڑبڑائے۔

"پروفیسر صاحب۔ مجھے خوف محسوس ہو رہا ہے۔ یہ تینوں اب چکر چلا کر رہیں گے۔ لہٰذا آپ اگر جانا چاہیں تو جا سکتے ہیں۔" خان رحمان نے دبی آواز میں کہا۔

"اور تم ؟" انھوں نے سوالیہ انداز میں کہا۔

"میرا کیا ہے۔ میں ٹھہرا بے کار آدمی۔ اگر کوئی چکر چل بھی گیا تو ان کا پوری طرح ساتھ دوں گا، کیوں کہ یہاں جمشید بھی نہیں ہے۔"

"تب تو میں بھی نہیں جاؤں گا۔ اگر تم ان کا پورا پورا ساتھ دے سکتے ہو تو آدھا پونا ساتھ تو میں بھی دے ہی ڈالوں گا۔" انھوں نے بُرا سا منہ بنایا۔

"لل۔ لیکن۔ آپ کو تو جانا ہے۔ تیاری کے سلسلے میں۔"

"بھاڑ میں گئی تیاری ویاری۔" انھوں نے تلملا کر کہا۔

"چلیے پھر ٹھیک ہے۔" خان رحمان مسکرا دیے۔

"کیا ٹھیک ہے ؟"

"یہی کہ بھاڑ میں گئی تیاری۔" انھوں نے کہا۔

"یار کہیں۔ تم میں۔ فاروق کی روح تو نہیں آ گھسی۔"

"لیکن فاروق تو خود یہیں موجود ہے۔" خان رحمان گھبرا گئے۔

اسی وقت تینوں آتے نظر آئے۔ اب ان تینوں کے چہرے لٹکے ہوئے تھے۔

"خیر تو ہے۔ اب تم تینوں کے چہروں پر۔" خان رحمان کہتے رُک گئے۔

"انکل۔ آفاقی صاحب ہمارے مُلک کے بہت بڑے آدمی ہیں نا۔" فرزانہ نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

"ہاں! بالکل۔" وہ بولے۔

"اور ان کے تعلقات بڑے بڑے آفیسرز سے ہیں۔"

"اس میں بھی کوئی شک نہیں۔"

"تب خیر نظر نہیں آتی۔"

"آخر بات کیا ہے ؟"

"ریوٹا کو یہاں دیکھ کر۔ میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ یہ ضرور شیلاک کو چھڑانے آئی ہے۔ یہی سوچ کر میں فون کرنے گئی تھی۔ ایس پی جیل صاحب سے میری گفتگو ہوئی ہے۔ وہ میری بات سُن کر ہنس پڑے اور انھوں نے کہا۔ کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ شیلاک فرار ہو جائے۔ اور ہمیں پتا نہ چلے۔ جیل میں تمام قیدی موجود ہیں۔ کوئی ایک قیدی

بھی کم نہیں ہے۔ جیل سے کسی ایک آدمی کے فرار ہونے کا
یہ مطلب بھی تو ہے کہ ایک قیدی کم ہو جائے، لیکن جیل
کا کوئی قیدی کم نہیں ہے۔"

"تب پھر۔ تم کیوں فکر مند ہو رہی ہو؟"

"نہ جانے کیا بات ہے۔ فکر میرے پیچھے ہاتھ دھو کر
پڑ گیا ہے۔" فرزانہ بولی۔

"ہو سکتا ہے فرزانہ۔ یہ ریوٹا نہ ہو۔ اور تمھیں غلط فہمی
ہوئی ہو۔" محمود بولا۔

"ہمیں شک تو مٹانا ہو گا۔ اسے چیک تو کرنا ہو گا۔"
فرزانہ نے کہا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیسے چیک کریں۔ یہ
دعوت ان دونوں کے اعزاز میں دی جا رہی ہے۔ ہم انھیں کس
طرح چیک کر سکتے ہیں۔" فاروق نے اعتراض کیا۔

"دعوت ختم ہونے پر۔" فرزانہ نے فوراً کہا۔

"ہاں! ٹھیک ہے۔ بلکہ بالکل ٹھیک۔" فاروق مسکرایا۔

"اس طرح تو پروگرام لمبا ہو جائے گا۔" پروفیسر داؤد
گھبرا گئے۔

"آپ۔ آپ تشریف لے جا سکتے ہیں انکل۔"

"یہی تو مصیبت ہے۔ اب میں تشریف بھی نہیں لے جا

سکتا۔" انھوں نے بے چارگی کے عالم میں کہا۔

"جی کیا مطلب۔ تشریف بھی نہیں لے جا سکتے۔ یہ کیا بات
ہوئی۔"

"میری خان رحمان سے ٹھن گئی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ
تم تینوں کا پورا پورا ساتھ دیں گے۔ لہٰذا میں نے یہی سوچا،
ساتھ دینے کے معاملے میں پیچھے نہیں رہوں گا۔"

"ہوں۔ چلیے خیر۔ یوں ہی سہی۔ ویسے میرا خیال ہے۔ لوگوں
کے رخصت ہونے میں اب زیادہ وقت نہیں لگے گا۔"

لیکن ان سب کے اندازے دھرے کے دھرے رہ گئے،
ابھی لوگ فارغ نہیں ہوئے تھے کہ وہ لڑکی اُٹھ کھڑی ہوئی۔
اور بلند آواز میں بولی:

"پیارے انکل آفاقی صاحب اور معزز مہمانو۔ ہمارے جہاز
کا وقت ہو چلا ہے۔ لہٰذا ہم اب رخصت چاہتے ہیں۔ آپ
لوگ اسی طرح تشریف رکھیں اور ہماری وجہ سے اپنی دعوت
خراب نہ کریں۔ دراصل جہاز کے وقت کے معاملے میں ہمیں
غلط فہمی ہو گئی تھی۔ جو ابھی ابھی آپس میں بات چیت
کرنے پر دور ہوئی۔ اس لیے اب ہم مزید نہیں ٹھہر سکتے۔"

مہمانوں نے حیران ہو کر اِدھر اُدھر اور پھر میزبان آفاقی صاحب
کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پر حیرت کے آثار تھے:

" اس بات کا تو مجھے بھی پتا نہیں تھا۔ یہ معلوم ہے کہ جہاز اس وقت سے کوئی دو گھنٹے بعد جائے گا۔"

" جی نہیں۔ اس کے جانے میں صرف ایک گھنٹا باقی ہے، ہم سے جہاز کا وقت پڑھنے میں غلطی ہو گئی ہے۔"

" اوہ۔ تب تو۔ تب تو ٹھیک ہے۔"

" ہم درخواست کرتے ہیں کہ ہمارے لیے کوئی صاحب بھی اُٹھنے کی کوشش نہ کریں۔ بس ہم چلے جائیں گے۔ ٹاٹا۔"

دونوں نے ایک ساتھ ہاتھ ہلائے اور اندرونی حصے کی طرف چلے گئے۔ مہمان اسی طرح بیٹھے رہے۔

" آئیے انکل۔ موقع اچھا ہے۔ ہم اندر ہی ان سے ملاقات کر لیتے ہیں، لیکن ذرا دبے پاؤں آئیے گا۔" فرزانہ نے سرگوشی کی۔

وہ اُٹھے اور اندرونی حصے کی طرف چل پڑے۔ انھیں معلوم نہیں تھا کہ ان کا کمرہ کون سا ہے۔ تاہم وہ ایک ایک کمرے کے پاس سے گزرتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ ایک تھوڑے سے کھلے دروازے میں سے اس لڑکی کی آواز سنائی دی:

" میں نہیں سمجھی۔ آخر اس کی کیا ضرورت تھی۔ جہاز میں تو ابھی دو ہی گھنٹے باقی ہیں۔"

" تم انھیں نہیں دیکھ سکیں ریوٹا۔ اور دیکھ بھی کیسے سکتی تھیں۔ تمھارا ان سے واسطہ ہی نہیں پڑا۔ مہمانوں میں محمود، فاروق اور فرزانہ بھی تھے۔ انسپکٹر جمشید کے بچے۔"

" اوہ۔ اوہ۔ تو کیا۔ انسپکٹر جمشید بھی۔"

" نہیں۔ وہ نظر نہیں آیا۔"

" تب تو ٹھیک ہے شیلاک۔ ہمارا یہاں سے نکل جانا ہی بہتر ہے۔ کہیں ہم الجھ نہ جائیں۔ ادھر ہدایات یہ ہیں کہ فوری طور پر حاضری دو۔" ریوٹا بولی۔

شیلاک کا نام سُن کر ان کی سٹی گم ہو گئی۔ جیل کا سپرنٹنڈنٹ تو کہہ رہا تھا کہ شیلاک اندر ہی ہے۔ لیکن یہ باہر موجود ہے۔ بلکہ فرار ہونے کے لیے پوری طرح تیار بھی۔

اچانک فرزانہ اُچھل پڑی۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ فوراً کمرے میں داخل ہو گئی۔ اور پُرسکون آواز میں بولی:

" معاف کیجیے گا۔ ہم نے آپ سے آٹوگراف تو لیے ہی نہیں۔ آخر آپ ہمارے انکل آفاقی کے قریبی دوست ہیں۔"

دونوں زور سے اُچھلے۔ اور پھر ان کی نظریں پانچوں پر جم گئیں۔ ساتھ ہی ان میں اُلجھن تیرنے لگی۔

O

میٹنگ روم میں تمام بڑے بڑے آفیسرز موجود تھے۔ ان کے چہروں پر ایک سوال تھا۔ یہ کہ ہمیں یہاں کیوں بُلایا گیا ہے۔ آخر آئی جی صاحب کی آواز ابھری:

"آپ کو بہت ہی مختصر سے نوٹس پر یہاں بلایا گیا ہے۔ جس کے لیے میں معافی چاہتا ہوں، لیکن مجبور تھا، احکامات اوپر سے آئے تھے۔ ابھی ہمیں کچھ دیر انتظار کرنا ہو گا۔" یہاں تک کہہ کر وہ خاموش ہو گئے۔

"ضرور کوئی بہت سنگین معاملہ ہے۔" ایک آفیسر کی آواز اُبھری۔

"جی ہاں! یہ تو ظاہر ہے۔" دوسرے نے کہا۔

"سر۔ آپ نے یہ نہیں بتایا کہ اطلاع کس کی طرف سے تھی؟" ایک تیسرا آفیسر بولا۔

"فون وزیرِ خارجہ صاحب نے کیا تھا۔" انھوں نے جواب دیا۔

"اوہ!" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

آخر آدھ گھنٹے کے جان لیوا انتظار کے بعد دروازہ کھلا اور نیلے کپڑوں میں کوئی شخص اندر داخل ہوا۔ اس کے ساتھ

کوئی نہیں تھا۔ سر پر ہیٹ اور آنکھوں پر تاریک شیشوں کی عینک نے اس کے چہرے کو بڑی حد تک چھپا رکھا تھا۔ دروازے پر موجود مسلح نگرانوں نے جب اُسے روکنے کی کوشش کی تو اس نے ایک بیج آگے کر دیا۔ یہ بیج صدرِ مملکت کے خاص آدمیوں کو دیا جاتا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر یک دم پیچھے ہٹ گئے۔ نیلے کپڑوں والا تیز تیز چلتا صدارت کی کرسی پر جا بیٹھا۔ اس نے سب کو ایک نظر دیکھا، پھر کہنے لگا:

"صدرِ مملکت نے انسپکٹر جمشید کو بیگال کا ایٹمی پلانٹ اڑانے کی اجازت کیا دی کہ ہماری سرحدوں پر تین بڑی طاقتوں کی فوجیں جمع ہو گئی ہیں۔ یہ گویا اس بات کا اعلان ہے کہ اگر ہم نے بیگال کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا تو وہ ہم پر چاروں طرف سے حملہ کر دیں گے۔ گویا پورے مُلک کو آگ میں جھونک دیں گے۔ ان حالات میں۔ صدرِ مملکت نے ایک فیصلہ کیا ہے۔ اور میں آپ لوگوں کو ان کا فیصلہ سُنانے آیا ہوں۔ انھوں نے اپنے مشیروں سے مشورے کے بعد یہی فیصلہ کیا ہے کہ انسپکٹر جمشید ان کے ایٹمی پلانٹ کی طرف کوئی قدم نہیں اٹھائیں گے۔"

"کیا!!!" ان سب کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"ہاں ! پورے ملک کو بلاوجہ جنگ کی آگ میں دھکیل دینا عقل مندی نہیں ہو گی۔ تین بڑی طاقتوں سے جنگ کرنا ہمارے بس کی بات نہیں ہو گی۔ جنگ کی صورت میں صرف ایک بڑی طاقت ہماری مدد کرے گی۔ وہ بھی صرف سامانِ جنگ کی حد تک۔ اور اگر اس نے بھی اچانک مدد سے ہاتھ اٹھا لیا تو ہم تو گئے کام سے۔ ان حالات میں یہ ہی فیصلہ کیا گیا ہے۔" یہاں تک کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

"معاف کیجیے گا سر۔ یہ ہی ہماری بد قسمتی ہے۔" انسپکٹر جمشید کی آواز کمرے میں ابھری۔

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔ آپ شاید انسپکٹر جمشید ہیں۔" اس نے انہیں گھورا۔

"جی ہاں ! میں انسپکٹر جمشید ہوں ، لیکن کیا ہی اچھا ہوتا کہ میں انسپکٹر جمشید نہ ہوتا۔"

"کیا مطلب۔ یہ آپ نے کیا کہا ؟" نیلے لباس والے نے حیران ہو کر کہا۔

"اس صورت میں مجھے تکلیف تو نہ ہوتی ، کیوں کہ میں اس میٹنگ میں شریک نہ ہوتا۔ دیکھیے نا۔ مسلمانوں نے بڑی طاقتوں سے خوف کھانا شروع کر دیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرنا چھوڑ دیا ہے۔ حالاں کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم

کا فرمان ہے کہ اگر تم اللہ سے ڈرو گے تو سب تم سے ڈریں گے اور جب تم اللہ سے نہیں ڈرو گے تو سب سے ڈرنے لگو گے۔ آج ہماری بھی یہ ہی حالت ہے۔ ہم ان بڑی طاقتوں سے ڈرتے ہیں ، اللہ سے نہیں۔ لہٰذا یہ سب ہمیں ڈرانے پر تُل گئے ہیں۔"

"مسٹر انسپکٹر جمشید۔ ان باتوں کا تعلق ملک کی پالیسیوں سے نہیں ہے۔ آپ نہیں سمجھ سکتے۔" نیلے لباس والے نے ناخوش گوار لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے سر۔ میں واقعی نہیں سمجھتا۔" انسپکٹر جمشید دکھ بھرے لہجے میں بولے۔

"میں نے صدر صاحب کا حکم سنا دیا ہے۔ اس حکم کی خلاف ورزی نہیں کی جائے گی۔ صدر صاحب ان ملکوں کو مطمئن کرنے کی کوشش میں ہیں۔ لہٰذا کوئی ایسی بات نہ ہو کہ ان کوششوں میں کوئی رکاوٹ پڑ جائے۔"

"بہت بہتر سر۔ نہیں پڑے گی رکاوٹ۔" آئی جی صاحب جلدی سے بولے۔

"شکریہ۔ اب میں چلوں گا۔" اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ایک منٹ سر۔ آپ نے نہ تو اپنی شناخت کرائی۔ اور نہ نمبر وغیرہ بتایا۔" انسپکٹر جمشید نے سرسراہٹ زدہ آواز میں کہا۔

"کیا مطلب۔ کیا میں ایسا کرنے کا پابند ہوں۔" اس نے غرا کر کہا۔

"ج۔ جی نہیں۔" آئی جی جلدی سے بولے۔

"اس کے باوجود میں آپ کا کارڈ دیکھنا پسند کروں گا۔" انسپکٹر جمشید نے بلند آواز میں کہا۔

"اس سے یہ کہیں بہتر ہو گا کہ آپ میرے بارے میں صدر صاحب سے بات کر لیں۔" اس نے غرا کر کہا۔

"اوہ ہاں جمشید۔ یہ بالکل ٹھیک رہے گا۔" آئی جی صاحب نے کہا اور کانپتے ہاتھوں سے فون کا ریسیور اٹھا کر نمبر گھمانے لگے۔ انہیں انسپکٹر جمشید پر بہت غصہ آ رہا تھا۔ اب ہال میں موت کا سناٹا طاری ہو گیا تھا۔ صرف ڈائل گھومنے کی آواز سنائی دیتی رہی۔ آخر سلسلہ مل گیا:

"ہیلو سر۔ جی۔ میں شیخ نثار احمد عرض کر رہا ہوں۔ اس وقت ہم محکمہ سراغرسانی کے میٹنگ روم میں جمع ہیں۔ کچھ دیر پہلے ہمیں یہاں جمع ہونے کا حکم ملا تھا، پھر آپ کے خاص کارندے یہاں تشریف لائے۔ انھوں نے آپ کا حکم سنایا کہ انسپکٹر جمشید بنگال مشن کے لیے روانہ نہیں ہوں گے۔ کیا یہ آپ کے ہی بھیجے ہوئے ہیں۔"

"ہاں شیخ صاحب۔ یہی بات ہے۔" دوسری طرف سے

صدرِ مملکت نے کہا۔

"شکریہ سر۔ بس یہی معلوم کرنا تھا۔"

دوسری طرف سے ریسیور رکھ دیا گیا تو انھوں نے بھی ریسیور رکھتے ہوئے کہا:

"جمشید۔ تصدیق ہو گئی۔ میرا خیال ہے۔ تم معافی مانگ لو۔"

"جی بہتر۔ میں معافی مانگ لوں گا سر، لیکن ابھی نہیں۔" انسپکٹر جمشید پُرسکون انداز میں مسکرائے۔

"کیا مطلب؟" وہ چونکے۔ ان کے ساتھ دوسروں نے بھی حیران ہو کر ان کی طرف دیکھا۔

"پہلے یہ اپنا کارڈ دکھائیں گے۔ اس کے بعد میں معافی مانگوں گا۔"

"جمشید۔ تمہیں کیا ہو گیا۔ صدر صاحب تصدیق کر چکے ہیں۔" آئی جی صاحب نے بھنا کر کہا۔

"صرف اس بات کی کہ انھوں نے ہماری طرف اپنے ایک خاص کارندے کو بھیجا ہے۔ اس بات کی نہیں کہ وہ ہی خاص کارندہ یہاں تک پہنچ گیا ہے۔" انھوں نے مسکرا کر کہا۔

"یہ۔ یہ تم کیا کہ رہے ہو جمشید۔"

"جی ہاں! کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ اصلی کارندے یہاں تک نہ پہنچ سکے ہوں۔"

" اس کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں، کیوں کہ اصلی کارندے کو جو کچھ کہنا تھا۔ وہی انھوں نے کہا ہے۔"

" میں امکانات کا جائزہ لینے کی بجائے تجربہ کرکے دیکھ لینا زیادہ بہتر خیال کرتا ہوں۔ کیا یہ اپنا ہیٹ اور عینک اتاریں گے۔" انسپکٹر جمشید کی گونج دار آواز سنائی دی۔

" میرا خیال ہے، صدر صاحب کے ایک خاص کارندے کی اس سے زیادہ بے عزتی پہلے کبھی نہیں ہوئی ہو گی۔ بہر حال میں جا رہا ہوں۔ صدر صاحب کو رپورٹ کروں گا۔ اس زیادتی اور بے عزتی کا حساب لیا جائے گا۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے دروازے کی طرف چلا، لیکن اچانک انسپکٹر جمشید اس کے سامنے آگئے اور پُرسکون آواز میں بولے:

" نہیں جناب۔ آپ اس طرح نہیں جا سکتے۔ آپ کو اپنا کارڈ دکھانا ہوگا۔"

دوسرا لمحہ حیران کن تھا۔ نیلے لباس والے کا ایک بھرپور مکا انسپکٹر جمشید کے چہرے پر پڑا۔ اور بچنے کی لاکھ کوشش کے باوجود مکا ان کے جبڑے پر لگ ہی گیا۔ نہ جانے اس مکے میں کس قدر طاقت تھی۔ انسپکٹر جمشید دوسری طرف اُلٹ گئے۔ اور چند سیکنڈ کے لیے اٹھ نہ سکے۔ جب اُٹھے تو

وہ کمرے سے باہر نکل چکا تھا۔ وہ بے تحاشا اس کے پیچھے دوڑ پڑے۔

" جمشید۔ کیا کر رہے ہو۔ تمھیں کیا ہو گیا ہے۔" آئی جی صاحب چلا اُٹھے۔

لیکن اتنی دیر میں وہ بھی نکل چکے تھے۔ دوڑتے ہوئے وہ بیرونی گیٹ تک آئے، لیکن نیلے لباس والے کا دور دور تک پتا نہ تھا۔

" نیلے لباس والا کس طرف گیا؟" انھوں نے بھناتے ہوئے لہجے میں گیٹ کیپر سے پوچھا۔

" جی اس طرف۔ اس کے پاس سُرخ کار تھی۔"

" ہوں۔" انھوں نے کہا اور تیز تیز چلتے اپنی جیپ تک آئے۔ دوسرے ہی لمحے ان کی جیپ بھی اسی سڑک پر اُڑی جا رہی تھی اور رفتار اس قدر تیز تھی کہ جیپ سڑک پر اُچھل اُچھل پڑ رہی تھی۔

اور پانچ منٹ تک طوفانی رفتار سے جیپ دوڑانے کے بعد سُرخ کار انھیں نظر آنے لگی۔

غلط آدمی

"اُف اللہ! جمشید کو آج کیا ہو گیا؟" آئی جی بڑبڑائے۔

"شاید ان کا دماغ چل گیا ہے۔ جو صدر صاحب کے خاص کارندے کا راستا روک بیٹھے۔ جب کہ صدر صاحب نے تصدیق بھی کر دی تھی۔" انسپکٹر فضلی نے کہا۔

"ہاں! اب وہ صدر صاحب کو رپورٹ کرے گا اور ہم سب پر نزلہ گرے گا۔" ایک اور آفیسر بولا۔

عین اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ آئی جی صاحب نے ریسیور اُٹھایا تو دوسری طرف سے صدر صاحب کی آواز سنائی دی:

"میرا کارندہ ابھی تک یہاں موجود ہے یا جا چکا ہے؟"

"ہمیں بہت افسوس ہے سر۔ یہاں ایک ناخوش گوار واقعہ ہو گیا ہے۔" آئی جی بولے۔

"کیا مطلب؟" انھوں نے چونک کر کہا۔

"مطلب یہ کہ انسپکٹر جمشید نے آپ کی طرف سے تصدیق

کے بعد بھی ان سے شناختی کارڈ مانگا، لیکن وہ غصے میں آ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ انسپکٹر جمشید بھی اٹھ کر ان کے راستے میں آ گئے، اس پر آپ کے کارندے نے ایک مکا ان کے دے مارا اور نکل گئے۔ اب انسپکٹر جمشید ان کے تعاقب میں گئے ہیں۔"

"ہوں۔ تو یہاں۔ یہ ہو چکا ہے۔"

"جی ہاں۔ ہم سب کو اس کا بہت زیادہ افسوس ہے، انسپکٹر جمشید سے جواب طلبی کی جائے گی۔ آپ مطمئن رہیے سر۔"

"افسوس۔ میں مطمئن کس طرح ہو سکتا ہوں۔" صدر صاحب بولے۔

"جی۔ کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ میں انسپکٹر جمشید کی ذہانت کو سلام کرنا چاہتا ہوں۔ وہ واقعی ایک عظیم وطن پرست ہے۔ سازش کی بُو کو دُور سے سونگھ لیتا ہے۔ اس پر جتنا بھی فخر کیا جائے، کم ہے۔"

"یہ۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں سر؟"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ میرے کارندے کی لاش ایک جگہ سے مل گئی ہے۔ اس کے سینے میں گولی اُتار دی گئی ہے،

اور اس کا لباس اور کاغذات سب غائب ہیں۔ گویا آپ لوگوں
کے پاس غلط آدمی پہنچا تھا۔"

"نہیں!!!" ان کے منہ سے حیرت اور خوف کی زیادتی
سے نکلا۔

"ہاں! آپ نے بتایا ہے کہ انسپکٹر جمشید اس کے تعاقب
میں گئے ہیں۔"

"یس سر۔" وہ جلدی سے بولے۔

"تب تو ہو سکتا ہے وہ اس تک پہنچ جائیں، لیکن اگر
وہ نکل بھی گیا تو اس کا الزام ہم جمشید کو ہرگز نہیں دے
سکتے۔"

"تو۔ کیا سر۔ آپ نے بنگال مشن کو ملتوی کرنے کا
حکم نہیں دیا؟"

"یہ حکم تو خیر دیا تھا، لیکن جس کارندے کو بھیجا تھا،
اس کی بجائے دشمن کا آدمی آپ لوگوں کے پاس پہنچا۔"

"لیکن اس سے ان لوگوں کو بھلا کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔"

"کم از کم وہ محکمہ سراغرسانی کی عمارت کو تو اندر سے دیکھ
چکا ہے۔ ہو سکتا ہے، اس نے خفیہ کیمرے کے ذریعے سے
اندر کی تصاویر بھی لی ہوں۔ اور آپ لوگوں کی تصاویر بھی
لے گیا ہو۔"

"اوہ!" ان کے منہ سے حیرت کی زیادتی سے نکلا۔ دوسری
طرف سے صدر صاحب فون کا ریسیور رکھ چکے تھے۔

عین اسی وقت ہال کے دروازے پر اکرام نمودار ہوا
اور بے دھڑک اندر داخل ہو گیا:

"خیر تو ہے اکرام؟"

"محمود، فاروق اور فرزانہ کو آفاقی صاحب کی کوٹھی میں کوئی
شدید الجھن در پیش ہے۔ ابھی ابھی فرزانہ نے فون کیا تھا۔
میں نے اسے بتا دیا کہ انسپکٹر صاحب سے بات نہیں کرائی جا
سکتی، لیکن ابھی ابھی میں نے انسپکٹر صاحب کو جیپ میں کہیں جاتے
دیکھا تو رہا نہ گیا اور ادھر آ گیا۔"

"ہوں۔ جلدی کرو اکرام۔ تم اپنے کچھ آدمیوں کو لے
کر فوراً آفاقی صاحب کے ہاں پہنچ جاؤ۔ ایسا نہ ہو، وہاں
بھی معاملہ گڑبڑ ہو۔"

"وہاں بھی۔ سے آپ کا کیا مطلب؟" وہ چونکا۔

"یہاں پہلے ہی گڑبڑ ہو چکی ہے۔"

"جی۔ کیا مطلب؟"

"پہلے آفاقی صاحب کے ہاں پہنچو اکرام۔ میں بھی آ رہا
ہوں۔" انھوں نے کہا۔

وہ افراتفری کے عالم میں باہر کی طرف دوڑا۔ جلدی

جلدی اپنے ماتحتوں کو ہدایات دیں اور پھر وہ ایک جیپ میں بیٹھ کر آفاقی صاحب کی طرف روانہ ہوئے۔ جوں ہی ان کی جیپ کوٹھی کے دروازے پر پہنچی۔ اکرام کو اسے پورے بریک لگانے پڑے۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

○

"آٹو گراف۔ کیا مطلب؟" دونوں نے ایک ساتھ کہا۔

"جی۔ وہ۔ آٹو گراف کا مطلب تو آٹو گراف ہی ہوتا ہے۔" فاروق بولا۔

"لیکن بھئی۔ ہم کوئی مشہور شخصیات نہیں ہیں۔" ریٹا ہنسی۔

"چلیے نہ سہی۔ آپ انکل آفاقی کے معزز مہمان تو ہیں، ہمیں تو جانا بھی ہے۔"

"جی ہاں ضرور کیوں نہیں۔" یہ کہ کر تینوں نے اپنی اپنی جیب میں ہاتھ ڈالے اور پھر ان کے منہ بن گئے۔

"لیجیے۔ یہ ایک ہی رہی۔ ہم آٹو گراف بکیں تو لائے ہی نہیں۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔" شیلاک نے بُرا سا منہ بنایا۔

"ہماری طرف اس قسم کی باتیں بھی ہو ہی جاتی ہیں۔" فاروق گنگنایا۔

اسی وقت قدموں کی آواز ابھری۔ پروفیسر داؤد اور خان رحمان بھی آتے نظر آئے۔

"انکل۔ آپ تو اپنی آٹو گراف بک لائے ہوں گے۔"

"آٹو گراف بک۔ کیا مطلب؟" خان رحمان چونک اُٹھے۔

"لیجیے۔ آپ بھی آٹو گراف بک کا مطلب پوچھ رہے ہیں، کمال ہے۔"

"تو کیا۔ کسی اور نے بھی پوچھا ہے۔" خان رحمان کے لہجے میں بلا کی حیرت در آئی۔

"جی ہاں انھوں نے۔ خیر ہم ہاتھوں پر آٹو گراف لے لیتے ہیں۔"

"لیکن بھئی۔ ہاتھوں پر لیے گئے آٹو گراف کتنے دن چلیں گے۔" ریٹا نے منہ بنایا۔

"چلیے کوئی بات نہیں۔ چند گھنٹے تو چل ہی جائیں گے۔"

"میں دیتا ہوں انھیں آٹو گراف۔ تم سامان سمیٹو۔" شیلاک بولا۔

دوسرے ہی لمحے کمرے میں چاقو کھلنے کی کڑکڑاہٹ گونج اٹھی۔

"ہائیں۔ یہ کیسی آواز ہے؟" فاروق نے کانپ کر کہا۔

"کم از کم یہ قلم کھلنے کی آواز تو ہو نہیں سکتی۔" فرزانہ بڑبڑائی۔

"یوں بھی۔ قلم کھلنے کی آواز تو ہوتی بھی نہیں۔ ہو نہ ہو یہ چاقو۔ یا خنجر ہے۔"

"اسے کہتے ہیں، اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی۔ آئے تھے آٹوگراف لینے۔ چاقو گلے پڑ گیا۔" فاروق نے جلدی سے کہا۔

"نہیں۔ اسے اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی نہیں کہتے۔ بلکہ یہ کہتے ہیں کہ آئے تھے نماز بخشوانے ـــ روزے گلے پڑ گئے۔" فرزانہ نے بُرا سا منہ بنایا۔

"چلو یوں ہی سہی، لیکن ہم محاورات اور ضرب المثل بولتے بولتے گلے نہ کٹا بیٹھیں۔ اس شخص کے ارادے نیک نہیں لگتے۔" محمود نے جل کر کہا۔

"تو پہلے کیوں نہیں بتایا تھا۔ ہم نیک ارادے ساتھ لے آتے اور ان کے حوالے کر دیتے۔" فاروق نے کہا۔

اسی وقت شیلاک نے چاقو سمیت ان پر چھلانگ لگائی:

"ارے باپ رے۔ یہ تو سچ مچ آٹوگراف دینے لگے۔ ہم تو یوں ہی مذاق کر رہے تھے جناب۔ آپ تو بُرا مان

گئے۔" فاروق ایک کونے کی طرف لڑھک گیا۔ محمود اور فرزانہ نے بھی یہی کیا۔ خان رحمان اور پروفیسر داؤد دروازے کے ساتھ ہی دیوار سے چپک گئے۔ ادھر ریوٹا ایک بریف کیس میں کچھ چیزیں رکھنے میں محو تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اسے کمرے میں ہونے والی لڑائی سے دُور کا بھی واسطہ نہ ہو۔ شیلاک نے پہلی چھلانگ فاروق پر لگائی تھی۔ جب وہ کونے میں لڑھک گیا تو اس نے بھی اس پر چھلانگ لگائی۔ اور فاروق کے عین سر پر پہنچ گیا۔ اس کا چاقو والا ہاتھ بلند ہوا اور پھر اس کے سر کی طرف تیر کی طرح آیا، لیکن محمود کے سر کی ٹکر اسی وقت شیلاک کے سر پر لگی۔ وہ لڑکھڑا گیا اور فاروق پر گرا۔ فاروق فوراً اپنی جگہ سے کھسک گیا، لیکن دوسرا لمحہ سنسنی خیز تھا۔ شیلاک گرتے گرتے سنبھل گیا اور بلا کی رفتار سے گھومتے ہوئے اس نے چاقو والا ہاتھ فاروق پر دے مارا۔ چاقو کی نوک اس کی قمیص کو کاٹتی چلی گئی۔ وہ کمان کی طرح نہ جھک جاتا تو چاقو اپنا کام کر گیا تھا۔ ایسے میں ریوٹا کی آواز اُبھری:

"مسٹر شیلاک۔ خود کو تھکانے کی ضرورت نہیں۔ میں ان لوگوں کی خدمت میں ایک گیند پیش کیے دیتی ہوں۔"

اس کے ان الفاظ کے ساتھ ہی گیند فرش پر گری اور

ایک زور دار دھماکے کے ساتھ پھٹ گئی۔ کمرہ دھوئیں سے بھر
گیا۔ اور وہ گرتے چلے گئے۔

ہوش آیا تو وہ کوٹھی کے لان میں لیٹے ہوئے تھے اور
لوگ ان پر جھکے ہوئے تھے۔ سب سے پہلے محمود کو ہوش آیا،
اس نے سُنا۔ آفاقی صاحب کہ رہے تھے:

"کیا ہوا تھا محمود؟"

"وہ۔ وہ کہاں ہیں؟" اس نے بوکھلا کر پوچھا۔

"کون۔ گمی اور روماک؟" آفاقی صاحب بولے۔

"اگر یہ نام آپ کے ان دو مہمانوں کے ہیں جن کے اعزاز
میں یہ دعوت دی گئی تھی تو میں انھی کے بارے میں پوچھ
رہا ہوں۔"

"ہم نے دھماکے کی آواز سُنی تھی، پھر دُھواں اٹھتے دیکھا
تو سب کے سب اندر کی طرف دوڑ پڑے۔ دُھوئیں کی وجہ سے
ہم سے کمرے میں نہ گھُسا جا سکا۔ دُھواں چھٹنے میں دو منٹ
لگے، پھر ہم آپ لوگوں کو اٹھا لائے۔"

اب باقی لوگ بھی ہوش میں آ چکے تھے۔ پروفیسر داؤد
ہوش میں آتے ہی یہ کہ کر اپنی کار کی طرف چلے گئے۔ میں
ذرا تجربہ گاہ تک ہو آؤں۔

"اس کا مطلب ہے۔ آپ انھیں فرار ہوتے نہیں دیکھ سکے،

یعنی اپنے مہمانوں کو؟"

"کیوں۔ انھیں فرار ہونے کی کیا ضرورت تھی؟" آفاقی صاحب
نے حیران ہو کر کہا۔

"اس لیے کہ وہ بہت خطرناک قسم کے مجرم ہیں۔ یہاں ایک
خاص مقصد کے تحت آئے تھے، جب انھوں نے دیکھا کہ ہم
نے انھیں پہچان لیا ہے تو دُھوئیں کا بم مار کر فرار ہو گئے۔"

"نہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" آفاقی صاحب بے یقینی کے
عالم میں بولے۔

"تو پھر بتائیے۔ وہ کہاں ہیں۔ چوروں کی طرح کیوں چلے
گئے۔ دوسرے یہ کہ وہ ہوائی اڈے پر بھی نہیں ملیں گے۔"

"اوہ!" آفاقی صاحب دھک سے رہ گئے۔

"افسوس! دُھوئیں کے بم نے کام خراب کر دیا۔"

"انکل! جب یہ آپ کے ہاں مہمان آئے تھے تو دونوں آئے
تھے یا ان میں سے ایک؟"

"دونوں ساتھ ہی آئے تھے۔ ایک ماہ تک یہاں رہے۔"

"اور کیا اس دوران وہ جیل کی سیر کرنے بھی گئے تھے؟"

"جیل کی سیر کرنے۔ اوہ ہاں۔ اس کے لیے تو انھوں نے
خاص طور پر کہا تھا اور میں نے ایس پی صاحب سے بات کی
تھی کہ انھیں آزادانہ قیدیوں سے ملنے اور سوالات کرنے دیا

جائے ؛ چنانچہ انھوں نے انھیں کھلی چھٹی دے دی تھی۔"

"اور وہ چاہتے بھی یہی تھے۔ انھیں جیل سے اپنے ایک ساتھی اور بین الاقوامی مجرم شیلاک کو چھڑانا تھا اور وہ چھڑا کر لے گئے۔"

"کیا!!" وہ چلّا اُٹھے۔

"جی ہاں! جیل میں اب دراصل وہ آدمی ہے جو گمی کے ساتھ آیا تھا۔ قیدی گمی کے ساتھ فرار ہو چکا ہے اور یہ بہت بُرا ہوا۔ ہم ابّا جان کو کیا منہ دکھائیں گے۔ شیلاک ہماری آنکھوں کے سامنے سے فرار ہو گیا۔"

"کیا مطلب۔ اس میں آپ لوگوں کا کیا قصور؟"

"قصور ہے۔ ہم نے انھیں گرفتار کرانے کے لیے کوئی منصوبہ بندی نہیں کی۔"

"محمود۔ دفتر فون کرو۔ دیکھو ابّا جان فارغ ہوئے یا نہیں۔" فرزانہ نے کچھ سوچ کر کہا۔

"اچھا۔" اس نے کہا اور اٹھ کر فون کی طرف دوڑ پڑا۔

"کیوں۔ کیا تمھارے خیال میں ہم انھیں اب بھی گرفتار کر سکتے ہیں؟"

"ہاں! اگر ابّا جان ہمارے ساتھ شامل ہو جائیں تو اس کی امید کی جا سکتی ہے۔"

جلد ہی محمود واپس آتا نظر آیا۔ اس کے چہرے پر فکرمندی کے آثار تھے:

"میٹنگ روم میں بھی چکر چل گیا ہے۔ بہرحال میں نے انھیں بتا دیا ہے کہ ہم یہاں موجود ہیں۔ ابّا جان لوٹیں تو انھیں بتا دیا جائے۔"

"ٹھیک کیا۔" فرزانہ نے کہا۔

"میرا خیال ہے۔ آپ لوگوں کو آرام کرنا چاہیے۔" آفاقی صاحب بولے۔

"آرام اب کہاں انکل۔" فاروق نے سرد آہ بھری۔

"محمود تفصیل نہیں بتاؤ گے۔ دفتر میں کیا ہوا ہے۔"

محمود تفصیل سُنانے لگا۔ جوں ہی وہ خاموش ہوا، فرزانہ چلّا اُٹھی:

"ارے۔ تو پھر۔ انکل اکرام کہاں گئے؟"

"اللہ ہی بہتر جانے۔"

"اس کا مطلب ہے۔ میری کوٹھی میں ایک ماہ تک ملک دشمن جاسوس ٹھہرے رہے۔" آفاقی صاحب نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

"جی ہاں! یہی بات ہے۔"

"اور یہ کس قدر غلط بات ہے۔ میں اپنے اس دوست

سے جواب طلب کروں گا کہ انھوں نے ان کی سفارش کیوں کی۔"

"وہ بھی بے قصور نکلیں گے۔ انھوں نے کسی اور سے سفارش کرائی ہو گی۔" فرزانہ مسکرائی۔

اسی وقت ایک جیپ اندر داخل ہو گئی۔ تینوں ایک ساتھ چلائے:

"ابا جان آ گئے۔"

وہ سب ان کے گرد جمع ہو گئے۔ ان کے چہرے پر شکست صاف لکھی تھی، وہ تفصیل سنانے لگے۔

"تو آپ اسے نہیں پا سکے۔"

"نہیں۔ اور اس کی ذمے داری چوکیدار پر جاتی ہے۔ اس نے مجھے جو سڑک بتائی۔ وہ اس کے ذریعے فرار نہیں ہوا۔"

"جی۔ کیا مطلب۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" محمود نے حیران ہو کر کہا۔

"ایسے کہ تھوڑی دیر پہلے چوکیدار کو بھی بے ہوش کر کے ایک طرف ڈال دیا گیا تھا۔ اور جس چوکیدار نے مجھے غلط سڑک بتائی۔ وہ نقلی تھا۔ اب یہاں کی تفصیل بتاؤ۔ یہاں کیا ہوا ہے۔"

انھیں جلدی جلدی تفصیل سنائی گئی۔

"آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" پروفیسر داؤد بولے۔

"اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ ریوٹا شیلاک کو فرار میں مدد دینے آئی تھی اور وہ اسے جیل سے نکال لے گئی۔" وہ مسکرائے۔

"تو کیا آپ انھیں فرار ہو جانے دیں گے۔ ابھی وہ ملک سے باہر تو نہیں چلے گئے۔" محمود کے لہجے میں حیرت تھی۔

"فکر نہ کرو۔ ہر طرف فون کر دیے گئے ہیں، تمام راستوں پر چیکنگ شروع ہو چکی ہے، جہاز بھی چیکنگ سے پہلے پرواز نہیں کر سکے گا۔"

"چلیے تب تو ٹھیک ہے۔" فاروق نے مطمئن انداز میں کہا۔

"یہی تو مصیبت ہے کہ ٹھیک نہیں ہے۔ وہ ان راستوں سے فرار ہونے کی کوشش نہیں کریں گے۔ جن پر چیکنگ ہو رہی ہے۔"

"جی کیا مطلب۔" ان کے لہجے میں حیرت تھی۔

"انھوں نے جہاز وغیرہ کا نام یوں ہی لیا تھا۔ جہاز سے جانے کا ان کا ارادہ قطعاً نہیں ہو سکتا، کیوں کہ جہاز کے ذریعے فرار ہونا اتنا آسان نہیں۔ ہر قدم پر چیکنگ ہو سکتی ہے۔ وہ تو کسی آزاد راستے سے فرار ہونے کی کوشش کریں گے۔"

"اوہ! یہ تو واقعی بہت فکر والی بات ہے۔"

عین اسی وقت ایک جیپ اندر داخل ہوئی، سب اس کی طرف مڑے، انھوں نے دیکھا، اکرام جیپ سے اُتر رہا تھا:

"اکرام — تم — تم کہاں تھے؟"

"میں یہاں عین اس وقت پہنچا تھا جب دھوئیں کا بم مارا گیا — لان میں موجود سب لوگ اندر کی طرف دوڑ پڑے تھے — ایسے میں میں نے ایک مرد اور ایک لڑکی کو مکان کے پچھلے حصے سے دیوار کے ساتھ لگ کر آتے دیکھا۔ میں نے فوراً جیپ پیچھے کر لی — اور پھر وہ ایک نیلی کار میں فرار ہو گئے — اس کے بعد میں ان کا تعاقب کرنے کے علاوہ کر ہی کیا سکتا تھا۔"

"وہ مارا — پھر تو مزا آ گیا۔" محمود چلا اُٹھا۔

"یہی تو مصیبت ہے — مزا نہیں آیا — میں ان کی گرد کو بھی نہیں پا سکا۔"

"اوہ!" وہ دھک سے رہ گئے۔

"لیکن اکرام — تم نے وہ سڑک تو دیکھ ہی لی — جس پر وہ گئے تھے۔"

"جی ہاں! وہ مُلک کے مشرقی حصے کی طرف جانے والی

سڑک پر گئے ہیں۔"

"ارے!!!" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"تو پھر ہم ابھی اور اسی وقت اس سڑک کی طرف جائیں گے — اکرام تم دفتر جاؤ۔"

"جی بہتر۔"

اسی وقت پروفیسر صاحب واپس آ گئے — انسپکٹر جمشید نے جلدی جلدی انھیں حالات سُنائے، پھر بولے:

"میرا خیال ہے، آپ تو ہمارے ساتھ جانا پسند نہیں کریں گے۔"

"بالکل پسند کروں گا۔" وہ مُسکرائے۔

"لیکن آپ تو بہت مصروف ہیں۔" خان رحمان نے اعتراض کیا۔

"کوئی بات نہیں — اس مہم میں کون سا اتنا وقت لگے گا — کیوں کیا خیال ہے؟"

"جی ہاں! خیال یہی ہے کہ ہم بہت جلد ان لوگوں کو گرفتار کر کے یہاں لے آئیں گے — ہم راستے میں ملنے والی ہر نیلی کار کو چیک کرتے جائیں گے — دوسرے یہ کہ میں مشرقی دارالحکومت کے آئی جی صاحب کو بھی اس نیلی کار کے بارے میں اطلاع دے دیتا ہوں۔" انھوں نے جلدی سے کہا اور پھر فون کرتے چلے گئے — تھوڑی دیر بعد وہ خان رحمان کی

کار اور انسپکٹر جمشید کی جیپ ہیں مشرقی سڑک پر چلے جا رہے
تھے۔ راستے میں انسپکٹر جمشید چند لمحوں کے لیے اپنے گھر گئے
شاید کوئی چیز لینے کا خیال آ گیا تھا۔ انسپکٹر جمشید اپنی جیپ
چلا رہے تھے اور خان رحمان اپنی کار۔ دونوں ڈرائیونگ میں
حد درجے ماہر تھے۔ لہٰذا کاریں گویا ہوا میں اڑ رہی تھیں۔
ایک گھنٹے کے سفر کے بعد اچانک انھوں نے ایک جگہ دھواں
اُٹھتے دیکھا۔ انھیں بریک لگانا پڑے۔ نزدیک پہنچنے پر
وہ جیپ اور کار سے نیچے اُترے۔ اور پھر ساکت رہ گئے۔
سڑک سے کافی نیچے ایک گہرے کھڈ میں ایک کار
دھڑا دھڑ جل رہی تھی۔ کار کا اگلا حصّہ جلنے سے ابھی کسی
قدر محفوظ تھا اور اس حصّے کا رنگ سُرخ تھا۔

"تت۔ تو وہ دونوں کار میں جل گئے۔" خان رحمان
بڑبڑائے۔

"ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ مقابلہ شیلاک اور ریوٹا سے
ہے۔ شیلاک نے مجھے غچہ دینے کی کوشش[1] کی تھی اور میں اس
کے غچے میں آ بھی جاتا۔ اگر بروقت مجھے اس کے حبسِ دم
کی مہارت کا پتا نہ چل جاتا۔ لہٰذا میں نے اسے مُردہ خیال

[1] انشارجہ کا جاسوس پڑھیے۔

نہیں کیا اور ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال کر جیل بھجوا دیا۔ ادھر
سُنا ہے، ریوٹا کی ٹکر انسپکٹر کامران[1] مرزا سے ہوئی تھی۔ اور
فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ کہنے کا مطلب یہ کہ دونوں
بہت کائیاں ہیں۔ لہٰذا ہمیں پوری طرح جائزہ لینا ہو گا۔"

یہ کہہ کر انھوں نے سڑک کا معائنہ شروع کر دیا اور پھر
اچانک بول اٹھے:

"اوہ! وہ یہاں سے ایک دوسری کار میں سوار ہوئے ہیں،
اس کا مطلب ہے انھوں نے کار کو جان بوجھ کر کھڈ میں دھکیلا
ہے۔ آؤ جلدی کرو۔"

وہ تیزی سے کار اور جیپ کی طرف بڑھے۔

[1] خون کا ہنگامہ پڑھیے۔

انعامی ناشتا

"آپ کا کیا خیال ہے انکل۔ یہ سیاہ بادل ہم سے کیا کہ رہے ہیں۔" فرحت نے شوخ انداز میں کہا۔

"بیٹی بادلوں کی زبان تو تم ہی سمجھ سکتی ہو گی۔ بتادو کیا کہ رہے ہیں۔" انسپکٹر کامران مرزا مسکرائے۔

"یہ کہ آج کا دن پکنک منانے کا دن ہے۔"

"تو یہ کون سی مشکل بات ہے۔ تمھیں تو آج کل چھٹیاں ہیں ہی۔ کسی بھی طرف نکل جاؤ۔" انسپکٹر کامران مرزا مسکرائے۔

"یوں مزا نہیں آئے گا انکل۔ آپ بھی چلیے۔"

"اور میں دفتر کا کیا کروں؟"

"چھٹی لینے کے سوا آپ کر ہی کیا سکتے ہیں۔" آفتاب نے منہ بنایا۔

"ہوں۔ خیر بھئی۔ میں چھٹی لے لیتا ہوں۔" انھوں نے گویا ہار مانتے ہوئے کہا۔

"اور مزے کی بات یہ کہ پکنک بالکل قدرتی انداز میں منائی جائے گی۔" فرحت نے شوخ آواز نکالی۔

"قدرتی انداز سے تمھاری کیا مراد۔ ہم تو کوئی کام بھی غیر قدرتی انداز سے نہیں کرتے۔" آفتاب نے حیرت زدہ انداز میں پوچھا۔

"مطلب یہ کہ گھر سے کھانے پینے کی کوئی چیز نہیں لے جائیں گے۔ جائیں گے بھی شہر سے باہر۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ راستے میں رک کر کسی ہوٹل میں ناشتا کر لیا جائے، کیوں کہ ہم ناشتا بھی کر کے نہیں جا رہے۔" فرحت جلدی جلدی بولی۔

"لیکن میں ناشتا تیار کر چکی ہوں۔" شہناز بیگم باورچی خانے سے چلائیں اور وہ مسکرا دیے۔

"کوئی بات نہیں بیگم۔ آج کا ناشتا غریبوں میں تقسیم کر دینا، لیکن پہلے اپنا حصہ نکال لینا۔ ایسا نہ ہو کہ بعد میں اپنا خیال آئے۔" انسپکٹر کامران مرزا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"آپ بھی ان کے ساتھ بچے بن گئے۔" انھوں نے باورچی خانے سے نکلتے ہوئے کہا۔

"نہیں تو۔ دیکھ لو۔ بالکل اتنا ہی ہوں۔ جتنا پہلے تھا۔"

"اوہو۔ شاید آپ پر آفتاب کا اثر ہو گیا ہے۔" وہ گھبرا اٹھیں۔۔۔

"مجھ بے چارے کا کیا کسی پر اثر ہوگا۔ ہر ایک کا اثر مجھ پر ضرور ہو جاتا ہے۔" آفتاب نے بے چارگی کے عالم میں کہا۔
انسپکٹر کامران مرزا دفتر فون کرنے لگے۔ فون کرنے کے فوراً بعد وہ روانہ ہو گئے۔ تیاری تو کرنا ہی نہیں تھی ۔ قدرتی طور پر پکنک منانے کا یہی طریقہ ہے کہ بغیر کسی تیاری کے نکل جاؤ ۔ جنگل سے ہی کھاؤ اور جنگل سے ہی پیو ۔ ایک گھنٹا ہی چلے ہوں گے کہ آفتاب نے پیٹ پکڑ لیا اور بولا :

"ہائے ناشتا۔"

"ہاں ! ناشتا اب کر ہی لیا جائے ۔ بھوک چمک اُٹھی ہے۔" آصف نے اس کی تائید کی ۔

"بھئی پہلے فرحت سے پوچھ لو ۔ اس کی بھوک بھی چمکی یا نہیں ۔ یہ پروگرام آخر اس کا ترتیب دیا ہوا ہے۔"

"میں نے ناشتے کے لیے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا۔" وہ مسکرائی ۔

اور پھر انسپکٹر کامران مرزا نے ایک صاف ستھرا ریسٹورنٹ دیکھ کر کار روک دی ۔ چاروں نیچے اترے ۔ انھیں نیلے رنگ کی ایک گرد آلود کار ریسٹورنٹ کے سامنے کھڑی نظر آئی ۔ شاید وہ بہت لمبا سفر کر کے آ رہی تھی ۔ کار میں کوئی نہیں تھا ۔ گویا کار میں سفر کرنے والے بھی

اندر ناشتا کر رہے تھے ۔ اِدھر اُدھر کئی ٹرک اور ویگنیں بھی کھڑی تھیں ۔ لب سڑک اس ریسٹورنٹ میں ناشتا کرنے والوں کا ہجوم تھا ، لیکن شاید ابھی کسی ایک شخص کو بھی ناشتا نہیں دیا گیا تھا ۔ سب لوگ بے چینی کے عالم میں بیٹھے نظر آئے ۔ وہ بھی ایک میز کے گرد بیٹھ گئے ۔ بیرا فوراً ان کی طرف لپکا ۔ اور انھوں نے اپنا آرڈر لکھوا دیا ۔ آرڈر لکھ کر وہ قدم اٹھانے ہی لگا تھا کہ آصف بول اُٹھا :

"یہ کیا معاملہ ہے ۔ ابھی تک ایک آدمی کو بھی ناشتا نہیں دیا گیا۔"

"شاید آپ ہمارے ریسٹورنٹ میں پہلی مرتبہ آئے ہیں۔"

"اس میں تو خیر کوئی شک نہیں۔" آصف بولا ۔

"یہاں ناشتا سب کو ایک ساتھ ملے گا ۔ ناشتے سے پہلے ایک ہلکا سا پروگرام ہوتا ہے ۔ یہ پروگرام دراصل ریسٹورنٹ کو شہرت دینے کا ایک طریقہ ہے۔"

"اور وہ پروگرام کیا ہے؟"

اس سے پہلے کہ بیرا جواب دیتا ، ہال تالیوں سے گونج اُٹھا ۔ انھوں نے پہلوان نما ایک شخص کو ریسٹورنٹ کے اندرونی حصے سے ہال کی طرف آتے دیکھا ۔ یہ شخص دیو نما تھا ۔

"حاضرین ! آپ کو معلوم ہی ہے ۔ ہمارے ہاں سا کیا

دستور ہے۔ آپ میں سے جو صاحب بھی ٹامانگو سے ہاتھ
ملائے گا اور اس کے مقابلے میں ڈٹا رہے گا یعنی اپنا
ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہیں کرے گا۔ اسے ہوٹل کی
طرف سے بالکل مفت ناشتا ملے گا۔ اور وہ پانچ مرتبہ اور
ناشتا کر سکے گا۔ جب بھی اس کا جی چاہے گا، آکر
ناشتا کر لے۔ لہٰذا میں آپ کو دعوت دیتا ہوں۔ ضروری
نہیں کہ صرف ایک ہی آدمی مقابلے کے لیے اُٹھے۔
ایک سے زائد بھی مقابلہ کر سکتے ہیں اور اگر جیت گئے تو
سبھی انعامی ناشتے کے حق دار ہوں گے۔"

یہاں تک کہہ کر وہ شخص خاموش ہو گیا۔ شاید وہ
ریسٹورنٹ کا منیجر تھا۔ فوراً ہی لمبے چوڑے قد کا ایک
آدمی اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور پہلوان کے مقابلے میں آکر کھڑا
ہو گیا۔ اس نے اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ پہلوان
نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور دبانا شروع کیا۔
تھوڑی دیر تک تو وہ برداشت کرتا رہا، پھر اچانک
چیخ اُٹھا:

"ارے مرا۔ بس کرو۔"

پہلوان نے ہنس کر اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اور وُہ سر جھکا
کر اپنی میز کی طرف چلا گیا:

"اور کوئی خواہش مند ذرا جلدی کریں۔ ناشتے کو دیر ہو رہی
ہے۔" منیجر نے گویا اعلان کیا۔

ایک اور شخص اٹھا۔ اس نے بھی مقابلہ کیا اور فوراً ہی
چیخ اُٹھا۔

"کیا فضول مقابلے ہیں۔ اس سے تو بہتر تھا، ہم کسی اور
ریسٹورنٹ میں جا بیٹھتے۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

اُسی وقت ایک میز سے ایک نوجوان اٹھا۔ اس کے بال
گرد آلود تھے۔ میز پر ایک لڑکی بھی بیٹھی تھی۔ وہ بھی گرد آلود
تھی:

"شاید۔ یہ سرخ کار انہی کی ہے۔" فرحت بڑبڑائی۔

"ہاں! جس طرح کار گرد آلود ہے، اسی طرح یہ دونوں،
اور اس پر بھی مقابلہ کرنے چلا ہے۔"

نوجوان پہلوان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ وُہ اس کے
مقابلے میں بہت کمزور اور پتلا دبلا نظر آ رہا تھا۔ ایسے میں
اچانک وُہ لڑکی اُٹھی اور بولی:

"نہیں ٹام۔ تم نہیں۔ اس سے مقابلہ میں کروں گی۔"

"اوہ اچھا۔ یوں ہی سہی۔ تم آجاؤ۔" نوجوان نے مڑتے
ہوئے کہا۔

"کیا مذاق ہے۔ اب لڑکیاں میرے مقابلے پر آئیں

گی۔ بڑے بڑے کڑیل جوان تو اپنی چیخ کسی طرح روک نہیں
سکے۔" پہلوان نے غرا کر کہا۔

"اگر تم نے اسے شکست دے دی تو میں تمھارے مقابلے
پر آؤں گا۔" نوجوان ٹام بولا۔

"خیر مجھے کیا۔ اس کا ہاتھ ٹوٹ گیا تو میں ذمے دار
نہیں۔" پہلوان نے ہنس کر کہا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔ کوئی بات نہیں۔" نوجوان نے کہا۔

لڑکی اٹھ کر پہلوان کے سامنے آگئی۔ اس نے اپنا
ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ پہلوان نے پہلے تو مذاق اڑانے والے
انداز میں اس کے ہاتھ کی طرف دیکھا۔ پتلا دبلا سا ہاتھ تھا،
پھر وہ ہنسا اور لڑکی سے ہاتھ ملایا۔ پہلوان بھی کسی مغربی
ملک کا تھا اور لڑکی بھی۔ دونوں کی آنکھیں گہرے نیلے
رنگ کی تھیں۔ پہلوان نے لڑکی کے ہاتھ پر دباؤ ڈالنا
شروع کیا۔ وہ پرسکون انداز میں کھڑی مسکراتی رہی۔

اچانک پہلوان کے چہرے پر حیرت اور خوف کے آثار نمودار
ہو گئے، پھر وہ اپنی پوری طاقت اپنے بازو میں سمیٹ
لیا اور پورا زور لگانے لگا، لیکن جلد ہی اس کے
چھکے چھوٹ گئے۔ چہرے پر پسینے کے قطرے نمودار ہو
گئے۔ اس کوشش میں ایک منٹ گزر گیا، لیکن لڑکی کے

منہ سے کوئی چیخ نہ نکلی۔ چیخ تو کیا۔ اس کے چہرے پر تو
تکلیف کے ذرا بھی آثار نہیں تھے۔ اور پھر پہلوان نے اس
کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ تھکے تھکے انداز میں بولا:

"مم۔ میں ہار گیا ہوں استاد۔"

"اوہ۔ خیر۔ کوئی بات نہیں۔ چلو بھئی۔ انھیں اعزازی
ناشتا پیش کیا جائے۔" منیجر نے بلند آواز میں کہا۔

"ایک منٹ۔" انسپکٹر کامران مرزا چلّا اٹھے۔

آفتاب، آصف اور فرحت نے انھیں حیرت زدہ انداز
میں دیکھا۔ سب لوگ ان کی طرف دیکھنے لگے۔ ایسے میں فرحت
نے دبی آواز میں کہا:

"یہ آپ کیا کر رہے ہیں انکل؟"

انھوں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اسی
وقت منیجر نے ناخوش گوار لہجے میں کہا:

"کیا بات ہے جناب؟"

"یہ نا انصافی ہے۔"

"آپ کا اشارہ کون سی نا انصافی کی طرف ہے۔" وہ
بھنا اٹھا۔

"آپ نے اعلان کیا تھا کہ مقابلے کے لیے ایک سے
زائد آدمی اٹھ سکتے ہیں۔ لیکن ایک سے مقابلہ ہارنے کے

بعد ہی مقابلہ ختم کرا دیا گیا۔ میں بھی مسٹر ٹانگو کا مقابلہ کرنا چاہتا ہوں۔"

"لیکن اب تو ٹانگو مقابلہ ہار چکا ہے۔" مینجر نے اعتراض کیا۔

"تو پھر جیتنے والے سے مقابلہ کرایا جائے۔" انسپکٹر کامران مرزا مسکرائے۔

"کیا مطلب؟" مینجر نے چونک کر کہا۔

"آخر یہ فیصلہ کس طرح ہو کہ اس فن میں اس وقت یہاں سب سے زیادہ طاقت ور کون ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں ٹانگو کے منہ سے چیخ نکلوا سکتا ہوں۔ جب کہ یہ محترمہ ایسا نہیں کر سکیں۔ اتنا ضرور ہے کہ یہ چیخی نہیں۔"

"تو آپ اس خاتون سے مقابلہ کرنا چاہتے ہیں؟"

"میرا ارادہ تو مسٹر ٹانگو سے مقابلے کا تھا۔ اگر وہ تیار نہیں تو میں بھی اس خاتون سے مقابلہ نہیں کر سکتا، کیوں کہ وہ ایک عورت ہے۔ مقابلے میں کوئی مرد ہوتا تو اور بات تھی؛ تاہم میرے ساتھ ایک بچّی بھی ہے۔ میں اسے ان خاتون کے مقابلے میں بھیج دیتا ہوں۔ جاؤ فرحت۔ مقابلہ کرو ان سے۔"

"جی۔ جی بہتر۔" فرحت نے حیرت زدہ انداز میں کہا اور

اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ اس خاتون کے مقابلے میں آدھی نظر آ رہی تھی۔ لوگوں نے بھی اسے حیران ہو کر دیکھا، اب ہال میں دلچسپی اور سنسنی کی لہر دوڑ گئی تھی۔

فرحت اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ اور بے چارگی کے آثار تھے جیسے اسے زبردستی میدان میں بھیج دیا گیا ہو، لڑکی نے اسے اُلجھن کے عالم میں دیکھا، پھر ان کی میز کی طرف مڑتے ہوئے کہنے لگی:

"میرا خیال ہے۔ یہ اس بچّی کے ساتھ ناانصافی ہو گی۔ ایسا کر لیتے ہیں کہ آپ میرے ساتھی کے ساتھ مقابلہ کر لیں، اگر آپ ان سے جیت گئے تو اسے میں اپنی شکست مان لوں گی۔ یہ میں نے اس لیے بھی کہا ہے کہ بچّی کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار ہیں۔"

"نہیں! میں آپ سے خوف زدہ نہیں ہوں۔ آئیے۔" فرحت نے منہ بنا کر کہا اور ہاتھ آگے کر دیا۔

"خاتون! مجھے آپ کی تجویز بھی پسند آئی؛ تاہم مقابلہ آپ دونوں کا بھی ہو ہی جانا چاہیے۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"خیر یوں ہی سہی۔ مجھے کیا۔ لیکن شکایت نہ کیجیے گا۔"

"فکر نہ کریں۔" انسپکٹر کامران مرزا مسکرائے۔

ریٹا نے اپنا ہاتھ آگے کر دیا اور فرحت کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس نے اس کے ہاتھ پر دباؤ ڈالنا شروع کیا — فرحت نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ کوئی فولادی ہاتھ اس کے ہاتھ کو بھینچے ڈال رہا ہے؛ تاہم اس کے منہ سے چیخ نہ نکل سکی۔ وہ مقابلے میں ڈٹی ہی رہی۔ یہاں تک کہ ریٹا نے اپنا سارا زور صرف کر ڈالا۔ فرحت پسینے میں نہا گئی۔ اس نے برداشت کی انتہا کر دی۔ منہ سے چیخ نہ نکلنے دی۔ ادھر ریٹا کے چہرے پر غصّے کے آثار نمودار ہو گئے۔ لیکن وُہ کر ہی کیا سکتی تھی۔ پورے ہال کی نظریں ان پر جمی تھیں۔ آخر اس نے فرحت کا ہاتھ چھوڑ دیا اور تھکے تھکے انداز میں بولی:

"افسوس! میں اسے چیخ پڑنے پر مجبور نہیں کر سکی۔"

"یہ مقابلہ شاید تمام گاہکوں کے لیے حیرت انگیز تھا۔" منیجر کی آواز ابھری: "بہرحال اب ناشتا پیش کیا جائے۔ اس بچّی کو اعزازی ناشتا دیا جائے گا۔"

"ابھی یہ مقابلہ ختم نہیں ہوا۔" ایک آواز گونجی۔ لوگ آواز کی سمت میں مُڑے۔ انھوں نے ریٹا کے ساتھی کو اُٹھتے دیکھا، اس کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ تھی۔

"کیا مطلب؟" کئی آوازیں اُبھریں۔

"میں اس بچّی کے ساتھی سے مقابلہ کروں گا۔" ٹام بولا۔

"جی نہیں۔ میرا خیال ہے، مقابلہ اب ختم ہو چکا ہے۔" منیجر بولا۔

"کیا حرج ہے۔ کیا حرج ہے۔" کئی آوازیں اُبھریں۔

"لوگوں کی خواہش ہے۔ یہ مقابلہ بھی ہو ہی جائے۔" یہ کہتے ہوئے انسپکٹر کامران مرزا اٹھ کھڑے ہوئے۔ دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے آ گئے۔

"اگر میں نے آپ کو چیخ پڑنے پر مجبور کر دیا تو آپ ہاریں گے۔" ٹام بولا

"ٹھیک ہے۔ اور اگر میں نے آپ کو چیخنے پر مجبور کر دیا تو آپ ہار جائیں گے۔"

"بالکل!" انھوں نے فوراً کہا۔

"اور اگر ہم دونوں نہ چیخ سکے۔" انسپکٹر کامران مرزا مسکرائے۔

"تب یہ مقابلہ برابر رہے گا۔"

"بات یہ بھی ٹھیک ہے۔"

دونوں نے ہاتھ آگے بڑھا دیے۔ ہاتھ ملے اور ان پر زور لگایا جانے لگا۔ پورا ہال غور سے ان کے چہروں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دونوں کے چہروں پر کسی تکلیف کے آثار نہیں تھے۔ یُوں لگتا تھا جیسے وہ زور لگا ہی نہ رہے ہوں،

لیکن۔ یہ تو ان دونوں کو ہی معلوم تھا کہ کتنا زور لگ رہا تھا۔ انسپکٹر کامران مرزا اگر دل ہی دل میں حیران ہو رہے تھے تو ٹام بھی کچھ کم حیران نہیں تھا۔ آخر پورا ایک منٹ گزر گیا۔ منیجر کی آواز ہال میں گونج اٹھی:

"میرا خیال ہے۔ یہ مقابلہ برابر رہے گا۔ بس کیجیے۔"

"کیوں جناب۔ کیا خیال ہے؟" ٹام نے جلدی سے پوچھا۔

"اگر آپ برابر ہاتھ چھوڑنے پر تیار ہیں تو مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔ مقابلہ برابر رہا۔" ٹام بولا۔

ان کے ہاتھ الگ ہو گئے۔ انسپکٹر کامران مرزا اپنی میز پر آ گئے:

"یہ کیا ہوا انکل؟" آصف نے کانپتی آواز میں کہا۔

"میرے مقابلے پر کوئی عام آدمی نہیں تھا بھئی۔ میں نہیں جانتا۔ یہ کون ہے، لیکن میں اس لڑکی کو اچھی طرح پہچان چکا ہوں۔ اور ان مقابلوں کی ضرورت بھی میں نے اسی لیے محسوس کی تھی کہ ذرا اسے نزدیک سے دیکھنے کا موقع مل جائے گا۔"

"جی کیا مطلب۔ آپ اسے پہچان چکے ہیں؟"

"ہاں! تم نے دراصل اس کی طرف توجہ نہیں دی۔

تمھاری توجہ پہلے تو پہلوان کی طرف رہی۔ اور اس کے بعد ہاتھوں اور چہرے کے تاثرات کی طرف کہ پہلے چیخ کس کی نکلتی ہے، لیکن اگر تم اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے تو ضرور پہچان لیتے۔"

"اوہو۔ اچھا۔ یہ بات ہے۔ تو ہم ابھی اسے غور سے دیکھنا شروع کر دیتے ہیں، یہ کیا مشکل ہے۔" آفتاب نے جلدی جلدی کہا اور پھر تینوں کی نظریں ریٹا پر جم گئیں۔ چند سیکنڈ بعد ہی ان کی آنکھوں میں حیرت کے دیے جگمگا اٹھے۔

"اوہو۔ یہ ہم کیا دیکھ رہے ہیں۔" فرحت بڑبڑائی۔

"وہی جو میں دکھانا چاہتا ہوں۔"

"ہمیں اب سو فی صد یقین ہو چلا ہے ابا جان۔ یہ ریٹا نہیں۔ ریوٹا ہے۔ جس سے خون کے معاملے میں ملاقات ہوئی تھی۔" آفتاب نے کانپتی آواز میں کہا۔

"ہاں! تمھارا اندازہ درست ہے۔" انھوں نے الجھن کے عالم میں کہا۔

"لل۔ لیکن۔ یہ اور یہاں۔"

"اسی بات پر مجھے حیرت ہے۔"

"اور۔ یہ اس کے ساتھ کون ہے۔"

"مجھے نہیں معلوم۔ ہے یہ بھی میک اپ میں۔ اگر میں نے اسے پہلے دیکھا ہوتا، یا کم از کم اس کی تصویر ہی دیکھی ہوتی تو فوراً بتا سکتا تھا کہ یہ کون ہے۔ بہر حال یہ بھی خطرناک آدمی جان پڑتا ہے۔"

"اس۔ اس کا مطلب ہے۔" آفتاب کہتے کہتے رُک گیا۔

"کیا مطلب ہے اور کس کا۔" آصف نے بُرا سا منہ بنایا۔

"یہ کہ۔ ہماری پکنک گئی بھاڑ میں۔"

"پکنک۔ کون سی پکنک۔ کیسی پکنک۔ کہیں تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا۔" انسپکٹر کامران مرزا نے بھنّا کر کہا۔

"ج۔ جی۔ جی کیا مطلب۔" تینوں بوکھلا اُٹھے۔

انسپکٹر کامران مرزا نے کوئی جواب نہ دیا۔ ان کی نظریں ریوٹا اور اس کے ساتھی پر جمی تھیں۔ ریوٹا اس کے کان میں کچھ کہہ رہی تھی، پھر وہ تیزی سے اُٹھی اور غسل خانوں کی طرف چلی گئی۔

"انھوں نے کوئی مشورہ کیا ہے۔ خبردار ہو جاؤ۔ یہ ریوٹا ہی ہے اور اس صورت میں صاف ظاہر ہے کہ اس نے ہمیں پہلی ہی نظر میں پہچان لیا ہوگا، کیوں کہ ہم میک اپ میں نہیں ہیں۔"

"ہوں۔" وہ سوچ میں گم لہجے میں بولے۔

ان کی نظریں ریوٹا کے ساتھی پر جمی تھیں۔ اور وہ گہری سوچ میں گم تھا، کبھی کبھار وہ ان کی طرف بھی دیکھ لیتا۔ لیکن سرسری انداز میں۔ اور آخر ریوٹا واپس آتی دکھائی دی۔ جوں ہی وہ اپنے ساتھی تک پہنچی۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں کاؤنٹر پر پہنچے۔ بل ادا کیا اور دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ انھوں نے ناشتا بھی بہت تیزی سے کیا تھا:

"یہ لیجیے۔ وہ جا رہے ہیں۔"

"آؤ۔ جلدی کرو۔" انسپکٹر کامران مرزا بھی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ انھوں نے بھی کاؤنٹر پر پہنچ کر بل کی رقم پھینکی اور باہر کی طرف لپکے۔ اسی وقت انھوں نے سُرخ کار کو حرکت میں آتے دیکھا:

"ابا جان۔ وہ نکلے جا رہے ہیں۔"

"فکر نہ کرو۔ میں انھیں نکلنے نہیں دوں گا۔"

باہر نکلتے ہی وہ اپنی کار میں بیٹھے۔ انسپکٹر کامران مرزا نے انجن سٹارٹ کرنے کے لیے چابی گھمائی۔ اس وقت تک سرخ کار نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ ان کی کار کا انجن گھرر گھرر کرکے رہ گیا۔

"ارے۔ اسے کیا ہوا؟" انھوں نے بوکھلا کر کہا۔ جلدی سے نیچے اترے۔ انجن کا جائزہ لیا تو ایک تار الگ نظر آیا۔ جلدی سے اسے اپنی جگہ پر لگایا اور پھر کار میں بیٹھ گئے۔ اب کار سٹارٹ کی تو وہ چل پڑی۔ اب وُہ اس سمت میں اڑے جا رہے تھے۔ لیکن پندرہ منٹ کی مسلسل دوڑ کے بعد بھی سُرخ کار کے آثار نظر نہیں آئے۔ انھوں نے یک دم کار روک دی۔ اور افسوس زدہ لہجے میں بولے:

"وُہ چال چل گئے۔"

"جی۔ کیا مطلب؟"

"کار کا تار ریوٹا نے الگ کیا تھا۔ وہ غسل خانوں کی طرف سے ہو کر ریسٹورنٹ سے باہر نکلی تھی اور کار میں خرابی پیدا کرکے پھر اندر آ گئی تھی، کیوں کہ وہ جانتی تھی۔ ہم ان کا تعاقب ضرور کریں گے۔"

"اوہ۔ اس کا مطلب ہے۔ وہ نکل گئے۔"

"ابھی میں کچھ نہیں کہ سکتا۔"

وُہ واپس مڑے اور وائرلیس پر اس کار کے سلسلے میں پیغام نشر کرنے لگے۔ ایک منٹ کے اندر اندر تمام سڑکوں کی ناکہ بندی کر دی گئی۔ ہوائی اڈوں۔ اور اسٹیشنوں پر سادہ

لباس والے پہنچ گئے۔ وُہ بھی مختلف سڑکوں پر دوڑتے رہے، ایسے میں ایک ٹریفک سارجنٹ موٹر سائیکل پر آتا نظر آیا، اس نے انھیں رکنے کا اشارہ کیا۔ اس کا چہرہ غصّے سے سرخ ہو رہا تھا۔ کچھ سوچ کر انسپکٹر کامران مرزا نے کار روک لی:

"وہ تو نکل گئے۔ آپ کو تو چالان کروانا ہی ہوگا۔"

"کون نکل گئے؟"

"دو بد بخت۔ انتہائی تیز رفتاری سے کار چلا رہے تھے۔"

"سرخ رنگ کی کار تو نہیں تھی؟" انسپکٹر کامران مرزا جلدی سے بولے۔

"ہاں! تھی تو سُرخ ہی۔ کیوں۔ آپ کیوں پُوچھ رہے ہیں؟"

"اس لیے کہ ہمیں بھی اسی کی تلاش ہے۔" یہ کہتے ہی انسپکٹر کامران مرزا نے کار آگے بڑھا دی۔

"ارے ارے۔ یہ کیا۔ رکو۔" سارجنٹ نے چلّا کر کہا۔ لیکن وُہ بھلا کہاں رُکنے والے تھے۔ سارجنٹ نے بھی موٹر سائیکل ان کے پیچھے چھوڑ دی۔ لیکن جلد ہی وُہ کار سے بہت پیچھے رہ گیا۔ اور پھر اس نے رک جانے میں ہی عافیت محسوس کی۔

"کیا آپ کے خیال میں ہم انھیں پکڑ لیں گے؟" آصف بولا۔

"اُمید پر دنیا قائم ہے۔"

"اور ہم تو کچھ زیادہ ہی قائم ہیں۔" آفتاب نے بے چارگی کے عالم میں کہا۔

دُور بہت دُور۔ سڑک کے بیچوں بیچ کوئی شخص کھڑا نظر آیا تو وہ چونک اُٹھے:

"یہ کون ہے۔ اور سڑک پر کیوں کھڑا ہے؟" فرحت نے اُلجھن کے عالم میں کہا۔

"لفٹ کی ضرورت ہو گی۔ کوئی دے نہیں رہا ہوگا۔ اس نے سوچا۔ اس طرح تو کسی کو کار وغیرہ روکنا ہی پڑے گی۔" آصف بولا۔

"ہوں۔ لیکن ہم لفٹ دینے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔" فرحت نے منہ بنایا۔

"اور میں کچھ اور سوچ رہا ہوں۔" آفتاب نے سوچ کے انداز میں کہا۔

"تمھارا کیا ہے۔ تم تو ہمیشہ ہی کچھ اور سوچا کرتے ہو۔" آصف نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"ہاں آفتاب۔ تم کیا سوچ رہے ہو؟"

"یہ کہ۔ یہ بھی کہیں ریوٹا کی چال نہ ہو۔"

"اوہ ہاں۔ ایسا ہی لگتا ہے۔ لیکن کیا کیا جائے۔ مجبوری ہے۔ کار کو آہستہ کرنا ہی ہو گا۔" یہ کہ کر انھوں نے پورے بریک لگائے۔ گاڑی عین اس کے پاس جا کر رُکی:

"کیوں بھئی۔ مرنے کا ارادہ ہے کیا؟"

"ہاں! زندگی اور موت کا سوال ہے۔ میری بچّی بہت بیمار ہے۔ ہسپتال کے اخراجات کے لیے میرے پاس کچھ نہیں ہے۔"

"اوہ اچھا۔ یہ لو۔ ادھر آجاؤ۔" انھوں نے جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔

جُوں ہی وُہ سڑک سے ہٹ کر کھڑکی کی طرف آیا۔ انھوں نے کار ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی:

"یہ آپ نے کیا کیا۔ اس کی مدد نہیں کی۔" آفتاب بولا۔

"اس لیے کہ وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ اس کی جیب سُرخ نوٹوں سے بھری ہوئی تھی اور یہ نوٹ اسے ضرور ریوٹا نے دیے تھے۔ تاکہ وُہ ہماری کار کو روک لے اور زیادہ سے زیادہ دیر کے لیے روک لے۔"

"اوہ۔ آخر ریوٹا کیا چاہتی ہے؟"

"ہمارے مُلک سے فرار ہونا، کیوں کہ ان کے رُخ سے میں سمجھ گیا ہوں کہ وُہ کس راستے سے مُلک سے باہر جانے کی ٹھانے ہوئے ہیں۔"

"کس راستے سے۔ کچھ ہمیں بھی تو بتائیں۔"

"اس سے بھی زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ وہ اس طرح کیوں بھاگ رہی ہے۔ شاید اپنے ساتھی کی وجہ سے۔ اب مجھے یہ احساس ہو رہا ہے کہ وہ اپنے اس ساتھی کو ہمارے ملک سے لے جانے کے لیے آئی تھی۔ اور غالباً اس کا ساتھی ہمارے ملک کی کسی جیل میں تھا۔"

"یہ۔ یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں۔"

"اس طرح کہ کچھ عرصہ پہلے انسپکٹر جمشید نے ایک بین الاقوامی مجرم شیلاک کو گرفتار کرایا تھا۔ وہ اس وقت سے جیل میں ہے۔ فرار نہیں ہو پایا۔ شاید اسی لیے ریوٹا کو بھیجا گیا ہو گا۔"

"اوہ۔ تو اس کے ساتھ شیلاک ہے۔ اس کے بارے میں تو سنا ہے۔ بہت خوفناک مجرم ہے۔" فرحت نے پریشان آواز میں کہا۔

"یہ کون سی نئی بات ہے۔ ہمارا واسطہ کم خوفناک مجرموں سے پڑتا ہی کب ہے۔"

"ہوں۔ اور آپ نے یہ نہیں بتایا کہ وہ کس راستے فرار ہونے کی سوچ رہے ہیں۔"

"ملک کے جنوبی حصے کی طرف سے۔ اس طرف سمندر کے ذریعے سے فرار ان کے لیے آسان ہو گا۔"

"آپ کا مطلب ہے۔ شوکی برادرز کے شہر سے۔" آفتاب جلدی سے بولا۔ لہجے میں جوش تھا۔

"ہاں بالکل۔" انھوں نے کہا۔

"اور اب ہمارا رخ بھی اسی سمت میں ہے۔" فرحت نے پوچھا۔

"ہاں! کاش ہم ان دونوں کو جا لیں۔" انسپکٹر کامران مرزا نے سرد آہ بھری۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس بار شوکی برادرز سے ملاقات کر رہے ہیں۔" فرحت بولی۔

"ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ہمارا اصل مقصد ریوٹا اور اس کے ساتھی کو گرفتار کرنا ہے۔ وہ بہر حال ہمارے ملک کے مجرم ہیں۔" انسپکٹر کامران مرزا نے پرعزم لہجے میں کہا۔

ان کا سفر تین گھنٹے تک جاری رہا۔ آخر شہر کے آثار نظر آنے لگے۔ اور پھر انہیں کار کو روکنا پڑا۔ سڑک پر ایک بڑی گاڑی کو آڑا کھڑا کیا گیا تھا۔

"خبردار!" ایک گونج دار آواز کانوں سے ٹکرائی۔

اسے پڑھ لیں

انھوں نے پریشان نظروں سے ان کی طرف دیکھا ۔ تین پولیس آفیسر پستول تانے کھڑے نظر آئے ۔ وہ اس گاڑی کی اوٹ سے نکلے تھے ۔

" کیا بات ہے جناب ؟"

" ہمیں اطلاع ملی تھی کہ ایک سرخ کار میں تین مرد اور ایک لڑکی اس سڑک سے آ رہے ہیں اور وہ چاروں سمگلر ہیں ، ان کی کار میں سمگلنگ کا سامان بھی ہے ۔"

" افسوس ! اس وقت ہم بہت جلدی میں ہیں ۔ چیکنگ کرانے میں دیر لگ جائے گی ۔ اس لیے مہربانی فرما کر آپ ہمیں جانے دیں ۔ واپسی پر کار کی چیکنگ کرا دیں گے ۔" آفتاب نے جلدی جلدی کہا ۔

" یہ ۔ یہ آپ کیا کر رہے ہیں ، ایسا بھی کبھی ہوتا ہے ۔" پولیس آفیسر نے کہا ۔

" تو آج ایسا کر لیجیے نا ۔" آفتاب بھنّا اٹھا ۔

" نہیں جناب ۔ آپ کو چیکنگ کرانا ہو گی ۔"

" اچھا تو پھر ادھر آ جائیے ۔ یہ دیکھ لیجیے ۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے ۔

" ہم نزدیک نہیں آئیں گے ۔ پہلے آپ لوگ کار سے نکل کر ہاتھ اوپر اٹھا کر کھڑے ہو جائیے ۔ ہم جانتے ہیں ، آپ انتہائی خطرناک ہیں ۔"

" اچھا بھائی ۔ یہ لو ۔" انسپکٹر کامران مرزا نے بے چارگی کے عالم میں کہا اور چاروں کار سے باہر نکل آئے ۔ انھوں نے ہاتھ اوپر اُٹھا دیے ۔

" چلو بھئی ۔ ان کی کار کی اچھی طرح تلاشی لو ۔" پولیس آفیسر نے اپنے دو ساتھیوں سے کہا ، پھر ان سے بولا :

" فرار ہونے کی کوشش کا دوسرا نام موت ہو گا ۔ اس گاڑی میں پولیس ہی پولیس بھری ہوئی ہے ۔"

" اس اِطلاع کے لیے شکر گزار ہیں ۔" آصف نے منہ بنایا ۔

کار کی تلاشی شروع ہوئی اور آخر پانچ منٹ بعد ایک آفیسر نے چہک کر کہا ۔

" ان کی اِطلاع بالکل درست ثابت ہوئی جناب ۔ ہیروئن کی تھیلی مل گئی ہے ۔ سٹپنی کے نیچے چھپائی گئی تھی ۔"

"کیا مطلب؟" انسپکٹر کامران مرزا حیران رہ گئے۔

"یہ رہی تھیلی۔ ہمیں اطلاع بھی یہی دی گئی تھی۔ اطلاع دینے والے نے فون پر بتایا تھا کہ تم لوگوں کے پاس بھاری مالیت کی ہیروئن موجود ہے۔"

وہ سناٹے میں آ گئے۔ فوراً جان گئے کہ یہ بھی ریوٹا کی حرکت ہے۔ اس نے صرف کار میں خرابی ہی نہیں کی تھی، ہیروئن بھی رکھ دی تھی۔ تالے کھولنا اس جیسوں کے لیے یوں بھی بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

"آپ ہماری تلاشی بھی لے لیں۔" انسپکٹر کامران مرزا نے کچھ سوچ کر کہا۔

"ہاں! وہ تو لینی ہو گی۔" آفیسر بولا۔

ان کی تلاشی لی گئی اور پستول اور دوسری چیزیں قبضے میں لے لی گئیں:

"اب ذرا مجھے ہاتھ نیچے گرانے کی مہلت دیں۔" وہ بولے۔

"کیوں۔ کیا ارادے ہیں؟"

"میری اندرونی جیب میں ایک چیز رہ گئی ہے۔ وہ آپ کو دکھانا چاہتا ہوں۔"

"خبردار۔ ہاتھ نیچے نہ گرانا۔ ہم خود وہ چیز نکال لیں گے۔" اس نے غرا کر کہا۔

ان میں سے ایک نزدیک آیا۔ ان کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا اور پلاسٹک کور میں رکھا کاغذ نکال لیا:

"یہ کیا ہے؟" اس نے منہ بنا کر کہا۔

"اسے پڑھ لیں۔"

"کسی بڑے آدمی کا سفارش نامہ ہو گا، لیکن سفارش نہیں چلے گی۔"

"یہ سفارش نامہ نہیں۔ اجازت نامہ ہے۔" انسپکٹر کامران مرزا نے جل بھن کر کہا۔

"کس بات کا اجازت نامہ۔ یہ کہ آپ اس ملک میں آزادانہ ہیروئن کا کاروبار کر سکتے ہیں۔"

"ہاں! اسی بات کا۔ پڑھ کر تو دیکھ لیں۔"

آفیسر نے حیران ہو کر کاغذ اپنے ماتحت سے لیا اور ان کے چہروں پر ایک نظر ڈالتے ہوئے نظریں کاغذ پر جما دیں۔ دوسرے ہی لمحے اس کا رنگ اُڑتا نظر آیا:

"آ۔۔ آپ۔ یہ آپ ہیں؟" اس نے کہا، اس کے دونوں ساتھی حیرت زدہ رہ گئے، پھر کاغذ انھوں نے لے لیا۔

"ہاں! آپ ہمارا بہت زیادہ وقت ضائع کر چکے۔ جن لوگوں نے آپ کو اطلاع دی۔ ہم انھی کا تعاقب کر رہے ہیں۔ اور اب شاید ان کی گرد کو بھی نہ پا سکیں۔ خیر

اب تو ہمیں جانے دیں۔ یا اب بھی کوئی اعتراض ہے؟"

"ج - جی - نہیں - آپ شوق سے تشریف لے جائیے۔"

"شکریہ!" انھوں نے کہا۔ جلدی جلدی ایک کاغذ پر پیغام لکھا اور پھر کاغذ اس کے حوالے کرتے ہوئے بولے:

"یہ آئی جی صاحب کو اسی وقت پہنچا دیں۔ بہت ضروری ہے۔"

"جی بہتر۔ میں خود لے کر جاتا ہوں۔" اس نے کہا۔

"شکریہ!" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا اور کار ایک بار پھر خراٹے بھرنے لگی۔

"شاید اب ہم ان تک نہ پہنچ سکیں۔" آصف نے مایوسانہ انداز میں کہا۔

"اگر وہ شہر سے باہر نہیں نکل گئے تو ہم اب بھی ان کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ تم فکر نہ کرو۔" انسپکٹر کامران مرزا مسکرائے

"کیوں نہ ہم پہلے شوکی برادرز سے مل لیں۔" آفتاب بڑبڑایا۔

"بھئی مل لیں گے۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے۔" انھوں نے بھنا کر کہا۔

"یہ ان کا شہر ہے۔ وہ ہماری مدد کر سکتے ہیں۔" فرحت بولی۔

"میں اپنے آپ کو مجبور اور بے بس خیال کرنے کا عادی نہیں۔" انھوں نے کہا اور خاموش ہو گئے۔ آفتاب، آصف اور فرحت کو بھی کچھ اور کہنے کی جرأت نہ ہوئی۔

وہ شہر سے باہر پہنچ گئے، لیکن ریوٹا اور شیلاک کی سرخ کار انھیں نظر نہ آسکی:

"ابا جان! یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ انھوں نے ایک بار پھر کار بدل لی ہو۔" آفتاب نے کہا۔

"ہاں! اس کا امکان ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہاں ان کا کوئی ایجنٹ ہو اور وہ مزے سے اس کے گھر میں بیٹھے ہوں۔ نیلی کار اس ایجنٹ کے گیراج میں کھڑی ہو اور ہم سڑکوں کی خاک چھان رہے ہوں۔ یہ سبھی کچھ ہو سکتا ہے، لیکن اس کے باوجود ہم مجبور ہیں۔ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ سوائے اس کے کہ ان کی تلاش جاری رکھیں۔ یہی ہمارا فرض ہے، ہماری ذمے داری ہے۔" انھوں نے جلدی جلدی کہا۔

آخر وہ واپس مڑے۔ آفتاب، آصف اور فرحت قریب قریب مایوس ہو چلے تھے۔ کہ اچانک انسپکٹر کامران مرزا نے کار کو بریک لگائے۔ وہ چونک اٹھے۔ کار بائیں طرف مڑنے والے ایک کچے راستے پر رکی تھی۔

"ٹائروں کا بالکل تازہ نشان۔ اس طرف کچھ ہی دیر پہلے

ایک کار گئی ہے۔"

"لیکن انکل! یہ ضروری نہیں کہ وہ ریوٹا اور شیلاک کی ہی کار ہو۔" فرحت بولی۔

"ہاں فرحت۔ یہ ضروری ہے۔" وُہ مسکرائے۔

"جی کیا فرمایا۔ یہ ضروری ہے، یعنی وُہ کار ریوٹا اور شیلاک کی ہی ہے۔"

"ہاں بھئی۔ مجھے سو فیصد یقین ہے۔ نیچے اُتر کر ان نشانات کا جائزہ لو۔ تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ مجھے یقین کیوں ہے۔"

آفتاب، آصف اور فرحت نے حیرت زدہ انداز میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر کار سے نیچے اُتر آئے۔ تازہ نشانات کو غور سے دیکھنے کے بعد انھوں نے پھر انسپکٹر کامران مرزا کی طرف دیکھا:

"ہم کچھ نہیں سمجھے انکل۔"

"بھئی بالکل سیدھی سی بات ہے۔ یہ راستا کار کی چوڑائی کے مطابق نہیں ہے۔ لہٰذا کار کی ایک سائڈ کو نیچے اُتارا گیا۔ اس سے صاف ظاہر ہے۔ اس راستے پر کار پہلے نہیں لے جائی جاتی رہی۔ ریوٹا اور شیلاک مجبور تھے، اس لیے کار کسی نہ کسی طرح لے گئے۔"

"تو پھر۔ کیا ہم پیدل چلیں۔"

"نہیں۔ ہم بھی کار میں ہی چلیں گے۔ نہ جانے کتنا فاصلہ طے کرنا پڑے۔"

انھوں نے کہا اور کار موڑ لی۔ اب وُہ آہستہ رفتار سے چل رہے تھے۔ ایک جگہ فرحت چلّا اُٹھی:

"وُہ دیکھو انکل۔ ایک جھاڑی میں رومال اُلجھا ہوا ہے۔"

ان کی نظریں جھاڑی میں اٹک گئیں، پھر انسپکٹر کامران مرزا اُترے اور رومال کھینچ لیا۔ انھوں نے دیکھا، رومال خون آلود تھا۔ اور خون ابھی خشک نہیں ہوا تھا۔

"ہو سکتا ہے، یہ رومال شیلاک کا ہو۔ اس کی اُنگلی وغیرہ پر کوئی زخم آگیا ہو اور اس نے اُنگلی رومال سے صاف کی ہو، پھر رومال اس کے ہاتھ سے نکل گیا ہو۔ بہرحال اب ہمیں آگے بڑھ کر دیکھنا ہی ہوگا۔"

وُہ برابر آگے بڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ راستا ختم ہو گیا اور سامنے ایک کچّا مکان نظر آنے لگا، لیکن یہاں کوئی کار نہیں کھڑی تھی۔

"آؤ بھئی۔ دیکھیں۔"

کار سے نیچے اُتر کر وُہ مکان تک پہنچے، دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔ وہ بے دھڑک اندر داخل ہو گئے اور پھر بوکھلا

اُٹھے۔ اندر ایک عورت کمرے کے کچّے فرش پر جھاڑو دے رہی تھی اور ایک مرد کا منہ حقّے کی نالی سے لگا ہوا تھا، لیکن وُہ اونگھ رہا تھا۔

عورت کی نظریں جُوں ہی ان پر پڑیں، وہ چیخ مار کر اُچھل پڑی۔ ساتھ ہی مرد چونک کر سیدھا ہو گیا، پہلے تو جھندھائی ہوئی آنکھوں سے انھیں دیکھتا رہا، پھر گھبرائی ہوئی آواز میں بولا:

"آپ۔ آپ کون ہیں جناب اور اس طرح اندر کیوں گھس آئے؟"

"غلطی سے گھس آئے ہیں۔ جس کے لیے معافی چاہتے ہیں۔ کیا اس طرف کوئی نیلی کار آئی تھی۔ کار ایک مرد چلا رہا تھا اور اس کے ساتھ ایک عورت بھی تھی؟"

"ہاں آئے تھے۔ بھوکے تھے بے چارے۔ روٹی کھا کر چلے گئے۔ کیا آپ بھی بھوکے ہیں۔ مکئی کی روٹی اور چھاچھ موجود ہے۔"

"نہیں شکریہ۔ ہمیں تو دراصل ان سے کام ہے۔ آؤ بھئی چلیں۔"

وہ باہر نکلے۔ آگے کھیتوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا، لہٰذا ریوٹا اور شیلاک کو یہاں سے واپس مڑنا پڑا ہوگا:

"ایسا معلوم ہوتا ہے۔ ریوٹا نے ہمیں آتے دیکھ لیا تھا، سو وہ اچانک اس طرف مڑ گئے اور ہم آگے نکل گئے، پھر وہ پلٹ کر شہر کی طرف چلے گئے۔"

"تب تو ان سے ملاقات کا امکان روشن ہو گیا ہے۔" فرحت نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

"آپ نے اس بڑے میاں سے یہ نہیں پوچھا کہ کار کس رنگ کی تھی۔" فرحت نے خیال دلایا۔

"اوہ ہاں! ٹھہرو۔ یہ ضروری ہے۔" وُہ پھر کار سے اُتر کر دروازے پر گئے:

"کیوں جناب۔ کار کا رنگ کیا تھا؟"

"نیلا۔" مرد نے فوراً کہا۔

"بہت بہت شکریہ۔" وُہ بولے۔

اب ان کا رُخ پھر شہر کی طرف تھا۔

"میں سمجھ گیا۔ اس شہر سے وہ کسی اور شہر نہیں جائیں گے۔ بلکہ اپنے ملک جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اور اس کے لیے یا تو وہ سمندر کا سہارا لیں گے یا پھر پہاڑوں کا۔ پہاڑوں کی چوٹی پر پہنچ کر دوسری طرف اُترنا اس قدر آسان نہیں، لیکن ان لوگوں کے لیے اتنا مشکل بھی نہیں۔ خیر۔ ہم اس طرف بھی کوشش کریں گے۔"

شہری حدود میں داخل ہوتے ہی انسپکٹر کامران مرزا نے آئی جی انوار عالم کے نمبر ڈائل کیے، سلسلہ جلد ہی مل گیا:

"ہیلو سر- کامران مرزا بول رہا ہوں، آپ کو میرا رقعہ تو مل گیا ہوگا۔"

"کامران مرزا - یہ آپ ہیں - آپ کہاں سے بول رہے ہیں اور کون سے رقعے کی بات کر رہے ہیں؟"

"جی - کیا فرمایا - کون سے رقعے کی بات کر رہا ہوں۔"

"ہاں! مجھے تو آپ کا کوئی رقعہ نہیں ملا۔"

"کیا!!!" وہ حیرت زدہ ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

"پوری بات بتائیں۔" وہ بولے۔

"میں خود آ رہا ہوں سر - معاملہ بہت اہم ہے۔"

"خود آ رہے ہیں - کیا آپ آس پاس ہی کہیں موجود ہیں؟"

"جی ہاں - میں پندرہ بیس منٹ تک پہنچ جاؤں گا۔"

"تو پھر میں انتظار کر رہا ہوں۔" وہ بولے۔

آندھی اور طوفان کی طرح کار چلاتے وہ ان کے دفتر پہنچ گئے - آئی جی صاحب نے نہایت گرم جوشی سے ان کا استقبال کیا - انسپکٹر کامران مرزا نے جلدی جلدی انھیں تفصیل سنائی - انھوں نے اِدھر اُدھر چند فون کیے اور آخر تھکے تھکے انداز میں بولے:

"جن لوگوں نے آپ کا راستہ روکا، وہ پولیس کے آدمی نہیں تھے - ضرور ریوٹا اور شیلاک کے ساتھی تھے - اور اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کے ملک کے یہاں بہت سے ایجنٹ موجود ہیں - جنھیں پہلے ہی خبردار کر دیا گیا ہے اور وہ ان کی ہر ممکن مدد کر رہے ہیں۔"

"جی ہاں! میں یہ نتیجہ نکال چکا ہوں - سوال یہ ہے کہ اب ہم کیا کر سکتے ہیں - میں تو اس خیال میں رہا کہ ان کی گرفتاری کے لیے پورے شہر کی پولیس حرکت میں آ چکی ہو گی اور ان کے فرار کے تمام راستے بند کر دیے گئے ہوں گے، لیکن میں بھول گیا تھا کہ مقابلہ ریوٹا اور شیلاک سے ہے - جو عام مجرم نہیں - بین الاقوامی مجرم ہیں - خیر - میرا اندازہ یہ ہے کہ ابھی وہ شہر سے نہیں نکلے - ہیں شہر میں ہی کسی جگہ - ہم ان کے حلیے بھی لکھوا دیتے ہیں۔"

انھوں نے سب چیزیں نوٹ کروا دیں اور آئی جی صاحب فون کرنے میں مصروف ہو گئے - آخر ریسیور رکھ کر بولے:

"اب آپ کو کوئی اطلاع ملنے تک آرام کرنا ہوگا۔"

"تت - تب پھر شش۔" آفتاب نے ہکلا کر کہا۔

"تت - تب پھر شش کیا؟" آئی جی حیرت زدہ انداز میں بولے۔

"جی ۔ انھیں تو بس شوکی برادرز سے ملاقات کی لگی ہے۔" انھوں نے منہ بنایا۔

"اوہ اچھا ۔ میں انھیں یہیں بلوا لیتا ہوں۔" وہ فون کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولے۔

"جی نہیں انکل ۔ اس طرح مزا نہیں آئے گا ۔ ابا جان، آپ یہیں تشریف رکھیں اور کسی اطلاع کا انتظار کریں ۔ ہم ذرا ان کے ہاں ہو آتے ہیں، زیادہ دیر نہیں لگائیں گے ۔ انھیں ساتھ لے کر یہیں آجائیں گے۔" آفتاب نے جلدی جلدی کہا۔

"اچھا بابا ۔ جیسے تمھاری مرضی، لیکن اتنا سن لو ۔ اگر مجھے کہیں جانا پڑ گیا میں انتظار نہیں کروں گا۔"

"جی بہتر۔" آصف بولا۔

آئی جی مسکرا دیے ۔ تینوں باہر نکلے اور ٹیکسی میں بیٹھ کر شوکی برادرز کے دفتر کی طرف روانہ ہوئے ۔ راستا انھیں معلوم ہی تھا دفتر کے سامنے اُترے ۔ دروازہ کھلا تھا ۔ نزدیک پہنچتے ہی بے دھڑک اندر داخل ہو گئے، لیکن پھر ٹھٹک کر رک گئے ۔ وہ چاروں دفتر میں نہیں تھے ۔ ہاں ایک لڑکا ضرور بیٹھا اونگھ رہا تھا ۔ وہ ہڑبڑا کر سیدھا ہو گیا ۔ اور گھبرا کر بولا:

"آپ ۔ آپ ۔ لگ کیا کوئی کیس حل کرانا ہے۔"

"ہاں! ملاقات کا کیس حل کرانا ہے۔" آفتاب بولا۔

"وہ ۔ وہ ۔ شوکی برادرز تو کہیں گئے ہوئے ہیں۔"

"اوہو اچھا ۔ یہ تو بہت بُرا ہوا ۔ خیر ۔ کہاں گئے ہیں؟"

"جی معلوم نہیں ۔ تاہم ایک آدھ گھنٹے تک آجائیں گے۔"

"خیر ۔ ہم ان کے امی ابو سے مل لیتے ہیں ۔ کیا باہر سے جانا ہو گا؟"

"ان کے امی ابو آپ کو جانتے ہیں؟" ارشد نے حیران ہو کر پوچھا۔

"بہت اچھی طرح۔"

"تو پھر اندرونی دروازے سے ہی چلے جائیں ۔ پہلے دستک دے لیں۔"

آصف نے آگے بڑھ کر دستک دی ۔ فوراً ہی قدموں کی آواز سنائی دی ۔ اور پھر دروازہ کھلتے ہی شوکی کی والدہ کی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی:

"لڑکو! تم کسی کام کے بھی ہو یا بالکل نکمّے ہی ہو۔"

انھوں نے بوکھلا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا ۔ اور ادھر شوکی کی امی کی نظریں ان پر پڑیں ۔ وہ بول اٹھیں:

"ہائیں ۔ یہ تمھاری صورتوں کو کیا ہوگیا۔ اوہ سمجھ گئی ۔ تم نے ضرور میک اپ ۔"

ان کے الفاظ درمیان ہی میں رہ گئے۔ اسی وقت مردانہ آواز گونجی تھی :

"کیا سمجھ گئی ہو بیگم۔ کچھ مجھے بھی تو سمجھاؤ۔" یہ آواز مشتاق احمد خان کی تھی۔

"ادھر تو آیئے ۔ دیکھیے تو سہی ۔ ان کی مہارت۔ اُف اللہ اتنا زبردست میک اپ ۔ بھئی کمال ہوگیا۔"

"کس نے کیا ہے ۔ اتنا زبردست میک اپ۔" مشتاق احمد خان بولے ۔ پھر وہ بھی دروازے پر نمودار ہوگئے۔

"آپ کے ان سپوتوں نے۔"

"اوہو ۔ یہ ۔ یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں ۔ لیکن نہیں ۔ بیگم تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا ۔ یہ میک اپ میں نہیں ہیں۔"

"جی کیا فرمایا ۔ میک اپ میں نہیں ہیں۔"

"بیگم ۔ عقل کے ناخن لو ۔ میک اپ کرنے سے آدمیوں کا حلیہ تبدیل ہوتا ہے ۔ تعداد کم یا زیادہ نہیں ہوتی۔" انھوں نے تلملا کر کہا۔

"اوہ ہاں ۔ واقعی ۔ یہ تو تین عدد ہیں ۔ حد ہوگئی یعنی کہ۔" انھوں نے گھبرا کر کہا۔

"اور دوسری مزے کی بات یہ کہ یہ تو انسپکٹر کامران مرزا کے بچے ہیں۔"

"ارے ہائیں ۔ کیا ۔ اچھا۔" وہ چلا اُٹھیں۔

پھر دروازہ پورا کھل گیا اور وہ انھیں اندر کھینچ لے گئیں:

"لیکن آنٹی ۔ انکل ۔ وہ گئے کہاں ہیں؟"

"ان میں بس یہی بُری بات ہے ۔ بتا کر نہیں جاتے۔"

"اوہ ۔ تب تو ہم یہاں نہیں رک سکتے۔ ابا جان آئی جی صاحب کے دفتر میں ہمارا انتظار کر رہے ہیں ۔ وہ جوں ہی آئیں ۔ آپ انھیں وہاں بھیج دیں۔"

"چلو ۔ میں تم لوگوں کے ساتھ چلتا ہوں۔" مشتاق احمد خان بولے ۔

"نہیں انکل ۔ آپ تکلیف نہ کریں ۔ ہمیں شاید یہاں پھر آنا ہوگا ۔ ابھی تو ہم ایک پریشانی میں مبتلا ہیں ۔ دو بین الاقوامی مجرموں کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک آئے ہیں۔"

"اوہ اچھا ۔ جیسے تم لوگوں کی مرضی۔"

ان سے رخصت ہوکر بجھے بجھے انداز میں وہ واپس روانہ ہوئے ۔ دفتر پہنچے تو وہاں انسپکٹر کامران مرزا نہیں تھے ۔ نہ صرف انسپکٹر کامران مرزا ۔ بلکہ آئی جی صاحب

بھی نہیں تھے۔ اور مزے کی بات یہ کہ وہ کسی کو بھی کچھ
بتا کر نہیں گئے تھے۔ وہ سوچ میں ڈوب گئے:

"اس کا مطلب ہے۔ انھیں ریوٹا اور شیلاک کا سراغ
مل گیا ہو گا۔" آفتاب نے پُر خیال انداز میں کہا۔

عین اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ آئی جی کے اسسٹنٹ
نے ریسیور اٹھایا اور پھر ان کی طرف بڑھا دیا:

"آپ کا فون ہے۔ انسپکٹر صاحب بول رہے ہیں۔"

آفتاب نے جلدی سے ریسیور لیا اور بے تابانہ بولا:

"ہیلو ابا جان۔ خیریت تو ہے۔"

"فوراً سول ہسپتال پہنچو۔ ان دونوں کو یہاں لایا گیا ہے۔"

"آپ کا مطلب ہے۔ شیلاک اور ریوٹا کو۔"

"ہاں۔ آخر ہم نے انھیں پا ہی لیا۔" انسپکٹر کامران
مرزا بولے۔

"ہم آ رہے ہیں۔"

وہ ایک بار پھر افراتفری کے عالم میں باہر نکلے۔ ٹیکسی
لی اور سول ہسپتال پہنچے۔ انسپکٹر کامران مرزا ان کا انتظار
کر رہے تھے، آئی جی صاحب بھی ان کے ساتھ تھے۔
دیکھتے ہی بولے:

"ان کی کار ایک درخت سے ٹکرا گئی تھی۔ انھیں بے ہوش

حالت میں یہاں تک لایا گیا ہے۔ ان کے حلیے وہی ہیں
جو ہم نے لکھوائے تھے۔ فی الحال ڈاکٹر صاحبان انھیں
ہوش میں لانے کی تدبیر کر رہے ہیں۔ جوں ہی وہ
ہوش میں آئے۔ ہمیں ان کے پاس پہنچا دیا جائے گا۔"

"اوہ۔ اچھا۔" ان کے منہ سے نکلا۔

وہ بے چینی سے انتظار کرتے رہے۔ آخر بیس منٹ بعد
ایک نرس ان کے پاس آ کر بولی:

"وہ دونوں ہوش میں آ گئے ہیں۔ آپ ان سے مل
سکتے ہیں۔"

"بہت بہت شکریہ۔" یہ کہہ کر وہ اٹھے اور نرس کے
پیچھے چلنے لگے۔ آخر ایک کمرے میں داخل ہوئے۔ کمرے
میں دو بستر لگے تھے اور دونوں پر ایک مرد اور ایک عورت
لیٹے تھے۔ ان کی آنکھیں کھلی تھیں اور وہ گہرے گہرے
سانس لے رہے تھے۔ پہلی نظر میں وہ انھیں شیلاک اور
ریوٹا نظر آئے، لیکن جب غور سے دیکھا تو فوراً ہی چونک
اٹھے:

"اوہو۔ یہ کیا۔"

"کیا ہوا؟" آئی جی بولے۔

"ان کے چہروں پر تو میک اپ کیا گیا ہے۔ اور وہ بھی

بہت جلدی میں۔"

"کیا!!!" آئی جی بولے۔

"جی ہاں! یہ دیکھیے۔" انھوں نے آگے بڑھ کر ان کا
میک اپ اُتار دیا۔ اب اور ہی شکل صورت کے مرد اور عورت
لیٹے نظر آئے:

"کون ہو تم؟" آئی جی غرّا کر بولے۔

"دو مصیبت کے مارے۔ ہمیں زبردستی اس کار میں بٹھا کر
ہمارے چہروں پر میک اپ کیا گیا تھا اور پھر کوئی چیز سنگھا
دی گئی تھی۔ بس ہم وہ سونگھتے ہی بے ہوش ہو گئے۔"

"اوہ!"

عین اسی وقت ایک نرس کمرے میں داخل ہوئی اور بولی:

"انسپکٹر کامران مرزا پلیز۔ آپ کا فون ہے۔"

انھوں نے حیرت بھری نظروں سے انھیں دیکھا اور نرس
کے ساتھ باہر نکل گئے۔ فون کا ریسیور اُٹھاتے ہی ان کے کانوں
سے ریوٹا کی آواز ٹکرائی، وہ بُری طرح ہنس رہی تھی:

"بہت بُری طرح چکرا رہے ہو انسپکٹر۔ خیر۔ ہم شہر میں ہی
ہیں اور تمھیں چیلنج کرتے ہیں کہ ہمیں تلاش کر لو۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی ریسیور رکھ دیا۔

ہم بے چارے

"آج میرے دل کا بایاں حصّہ زور زور سے دھڑک رہا
ہے۔" آفتاب نے اعلان کرنے والے انداز میں کہا۔

"دماغ تو نہیں چل گیا۔" شوکی نے بھنّا کر اس کی طرف
دیکھا۔

"یہ۔ اندازہ۔ آپ نے کس طرح لگا لیا؟" آفتاب نے
حیران ہو کر پوچھا۔

"دل کے دھڑکنے والی بات تو چلو تسلیم کی جا سکتی ہے،
لیکن یہ کیا بات ہوئی کہ دل کا بایاں حصّہ دھڑک رہا ہے۔
آخر تمھیں یہ کیسے معلوم۔ کہ بایاں حصّہ دھڑک رہا ہے یا
دایاں۔ یا پھر پورا دل۔" شوکی نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

"بات تو بہت معقول ہے۔ جواب دو آفتاب۔" اشفاق نے
خوش ہو کر کہا۔

"لیکن آپ کی خوشی سے باچھیں کیوں کھلی جا رہی ہیں"۔ اس

نے اشفاق کو گھورا۔

" یہ اچھا طریقہ ہے۔ خود کو جواب سے بچانے کا۔ اُلٹا سوال کر دیا۔" اخلاق نے جلا کر کہا۔

" خیر۔ میں جواب دیے دیتا ہوں۔ ایسی کون سی بات ہے۔ لیجیے۔ جواب حاضر ہے۔ جس طرح امّی جان کی بائیں آنکھ پھڑکتی ہے۔ بالکل اسی طرح میرے دل کا بایاں حصّہ دھڑک رہا ہے۔"

" غلط۔ بالکل غلط۔ یہ بات تسلیم کی ہی نہیں جا سکتی۔ اس سلسلے میں یہ ہو سکتا ہے کہ ہم کسی ڈاکٹر سے مشورہ کریں۔"

" ضرور۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔"

" بات دراصل یہ ہے کہ آج ہمیں۔" وہ کہتے کہتے رک گیا۔ عین اُسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ شوکی نے ریسیور اُٹھایا، دوسری طرف سے کوئی کہ رہا تھا:

" ہیلو۔ کیا یہ شوکی برادرز کا دفتر ہے؟"

" نن۔ جی۔ ہاں۔"

" نن۔ جی ہاں کیا؟" دوسری طرف سے چونک کر کہا۔

" مطلب یہ کہ یہ شوکی برادرز کا ہی دفتر ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔"

" تب پھر پہلے نہیں کیوں کہنے لگے تھے آپ؟" دوسری طرف

سے کہا گیا۔

" وہ۔ میرے منہ سے نکل گیا تھا۔" شوکی نے جلدی سے کہا۔

" نہیں۔ ضرور میں نے غلط نمبر ڈائل کیا تھا اور آپ بلاوجہ شوکی بن رہے ہیں۔" دوسری طرف سے بھنا کر کہا گیا اور پھر سلسلہ کاٹ دیا گیا۔ شوکی نے بھی بُرا سا منہ کر ریسیور رکھ دیا۔

" کون تھا بھائی جان؟"

" ابھی نوبت کون تھا تک نہیں پہنچ سکی تھی۔" شوکی نے بُرا سا منہ بنایا۔

اسی وقت گھنٹی پھر بجی۔ شوکی نے کچھ سوچ کر آفتاب سے کہا:

" اس مرتبہ فون تم سُنو۔ اور دیکھو۔ منہ سے نہیں کا لفظ نہ نکلنے پائے۔"

" نہیں نکلے گا۔" آفتاب نے گھبرا کر کہا۔

" نہیں کا لفظ منہ سے نکال بھی رہے ہیں اور کہ بھی رہے ہیں کہ نہیں نکلے گا۔" اخلاق نے بھنا کر کہا۔ دوسری طرف آفتاب نے ریسیور میں کہا:

" جی ہاں جناب۔ یہ شوکی برادرز کا دفتر ہے۔"

" اس کا مطلب ہے۔ وہ جھوٹ بول رہا تھا۔" دوسری طرف سے غصیلے لہجے میں کہا گیا۔

"کون - آپ کس کی بات کر رہے ہیں؟"

"چھوڑیے - مجھے آپ لوگوں سے کام ہے - کام حد درجہ خفیہ نوعیت کا ہے - اگر آپ کرنا پسند کریں تو ابھی اور اسی وقت ہوٹل گل ریز میں آ جائیں، لیکن ایک شرط ہے۔"

"چلیے شرط بھی بتا دیں۔" آفتاب نے بے چارگی کے عالم میں کہا۔

"آپ کسی کو بھی یہ بتا کر نہیں آئیں گے کہ کہاں جا رہے ہیں۔"

"بہت بہتر - نہیں بتائیں گے - ہمارا کیا جاتا ہے۔" آفتاب بولا۔

"تو پھر آ جائیے - میں کمرہ نمبر ۲۵ میں آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔"

"آپ کا نام۔"

"نام کی کوئی ضرورت نہیں - بس آپ ۲۵ نمبر کمرے میں آ جائیں۔"

"آپ نے گل ریز ہوٹل بتایا ہے نا - جو ساحلِ سمندر پر ہے۔"

"آپ بالکل ٹھیک سمجھے - یہ ہوٹل بحری جہازوں کے عملے کے لیے کھولا گیا ہے - عام لوگ اس ہوٹل میں نہیں آتے،

یوں پابندی نہیں ہے۔"

"شکریہ - ہم آ رہے ہیں - تقریباً تیس منٹ تک پہنچ جائیں گے۔"

"ایک بار پھر کہے دیتا ہوں - کسی سے بھی ذکر نہیں کریں گے کہ کہاں جا رہے ہیں۔"

"اچھی بات ہے۔" آفتاب نے کہا اور پھر ریسیور رکھ کر ہماری طرف مُڑا:

"ایک کیس ہے، لیکن ہے پُر اسرار۔" وہ بولا۔

"ہمیں تو ملتے ہی پُر اسرار کیس ہیں۔" اشفاق نے منہ بنایا۔

"وہ تو بعد کی بات ہے - یہ کیس ملنے سے پہلے ہی پُر اسرار ہے - اس شخص نے کہا ہے کہ ہم کسی کو بھی بتا کر نہیں آئیں کہ کہاں جا رہے ہیں۔"

"اوہ! لیکن جانا کہاں ہے۔" اخلاق نے بے چینی کے عالم میں کہا۔

"یہ میں کس طرح بتا سکتا ہوں۔"

"کیوں - ہمیں بتانے میں کیا حرج ہے۔" شوکی نے آنکھیں نکالیں۔

"معاف کیجیے گا بھائی جان - یہاں ارشد بھی موجود ہے، اور ارشد کے سامنے میں نہیں بتا سکتا، کیوں کہ میں اس شخص

سے وعدہ کر چکا ہوں۔" آفتاب بولا۔

"تو پھر۔ کیا ہم چلیں۔"

"ہاں بالکل۔ اگر ایک عدد کیس حل کرنا ہے تو جانا ہی پڑے گا۔"

وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ ارشد نے بے بسی کے عالم میں ان کی طرف دیکھا، جیسے کہ رہا ہو:

"یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ مجھے بتائے بغیر جانا کسی طرح بھی مناسب نہیں۔"

"ہمیں افسوس ہے ارشد۔ وعدہ ہو چکا ہے۔" شوکی نے بھی اسے اشاروں میں کہا، ارشد کے چہرے پر الجھن دوڑ گئی۔

وہ باہر نکل کر ٹیکسی میں بیٹھے۔

"اب کیا کرو گے مکھن۔ ٹیکسی ڈرائیور کو تو بتانا ہی پڑے گا۔" شوکی نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔

"نہیں۔ بالکل نہیں بتاؤں گا۔ چلو بھئی۔ ناک کی سیدھ میں چلو۔" اس نے کہا۔

"جی کیا کہا۔ ناک کی سیدھ میں۔ ناک کی سیدھ میں میں کیسے چل سکتا ہوں۔ سامنے تو کھمبا ہے۔"

"اوہو۔ میرا مطلب ہے۔ بس اسی سڑک پر چلے چلو۔ جہاں مڑنے کی ضرورت ہوگی۔ تو بتا دوں گا۔"

"لیکن آپ پہلے ہی کیوں نہیں بتا دیتے کہ کہاں جانا ہے۔"

"یہ حضرت قسطوں میں بتانے کے عادی ہیں۔" اخلاق بولا۔

"تو پھر ان کی بجائے آپ بتا دیں۔"

"ہمیں معلوم ہی نہیں کہ جانا کہاں ہے۔"

"آپ لوگ کہیں مذاق کے موڈ میں تو نہیں ہیں۔" اس نے منہ بنا کر کہا۔

"ارے نہیں۔ ہم بھلا آپ سے کیوں مذاق کریں گے۔ مذاق کرنے کے لیے اور تھوڑے ہیں کیا۔" آفتاب ہنسا۔

"جیسے آپ کی مرضی۔ میرا کیا ہے۔ یہ لیجیے۔ چل پڑا سڑک پر۔"

پچیس منٹ بعد وہ ٹیکسی سے اترے۔ آفتاب آگے آگے چل رہا تھا:

"بھئی اب تو ہمیں بتا دو۔ جانا کہاں ہے۔ یہ تم بحری جہازوں کے اڈے کی طرف کیوں نکل آئے ہو۔"

"اس شخص کی خواہش یہی تھی کہ ہم اس طرف نکل آئیں۔" آفتاب مسکرایا۔

"گویا تم ہمیں بھی کچھ نہیں بتاؤ گے۔"

"بس اب دیر ہی کتنی رہ گئی ہے۔ سامنے ایک ہوٹل نظر آ رہا ہے نا۔" آفتاب بولا۔

" ہاں۔ بالکل نظر آرہا ہے تو پھر۔"

" بس۔ ہم ذرا اس ہوٹل کے اندر چلیں گے۔"

" حد ہو گئی۔ کیا اس نے یہ کہا تھا کہ ہمیں بھی کچھ نہ بتایا جائے۔"

" نہیں! اس نے یہ نہیں کہا تھا، لیکن میں وعدہ کر چکا ہوں۔ اس لیے نبھانا پڑے گا۔"

آخر وہ ہوٹل میں داخل ہوئے۔ آفتاب تیر کی طرح کاؤنٹر کی طرف گیا اور دبی آواز میں بولا:

" کمرہ نمبر ۲۵۔"

" سیدھے چلے جایئے، پھر دائیں طرف مڑ جایئے گا۔" کلرک نے کہا۔

وہ سیدھے چل پڑے، پھر بائیں طرف مڑے ہی تھے کہ کمرہ نمبر ۲۵ نظر آگیا۔ آفتاب نے اس کے دروازے پر دستک دی۔ کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی، پھر دروازہ کھولے بغیر وہ بولا:

" باہر کون ہے؟"

" شوکی برادرز۔" آفتاب بولا۔

" تمھارے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ تم شوکی برادرز ہی ہو، ہو سکتا ہے، تم جوکی برادرز ہو۔" اندر سے کہا گیا۔

" ہونے کو ہم روکی برادرز بھی ہو سکتے ہیں جناب۔ کیا آپ شکل صورت کے لحاظ سے ہمیں پہچانتے ہیں۔" اخلاق بولا۔

" اخبارات میں کبھی کبھار تصاویر دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے، لیکن میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ پہچان ہی لوں گا۔"

" تب پھر۔ آپ ہی بتایئے۔ ہم اپنی شناخت کس طرح کرائیں۔" اشفاق نے بے چارگی کے عالم میں کہا۔

" آپ کا اپنے ادارے کا کارڈ تو ہو گا۔" اس نے کہا۔

" جی ہاں۔ ہے۔" شوکی فوراً بولا۔

" تو وہی اندر سرکا دو۔"

" آپ اس قدر خوف زدہ کیوں ہیں۔" آفتاب نے منہ بنایا۔

" میں خوف زدہ نہیں ہوں۔ بس احتیاط کر رہا ہوں۔"

" اچھی بات ہے، خوب جی بھر کر احتیاط کریں، ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔" آفتاب نے منہ بنایا۔

شوکی نے اپنا کارڈ اندر سرکا دیا، چند سیکنڈ بعد دروازہ کھلا۔

" جلدی سے اندر آ جائیں۔" ایک گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ شاید دروازے کے ساتھ پیچھے ہٹتا چلا گیا تھا اور اب دیوار سے لگا کھڑا تھا۔

چاروں اندر داخل ہوئے۔ فوراً ہی دروازہ بند کر کے

پٹخنی لگا دی گئی۔ انھوں نے ایک جوان آدمی کو اپنے سامنے
کھڑے دیکھا۔ اس کے جسم پر سفید لباس تھا۔ چہرے پر
پریشانی اور فکر مندی کے آثار تھے:
"تو۔ تو آپ ہیں شوکی برادرز" اس نے بے یقینی کے
عالم میں کہا۔
"ہم تو ہیں ہی جناب، لیکن اگر آپ یہ بات تسلیم نہ
کریں تو ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے" آفتاب نے طنزیہ انداز میں
مسکراتے ہوئے کہا۔
"کچھ کیوں نہیں کر سکتے۔ کم از کم صبر تو کر ہی سکتے ہیں"
اشفاق بولا۔
"خیر خیر۔ میں یہ بات مان لیتا ہوں۔ کہ تم لوگ ہی شوکی
برادرز ہو۔ اب مجھ سے ملو۔ میں ہوں، کپتان شومی"
"کپتان شومی صاحب! ہم کچھ نہیں کہ سکتے کہ آپ سے
مل کر خوشی کا اظہار کریں یا نہ کریں" آفتاب نے مسمسی صورت
بنائی۔
"کوئی بات نہیں۔ یہ ملاقات کچھ اس قسم کے حالات میں
ہو رہی ہے کہ خوشی کا اظہار کیا بھی نہیں جا سکتا۔ بہر حال
مہربانی فرما کر پہلے میری پوری بات سن لیں۔ میں ایک بحری
جہاز کا کپتان ہوں۔ میرا جہاز آج اس وقت سے ٹھیک

دو گھنٹے بعد روانہ ہونے والا ہے۔ میں بہت مشکل سے وقت
نکال کر یہاں آیا ہوں۔ آپ کے دفتر اس لیے نہیں گیا کہ
میرا تعاقب کیا جا رہا تھا۔ تعاقب کرنے والے اس وقت بھی
ہال میں موجود ہوں گے" وہ کہتا کہتا رک گیا، اسی وقت شوکی
نے برا سا منہ بنا کر کہا:
"آپ کو ہمیں یہ بات فون پر ہی بتا دینی چاہیے تھی،
اب ہم بھی ان لوگوں کی نظروں میں آگئے ہیں"
"میں نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے" وہ دھیمے انداز میں
مسکرایا۔
"وہ کیوں! آپ کو ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی" اشفاق
جلدی سے بولا۔
"تاکہ آپ واپس جانے کا خیال دل سے نکال دیں"
اس نے پر اسرار انداز میں کہا۔
"کہاں سے واپس جانے کا" اخلاق بوکھلا اٹھا۔
"یہاں سے اپنے گھر جانے کا۔ آپ لوگوں کے لیے
اب صرف اور صرف ایک ہی راستا رہ گیا ہے۔ اور وہ یہ کہ
میرے ساتھ بحری جہاز پر چلیں"
"بات سمجھ میں نہیں آئی کہ ہمارے لیے بس ایک ہی
راستا کیوں رہ گیا ہے۔ ہم تو کہیں بھی جا سکتے ہیں، ہم پر

کوئی پابندی نہیں ہے۔" شوکی نے ہنسا کر کہا۔
" آپ نہیں جانتے۔ تعاقب کرنے والے نہیں چاہتے کہ کوئی مجھ سے ملاقات کرے اور ملاقات کرکے کسی کو کچھ بتائے۔"
" تو آپ فون پر ہی سب کچھ بتا سکتے تھے۔"
" نہیں! میں فون پر کچھ بتانے کے قابل نہیں ہوں۔ اس طرح معاملہ اور خراب ہو جائے گا۔ پولیس کو اطلاع دے کر بھی معاملات خراب ہو سکتے تھے۔ سوچ سوچ کر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ آپ لوگوں سے مدد لی جائے؛ چنانچہ آپ یہاں موجود ہیں۔"
" وہ تو سب ٹھیک ہے جناب، لیکن آپ یہ بھی تو بتائیں، کام کیا ہے؟"
" میرے جہاز پر کوئی گڑبڑ ہے۔ میں اندازہ نہیں لگا سکا کہ کیا، لیکن کچھ نہ کچھ ہے ضرور۔"
" آپ نے یہ اندازہ کس بنا پر قائم کیا۔" شوکی نے جلدی سے کہا۔
" اس طرح کہ میں ہر چیز کو ذاتی طور پر چیک کرنے کا عادی ہوں۔ اس بار بھی جب میں نے چیکنگ کرنے کی کوشش کی تو مجھے ایک رقعہ ملا۔ اس میں لکھا تھا۔ خبردار۔ چیکنگ کرنے کی کوشش کی تو جان سے جاؤ گے اور تمھارا نشان تک

کسی کو نہیں ملے گا۔ میں یہ رقعہ پڑھ کر ڈر گیا۔ جہاز سے اُتر کر جانے لگا تو محسوس ہوا۔ کچھ لوگ میری نگرانی کر رہے ہیں۔ میں اور بھی ڈرا۔ پھر ایک آدمی مجھ سے ٹکراتا ہوا آگے نکل گیا۔ وہ میرے ہاتھ میں کاغذ کا ایک پُرزہ تھما گیا تھا، اس پُرزے پر لکھا تھا۔ جہاں کہیں بھی جاؤ۔ سوچ سمجھ کر جاؤ، ہم سائے کی طرح تمھارے ساتھ ہیں۔ اگر کسی شخص نے تم سے ملاقات کی تو ہم اسے بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"
" ج۔ جی۔ کک۔ کیا مطلب؟" آفتاب بوکھلا اٹھا۔
" ہاں۔ یہی بات ہے۔ اس پرزے پر یہی لکھا تھا۔ میں بہت زیادہ پریشان ہو گیا، ایسے میں آپ لوگوں کا خیال آیا اور میں نے آپ کو بلا لیا۔" یہاں تک کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔
" یہ آپ نے اچھا نہیں کیا۔" شوکی نے جل کر کہا۔
" ہاں! یہ ٹھیک ہے، میں نے آپ لوگوں کے حق میں اچھا نہیں کیا، لیکن۔ میری حالت پر بھی غور کر لیں۔ آخر میں اور کیا کرتا، کسے بلاتا؟" اس نے بے چارگی کے عالم میں کہا۔
" پولیس۔ بحری پولیس کو بلانا چاہیے تھا۔"
" آپ۔ نہیں سمجھیں گے۔ میں اور میرا جہاز کن خطرات کا شکار ہیں۔ جہاز کا کپتان جب اس کی چیکنگ نہ کر سکے تو پھر

اس جہاز کا اللہ ہی مالک ہے۔ اللہ ہی جانتا ہے، ان لوگوں نے اس میں کوئی خرابی پیدا کی ہے یا کیا بات ہے۔ جہاز غرق ہونے والا ہے یا کیا واقعہ پیش آنے والا ہے۔"

"تب آپ کے لیے بہترین راستا یہ ہے کہ جہاز کو یہاں سے لے جایا ہی نہ جائے۔ آپ خود ہی یہ اعلان کر دیں کہ جہاز میں کوئی گڑبڑ ہے۔ جب تک گڑبڑ دور نہیں ہو جاتی، اسے لے جانا غلط ہو گا۔" شوکی نے تلملائے ہوئے انداز میں کہا۔

"دراصل آپ ابھی تک حالات کی سنگینی کا اندازہ نہیں لگا سکے۔ انھوں نے رقعے میں یہ بھی لکھا ہے۔ جہاز اگر مقررہ وقت پر یہاں سے روانہ نہ ہوا تو اسے ڈائنامیٹ سے اڑا دیا جائے گا۔ اس طرح کچھ بھی نہیں بچے گا، جب کہ دوسری صورت میں تمام مسافر بخیریت اپنی منزل پر پہنچ جائیں گے۔"

"تب پھر۔ جہاز میں گڑبڑ کیا ہے۔" اشفاق جھلا اٹھا۔

"گڑبڑ کہاں ہے، یا کیا ہے، میں نہیں جانتا۔ صرف یہ جانتا ہوں کہ گڑبڑ ہے ضرور۔"

"ان حالات میں ہم بے چارے کیا کر سکیں گے۔" اخلاق مایوسانہ انداز میں بولا۔

"میں یہ بھی نہیں جانتا کہ آپ لوگ کیا کر سکیں گے اور کیا نہیں۔ بس گھنگھور اندھیرے میں روشنی کی ایک کرن مجھے آپ

لوگ نظر آئے۔ اور میں نے آپ کو بلا لیا۔"

"کیا یہاں سے فون کیا تھا؟" شوکی نے جلدی سے کہا۔

"فون میں نے کاؤنٹر سے کیا تھا۔ اور وہ لوگ میرے بہت نزدیک کھڑے تھے۔"

"گویا ہمیں ابھی اور اسی وقت آپ کے ساتھ جہاز پر چلنا ہو گا۔ یہاں تک کہ ہم اپنے گھر والوں کو اطلاع بھی نہیں دے سکتے کہ کہاں جا رہے ہیں۔"

"ہاں! جہاز اسی صورت میں روانہ ہو سکتا ہے، ورنہ اسے اڑا دیا جائے گا۔"

"کپتان شومی صاحب۔ آپ نے ہمیں ایک بہت بڑی مصیبت میں مبتلا کر دیا ہے۔" آفتاب نے فکرمندانہ انداز میں کہا۔

"ہاں! مجھے اس کا احساس ہے، لیکن میں کر ہی کیا سکتا ہوں۔ میں خود کس قدر مجبور ہوں۔ کوئی راستا بھی تو مجھے نظر نہیں آ رہا۔" اس نے قریب قریب روتے ہوئے کہا۔

"خیر۔ اللہ کو اگر یہی منظور ہے تو ہم چپ چپاتے — کسی کو کانوں کان خبر نہ کرتے ہوئے۔ بحری جہاز پر سوار ہو جائیں اور اپنے ملک سے نکل جائیں۔ تو ہم کر ہی کیا سکتے ہیں، کم از کم اتنا تو بتا دیں۔ جہاز کو جانا کہاں ہے؟"

"افریقہ۔ لیکن ہو سکتا ہے۔ یہ افریقہ نہ پہنچ سکے۔ اور

یہ لوگ اسے کسی اور ہی سمت میں لے جائیں۔"

"جہاز پر صرف مسافر ہی سوار ہیں یا کوئی سامان بھی؟"

"مسافر اتنے زیادہ نہیں ہیں۔ جتنا سامان۔ دراصل یہ ایک مال بردار جہاز ہے۔ ملک کا مال افریقی ممالک کو سپلائی کرتا ہے۔ عام طور پر میرے جہاز سے چاول باہر بھیجا جاتا ہے اور اس وقت بھی چاول جہاز پر لدا ہوا ہے۔"

"ان لوگوں کا پروگرام چاول کہیں اور پہنچانا تو نہیں؟"

"نہیں۔ اس کا قطعاً امکان نہیں۔ میرے خیال میں پوری دُنیا میں چاول کا کہیں بحران نہیں مچا ہوا۔"

"کچھ قحط زدہ ممالک بھی تو ہیں۔" شوکی نے پُرخیال لہجے میں کہا۔

"ہاں، لیکن وہ تو پہلے ہی قحط کا شکار ہیں۔ وہ بے چارے کیا اس قسم کی سازش کر سکتے ہیں۔ دُوسرے ممالک انھیں خوراک روانہ کرتے رہتے ہیں۔ یہ تو کوئی اور ہی چکر ہے۔"

"اور آپ نے اتنے بڑے چکر سے نبٹنے کے لیے ہم بے چاروں کو منتخب کر لیا ہے۔ افسوس۔ کاش۔" آفتاب نے سرد آہ بھری۔

"افسوس۔ کاش۔ یہ کیا بات ہوئی۔ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔"

"کاش آپ نے انسپکٹر کامران مرزا صاحب۔ یا انسپکٹر جمشید صاحب کو منتخب کیا ہوتا اس کام کے لیے۔ وہ اس قابل ضرور تھے کہ اس چکر کو بھی چکر دے دیتے۔"

"میں نے ان لوگوں کے بارے میں سُن رکھا ہے، لیکن وہ یہاں کہاں۔ اور میں جہاز کو ساحل پر چھوڑ کر شہر سے باہر کس طرح جا سکتا ہوں۔"

"ہوں۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ آپ بھی مجبور ہیں اور ہم بھی مجبور۔ چکر چلانے والے بھی مجبور ہیں۔ سوال یہ ہے کہ بے چارے مسافروں کا کیا بنے گا۔"

"اگر آپ نے ان کے چکر کو ناکام بنا دیا تو کچھ بھی نہیں ہوگا۔ اور ہم بخیریت اپنی منزل پر پہنچ جائیں گے۔"

"اور اس دوران ہمارے ماں باپ رو رو کر اپنا بُرا حال کر لیں گے۔"

"مجھے افسوس ہے۔ اس طرح ان کے ساتھ بہت بڑی زیادتی ہوئی، لیکن کیا کیا جائے۔ پچاس کے قریب مسافروں کی زندگی اور موت کا سوال ہے۔"

"آپ تو کہہ رہے تھے، مسافر زیادہ نہیں ہیں۔"

"ہاں! وہ اس لحاظ سے کہ جہاز پر پندرہ سو کے قریب مسافروں کے لیے جگہ ہے۔"

"اوہ اچھا! تو پھر- اب کیا پروگرام ہے- کیا ہم چلیں؟" شوکی بولا۔

"تو آپ نے فیصلہ کر لیا ہے۔" اس نے خوش ہو کر کہا۔

"ہاں! اس کے سوا چارہ ہی کیا ہے۔"

"بہت بہت شکریہ! مجھے یہی امید تھی- جوں ہی ہم ہال میں پہنچیں گے اور باہر کا رُخ کریں گے- نیلے لباس والے چار آدمی حرکت میں آ جائیں گے- ان کی ٹیکسی باہر تیار کھڑی ہو گی- فوراً ہی ہمارا تعاقب شروع ہو جائے گا۔"

"کیا آپ بھی ٹیکسی میں آئے ہیں؟"

"ہاں! میری ٹیکسی بھی باہر موجود ہے۔"

"اور ٹیکسی ڈرائیور پانچ آدمیوں کو لے جائے گا؟"

"ضرور- اس کی ٹیکسی عام سائز سے بڑی ہے اور اسے پانچ آدمی لے جانے کی اجازت ہے۔"

"تو پھر بسم اللہ کیجیے جو ہو گا- دیکھا جائے گا۔" شوکی نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"کیا تمام مسافر اس وقت تک جہاز پر پہنچ چکے ہیں؟"

"چند مسافر اور عملے کے کچھ لوگ اِدھر اُدھر ہوں گے- وہ روانہ ہونے سے پہلے پہنچ جائیں گے- کیوں، آپ نے یہ کیوں پوچھا؟" اس نے حیرت بھرے انداز میں کہا۔

"میں یہ سوچ رہا ہوں کہ شاید کسی وجہ سے جہاز کو لیٹ کرنا پڑ جائے- اور کوئی ایسی صورت بن جائے کہ ہم یہیں کچھ کر سکیں- پانی میں کچھ کرنے کی نسبت یہ کہیں مناسب ہے کہ ان لوگوں سے یہیں نبٹ لیا جائے۔"

"اللہ کرے- کوئی ایسی صورت بن جائے۔" کپتان شومی نے جلدی سے کہا۔

"ہماری ہر ممکن کوشش یہ ہو گی کہ ساحل پر ہی کچھ کر گزریں۔" آفتاب نے کہا۔

"لیکن کوئی ایسا قدم بھی نہ اُٹھائیں کہ معاملہ ہی الٹ ہو جائے۔" کپتان شومی نے گھبرا کر کہا۔

"دیکھیے جناب- ایسے معاملات میں خطرہ مول لیے بغیر کوئی چارہ نہیں ہوتا- خطرہ مول لینا ہی ہو گا۔"

"ہوں- ٹھیک ہے۔" اس نے فکرمندانہ لہجے میں کہا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ اب ہم آپ کے ساتھ باہر نکلیں گے تو وہ سائے کی طرح ہمارے ساتھ ہوں گے- اور اگر ہم نے آپ سے علیحدگی اختیار کی- یعنی آپ اور راستے پر گئے اور ہم اور راستے پر تو وہ ہمیں ختم کر دیں گے۔"

"بالکل- ان کا پروگرام یہی ہے۔"

"مہربانی فرما کر ہمیں وہ رقعہ دکھا دیں- جو آپ کو

ملا تھا۔"

"ہاں ضرور۔ کیوں نہیں۔" اس نے کہا اور جیب سے رقعہ نکال کر شوکی کی طرف بڑھا دیا۔

انھوں نے رقعہ پڑھا۔ وہی الفاظ تھے۔ جو کپتان شومی نے بتائے تھے۔ نیچے کسی کا نام نہیں تھا۔ الفاظ اُردو میں لکھے گئے تھے۔ شوکی نے رقعہ جیب میں رکھ لیا اور بولا:

"چلیے اب چلیں۔ روانہ ہونے سے پہلے ہی ہمیں اپنا کام شروع کرنا ہے۔"

"لیکن بالکل غیر محسوس طور پر۔" اس نے پریشان ہو کر کہا۔

"ہاں! آپ فکر نہ کریں۔ ہمیں احساس ہے کہ یہ پچاس مسافروں اور جہاز کے عملے کی زندگی اور موت کا معاملہ ہے — عملے کے لوگ کتنے ہیں؟"

"عملے کے بھی پچیس آدمی تو ہوں گے ہی۔"

"لیکن آپ ہمیں جہاز پر کس حیثیت سے سوار کریں گے۔"

"ایک کپتان کو اس قسم کے اختیارات ہوتے ہیں — ضرورت کے مطابق کچھ آدمی جہاز پر سوار کر سکتا ہے۔"

آخر وہ ہوٹل کے کمرے سے نکلے۔ اور باہر کی طرف چلے — وہ پُرسکون انداز میں قدم اٹھا رہے تھے — فوراً

ہی انھوں نے چار نیلے لباس والوں کو اُٹھتے دیکھا۔ ہوٹل کے باہر دو ٹیکسیاں کھڑی نظر آئیں۔ وہ ان میں سے ایک کی طرف بڑھے۔ ڈرائیور اونگھ رہا تھا۔ ان کے دروازہ کھولنے پر چونک کر سیدھا ہو گیا:

"اوہ آپ آ گئے۔ بہت دیر لگا دی۔"

"ہاں! دیر ہو گئی، لیکن آپ فکر نہ کریں۔ آپ کو اپنے وقت کی قیمت مل جائے گی۔" کپتان شومی نے کہا۔

"شکریہ جناب۔"

جُوں ہی ان کی ٹیکسی روانہ ہوئی۔ دوسری ٹیکسی بھی حرکت میں آ گئی۔ انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا جیسے کہ رہے ہوں:

"یا اللہ۔ بیٹھے بٹھائے یہ کیا چکر شروع ہو گیا۔"

آدھ گھنٹے کے سفر کے بعد آخر وہ سی پورٹ پہنچ گئے۔ کپتان نے اُتر کر بل ادا کیا اور انھیں ساتھ لے کر آگے بڑھا۔ ساتھ ہی انھوں نے دوسری ٹیکسی کو رُکتے دیکھا۔

"کیا یہ لوگ ہماری موجودگی پر اعتراض نہیں کریں گے۔"

"نہیں۔ اس لیے کہ جہاز پر تو پہلے ہی مسافر موجود ہیں۔ ان میں اگر دس بیس اور شامل ہو جائیں تو انھیں کیا فرق پڑ جائے گا۔"

"تاہم یہ لوگ آپ سے ہمارے بارے میں پوچھیں گے ضرور۔"

"ہاں! اور میں واقعی اُلجھن محسوس کر رہا ہوں کہ انھیں کیا بتاؤں گا۔" اس نے جلدی سے کہا۔

اسی وقت تیز تیز قدموں کی آواز سُنائی دی اور ایک نیلے لباس والا ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگا، پھر اس نے سرسری انداز میں کہا:

"کپتان شومی ۔ یہ تم کیا کرتے پھر رہے ہو۔ کیا ہم نے خبردار نہیں کر دیا تھا کہ کسی کو بھی جہاز پر گڑبڑ کے بارے میں نہیں بتایا جائے گا۔"

"جن لوگوں کو میں نے بتایا ہے، انھیں ساتھ ہی لے آیا ہوں اور یہ لوگ کسی کو کسی قسم کی اطلاع نہیں دے سکے، یہ بات آپ کو اچھی طرح معلوم ہی ہے۔"

"پھر بھی ۔ ان لوگوں کو لانے کی کیا ضرورت تھی۔" نیلے لباس والے نے کہا۔

"آپ کی تعریف کپتان صاحب۔" شوکی بول اُٹھا۔

"یہ ۔ یہ مسٹر کوبرا ہیں ۔ ہمارے جہاز کے ایک مسافر۔"

"انھیں ہماری شمولیت پر اعتراض کیوں ہے ۔ بہتر ہوگا کہ ہم یہیں سے لوٹ جائیں۔"

"اب آپ واپس بھی نہیں جا سکتے ۔ آپ بھی ہمارے ساتھ سفر کریں گے۔"

"تب پھر اعتراض کیوں؟" شوکی نے منہ بنایا۔

"یہ ہمارا اور کپتان شومی کا معاملہ ہے ۔ خیر ۔ جہاز پر بات ہو گی۔" اس نے کندھے اچکائے اور قدم آہستہ کر لیے، یہاں تک کہ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل گیا۔

"ہمارے پاس کچھ کرنے کے مواقع اَن گنت ہیں ۔ کپتان صاحب ہم بہت کچھ کر سکتے ہیں ۔ ہر طرح کی مدد منگوا سکتے ہیں۔" اچانک آفتاب نے چہک کر کہا۔

"افسوس ۔ آپ کا خیال غلط ہے ۔ ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے ۔ جوں ہی یہ دیکھیں گے کہ ان کے کام میں رکاوٹ ڈالی جا رہی ہے ۔ یہ جہاز کو بم سے اڑا دیں گے، ویسے آپ اتنے پُرجوش کیوں نظر آ رہے ہیں۔" کپتان شومی کے لہجے میں حیرت تھی ۔ عین اسی وقت کسی نے چہکتی آواز میں کہا:

"ہیلو شوکی ۔ ارے تم لوگ یہاں کیا کر رہے ہو۔"

کپتان شومی نے بوکھلا کر نظریں اُٹھائیں ۔ اس نے دیکھا ۔ ان سے چند قدم کے فاصلے پر ایک پولیس آفیسر کھڑا تھا ۔ اس کے چہرے پر حیرت کے آثار تھے۔

بلّی کے ساتھ کپتان

" اوہو ۔ انسپکٹر صاحب ۔ یہ آپ ہیں ۔ ہم ذرا اس طرف ایک کام آئے تھے ۔ آپ ادھر کیسے ؟ " شوکی نے جلدی سے کہا ۔

پولیس آفیسر کی پیشانی پر بل پڑ گئے ۔ اس نے حیرت بھرے انداز میں شوکی پر ایک نظر ڈالی اور پھر جلدی سے کہنے لگا :

" میں اپنے ایک عزیز سے ملنے آیا تھا ۔ وہ بحری جہاز سے افریقی ممالک کی سیر کے لیے جا رہا ہے ۔ اور تو سب خیریت ہے نا ؟ "

" جی ہاں ۔ بالکل ۔ السلام علیکم ۔ " شوکی نے جلدی سے کہا اور ہاتھ ہلاتے ہوئے آگے نکل گیا ۔

" وعلیکم السلام ۔ " پولیس آفیسر نے کہا اور پھر ان پر ایک نظر ڈالتے ہوئے ۔ اس نے بھی اپنا راستا لیا ۔ اسی وقت چار نیلے لباس والے اس کے پاس سے گزرے ۔ اس نے دیکھا ۔ وہ

تیز تیز قدم اٹھاتے شوکی برادرز کے نزدیک ہوتے جا رہے تھے ، پھر ان میں سے ایک نے جھک کر شوکی سے کچھ کہا ، لیکن چوں کہ آواز نیچی تھی اس لیے وہ سن نہ سکا کہ اس نے کیا کہا ہے ۔ وہ قدم اٹھاتا چلا گیا ۔

" یہ کون تھا ؟ " نیلے لباس والے نے شوکی سے کہا ۔

" ہمارے واقف ایک پولیس انسپکٹر ۔ کیا یہ کوئی قابلِ اعتراض بات ہے ۔ اور کیا ہم نے اس سے کوئی ایسی ویسی بات کی ہے ؟ " شوکی نے بھنا کر کہا ۔

" نہیں ۔ خیر ۔ ایسی تو کوئی بات نہیں ۔ " نیلے لباس والے نے کہا ۔

" تو پھر آپ کیوں اعتراض کر رہے ہیں ؟ " آفتاب بولا ۔

نیلے لباس والے نے کوئی جواب نہ دیا ۔ رفتار کم کرتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے جا ملا ۔

" یہ ۔ کون تھا ؟ " کپتان شوکی بولا ۔

" ہم نے بتایا تو ہے ۔ " اشفاق بولا ۔

" تو یہ واقعی آپ کے واقف پولیس آفیسر ہیں ؟ "

" ہاں بالکل ۔ اس میں ایک فیصد بھی جھوٹ نہیں ہے ۔ " اخلاق نے کہا ۔

اب وہ پلیٹ فارم پر چل رہے تھے ۔ یہاں بہت

سے جہاز کھڑے تھے۔ ان میں سے اکثر پر سامان لادا جا رہا
تھا۔ آخر ایک جہاز کے پاس پہنچ کر وہ رک گئے۔

"یہ ہے میرا جہاز۔" کپتان شومی نے کہا۔

انھوں نے دیکھا۔ وہ ایک بہت بڑا جہاز تھا، رنگ
سرخ اور نیلا تھا۔ ایک ستون پر ان کے ملک کا جھنڈا لہرا
رہا تھا۔ وہ سیڑھی کے ذریعے اوپر جانے لگے۔ ان کے
پیچھے نیلے لباس والے بھی تھے۔ عجیب صورت حال تھی۔ جہاز
زبردست خطرے کی لپیٹ میں تھا، مگر وہ کچھ بھی نہیں کر
سکتے تھے۔ نیلے لباس والوں نے دھمکی دے رکھی تھی کہ اگر
جہاز وقت پر روانہ نہ ہوا تو وہ اسے بم سے اڑا دیں
گے۔

جوں ہی وہ اوپر پہنچے، ایک آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی:

"کیپٹن۔ آپ کہاں چلے گئے تھے؟"

انھوں نے دیکھا۔ وردی میں ملبوس ایک نوجوان کھڑا
ان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"یہ میرے نائب ہیں۔ نائب کپتان امیر رانا۔"

"آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔" شوکی نے مسکرا کر کہا۔

"اور آپ کون صاحبان ہیں؟"

"یہ بھی ہمارے ساتھ سفر کریں گے۔" کپتان نے نامکمل

تعارف کرایا۔

"اوہو۔ یہ حضرات بھی کہیں گئے ہوئے تھے۔" امیر رانا کی
نظر نیلے لباس والوں پر پڑی۔

"ہاں! جہاز پر تو ہر طرح خیریت ہے نا؟"

"بالکل۔ سب ٹھیک ہے۔"

"جو لوگ رہتے تھے۔ وہ آ گئے؟"

"نہیں۔ ابھی تک نہیں۔ اوہو۔ شاید چند لوگ آ پہنچے۔ وہ
اپنے کاغذات چیک کرا رہے ہیں۔"

امیر رانا کی نظروں کے تعاقب میں انھوں نے نیچے دیکھا۔
وہاں ایک مرد اور ایک عورت کھڑے تھے۔ ان کے جسموں پر
عربی لباس تھا۔ نقش و نگار بھی بالکل عربوں جیسے تھے۔
اور وہ سیڑھی کے ذریعے اوپر آتے نظر آئے۔ عملے میں سے
دو آدمی فوراً ان کی طرف بڑھے اور انہیں ان کے کیبن
کی طرف لے گئے۔

"مسٹر شوکی۔ آپ لوگ بھی آرام کریں۔ رانا۔ انھیں میرے
کیبن کے ساتھ والا کیبن دے دیں۔"

"جی بہتر۔ آئیے چلیں۔"

وہ اس کے ساتھ روانہ ہو گئے۔

"آپ کا نام کیپٹن نے شوکی لیا تھا۔" امیر رانا بولا۔

"جی ہاں! کیا آپ کو میرے نام پر کوئی اعتراض ہے؟"

"نہیں! ایسی کوئی بات نہیں۔ آپ کا نام کچھ جانا پہچانا سا لگتا ہے۔ ارے — کہیں آپ وہ شوکی برادرز تو نہیں۔ جو سُراغرسانی کے کام کرتے پھرتے ہیں۔" اس کے لہجے میں حیرت در آئی۔

"چلیے — یہی سمجھ لیں۔ اور کتنے مسافر ابھی آنے والے ہیں؟"

"دس کے قریب۔ فکر نہ کریں — وہ آئیں یا نہ آئیں — ہم اپنے وقت پر روانہ ہو جائیں گے۔ ہمارے کپتان صاحب وقت کے بہت پابند ہیں۔"

اب وہ ایک کیبن کے سامنے جا رُکا۔

"یہ ہے آپ کا کیبن۔" امیر رانا بولا۔

"کیا آپ —"

شوکی کے الفاظ درمیان میں رہ گئے۔ اسی وقت اس کی نظر ایک نیلے لباس والے پر پڑی تھی — یہ وہی تھا۔ مسٹر کوبرا —

"کیا کہہ رہے تھے آپ؟" امیر رانا نے کہا، وہ ابھی تک نیلے لباس والے کی آمد سے بے خبر تھا۔

"کک — کچھ نہیں — ہم بے چارے کیا کہیں گے۔ کہنے کے

لیے ہمارے پاس رکھا ہی کیا ہے۔" آفتاب مسٹر کوبرا کو دیکھ کر گڑبڑا گیا۔ وہ مسکرا دیا۔

اسی وقت امیر رانا نے نیلے لباس والے کو دیکھ لیا:

"آپ یہاں — کیا بات ہے جناب۔" اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

"مجھے مسٹر شوکی سے کچھ کام ہے — کیا آپ کچھ وقت دیں گے جناب۔"

"لل — لے — لیں۔" شوکی نے گھبرا کر کہا۔

"تو پھر آئیے — بیٹھ کر بات کریں گے — مسٹر امیر رانا سے تو اب آپ کو کوئی بات نہیں کرنی۔"

"اب ہم ان سے کیا بات کریں گے — باتیں کرنے کے لیے آپ جو آ گئے ہیں۔" اشفاق جل کر بولا۔

"کیا مطلب — یہ آپ نے کیا کہا۔" امیر رانا بول اٹھا۔

"اوہ کچھ نہیں مسٹر رانا — یہ صاحب شاید ہم سے کوئی کیس حل کرانا چاہتے ہیں — آپ کا بہت بہت شکریہ — آپ ہمیں یہاں تک لائے۔"

"ٹھیک ہے — میں چلتا ہوں۔"

اس نے کہا اور تیز تیز قدم اٹھاتا چلا گیا — شوکی نے کیبن کا دروازہ کھولا — وہ کیبن میں فرش پر بچھی چٹائی پر

بیٹھ گئے:

"جی کوبرا صاحب ۔ فرمائیے ۔ ہم کیا خدمت کر سکتے ہیں؟"

"کیا آپ چاہتے ہیں، یہ سو کے قریب آدمی زندہ سلامت رہیں ۔ اور اپنی منزل پر پہنچ جائیں؟"

"بھلا ہم ایسا کیوں نہ چاہیں گے ۔ ایسا چاہنا تو عین انسانیت ہے۔" اشفاق نے فوراً کہا۔

"تب پھر اس کا سیدھا سادا طریقہ یہ ہے کہ آپ کسی سے بھی کوئی بات نہ کریں ۔ ہم آپ لوگوں کے بارے میں جانتے ہیں ۔ یہ بھی جانتے ہیں کہ کپتان صاحب نے آپ کو ہمارے بارے میں بتا دیا ہے ۔ چلیے کوئی بات نہیں، آپ آ گئے ۔ شوق سے اپنی تفتیش کریں، لیکن اتنا یاد رکھیں ہمارے پروگرام میں کوئی رخنہ پڑا تو پھر اس جہاز کو تباہی سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔"

"بہت بہتر ۔ ہم اتنا یاد رکھیں گے۔" آفتاب نے فوراً کہا۔

"شکریہ!" اس نے کہا اور واپسی کے لیے مڑ گیا۔

"اس کا مطلب ہے، کپتان شومی کی تمام باتیں بالکل درست ہیں، جہاز واقعی کسی ہولناک خطرے کی زد میں ہے۔" اشفاق بڑبڑایا۔

"ایسا ہی معلوم ہوتا ہے ۔ سب سے پہلے تو ہمیں یہ

معلوم کرنا ہے کہ چکر کیا ہے ۔ اور جب چکر معلوم ہو گیا تو جہاز کو اس چکر سے نکالنا ہو گا ۔ اور شاید یہ کام آسان ثابت نہ ہو۔" شوکی بڑبڑایا۔

"تب پھر ۔ کیبن میں بیٹھ کر کیا کریں گے ۔ اسی وقت کام شروع کر دیں ۔ کیا خبر ہم جہاز کی روانگی سے پہلے ہی کوئی کام دکھا دیں۔"

"ضرور ۔ آؤ جہاز کی چیکنگ شروع کریں ۔ ہمیں سب سے پہلے گودام کا جائزہ لینا ہو گا۔"

"اور گودام میں ہمیں کون گھسنے دے گا۔" اخلاق بولا۔

"جہاز کے کپتان ہمیں یہاں لائے ہیں، وہی جہاز کے انچارج ہیں ۔ لہٰذا عملے کی حد تک تو ہمیں کوئی فکر نہیں کرنا چاہیے ۔ رہ گئے نیلے لباس والے ۔ ان کا معاملہ ٹیڑھا ہے۔" آفتاب نے جلدی جلدی کہا۔

"ان کی طرف سے بھی اجازت مل چکی ہے ۔ ہم شوق سے تفتیش کر سکتے ہیں۔" شوکی نے مسکرا کر کہا۔

آخر وہ کیبن سے باہر نکلے ۔ عملے کے کسی آدمی کی تلاش میں نظریں دوڑائیں ۔ لیکن وہاں کوئی نہیں تھا ۔ کیبنوں میں البتہ مسافر موجود تھے، لیکن بھلا مسافر ان کی کیا مدد کر سکتے تھے ۔ وہ قدم اٹھاتے رہے ۔ یہاں تک کہ ایک بار پھر

عرشے پر پہنچ گئے ۔ کپتان شومی عملے کے ایک آدمی پر گرجتا
برستا نظر آیا۔ وہ کہہ رہا تھا :

"میں تمھاری کوتاہیوں سے تنگ آگیا ہوں ۔ تم ایک دم
نالائق ہو ، دُور ہو جاؤ میری نظروں سے ۔" اسی وقت اس
کی نظر ان پر پڑی۔ وہ جلدی سے بولا :

"اوہو۔ آپ لوگ پھر اوپر آگئے ۔"

"ہم آرام کرنے کے عادی نہیں ۔ اپنا کام شروع کرنا چاہتے
ہیں ، مہربانی فرما کر ہمیں گودام تک پہنچا دیں ۔"

"اوہ اچھا ۔ چلیے میں خود لے کر چلتا ہوں ۔" اس نے
کہا ۔

"جی نہیں ۔ آپ تکلیف نہ کریں ۔ ان صاحب کو ہمارے
ساتھ کر دیں ۔" شوکی نے اس نالائق آدمی کی طرف اشارہ کیا۔

"جاؤ تابو ۔ انھیں گودام تک لے جاؤ ۔"

"او کے سر ۔" اس نے کہا اور پھر انھیں اشارہ کر کے آگے
بڑھ گیا ، اس کے چہرے پر جھلاہٹ کے آثار تھے ۔

چند قدم کا فاصلہ طے کرنے کے بعد شوکی نے اس سے
کہا :

"کپتان شومی کس لیے آپ پر بگڑ رہے تھے ؟"

"یہ ان کی پرانی عادت ہے ۔ اپنے ماتحتوں پر گرجتے

برستے رہنا ۔ غلطی مجھ سے صرف اتنی ہوئی ہے کہ میں ذرا دیر
کے لیے باورچی خانے سے نکل کر ادھر گھومنے آگیا ۔ اور
بس ۔ اتنی سی بات پر یہ بگڑ پڑے ۔ ہے کوئی بات ۔ اب
ہم قیدیوں کی طرح تو باورچی خانے میں بند ہو کر نہیں رہ
سکتے ۔"

"تو آپ باورچی ہیں ۔" آفتاب نے خوش ہو کر کہا ۔ شوکی ،
اشفاق اور اخلاق نے اسے حیران ہو کر دیکھا ۔ اخلاق سے رہا
نہ گیا :

"لیکن اس میں خوش ہونے کی کیا بات ہے ۔"

"آپ غلط سمجھے ۔ میں باورچی نہیں ہوں ۔" وہ بولا ۔

"تو پھر آپ باورچی خانے میں کیا کر رہے تھے ؟"

"نگرانی ۔ میں باورچیوں پر نگران ہوں ۔ کھانا پکانے
کے دوران ان سب پر نظر رکھنا میرا فرض ہے ۔ اکثر اوقات
باورچی حضرات اچھی اچھی بوٹیاں یا دوسری چیزیں خود کھا جاتے
ہیں ۔ یا مقررہ مقدار میں چیزیں ڈالنے کی بجائے اندازوں
سے کام چلانے کی کوشش کرتے ہیں ۔ جب کہ ہمارے کپتان
صاحب ایسی بے قاعدگیوں کے سخت خلاف ہیں ۔ وہ چاہتے
ہیں کھانا پوری ایمان داری سے تیار کیا جائے ۔ مصالحہ جات
اور دوسری چیزیں تول کر بالکل پوری مقدار میں ڈالی جائیں ۔

اور کھانوں کی اچھی اچھی چیزوں کو باورچی ہاتھ تک نہ لگا پائیں۔"

"تب تو کپتان صاحب بہت اچھے آدمی ہیں، لیکن نہیں، پہلے یہ بتائیں - کیا وہ اپنے لیے اچھی اچھی بوٹیاں وغیرہ منگواتے ہیں۔"

"ہرگز نہیں - ان کی ہدایت یہ ہے کہ ایک عام مسافر کو جو کھانا دیا جاتا ہے - وہی ان کو دیا جائے - کبھی کبھار ہم ان پر ترس کھا کر پلیٹ میں اچھی بوٹیاں اور دوسری چیزیں ان کی ٹرے میں رکھ دیتے ہیں - لیکن وہ اس ٹرے کو فوراً واپس کر دیتے ہیں - ایک بار تو میں نے ایسا کیا کہ ایک پلیٹ کو مرغ کی بوٹیوں سے بھر دیا اور اوپر چاولوں کی تہ اس طرح جما دی کہ اوپر کوئی بوٹی نظر ہی نہیں آ رہی تھی - اس پلیٹ کو دیکھ کر پہلے، تو کپتان صاحب خوش ہوئے اور پھر جب انھوں نے پلیٹ سے پہلا لقمہ لیا تو اس کی حقیقت معلوم ہو گئی - بہت ناراض ہوئے - فوراً پلیٹ واپس کر دی اور کہا - جیسی پلیٹ، دوسروں کو دی ہے بالکل ویسی میرے لیے لائیے یہ ہے ان کی عادت۔"

"تب تو وہ اسلامی ذہن کے آدمی ہیں - آپ کو تو ان کی قدر کرنی چاہیے۔"

"قدر تو سارا عملہ ان کی کرتا ہے، لیکن ان کا بات

بات پر غصے ہونا بہت بُرا لگتا ہے - ارے میں تو غلطی سے باورچی خانے کی طرف مُڑ گیا - باتوں میں دھیان ہی نہیں رہا - اس طرف سے آئیے۔"

"نہیں جناب - پہلے ہمیں باورچی خانے کی سیر کرا دیں" آفتاب نے جلدی سے کہا۔

"بھئی تمھیں کہیں بھوک تو نہیں لگی" شوکی جل کر بولا۔

"آپ کا اندازہ درست ہے۔"

"لیکن جناب - کھانا تو سب لوگوں کے ساتھ ہی دیا جا سکے گا - یہ بھی ہمارے کپتان صاحب کا ہی حکم ہے" نگران نے پریشان ہو کر کہا۔

"فکر نہ کریں - میں آپ سے کھانا نہیں مانگوں گا - خوشبو سونگھ کر گزارہ کر لوں گا۔" آفتاب نے کہا۔

"آپ نے اب تک اپنا نام نہیں بتایا جناب" شوکی بولا۔

"میں - میں کاشف فرشوری ہوں۔"

"جی - یہ فرشوری کیا چیز ہے - کیا ذات ہے؟"

"جی نہیں - یہ میری جائے پیدائش ہے - ہمارے گاؤں کا نام فرشوری تھا - میں کاشف فرشوری کہلانے لگا۔"

"آپ نے اچھا ہی کیا - فرشوری کہلانے لگے" آفتاب بول اُٹھا -

" گک ۔ کیا مطلب ۔" اس نے بوکھلا کر کہا۔

" جی ۔ اب میں مطلب کیا بتاؤں ۔ اکثر لوگ اپنے نام کے ساتھ ذات ضرور لگاتے ہیں ، حالاں کہ اس کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ۔ ذات پات ، حسب نسب کوئی چیز نہیں ، اصل چیز تو آدمی کے اعمال ہیں ۔" آفتاب نے گڑبڑا کر کہا۔

" بات آپ کی بالکل ٹھیک ہے ۔ لیجیے ۔ یہ ہے باورچی خانہ ۔"

" کھانا کس وقت کا تیار کیا جا رہا ہے ؟"

" جہاز کے روانہ ہونے کے بعد سب مسافروں کو پہلا کھانا دیا جاتا ہے ۔ اسے آپ استقبالیہ کھانا بھی کہہ سکتے ہیں ۔"

" ہوں ۔ مہربانی فرما کر باورچی حضرات سے یہ پوچھ لیں ۔ آپ کی غیر حاضری میں ادھر کوئی آیا تو نہیں ۔" شوکی نے سوچ کے انداز میں کہا۔

" ادھر بھلا کوئی کیوں آنے لگا ۔" اس نے حیران ہو کر کہا ۔

" معلوم تو کر لیں ۔"

" اچھی بات ہے ۔" اس نے کہا اور باورچیوں پر ایک نظر ڈالتے ہوئے بولا :

" رؤف خان ۔ میرے بعد ادھر کوئی آیا تو نہیں ۔"

" جی ہاں ! ایک صاحب آئے تھے ۔ آپ کا پوچھ رہے

تھے ۔ انھوں نے باورچی خانے کا ایک چکر بھی لگایا تھا ۔ حالاں کہ ہم نے ان سے کہہ بھی دیا تھا کہ باورچی خانے میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے ، لیکن انھوں نے تو جیسے سنا ہی نہیں ۔ ہم بھی خاموش ہو گئے ۔ یہ سوچ کر کہ شاید وہ کپتان صاحب کا کوئی مہمان ہے ۔ جو ہماری بات سن ہی نہیں رہا ۔"

" اس کا حلیہ کیسا تھا ۔ لباس کیسا تھا ؟" شوکی نے پوچھا۔

" نیلے کپڑوں میں تھا ۔"

" اوہ ۔" چاروں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا ۔ چہروں پر حیرت دوڑ گئی ۔

" کیوں ۔ اس میں حیرت کی کیا بات ؟"

" کیا آپ اپنے ارادے سے باورچی خانے سے اوپر گئے تھے ؟" شوکی نے جلدی سے پوچھا۔

" نہیں ۔ عملے کا ایک آدمی پیغام لے کر آیا تھا کہ نائب کپتان مجھے اوپر بلا رہے ہیں ۔"

" تو کیا آپ نے اوپر جا کر نائب کپتان امیر رانا سے پوچھا ۔ انھوں نے کیوں بلایا تھا ۔"

" ہاں ۔ لیکن انھوں نے صاف انکار کر دیا ۔ کہنے لگے ۔ میں نے ہرگز نہیں بلایا ۔ اسی وقت کپتان صاحب ہمارے پاس پہنچ گئے ۔ اور مجھ پر گرجنے برسنے لگے ۔ اگر آپ لوگ

نہ آجاتے تو میں اپنی صفائی پیش کرتا، لیکن پھر آپ کی آمد کی وجہ سے میں نے کچھ نہیں کہا۔"

"عملے کا وہ آدمی کون تھا۔ جو پیغام لایا تھا؟"

"ظاہر میاں۔" اس نے کہا۔

"مہربانی فرما کر فوراً ظاہر میاں کے پاس چلیے۔"

"جی کیا مطلب۔ اس کے پاس جا کر کیا کریں؟"

"آئیے تو سہی۔" شوکی نے اسے بازو سے پکڑ کر کھینچا۔

"نہیں جناب۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ پھر کپتان صاحب کی جھڑکیاں سنوں۔"

"اوہو۔ یہ ہماری ذمے داری رہی۔ وہ آپ کو نہیں جھڑک سکیں گے۔"

"بہت اچھا۔ آئیے۔"

وہ تیز تیز قدم چلتے جہاز کے ایک دوسرے حصے میں پہنچے۔ یہ حصہ درمیانی منزل میں تھا۔ جب کہ باورچی خانہ سب سے اوپر والی منزل میں تھا۔ ایک شخص رسوں سے الجھا نظر آیا:

"ظاہر میاں۔ یہ لوگ آپ سے کچھ بات کرنا چاہتے ہیں۔" کاشف فرشوری بولا۔

وہ چونک کر مڑا اور پھر قدرے حیران ہو کر بولا:

"مجھ سے۔ جی فرمائیے۔ کیا بات ہے؟"

"تھوڑی دیر پہلے آپ نے کاشف صاحب کو امیر رانا صاحب کا پیغام دیا تھا۔ کیا یہ درست ہے؟"

"ہاں۔ بالکل۔" اس نے کہا۔

"لیکن۔ امیر رانا صاحب کا کہنا ہے کہ انھوں نے کاشف صاحب کو ہرگز نہیں بلایا تھا۔" شوکی نے اس کے چہرے پر نظریں جما دیں۔

"کیا!!!" اس کے لہجے میں حیرت در آئی۔

"جی ہاں! کیا امیر رانا نے خود آپ سے یہ کہا تھا کہ کاشف صاحب کو بلا لائیں۔"

"نہیں۔ ایک مسافر نے مجھ سے کہا تھا کہ امیر رانا صاحب نے انھیں بلایا ہے۔"

"اوہ۔ مسٹر کاشف فرشوری۔ جلدی آئیے۔" شوکی نے کہا اور دوڑ لگا دی۔

"ارے ارے۔ کیا بات ہے۔" کاشف چلایا۔

"وہ مسافر کہیں نیلے لباس میں تو نہیں تھا؟" اخلاق نے گھبرا کر پوچھا۔

"نیلے لباس میں۔ اوہ ہاں بالکل۔ وہ نیلے لباس میں ہی تھا۔"

"تب تو مسٹر کاشف فرشوری آپ کو واقعی جلدی آنا ہو گا۔" اخلاق بولا اور اس نے بھی شوکی کے پیچھے دوڑ لگا دی، اب اشفاق اور اخلاق بھی رُکے نہ رہ سکے۔ یہ دیکھ کر کاشف فرشوری اور ظاہر میاں بوکھلا اُٹھے۔

"یہ۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔" کاشف کے منہ سے نکلا۔

"پپ۔ پتا نہیں جناب۔" ظاہر میاں بولا۔

"آؤ۔ تم بھی میرے ساتھ۔" کاشف نے کہا اور ظاہر میاں کا ہاتھ پکڑ کر بھاگنے لگا۔ یہاں تک کہ وہ لوگ دوڑتے دوڑتے باورچی خانے میں داخل ہو گئے۔

"کیا مصیبت ہے۔ آخر کیا ہو گیا ہے۔" کاشف فرشوری بھنا اُٹھا۔

"اے۔ مسٹر۔ خبردار۔ ہاتھ والا لقمہ نیچے رکھ دو۔" شوکی نے چلّا کر کہا۔

انھوں نے چونک کر دیکھا۔ ایک باورچی کے ہاتھ میں ایک بڑی سی بوٹی تھی۔ اور غالباً وہ ان کے اندر داخل ہونے سے پہلے بوٹی کھانے کے ارادے سے اُٹھا چکا تھا۔ شوکی نے جوں ہی اس کے ہاتھ میں بوٹی دیکھی۔ بول اُٹھا، باورچی نے گھبرا کر بوٹی واپس رکھ دی:

"مم۔ میں تو یہ دیکھ رہا تھا جناب۔ گوشت گل گیا

یا نہیں۔"

"اچھا ہی ہوا۔ تم نے نہیں دیکھا۔ ورنہ خود گل جاتے۔" شوکی بولا۔

"جی۔ میں گل جاتا۔"

"ہاں! اگر ہم نہ آجاتے تو تمھارے گل جانے میں کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی۔ مسٹر کاشف شرفوری۔ جہاز پر کوئی بلّی وِلّی بھی ہے یا نہیں۔"

"شرفوری نہیں۔ فرشوری۔" اس نے بھنا کر کہا۔

"اوہ معافی چاہتا ہوں۔ میں نے جان بوجھ کر شرفوری نہیں بولا۔ ہاں تو ایک بلّی کا انتظام کیجیے۔"

"آخر بلّی کی کیا ضرورت پڑ گئی۔"

"بہت ضرورت ہے۔ اتنی کہ آپ سوچ بھی نہیں سکتے۔ بہتر ہو گا، آپ بلّی کے ساتھ کپتان صاحب کو بھی بُلا لیں۔"

"بلّی کے ساتھ کپتان صاحب۔" آفتاب بڑبڑایا۔

"جلدی کریں۔ وقت بہت کم ہے۔"

"جاؤ ظاہر میاں۔ فوراً کپتان صاحب کو بلا لاؤ۔ اور ان سے کہنا اپنی پالتو بلّی بھی ساتھ لے آئیں۔"

"جی بہتر!" ظاہر میاں نے کہا اور تیز تیز قدم اُٹھاتا چلا گیا۔

" آخر معاملہ کیا ہے؟"

" پتا نہیں - جہاز پر کوئی گڑبڑ ہے - ہمیں اس گڑبڑ کو دُور کرنے کے لیے لایا گیا ہے - ہمارا فرض ہے جہاں کہیں بھی کوئی گڑبڑ نظر آئے، اسے دُور کر دیں۔"

" لیکن بھلا باورچی خانے میں کیا گڑبڑ ہو سکتی ہے۔"

" گڑبڑ کا کیا ہے - کہیں بھی ہو سکتی ہے۔" آفتاب بولا۔

" کچھ سمجھ نہیں آ رہا - کیا ہونے والا ہے۔" کاشف فرشوری بڑبڑایا۔

" آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں - آپ کو امیر رانا نے نہیں بلوایا تھا - ایک نیلے لباس والے نے ظاہر میاں سے آکر کہا کہ کاشف فرشوری صاحب کو امیر رانا بلا رہے ہیں - ظاہر میاں نے آپ کو اطلاع دی - آپ فوراً اوپر پہنچ گئے - لیکن امیر رانا نے آپ کو بتایا کہ آپ نے انھیں نہیں بلایا - اس دوران کپتان صاحب وہاں آ گئے اور آپ پر بگڑنے لگے - پھر ہم وہاں پہنچ گئے - اور آپ کے ساتھ گودام کی طرف روانہ ہوئے، لیکن باورچی خانے کی طرف آ گئے - یہاں آکر پتا چلا کہ ایک نیلے لباس والا باورچی خانے میں داخل ہو گیا تھا - حالاں کہ اسے منع بھی کیا گیا - یہ سب حالات پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ یہاں کچھ نہ کچھ ہونے

والا ہے۔" اخلاق جلدی جلدی کہہ گیا۔

" اوہ!" ان کے منہ سے نکلا۔

اسی وقت ظاہر میاں دوڑتا ہوا وہاں پہنچا - اس کے ساتھ کپتان شومی نہیں تھا:

" کپتان صاحب نہیں آ سکتے - جہاز کے بقیہ تمام مسافر سوار ہو چکے ہیں - جہاز روانگی کے لیے بالکل تیار ہے اور وہ انجن روم میں ہیں - ان حالات میں وہ ادھر نہیں آ سکتے - تھوڑی دیر بعد ضرور آ سکیں گے۔"

" افسوس - انھیں روانگی سے پہلے یہاں آ جانا چاہیے تھا۔" شوکی نے سرد آہ بھری۔

" لیکن - ان کی یہاں کیا ضرورت ہے؟" ظاہر میاں نے حیران ہو کر کہا۔

" چلیے خیر - آپ ایک بلّی کا بندوبست تو کر دیں۔"

" جہاز پر بس ایک ہی بلّی ہے - اور وہ کپتان شومی کی ہے - ہاں دو طوطے ضرور میں نے پال رکھے ہیں۔" کاشف فرشوری نے کہا۔

" چلیے - طوطوں کا پنجرہ ہی لے آئیں۔"

" آپ کرنا کیا چاہتے ہیں؟"

" بس آپ لے آئیے - جلدی۔" شوکی بولا۔

فرشوری چلا گیا۔ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں طوطوں کا پنجرہ تھا۔ شوکی نے فوراً تھوڑے سے چاول طوطے کی پیالی میں ڈال دیے۔ طوطے چاول کھانے لگے۔ شوکی نے چند اور چیزیں بھی ڈال دیں۔ اچانک طوطے زور سے پھڑپھڑائے اور پھر اپنی سلاخ سے نیچے گر پڑے:

"ارے! انھیں کیا ہوا۔"

"وہی۔ جو تمام مسافروں کو ہونے والا تھا۔" شوکی بولا۔

"جی۔ کیا مطلب۔" کاشف فرشوری نے بوکھلا کر کہا۔

"اس سارے کھانے میں زہر ملا دیا گیا ہے۔"

"نہیں!!!" کاشف فرشوری، ظاہر میاں اور تمام باورچی چلّا اُٹھے۔

"نیلے لباس والا اسی لیے یہاں آیا تھا۔"

"اوہ! تب تو ہمیں فوراً کپتان شومی کو اطلاع دینی چاہیے۔" کاشف بولا۔

"ہاں! ہم انھیں اطلاع ضرور دیں گے، لیکن وہ کچھ بھی نہیں کر سکیں گے۔ آپ لوگ اس کھانے کو سمندر میں پھینک دیں اور دوسرا کھانا تیار کریں۔ یاد رکھیں۔ کوئی غیر متعلق شخص باورچی خانے میں نہ آنے پائے۔"

"ہوں۔ ٹھیک ہے۔ ایسا ہی کیا جائے گا۔ کپتان

صاحب کو آپ لوگ خود ہی اطلاع کر دیں۔"

"کر دیں گے، لیکن ابھی نہیں۔ ہم کچھ دیر یہیں ٹھہریں گے۔"

"چلو بھئی۔ دوسرا سامان لاؤ۔ لیکن نہیں، پہلے یہ تمام کھانا پھینک دو۔ ہو سکتا ہے۔ اس کھانے سے ان گنت مچھلیاں مر جائیں، لیکن افسوس۔ ہم کچھ بھی تو نہیں کر سکتے۔"

کھانا تلف کرنے میں پندرہ منٹ لگ گئے۔ اس کے بعد باورچی کھانے کا دوسرا سامان لینے گودام کی طرف روانہ ہوئے، لیکن اسی وقت جہاز نے اپنے روانہ ہونے کی سیٹی دی۔ شوکی برادرز نے اس سیٹی کو سنا۔ ان کے چہروں پر الجھن دوڑ گئی۔ وہ جہاز کو روانہ ہونے سے نہیں روک سکتے تھے۔ جب کہ جہاز کا روک لیا جانا ضروری تھا، کیوں کہ نیلے لباس والوں کا پروگرام اس سے کہیں زیادہ ہولناک تھا، جتنا وہ خیال کرتے رہے تھے۔ وہ تو تمام مسافروں کو عملے کو موت کے گھاٹ اُتار دینا چاہتے تھے۔ گویا پورے بحری جہاز کو اغوا کر لینا چاہتے تھے۔ اور یہ کوئی کم سنسنی خیز بات نہیں تھی۔ اس بات کے علم میں آ جانے کے باوجود شوکی برادرز مجبور تھے۔ کپتان شومی مجبور تھا۔ اگر وہ جہاز کو مقررہ وقت پر نہ چلاتا تو جہاز کو ڈائنامیٹ سے اڑا دیا جاتا۔ اس صورت

یں تو کچھ بھی بچنے کا امکان نہیں تھا۔ جب کہ دوسری صورت
میں کچھ نہ کچھ کر گزرنے کا امکان باقی تھا۔ اسی لیے وہ
بُت بنے کھڑے رہے۔

اور پھر باورچی واپس آ گئے۔ لیکن خالی ہاتھ۔ کھانا
پکانے کا سامان ان کے ہاتھوں میں نہیں تھا اور ان کے
چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

نیلی کار

ارشد نے ان کے کمرے سے نکلنے کے بعد حیرت زدہ انداز
میں پلکیں جھپکائیں اور پھر جلدی سے باہر نکلا۔ خوش قسمتی سے
ایک ٹیکسی مل گئی۔ اس نے ہوٹل گل ریز تک ان کا تعاقب
کیا اور پھر ایک پبلک فون بوتھ سے انسپکٹر کو فون کیا۔
سلسلہ ملتے ہی بولا:

"ہیلو انکل! ایک بہت ہی پُراسرار معاملہ ہے۔ میں
گل ریز ہوٹل کے باہر موجود ہوں، مہربانی فرما کر یہاں
تشریف لے آئیں۔ شوکی صاحبان ہوٹل کے اندر گئے ہیں، کاش
آپ ان کے باہر آنے سے پہلے آ جائیں۔"

"لیکن بات کیا ہے؟"

"آپ یہاں آ جائیں۔ بات معلوم ہو جائے گی۔"

"کیا شوکی وغیرہ کسی مصیبت میں پھنسنے والے ہیں؟"

"جی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔"

"اچھا۔ میں آرہا ہوں۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔

چند منٹ بعد ہی وہ ارشد کے پاس پہنچ گئے:

"ہاں! اب بتاؤ۔ کیا معاملہ ہے؟"

"کسی نامعلوم آدمی نے بہت ہی خفیہ طور پر یہاں بلایا ہے۔ روانہ ہونے سے پہلے انھوں نے کسی کو بھی نہیں بتایا کہ وہ ہوٹل گل ریز جا رہے ہیں۔ میں اپنے طور پر تعاقب کر کے یہاں تک آیا ہوں۔"

"تو اس میں پُر اسرار بات کیا ہو گئی۔ کوئی شخص انھیں خفیہ طور پر کوئی کیس سونپنا چاہتا ہو گا۔"

"مجھے معاملہ حد درجے پُر اسرار لگا تھا۔ اس لیے میں نے آپ کو فون کر دیا۔"

"یہ ضروری نہیں کہ جو معاملہ تمھیں پُر اسرار محسوس ہو، وہ ہو بھی۔ تم نے میرا وقت ضائع کیا۔ میں چلتا ہوں۔" انسپکٹر کاشان نے منہ بنا کر کہا اور جانے کے لیے مڑے۔

عین اسی وقت شوکی برادرز باہر آتے نظر آئے۔ ان کے ساتھ ایک اور شخص تھا۔ ان کے قدم رک گئے، وہ کافی دور کھڑے تھے۔ شوکی برادرز کے منہ دوسری طرف تھے۔ اس لیے وہ انھیں نہیں دیکھ سکے، پھر وہ ایک ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ اسی وقت چند نیلے لباس والے ایک ٹیکسی میں

ان کے تعاقب میں جاتے نظر آئے:

"معاملہ تو واقعی پُر اسرار معلوم ہوتا ہے۔ اچھا۔ تم گھر جاؤ، میں ان کے پیچھے جاتا ہوں۔"

"بہت بہت شکریہ جناب۔" ارشد نے خوش ہو کر کہا۔

انسپکٹر کاشان احتیاط سے تعاقب کرتے سی پورٹ تک پہنچے، پھر جلدی سے جیپ سے اُتر کر تیز تیز قدم اٹھاتے ایک لمبا چکر کاٹا اور شوکی برادرز کے سامنے پہنچ گئے۔ انھوں نے پُر جوش انداز میں کہا:

"ہیلو شوکی۔ ارے تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"اوہو۔ انسپکٹر صاحب۔ یہ آپ ہیں۔ ہم ذرا اس طرف ایک کام سے آئے تھے۔ آپ ادھر کیسے؟" شوکی نے کہا۔

"میں اپنے ایک عزیز سے ملنے آیا تھا۔ وہ بحری جہاز سے افریقی ممالک کی سیر کے لیے جا رہا ہے۔ اور تو سب خیریت ہے نا۔"

"جی ہاں۔ بالکل۔ السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام۔" انھوں نے کہا۔ ان پر ایک نظر ڈالی اور آگے بڑھ گئے۔ کچھ دُور جا کر کن انکھیوں سے ان کی طرف دیکھا تو ایک نیلے لباس والا ان کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ وہ کافی دُور جا کر مڑے۔ اور دُور سے

ان کا جائزہ لینے لگے۔ جلد ہی وہ جہاز پر چڑھتے نظر آئے۔
انھوں نے جہاز کا نام پڑھا۔ اس کا نام نیا چاند تھا۔ اب
وہ جلدی سے معلومات والی کھڑکی پر پہنچے:

"نیا چاند کب روانہ ہو گا؟"

"اس کے روانہ ہونے میں بہت تھوڑا وقت رہ گیا ہے، چند مسافر ابھی تک نہیں پہنچے؛ تاہم جوں ہی وقت ہو گا، جہاز روانہ ہو جائے گا۔"

"یہ کہاں جا رہا ہے؟"

"افریقی ممالک کی طرف۔"

"شکریہ۔" انھوں نے کہا اور وہاں سے اپنی جیپ میں روانہ ہو کر ہوٹل گل ریز پہنچے۔ کلرک سے معلوم کرنے کے بعد اس کمرے میں آئے جہاں شوکی برادرز نے کپتان سے ملاقات کی تھی۔ اور پھر وہ ٹھٹک کر رہ گئے۔ ان کی نظریں کاغذ کے ایک پرزے پر پڑیں۔ کاغذ کا پرزہ پڑھتے ہی ان کی سٹی گم ہو گئی۔ وہ جیپ میں بیٹھ کر آئی جی صاحب کی طرف دوڑ پڑے۔ آئی جی صاحب نے کاغذ کے پرزے کو پڑھا اور دھک سے رہ گئے۔

"اور شوکی وغیرہ اس جہاز پر سوار ہو چکے ہیں؟"

"جی ہاں! میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں۔"

"اب کیا کیا جائے؟"

"اگر ہم نے کچھ کیا۔ تو وہ جہاز کو اڑا دیں گے۔" انسپکٹر کاشان بولے۔

"وہ مارا۔ ترکیب ذہن میں آ گئی۔" اچانک آئی جی صاحب اچھل پڑے۔

"جی۔ کیا مطلب؟"

"انسپکٹر کامران مرزا اور ان کے بچے اس وقت ہمارے شہر میں ہیں۔ وہ دو بین الاقوامی مجرموں کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں آئے ہیں۔ ہم ان سے اس معاملے میں مدد لے سکتے ہیں۔"

"ویری گڈ سر۔ اس سے بہتر بات بھلا اور کیا ہو سکتی ہے۔" اس نے خوش ہو کر کہا۔

"ل۔ لیکن۔" وہ ہکلا کر رہ گئے۔

"لیکن کیا سر۔" انسپکٹر کاشان نے پریشان ہو کر کہا۔

"لیکن میں نہیں جانتا۔ اس وقت انسپکٹر کامران مرزا کہاں ہیں۔ ہسپتال سے میں ادھر آ گیا تھا اور وہ پھر ریوٹا اور شیلاک کی تلاش میں نکل گئے تھے۔"

"ریوٹا اور شیلاک۔" کاشان نے حیران ہو کر کہا۔

"ہاں۔ دو بین الاقوامی مجرم۔ حد درجے خطرناک لوگ۔" وہ بولے۔

"تب پھر ہم کیا کریں؟"

"یہی میں سوچ رہا ہوں۔ خیر یوں کرتے ہیں کہ تمام اسٹیشنوں پر ان کے لیے پیغام دے دیتے ہیں۔"

"یہ بہتر رہے گا۔ میں ذرا شوکی برادرز کے والدین کو فون کر دوں۔ کیا خبر وہ ادھر نہ پہنچ گئے ہوں۔"

"ہوں ٹھیک ہے۔"

دونوں فون کرنے لگے۔ فارغ ہونے کے بعد انسپکٹر کاشان نے کہا:

"وہ وہاں پہلے ہی ہو آئے تھے، لیکن صرف بچے۔"

"ہاں! وہ تینوں تو یہاں سے ہی گئے تھے۔"

"اس کے بعد وہ وہاں نہیں پہنچے۔ بہرحال میں نے اطلاع دے دی ہے۔" وہ بولے۔

عین اسی وقت دفتر کے دروازے پر ایک کار کے رُکنے کی آواز سنائی دی:

"دیکھنا کاشان۔ کہیں یہ وہی لوگ تو نہیں ہیں۔"

"جی بہتر۔" انسپکٹر کاشان نے کہا اور جلدی سے باہر نکلا، پھر چلّا اُٹھا:

"وہی ہیں سر۔"

"یہ کیا بات ہوئی جناب۔ وہی ہیں سر۔" آفتاب نے

حیران ہو کر کہا۔

انسپکٹر کاشان مسکرا دیا۔ پھر وہ اندر داخل ہوئے:

"کہیے۔ ان کا کوئی سُراغ ملا یا نہیں۔" آئی جی بولے۔

"ابھی تک نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس شہر میں ان کے بہت سے مددگار موجود ہیں۔ اس شہر میں ہی نہیں، ہمارے مُلک کے تمام بڑے اور اہم شہروں میں۔ وہ ان کے پاس پناہ لے لیتے ہیں اور موقع پا کر نکل کھڑے ہوتے ہیں۔"

"پھر اب آپ لوگوں کا کیا پروگرام ہے؟"

"ہم تلاش جاری رکھیں گے۔"

"لیکن ادھر ایک اور سنگین سا معاملہ پیش آ گیا۔" انوار عالم بولے۔

"سنگین سا۔ یعنی معاملہ پوری طرح سنگین نہیں ہے۔"

"کیا کہا جا سکتا ہے، اس کی سنگینی کے بارے میں ہمیں صحیح اندازہ نہیں ہے۔"

"خیر۔ فرمائیے۔ کیا معاملہ ہے؟"

آئی جی انھیں تفصیلات سنانے لگے۔ ان کے خاموش ہونے پر آفتاب بول پڑا:

"اوہ۔ شوکی برادرز بھی شامل ہیں۔ تب تو ہمیں ضرور اس

معاملے کی طرف توجہ دینا ہو گی، کیوں ابا جان؟

"ہوں۔ ٹھیک ہے۔ ریوٹا اور شیلاک تو مل نہیں رہے۔ فی الحال یہی سہی۔ مہربانی فرما کر معلوم کریں۔ جہاز ابھی روانہ تو نہیں ہوا۔"

"اچھا!" انھوں نے کہا اور سی پورٹ فون کرنے لگے۔ جلد ہی ریسیور رکھتے ہوئے بولے:

"جہاز ابھی روانہ نہیں ہوا۔"

"تو پھر ہمارے لیے جہاز کے مسافروں کی حیثیت سے انتظام کر دیں۔ ہم چند منٹ میں اپنے حلیوں میں تبدیلی کر لیں۔ اور ساتھ ہی گھر فون کر دیں، کیوں کہ اب نہ جانے واپسی کب ہو گی۔ آپ نے جہاز کا کیا نام بتایا۔" انھوں نے جلدی جلدی کہا۔

"نیا چاند۔" انسپکٹر کاشان بولے۔

"شکریہ!" انھوں نے کہا اور اپنے گھر کے نمبر ڈائل کرنے لگے، سلسلہ ملنے پر بولے:

"ہیلو بیگم۔ ملک کے جنوبی حصے سے بول رہا ہوں۔ اس وقت آئی جی انوار عالم صاحب کے دفتر میں موجود ہیں، لیکن تھوڑی دیر بعد ہمیں ایک بحری جہاز میں سفر کرنا ہے۔ واپسی کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے۔ شوکی برادرز بھی ہمارے

ساتھ ہوں گے۔ اطلاعاً عرض ہے۔"

"لیکن اتنے عرصے تک میں اکیلی کس طرح رہ سکوں گی۔"

"تو پھر۔ تم کیا کہنا چاہتی ہو۔"

"میں چاہتی ہوں۔ بیگم جمشید کو اپنے ہاں بلا لوں۔ یا خود ان کے ہاں چلی جاؤں۔"

"اوہ۔ بہت اچھی ترکیب ہے۔ سنو۔ اگر انسپکٹر جمشید صاحب سے بات ہو تو انھیں اتنا ضرور بتا دینا کہ ہم نیا چاند نامی بحری جہاز پر سفر کرنے پر مجبور ہیں۔ یہ اس لیے کہہ رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے۔ ہم واپس نہ لوٹ سکیں۔ چنانچہ ہمارے بعد انسپکٹر جمشید اس معاملے کا سراغ تو لگانے کی کوشش کر ہی سکیں گے۔"

"شکریہ! میں اسی وقت فون پر ان سے بات کرتی ہوں۔" وہ بولیں اور انسپکٹر کامران مرزا نے مسکراتے ہوئے ریسیور رکھ دیا۔

ادھر آئی جی صاحب سی پورٹ کے عملے کو ہدایات دے چکے تھے۔ انسپکٹر کامران مرزا اپنے اور ان کے میک اپ میں مصروف ہو گئے۔ میک اپ اگرچہ بہت جلدی میں کیا گیا تھا۔ پھر بھی انھیں آسانی سے پہچانا نہیں جا سکتا تھا، وہاں سے رخصت ہوتے وقت آفتاب نے سرد آہ بھرتے

ہوئے کہا:

"جہاز پر شوکی برادرز سے تو ملاقات ہو جائے گی۔ کاش اس سفر پر انکل جمشید وغیرہ بھی ساتھ ہوتے۔"

"آنٹی کے ذریعے انھیں اطلاع تو مل ہی جائے گی۔ ہو سکتا ہے۔ وہ روانہ ہو ہی جائیں۔" آصف بولا۔

"دماغ تو نہیں چل گیا۔ جہاز تو کوئی دم میں روانہ ہونے والا ہے۔ وہ اس قدر جلد کیسے پہنچ سکتے ہیں، لہٰذا ان سے ملاقات کی کوئی امید نظر نہیں آتی۔" آفتاب نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔

"بھئی اس دنیا میں کچھ بھی نا ممکن نہیں۔" فرحت نے منہ بنا کر کہا۔

"عقل کے ناخن لو۔ بھلا وہ اس جہاز پر کس طرح سوار ہو سکتے ہیں۔"

"ہاں! یہ تو قریب قریب ناممکن ہی نظر آتا ہے۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"انکل! آپ بھی یہ کہہ رہے ہیں۔"

"فرحت۔ اس دنیا میں بھی کچھ باتیں ناممکن ہیں۔ مثلاً کسی انسان کا ہمیشہ کے لیے زندہ رہنا، کیوں کہ ہر شخص کو موت آ کر رہے گی۔ اسی طرح کچھ اور باتیں بھی نا ممکن ہو سکتی ہیں۔"

"آپ۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں انکل۔" فرحت بڑبڑائی۔

"آؤ چلیں۔ اب ہم تیار ہیں۔" وہ بولے۔

چند منٹ بعد وہ ایک ٹیکسی میں بیٹھے سی پورٹ کا رخ کر رہے تھے۔ اپنی کار انھوں نے دفتر میں ہی چھوڑ دی تھی۔ عملے نے ان کے ساتھ پورا تعاون کیا۔ اور بعد میں آنے والے مسافروں کے ساتھ انھیں جہاز پر سوار ہونے میں مدد دی۔ انھوں نے پورے عرشے پر نظریں دوڑائیں۔ مگر۔ شوکی برادرز انھیں کہیں بھی نظر نہ آئے۔ اور جب انھیں ان کے کیبن کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔ تو انسپکٹر کامران مرزا چونک اٹھے، بے اختیار ان کے منہ سے نکلا:

"اوہو۔ یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔"

ان کے لہجے میں بے پناہ جوش تھا۔ آنکھوں میں حیرت تھی۔ یہاں تک کہ ان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"کیا دیکھ رہے ہیں ابا جان۔ کچھ ہمیں بھی تو بتائیے۔" آفتاب بولا۔

"خاموش رہو۔ کہیں ہماری گفتگو سن نہ لی جائے۔ میں محسوس کر رہا ہوں۔ جہاز پر حالات واقعی نازک ہیں۔ اگر ہم نے کانا پھوسی شروع کر دی تو ہم ان لوگوں کی نظروں میں آ جائیں گے۔" انھوں نے سامنے دیکھتے ہوئے دبی آواز

میں کہا۔

"کن لوگوں کی نظروں میں؟" فرحت بولی۔

"جو حالات نازک بنانے کے ذمے دار ہیں، مہربانی فرما کر کیبن میں داخل ہونے تک خاموش رہو۔"

"جی بہتر!" آفتاب نے کہا اور انھوں نے اپنے ہونٹ مضبوطی سے بند کر لیے۔

آخر ان کا کیبن نظر آ گیا۔ اس میں داخل ہو کر انھوں نے دروازہ بند کر لیا:

"اب بتائیے۔ آپ کو کیا نظر آیا تھا؟"

"ابھی کچھ نہ پوچھو۔ حالات کا جائزہ لینے دو۔ میں نہیں جانتا۔ یہاں کیا ہو رہا ہے۔ یا کیا ہونے والا ہے، لیکن میری چھٹی حس کہہ رہی ہے۔ ہم نے موت کے منہ میں قدم رکھ دیے ہیں۔"

"خیر ابا جان۔ یہ تو کوئی نئی بات نہیں۔ ایسا تو ہم پہلے بھی کرتے رہے ہیں۔" آفتاب بولا۔

عین اسی وقت جہاز نے روانگی کی سیٹی دی۔ اور وہ چلنے لگا:

"لو بھئی۔ ہم اپنے ملک سے روانہ ہو رہے ہیں۔ ہمیں نہیں معلوم۔ ہم کہاں جا رہے ہیں۔"

"معلوم کیوں نہیں انکل۔ ہم افریقی ممالک کی طرف جا رہے ہیں۔" فرحت نے حیران ہو کر کہا۔

"ہاں؛ تم بھی ٹھیک کہتے ہو۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

عین اسی وقت انھوں نے دوڑتے قدموں کی آواز سنی، وہ چونک اٹھے۔

○

انسپکٹر جمشید کے گھر کے فون کی گھنٹی بجی۔ بیگم جمشید نے جلدی سے ریسیور اٹھایا:

"ہیلو۔ بیگم جمشید بول رہی ہوں۔"

"اور میں ہوں بیگم کامران مرزا۔ کیوں کیسی رہی۔" دوسری طرف سے شہناز بیگم کی چہکتی آواز سنائی دی۔

"بہت اچھی۔ شکر ہے۔ آپ کو فون کرنے کا خیال آیا۔"

"مجبوری تھی۔" وہ بولیں۔

"مجبوری کیسی۔ ذرا میں بھی تو سنوں۔"

بیگم کامران مرزا نے تفصیل سنا دی۔ ان کے خاموش ہونے پر انھوں نے کہا:

"میں بھی اسی قسم کے حالات کا شکار ہوں۔ یعنی بالکل

تنہا ہوں ۔ سب لوگ کسی نامعلوم مہم کی طرف روانہ ہو چکے
ہیں ۔"

" ارے کمال ہے ۔ تو پھر آپ یہاں آ رہی ہیں ۔ یا
میں وہاں ۔"

" جیسے آپ کی مرضی ۔"

" اچھی بات ہے ۔ تو پھر آپ ہی آ جائیں ۔ میں بے چینی
سے انتظار کروں گی ۔"

" اتنی بے چینی سے انتظار کرنے کی بھی ضرورت نہیں ۔"
وہ مسکرا کر بولیں ۔

دونوں نے ریسیور رکھ دیے ۔ بیگم کامران مرزا کو ایسے
میں ایک نیا خیال آیا ۔ انھوں نے پہلے تو آئی جی انوار عالم
کو فون کیا ۔ ان سے شوکی برادرز کے بارے میں پوچھا ،
پھر حالات معلوم کرنے کے بعد ان کے گھر کا نمبر پوچھا اور
سلسلہ کاٹ کر ان کے گھر کے نمبر ملائے ۔ پہلے ارشد نے
ان سے بات کی ، پھر اس نے شوکی کی والدہ سے بات
کرائی :

" ہیلو بہن ۔ شوکی کی والدہ بول رہی ہوں ۔ کیا حال
ہے ۔"

" اللہ کا شکر ہے ۔ میں اور بیگم جمشید ایک جگہ جمع

ہو رہے ہیں ۔ کیوں نہ چند دن آپ ہمارے ساتھ گزاریں ۔ شوکی
وغیرہ سے مل کر بہت خوشی ہو گی ہمیں ۔"

" وہ تو غائب ہیں ۔ پتا نہیں کہاں ہیں ۔"

" اوہ ۔ ارے ۔ اچھا ۔ تب تو آپ ضرور آ جائیں ۔" وہ
بولیں ۔

" لیکن میں یہ مناسب خیال نہیں کرتی ، کیوں نہ آپ
دونوں میرے ہاں آئیں ۔"

" اچھی بات ہے ۔ یوں ہی سہی ۔ ہم جلد آپ کے ہاں
پہنچیں گی ۔"

" بہت بہت شکریہ ۔" وہ بولیں ۔

سلسلہ کاٹ کر بیگم کامران مرزا نے پھر بیگم جمشید کو
فون کیا :

" ہیلو ۔ ایک بار پھر تکلیف دے رہی ہوں ۔ امید ہے ،
محسوس نہیں کریں گی ۔ پروگرام ذرا بدل گیا ہے ۔"

" یعنی آپ میرے ہاں آ رہی ہیں ۔" بیگم جمشید بولیں ۔

" نہیں ۔ بلکہ میں اور آپ دونوں شوکی برادرز کے گھر جا
رہے ہیں ۔ ان کی والدہ کے ساتھ رہیں گے ۔"

" اوہ ۔ تت ۔ تو ۔ تو کیا ۔"

" تت ۔ تو کیا کیا ۔" وہ حیران ہو کر بولیں ۔

"کیا شوکی برادرز بھی اپنے گھر سے غائب ہیں؟" بیگم جمشید نے پوچھا۔

"یہ اندازہ آپ نے کیسے لگا لیا؟" بیگم کامران مرزا حیران ہو کر بولیں۔

"میری چھٹی حس ذرا جاسوسی قسم کی ہے۔" وہ ہنس کر بولیں۔

"بہر حال۔ آپ کا اندازہ درست ہے۔ اب یا تو پہلے آپ میرے پاس پہنچ جائیں، پھر ہم دونوں ان کے ہاں چلیں گے، یا پھر آپ سیدھی وہیں پہنچیں، میں بھی روانہ ہو جاتی ہوں۔"

"اس طرح مزہ نہیں آئے گا۔ ہم دونوں ساتھ ہی ان کے ہاں چلیں گے۔"

"چلیے یوں ہی سہی۔" بیگم کامران مرزا بولیں اور ریسیور رکھ دیا۔

ریسیور رکھ کر بیگم جمشید مڑی ہی تھیں کہ ان کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ سامنے دیوار پر ایک سیاہ بٹن لگا ہوا تھا۔ وہ اس بٹن سے بہت اچھی طرح واقف تھیں۔ اس کی مدد سے گھر کے اندر ہونے والی گفتگو باہر ایک دوسرے آلے پر بالکل

صاف سنی جا سکتی تھی۔ ان کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

پھر انھیں یاد آیا۔ کافی دیر پہلے بجلی کے میٹر کی ریڈنگ لینے کے لیے ایک شخص آیا تھا۔ انھوں نے صرف اس کے لیے دروازہ کھولا تھا۔ اس کے علاوہ کوئی نہیں آیا تھا۔ اس کا مطلب ہے۔ وہ کوئی فرضی ملازم تھا اور دراصل وہ یہ سیاہ بٹن لگانے ہی آیا تھا۔ لیکن سوال تو یہ تھا کہ کیوں۔ کسی کو ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ صاف ظاہر ہے۔ یہ کام کرنے والوں کو اتنا تو معلوم ہی تھا کہ ان کے گھر کے افراد کہیں جا چکے ہیں۔ اس صورت میں بھلا انھیں یہاں سے کیا خبریں حاصل ہو سکتی تھیں، ان کی موجودگی میں یہ بٹن لگایا جاتا تو ایک بات بھی تھی۔ بیگم جمشید کافی دیر تک سوچ میں گم رہیں، لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکیں۔

آخر انھوں نے بے فکری کے عالم میں سر کو جھٹکا اور جانے کی تیاری کرنے لگیں۔

پھر جوں ہی وہ گھر سے باہر نکلیں۔ اور ایک ٹیکسی میں بیٹھیں۔ فوراً ہی ایک نیلی کار ان کے تعاقب میں

نکل کھڑی ہوئی۔

اب تو ان کی پیشانی پر لکیریں اُبھر آئیں۔ دل دھک دھک کرنے لگا۔

فائر اور چیخ

"کیا بات ہے بھئی۔ تم خالی ہاتھ کیوں واپس آ گئے؟"
کاشف فرشوری نے مُنہ بنایا۔

"خوراک کے ذخیرے پر دس نیلے لباس والے پوزیشن لیے کھڑے ہیں۔ ان کے پاس پستول ہیں"۔ ایک باورچی بولا۔

"دس نیلے لباس والے۔ اُف اللہ۔ آخر وہ کیا چاہتے ہیں"۔

"بھلا ہم کیا بتا سکتے ہیں۔ ہمیں دیکھتے ہی انھوں نے پستول سیدھے کر لیے اور کہا۔ خبردار اگر اس طرف آنے کی کوشش کی تو زندگیوں سے ہاتھ دھو بیٹھو گے"۔

"آؤ۔ میں ان سے بات کرتا ہوں۔ مسٹر شوکی۔ آپ لوگ میرے ساتھ چلیں گے"۔

"ج۔ جی ہاں۔ کیوں نہیں"۔ شوکی گھبرا گیا۔

"آپ پریشان ہو گئے۔ خیر تو ہے"۔

"جی۔ وہ۔ پپ" شوکی ہکلا کر رہ گیا۔

"وہ پپ - کیا!"

"دراصل ہمیں پستولوں سے بہت ڈر لگتا ہے - ان کا کیا بھروسا - کب چل پڑیں۔"

"خیر - اگر آپ خوف زدہ ہیں تو یہیں ٹھہریے - میں ان سے بات کرتا ہوں۔" کاشف فرشوری بولا۔

"اب ہم اتنے بھی بزدل نہیں کہ آپ کا ساتھ دے ہی نہ سکیں۔" آفتاب جلدی سے بولا۔

"ہاں! یہ بھی ٹھیک ہے - کم از کم ہم آپ کے پیچھے پیچھے تو آ ہی سکتے ہیں۔" شوکی نے فوراً کہا۔

"چلیے خیر - پیچھے ہی آ جائیے۔" کاشف نے منہ بنا کر کہا۔

وہ ان کے پیچھے چلتے سب سے نچلی منزل میں بنے سٹور میں پہنچے - یہ ایک بہت بڑا ہال تھا - سٹور کا دروازہ اندر سے بند نہیں تھا - کاشف فرشوری بے دھڑک اندر گھس گیا؛ تاہم شوکی برادرز ڈرتے ڈرتے اندر داخل ہوئے:

"خبردار - آگے قدم نہ رکھنا - ورنہ گولیوں سے اُڑا دیے جاؤ گے۔"

"بات کیا ہے جناب۔" کاشف نے بھنا کر کہا۔

"ہمارے باس کا حکم ہے - کھانے پینے کی کوئی چیز یہاں

سے نہ لی جائے۔"

"تو پھر - ہم کھانے پینے کی چیزیں کہاں سے لیں گے - کیا جہاز کے مسافروں اور عملے کو بھوکا پیاسا ماریں۔"

"مرنا تو تم لوگوں کو ہے ہی - بھوکا پیاسا مرنا زیادہ بہتر ہے۔" آواز آئی - انھوں نے بوریوں کے پیچھے پوزیشن لے رکھی تھی، البتہ پستولوں کی نالیں انھیں صاف نظر آ رہی تھیں۔

"اور تمھارا باس کون ہے؟"

"باس - لمبے قد والا شخص جو نیلے لباس میں ہے - وہی ہمارا باس ہے - بہتر ہوگا کہ آپ اس سے بات کر لیں - ہم تو صرف حکم کے غلام ہیں۔"

"یہ جان کر خوشی ہوئی کہ تم صرف حکم کے غلام ہو - آؤ بھئی چلیں - ان کے باس سے بات کرتے ہیں - اگر مسافروں کو اور عملے کو یہ بات معلوم ہو گئی تو ابھی بے چینی کی لہر پھیل جائے گی۔"

وہ تیز تیز قدم اُٹھاتے اُوپر والے حصے میں آئے - جہاز ساحل سے کافی دُور آ چکا تھا - کپتان شومی انجن روم میں تھا - انھوں نے انجن روم کا رُخ کیا - اسی وقت کپتان ان کی طرف مڑا:

"تو تم گودام دیکھ آئے شوکی برادرز۔"

"جی نہیں ۔ ابھی تک نہیں دیکھ سکے۔" شوکی نے منہ بنایا۔

"کیوں ۔ کیا بات ہے؟"

"راستے میں ہمیں باورچی خانے نے روک لیا تھا۔"

"باورچی خانے نے روک لیا تھا ۔ اوہ سمجھا ۔ آپ لوگ باورچی خانہ دیکھنے لگ گئے تھے ۔ خیر۔ تو کیا ہوا ۔ اب جا کر گودام دیکھ لیں۔"

"آپ کے پاس ظاہر میاں آئے تھے۔ ان کے ذریعے ہم نے آپ کو باورچی خانے میں بلایا تھا۔" کاشف فرشوری نے ناگوار لہجے میں کہا۔

"ہاں ! اس میں تو کوئی شک نہیں ۔ ظاہر میاں میرے پاس آیا تھا، لیکن میں اس وقت نیچے نہیں آسکتا تھا ۔ میں نے اندازہ لگا لیا تھا، کسی باورچی نے گڑبڑ کی ہوگی۔"

"جی نہیں ۔ معاملہ بہت سنگین ہے ۔ مسافروں اور عملے کے لیے تیار کیے جانے والے کھانے میں زہر ملا دیا گیا تھا، اگر شوکی برادرز اس بات کو نہ بھانپ لیتے تو وہ کھانا کھاتے ہی سب لوگ مرجاتے۔"

"نہیں !!!" کپتان چلایا۔

"جی ہاں ۔ انھوں نے میرے طوطوں کو وہ کھانا کھلایا تھا ۔ طوطے اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔" کاشف نے درد بھرے

انداز میں کہا۔

"یہ میں کیا سن رہا ہوں؟"

"یہی نہیں ۔ حالات اس سے بھی کہیں زیادہ سنگین ہیں ۔ ہم نے باورچیوں کو اور کھانا پکانے کا حکم دیا ۔ وہ سامان لینے سٹور میں گئے ۔ لیکن جہاز کا سٹور اس وقت دس آدمیوں کے قبضے میں ہے ۔ ان کے ہاتھوں میں پستول ہیں اور انھوں نے بوریوں کے پیچھے پوزیشن لے رکھی ہے ۔ ان کا کہنا ہے ہم کھانے پینے کی چیزیں وہاں سے نہیں لے سکتے ۔ اس سلسلے میں اگر کوئی بات کرنا ہے تو ان کے باس سے کریں۔"

"اور ان کا باس کون ہے؟" کپتان کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔

"نیلے لباس والا ایک لمبے قد کا آدمی۔"

"آؤ ۔ اس سے بات کرتے ہیں ۔ مسٹر شوکی ۔ آپ سب کچھ سن چکے ہیں۔"

"ہاں ، لیکن سننے سے کیا بنتا ہے ۔ اصل چیز تو عمل ہے، عمل کے بغیر کچھ نہیں ہوگا۔"

"آئیے ۔ پہلے تو ہم اس سے بات کرلیں۔"

وہ انجن روم سے نکل کر باہر آئے ۔ اور پھر ٹھٹک کر رک گئے ۔ لمبے قد والا جو نیلے لباس میں تھا ، عرشے پر ہی

ٹہل رہا تھا۔ اس کا رخ ان کی طرف نہیں تھا۔ بلکہ وہ سمندر
کی موجوں کو دیکھ رہا تھا:

"مسٹر ٹومین ۔ کیا آپ ہی ان تمام واقعات کے ذمے دار
ہیں؟"

وہ پُرسکون انداز میں ان کی طرف مُڑا۔ مسکرایا اور
پھر بولا:

"آپ کا اشارہ شاید ان دھمکیوں اور رقعوں کی طرف ہے۔"
اس نے کہا۔

"نہ صرف ان کی طرف۔ بلکہ سٹور پر قبضے کی طرف بھی۔"
کپتان نے جھنجلا کر کہا۔

"رقعے۔ دھمکیاں ۔ کیا مطلب؟" کاشف فرشوری کے لہجے
میں حیرت تھی۔

"یہ ایک لمبی کہانی ہے فرشوری۔ بس تم اتنا سُن لو کہ
جہاز روانہ ہونے سے پہلے ہی ان کے قبضے میں آچکا تھا۔"

"یہ ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اور اگر کوئی ایسی بات تھی تو
آپ نے پولیس کو کیوں اطلاع نہیں دی؟"

"افسوس میں پولیس کو اطلاع دینے کی جرأت نہیں کر سکا۔
ان لوگوں نے جہاز میں ٹائم بم لگا رکھا ہے۔"

"کیا!!" فرشوری چلّا اُٹھا۔

"آہستہ فرشوری آہستہ۔ اگر مسافروں اور عملے کے کانوں میں
اس معاملے کی بھنک بھی پڑ گئی تو حالات اور بھی نازک ہو
جائیں گے۔"

"اوہ!" فرشوری کے منہ سے نکلا۔ یوں لگا جیسے ان کے
جسم کا سارا خون کسی نے نچوڑ لیا ہو۔ کپتان کا چہرہ پہلے ہی
دھواں ہو رہا تھا۔ ظاہر میاں اور شوکی برادرز کی حالت بھی
اچھی نہیں تھی۔

"لیکن جناب۔ پولیس ماہرین کے ذریعے ٹائم بم کا سُراغ
لگوا سکتی تھی۔" ظاہر میاں نے کہا۔

"ہاں ٹھیک ہے، لیکن یہ لوگ ماہرین کو دیکھتے ہی
اس کا وقت تبدیل کر دیتے۔"

"اوہ!" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"خیر۔ سوال یہ ہے کہ یہ لوگ کیا چاہتے ہیں۔" کاشف
فرشوری نے بے تابانہ انداز میں کہا۔

"یہاں کیا ہو رہا ہے۔" ایک آواز ابھری۔ مُڑ کر دیکھا تو
نائب کپتان امیر رانا ان کے نزدیک آچکا تھا۔

"آؤ رانا ۔ تم بھی آؤ۔ کیوں نہ ہم ایک جگہ بیٹھ کر بات
کر لیں۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" ٹومین نے کندھے اچکائے۔

وہ عرشے پر بنے امیر رانا کے کمرے میں آ بیٹھے۔ کپتان
شوکی نے جلدی جلدی امیر رانا کو حالات سنا دیے۔ اس کا منہ
بھی خوف زدہ انداز میں کھل گیا:

"مہربانی فرما کر اب یہ بتایئے۔ آپ لوگ کیا چاہتے ہیں؟"

"ہم جہاز پر صرف بیس آدمی ہیں۔ اور یہ بیس آدمی اس
پورے جہاز پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ تاکہ اسے اپنے ملک
تک لے جا سکیں۔"

"لیکن کیوں۔ آپ کے ملک کو ہمارے ملک کے اس جہاز کی
ایسی کیا ضرورت پڑ گئی۔ آپ کا تعلق کس ملک سے ہے؟"

"ہمارا تعلق بیگال سے ہے۔"

"بیگال!" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔ ہونٹ نفرت زدہ
انداز میں سکڑ گئے۔ بیگال ان کے ملک کا بدترین دشمن تھا۔

"ہاں بیگال۔ جو بہت جلد تمہارے ملک پر حملہ آور ہو
گا۔ اور اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دے گا۔"

"یا اللہ رحم۔" اشفاق نے فوراً کہا۔

"وہ تو بعد کی باتیں ہیں۔ آپ اس جہاز کو کیوں اغوا
کرنا چاہتے ہیں؟"

"چاولوں کی بوریوں میں۔ تمہارے ملک کے قومی بنک کا
سارا سونا موجود ہے۔ چاولوں میں چھپا ہوا۔ اس سونے کے

بغیر تمہارا ملک ایک ہولناک بحران سے دوچار ہو جائے گا۔ اور
اس بحران کے بعد جب ہم حملہ کریں گے تو ہمارا پہلا نشانہ تمہارے
ملک کا ایٹمی پلانٹ ہو گا، اس کے بعد تمام اہم تنصیبات
ہماری زد میں ہوں گی۔"

"وہ کیسے۔ زد میں کیسے ہوں گی۔" شوکی نے بوکھلا کر کہا۔

"تمام اہم ترین مقامات اور تنصیبات کے نقشے اور تصاویر
ہم حاصل کر چکے ہیں۔"

"غلط۔ بالکل غلط۔ بھلا تم یہ سب کچھ کس طرح حاصل کر
سکتے ہو۔" کپتان فرشوری چلا اٹھا۔

"کیوں۔ کیوں نہیں حاصل کر سکتے۔ یہ ہمارے لیے مشکل
ہی کیا ہے۔ تمہارے ملک میں ایک پوری جماعت ایسی ہے
جو ہمارے اشاروں پر ناچتی ہے۔ اور اس نے اپنا مشن بھی
ہمارے ملک میں قائم کر رکھا ہے۔ بہانا اسلام کی تبلیغ کا
ہے۔ لیکن اسلام کی تبلیغ سے اس جماعت کو دور کا بھی واسطہ
نہیں۔ وہ تو بس تمہارے ملک کی جڑیں کاٹنے کا کام کرتی ہے،
اس جماعت کے لوگ تمہارے ملک میں بڑے بڑے عہدوں
پر فائز ہیں، پھر بھلا ان کے لیے ہمیں اطلاعات بھیجنا کیا مشکل
ہے۔ اب اس جہاز کی مثال لے لو۔ قومی بنک کا سونا جہاز
پر چاولوں کی بوریوں میں رکھ کر منتقل کروا دینا۔ یہ اسی جماعت

کے ان لوگوں کا کام ہے ۔ جو اعلیٰ عہدوں پر کام کر رہے ہیں ۔ اور جن کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا ۔ تمھاری حکومت اگر ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے ۔ تو بڑے بڑے ملک تمھاری امداد بند کر دیں ۔ جنگی امداد ۔ غذائی امداد ۔ لہٰذا ان کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کی جرأت تک نہیں کر سکتا ۔ لہٰذا ہم ان سے جو کام چاہتے ہیں لے لیتے ہیں ۔"

"لل ۔ لیکن ۔ قومی بنک کا سونا وہاں سے کیسے نکالا جا سکتا ہے ۔ یہ بات تو ذہن میں آنے والی نہیں ۔"

"کیوں نہیں ۔ اس کے لیے بہت زبردست منصوبہ بندی کی گئی ہے ۔ اور اس منصوبہ بندی کے پیچھے میرا ذہن کام کر رہا ہے ۔ قومی بنک میں موجود تمام سونے کے برابر بالکل اسی کی سلاخوں جتنی بڑی سلاخیں پیتل کی تیار کرائی گئیں ۔ ان پر سونے کا پانی چڑھایا گیا ۔ بنک کے کئی اعلیٰ افسر ہماری ہمدرد جماعت کے افراد ہیں ۔ وہ ایک ایک کر کے سلاخ تبدیل کرتے رہے ۔ چیکنگ کرنے کے بہانے اندر جانا اور دو چار سلاخیں تبدیل کر لانا ۔ کون ان پر شبہ کر سکتا تھا ۔ آخر چند مہینوں میں سارا سونا ایک دوسری جگہ منتقل کر دیا گیا ۔ وہاں سے وہ چاولوں کی بوریوں میں چھپایا گیا اور اب اس جہاز پر موجود ہے ۔ چاولوں کی کارپوریشن کا انچارج بھی اسی

جماعت کا آدمی ہے ۔ ان حالات میں یہ کام ہمارے لیے کچھ زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا ۔" یہاں تک کہ کر ٹوین خاموش ہو گیا ۔

"اُف اللہ !" کپتان شومی لرز گیا ۔ امیر رانا کا چہرہ دُودھ کی طرح سفید ہو گیا ۔ باقی لوگوں نے یوں محسوس کیا جیسے جہاز ان کے پیروں تلے سے نکلا جا رہا ہے ۔

○

ان کے دل ڈوبے جا رہے تھے ۔ ایک پورا جہاز ہی نہیں اڑایا جا رہا تھا بلکہ پورے ملک کی دولت بھی اڑائی جا رہی تھی ۔ اور یہ سب کچھ ایک جماعت کے سر پر کیا گیا تھا ۔

"تم سب لوگ بھی دراصل اب ہمارے قبضے میں ہو ، کیوں کہ کسی کو نہیں معلوم کہ بم کہاں چھپایا گیا ہے ۔ اور کب وہ پھٹے گا ۔ اس لیے اگر ہمارے خلاف کوئی قدم اٹھایا گیا اور ہمیں کسی طرح موت کے گھاٹ اتار بھی دیا گیا تو بھی ٹائم بم سے یہ جہاز نہیں بچ سکے گا ۔ بچنے کی صرف اور صرف ایک صورت ہے ۔ اور وہ یہ کہ تم لوگ اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دو ، جہاز کا کنٹرول بھی ہمیں دے دو ۔ ہم میں ایک ماہر جہاز ران

بھی موجود ہے۔ یہاں سے جہاز کو وہ آگے لے کر جائے گا۔
اسے راستوں کے بارے میں معلوم ہے۔ میرے ان دس ساتھیوں
کے پاس اَن گنت کارتوس ہیں۔ کارتوس ختم نہیں ہوں گے،
جہاز پر موجود سب لوگ ختم ہو جائیں گے۔ شاید تم میں سے
کوئی یہ خیال کرے کہ اتنے پستول اور اسلحہ جہاز پر کس طرح
آگیا۔ تو یہ سوال احمقانہ ہو گا؛ کیوں کہ چاولوں میں اگر سونا
چھپاکر لایا جا سکتا ہے تو پستول اور گولیاں کیوں نہیں لائی جا
سکتیں۔ ان دس کے علاوہ میرے نو ساتھی اور ہیں۔ جو اس
وقت تک جہاز کی ایسی جگہوں پر پہنچ چکے ہیں۔ جہاں سے
وہ دوسروں کو بخوبی نشانہ بنا سکتے ہیں، لیکن انھیں کوئی
نشانہ نہیں بنا سکتا۔ لے دے کے ایک میں ہی تم لوگوں
کے سامنے موجود ہوں۔ تم لوگ میری تکا بوٹی ضرور کر سکتے ہو،
لیکن اس کا نتیجہ اور بھی بھیانک ہو گا۔ میں تم لوگوں کو سوچنے
کے لیے ایک گھنٹا دیتا ہوں۔ ایک گھنٹے بعد تمھارا فیصلہ سُنوں
گا اور پھر اپنے پروگرام کے مطابق عمل کروں گا اگر یہ یقین
نہیں کہ میرے آدمی جہاز میں ایسی جگہوں پر پہنچ چکے ہیں،
جہاں سے وہ دوسروں کو آسانی سے نشانہ بنا سکتے ہیں تو پھر
میں یقین بھی دلا سکتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے منہ سے ایک
عجیب سی آواز نکالی۔

فوراً ہی ایک فائر ہوا۔ اور ایک چیخ گونجی۔ ایک لرزا
دینے والی چیخ۔ اور کوئی عرشے پر گرا۔ وہ بوکھلا کر اُٹھ کھڑے
ہوئے۔ پھر افراتفری کے عالم میں باہر نکلے۔ عملے کا ایک
آدمی بُری طرح تڑپ رہا تھا۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ
سرد ہو گیا۔

ان کے چہروں پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔

جہاز پر قتل

دوڑتے قدموں کی آواز نے انھیں چونکا دیا تھا، انسپکٹر کامران مرزا تیزی سے اُٹھے اور کیبن کا دروازہ کھول کر باہر نکلے —

"میں ابھی آتا ہوں۔"

یہ کہتے ہوئے وُہ تیز تیز قدم اُٹھاتے چلے گئے —

"لو بھئی — کھیل شروع ہو گیا۔" آصف بولا۔

"کھیل کا کیا ہے — وُہ تو ہماری یہاں آمد سے پہلے ہی شروع ہو چکا تھا۔"

"لیکن بھئی — کھیل ضرورت سے کچھ زیادہ ہی سنسنی خیز جان پڑتا ہے۔" فرحت نے پریشان آواز میں کہا۔

"خیر — ہمیں ضرورت سے زیادہ سنجیدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔" آفتاب مسکرایا۔

"اب یہ کیبن مجھے کاٹ کھانے کو دوڑ رہا ہے — آؤ

ذرا ہم بھی دیکھیں — کیا معاملہ ہے — کسی کو دوڑنے کی کیا ضرورت آ پڑی ہے۔" آصف نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"انکل ہمیں ساتھ نہیں لے گئے — شاید وہ چاہتے ہیں کہ ابھی ہم باہر نہ نکلیں۔" فرحت نے نفی میں سر ہلایا۔

"تم پر آفتاب کا رنگ تو نہیں چڑھتا جا رہا — میرا مطلب ہے، سُست مزاجی آتی جا رہی ہے تم میں۔"

"کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ میں سُست مزاج ہوں۔" آفتاب بھنا کر کھڑا ہو گیا۔

"کہنا چاہتا نہیں — کہہ چکا ہے۔" فرحت ہنسی۔

"اچھا — کیوں آصف — تم یہ بات کہہ چکے ہو۔" آفتاب پھاڑ کھانے والے انداز میں بولا۔

"کیا تمھیں اتنی اُردو بھی نہیں آتی۔" آصف نے منہ بنایا۔

"کتنی — یہ اُردو کا پیریڈ نہیں ہے۔" آفتاب نے تلملا کر کہا۔

"زیادہ تلملانے، طیش کھانے اور بھنانے کی ضرورت نہیں۔" آصف مسکرایا۔

"مجھے ڈر ہے — تم کہیں لڑ نہ پڑو — ان حالات میں آپس میں لڑنا مناسب نہیں ہو گا — ہماری طاقت بٹ جائے گی۔" فرحت نے جلدی جلدی کہا — چہرے پر فکرمندی کے آثار تھے۔

"ہوں واقعی — شاید ہمارے دماغ چل گئے ہیں — یار آفتاب

تم تو بہت ہی پھرتیلے ہو رہے ہو ان دنوں - اس قدر
تیزی تم میں آچکی ہے کہ کیا بتاؤں۔"

"اوہو اچھا - کمال ہے - میں انسان نہ ہوا ، گرگٹ ہو گیا۔"
آفتاب خوش ہو کر بولا -

عین اسی وقت انسپکٹر کامران مرزا اندر داخل ہوئے اور
ان کا باہر نکلنے کا ارادہ دھرا کا دھرا رہ گیا -

"جہاز گڑبڑ کی لپیٹ میں ہے - عملے کا ایک آدمی دوڑتا
ہوا جہاز کے کپتان کے پاس گیا تھا - اس نے اس سے کہا تھا
کہ آپ کو نیچے باورچی خانے میں بلایا گیا ہے ، لیکن کپتان
نے باورچی خانے کی طرف جانے کی کوئی ضرورت محسوس
نہیں کی - میں اس کارکن کے تعاقب میں نیچے ہو آیا ہوں - وہاں
دو طوطے مُردہ پڑے ہیں۔"

"جی کیا مطلب - طوطے مُردہ پڑے ہیں۔"

"ہاں اور کھانا اٹھا کر سمندر میں پھینکا جا رہا ہے -
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے کھانے میں زہر ملا دیا تھا۔"

"اوہ!" ان کے مُنہ سے نکلا -

"ہاں! میں نے خود کو ظاہر نہیں کیا - خاموشی سے حالات
کا جائزہ لیا اور واپس آ گیا ، کیوں کہ جب تک پورے حالات
کا علم نہ ہو ، اس وقت تک کچھ کرنے کی صورت میں فائدے

کی بجائے نقصان ہوتا ہے۔"

"خیر - وہاں اور کھانا تیار کر لیا جائے گا - سوال یہ ہے
کہ شوکی برادرز کہاں ہیں - ہم تو ان کے چکر میں اس جہاز پر
سوار ہوئے ہیں۔"

"وہ بھی باورچی خانے میں موجود ہیں - اور شاید کھانے
میں زہر انھوں نے ہی دریافت کیا ہے۔" وہ مسکرائے -

"ارے! وہ باورچی خانے میں ہیں - اور ہم یہاں - یہ کیا
بات ہوئی - ہمیں تو فوراً ان سے ملنا چاہیے۔" آفتاب اُچھل
کر کھڑا ہو گیا - آصف اور فرحت نے بھی اُٹھنے میں دیر نہ لگائی -

"بیٹھے رہو - ابھی تم ان سے نہیں مل سکتے۔"

"جی - وہ کیوں؟"

"میں نے کہا نا - ابھی ہمیں خود کو بالکل الگ تھلگ رکھنا
ہے - عام مسافروں کی صورت میں غیر محسوس طور پر حالات
کا جائزہ لینا ہے۔"

"آپ نے اب تک یہ بھی نہیں بتایا کہ آپ کو کیا نظر
آیا تھا؟"

"مجھے ایک جانی پہچانی سی صورت نظر آئی تھی - ابھی
تک میں اس کے بارے میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا - کہ
وہ کون ہے - بہرحال اس کا بھی جائزہ لوں گا - تم فکر

نہ کرد۔ اس کے جسم پر نیلے رنگ کا لباس تھا۔ لمبے قد
کا آدمی۔ تم نے بھی اسے دیکھا ہوگا۔"

"ہم نے توجہ نہیں دی، کیوں کہ نہ تو لمبے قد کا ہونا
عجیب بات ہے اور نہ نیلا لباس۔" آصف نے جواب دیا۔

"ہاں! تمھاری بات ٹھیک ہے۔ میں نے بھی نہ تو اس
کے قد کو اہمیت دی اور نہ لباس کو۔ بلکہ میں نے تو
صرف اس کے چہرے کے نقوش دیکھے تھے۔"

"اور آپ کو ابھی تک یاد نہیں آسکا۔ کہ وہ کون ہے۔"

"بالکل نہیں۔"

"اس کا مطلب ہے۔ جہاز پر حالات پُر اسرار ہیں۔"
فرحت بڑبڑائی۔

"ہاں! یہ اندازہ تو ہو چکا ہے۔ کھانے کا زہریلا ہونا،
شوکی برادرز کا جہاز پر موجود ہونا۔ اور اس لمبے آدمی کا
جانا پہچانا لگنا۔ یہ سب باتیں کسی طوفان کی آمد کا پتا دے
رہی ہیں۔" انھوں نے بڑبڑانے کے انداز میں کہا۔

"جہاز میں یا سمندر میں۔" آفتاب نے فوراً کہا۔

"کیا چیز؟" وہ بے خیالی کے عالم میں بولے۔

"طوفان۔"

"اس جہاز میں۔ سمندر میں تو طوفان آتے ہی رہتے ہیں۔"

انھوں نے بُرا سا منہ بنایا۔

"کوئی بات نہیں۔ اگر اس جہاز میں طوفان آیا تو ہم سمندر
میں اُتر جائیں گے۔" آفتاب نے بے فکری کے عالم میں کہا۔

"ہاں! سمندر میں تو تمھارے لیے ریسٹ ہاؤس بنا ہوا
ہے نا۔" فرحت جل کر بولی۔

"اتنا بھی نہیں معلوم۔ جزیرے قدرتی ریسٹ ہاؤس ہی
تو ہوتے ہیں۔" اس نے شوخ آواز نکالی۔

"لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہاتھ پیر شل ہونے سے پہلے
کوئی جزیرہ نظر آ ہی جائے۔" آصف بولا۔

"بس۔ تم میں یہ بات ہے۔ ایک لفظ منہ سے کیا نکلا۔
اس کی کھال اتارنے لگے۔" انسپکٹر کامران مرزا تلملا اٹھے۔

"یہی تو ہماری کاری گری ہے ابا جان۔" آفتاب مسکرایا۔

"سنو، اگر میں کسی وقت اچانک غائب ہو جاؤں۔ تو
پروا نہ کرنا۔" انھوں نے دبی آواز میں کہا۔

"جی۔ کیا مطلب۔ کیا آپ غائب ہونے کا پروگرام
بنا چکے ہیں۔"

"اس کا امکان ہے، لیکن یہ ضروری نہیں کہ ضرور غائب
ہوں۔"

"اللہ تعالیٰ آپ کے غائب ہونے کی نوبت نہ لائے آمین۔"

آفتاب بولا۔

"اچھا۔ میں ذرا ایک بار پھر باہر کا جائزہ لے آؤں، لیکن نہیں۔ مجھے اپنے حلیے میں اب کچھ اور تبدیلی کرلینی چاہیے۔"

وہ میک اپ میں مصروف ہوگئے، پھر جوں ہی فارغ ہو کر اٹھے۔ ان کے کانوں سے فائر کی آواز ٹکرائی۔

"ارے۔ یہ کیا!!" وہ ایک ساتھ بولے اور پھر انسپکٹر کامران مرزا نے باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔

آواز عرشے کی طرف سے آئی تھی۔

○

"اُف اللہ! یہ تو گیا۔" کپتان شومی نے کانپتی آواز میں کہا۔

"اسی طرح تم سب لوگوں کو نشانہ بنایا جا سکتا ہے۔ خوراک بھی ہمارے قبضے میں ہے۔۔ اب تم لوگ غور کر سکتے ہو۔ صورتِ حال کیا ہے۔ ان حالات میں اگر تم ہماری ہدایات پر عمل کرو گے تو تمھاری زندگیوں کی ضمانت دی جا سکتی ہے۔ بصورتِ دیگر ہمارے لیے موت کے گھاٹ اُتار دینا بہت آسان ہے۔"

وہ سکتے کے عالم میں لاش کو دیکھتے رہے۔ ایسے میں

شوکی بڑبڑایا:

"جہاز پر قتل۔"

"بلکہ پہلا قتل۔" آفتاب نے منہ بنایا۔

"میں تم لوگوں کو سوچنے کے لیے ایک گھنٹا دے چکا ہوں۔ اس لاش کو اٹھا کر سمندر میں پھینک دو۔" اس نے کہا۔ اور ساتھ ہی بہت سے دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی۔ انھوں نے چاروں طرف دیکھا۔ عملے کے لوگ اور مسافر دوڑ دوڑ کر عرشے پر آ رہے تھے۔ فائر کی آواز نے ان سب کو بوکھلانے پر مجبور کر دیا تھا۔ مسافروں کے چہروں پر تو کچھ زیادہ ہی خوف و ہراس نظر آیا۔ عملے کے لوگ بھی حد درجے پریشان تھے، کیوں کہ مرنے والا بھی عملے کا آدمی تھا۔

"اسے کس نے مارا ہے۔ اور کیوں؟" عملے کے لوگ ایک ساتھ چلائے۔

"ہم ایک ہولناک صورتِ حال سے دوچار ہیں دوستو۔ پُرسکون رہ کر سُننے کی ضرورت ہے۔" کپتان شومی نے بلند آواز میں کہا۔

"کیا مطلب؟" وہ چلا اُٹھے۔

کپتان انھیں مختصر طور پر حالات سنانے لگا۔ آخر اس کے خاموش ہونے پر مجمع چلا اُٹھا:

"کہاں ہے ان کا باس۔ ہم ابھی اس کی تِکّا بوٹی کر دیں گے۔ یہ لوگ ہیں ہی کتنے۔ مسافروں سمیت ہم سَو کے قریب ہیں۔ جب کہ یہ لوگ بیس تیس ہوں گے۔" ایک بلے چوڑے آدمی نے پُر جوش انداز میں کہا۔

فوراً ایک فائر ہوا۔ گولی پُر جوش آدمی کے سینے میں لگی، اس کی چیخ نے پورے جہاز کو تھرا دیا۔ اس کے سینے سے خون کا فوارا اُبل پڑا۔ اور وُہ گر کر تڑپنے لگا:

"دد۔ دوسرا قتل۔" شوکی ہکلایا۔

"دیکھا آپ لوگوں نے۔ اللہ کے لیے صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ یہ لوگ اسلحے سے پوری طرح لیس ہیں۔ اور ایسی جگہوں پر دبکے بیٹھے ہیں۔ جہاں سے ہم پر بہت آسانی سے فائرنگ کر سکتے ہیں، لیکن ہم انھیں زد میں نہیں لے سکتے۔ شاید ان جگہوں کا انتخاب انھوں نے پہلے ہی کر لیا تھا۔" کپتان نے جلدی جلدی کہا۔

"لوگو دوڑو۔ اپنے اپنے کیبن میں گھس جاؤ۔ یہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔" کسی نے چلّا کر کہا۔

ان الفاظ کے ساتھ ہی بھگدڑ مچ گئی۔ اور تھوڑی دیر بعد وہاں کپتان شومی، امیر رانا، ظاہر میاں اور شوکی برادرز کے علاوہ کوئی نہیں رہ گیا تھا۔

"ارے۔ مسٹر ٹومین کہاں چلے گئے۔" کپتان کے منہ سے حیرت زدہ انداز میں نکلا۔

انھوں نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں، لیکن ٹومین کہیں بھی نظر نہیں آیا۔ اچانک اس کی آواز سُنائی دی:

"میں بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ موجود ہوں۔ یہ لوگ کس قدر بے وقوف ہیں۔ اپنے کیبنوں میں بھوکے کب تک رہیں گے۔ آخر انھیں کیبنوں سے نکلنا ہو گا۔ خیر ہمیں ان کے نکلنے یا نہ نکلنے سے غرض نہیں۔ ان سے ہم خود نبٹ لیں گے، کپتان شومی، آپ بتایئے۔ آپ کا کیا فیصلہ ہے۔"

"آپ ہمیں ایک گھنٹے کی مہلت دے چکے ہیں۔" کپتان شومی بولا۔

"ہاں! یہ ٹھیک ہے۔"

"تب پھر ایک گھنٹے بعد ہم جواب دے سکیں گے۔"

"ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن اتنا سن لیں۔ اگر آپ نے پُر سکون انداز میں جہاز کا نظام ہمارے حوالے کر دیا تو آپ سب لوگوں کی زندگیوں کی ضمانت دی جائے گی اور آپ لوگ زندہ رہیں گے۔" ٹومین بولا۔

"ٹھیک ہے۔ ہم ابھی مشورہ شروع کرتے ہیں۔"

ٹومین کی آواز مستول کے اوپر سے آ رہی تھی۔ گویا وُہ

وہاں دبکا ہوا تھا۔ وہ لوگ پھر اسی کمرے میں آ بیٹھے۔

"ہاں ساتھیو۔ اپنی اپنی رائے دو۔"

"میرا خیال ہے کہ یہ لوگ ہمیں بلاوجہ ڈرا رہے ہیں۔" امیر رانا نے کہا۔

"وہ دو آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار چکے ہیں، کیا تم یہ بات بھول گئے۔" کپتان شومی نے منہ بنایا۔

"اگر ہم سب مل کر ان پر ٹوٹ پڑیں تو وہ ہمارے چند آدمیوں کو ہلاک کر سکیں گے۔ اس کے بعد ہماری قید میں ہوں گے اور اس طرح ہم اپنے ملک کو تباہی سے بچا سکتے ہیں۔" شوکی بولا۔

"چند آدمی نہیں۔ بہت آدمی ہلاک ہوں گے۔ یہ بات وہ بھی جانتے ہیں کہ اگر انھیں شکست ہوگئی تو ہم سب مل کر ان کی بوٹیاں اڑا دیں گے۔" اخلاق نے فوراً کہا۔

"لہٰذا ہم بھی ان سے کسی نرمی کی امید نہیں رکھ سکتے۔" اشفاق نے فوراً کہا۔

"یہ ایک جوا ہوگا۔ اس جوئے میں بہت سے آدمی مر سکتے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم میں سے ایک بھی نہ مرے اور اس کا بھی امکان ہے کہ بے شمار لوگ مارے جائیں۔ دوسری طرف ان حالات میں ہم کب تک رہ سکیں گے۔ بھوک اور پیاس

ہمیں ان کا ہر حکم ماننے پر مجبور کر دے گی۔"

"تو پھر۔ کیا آپ کا مشورہ یہ ہے کہ جہاز ان کے کنٹرول میں دے دیا جائے۔" امیر رانا نے بوکھلا کر کہا۔

"ہاں! اس طرح یہ لوگ ہماری نگرانی کرنے کے چکر میں پڑ جائیں گے اور ہم کوئی موقع پا کر ان پر ٹوٹ پڑیں گے۔"

"لیکن اس وقت تک یہ جہاز کو نہ جانے کس سمت میں لے جائیں۔" امیر رانا نے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ ہم پھر سے اسے درست سمت پر لگا لیں گے۔" کپتان شومی بولا۔

"کم از کم میں تو جہاز کا کنٹرول ان کے ہاتھ میں دینے کی رائے نہیں دے سکتا۔" امیر رانا نے کہا۔

"اس پہلو پر بھی غور کر لیتے ہیں، فرض کیا، ہم جہاز کا کنٹرول ان کے ہاتھ میں نہیں دیتے۔ اور لڑائی بھڑائی پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اس صورت میں ہم پر تڑا تڑ گولیاں برسیں گی۔ اور ہم خوف زدہ ہو کر ان کی شرائط مان لیں گے، تو پھر کیا اس سے یہ بہتر نہیں کہ ہم پہلے ہی جہاز ان کے کنٹرول میں دے دیں۔ اس طرح ہمارے بہت سے ساتھی مرنے سے بچ جائیں گے۔"

"میرے خیال میں یہ رائے بہت مناسب ہے۔" شوکی نے

کہا۔

"مسٹر شوکی۔ اب میں سوچ رہا ہوں۔ میں آپ لوگوں کو بھی فضول ہی لایا۔ آپ بھی بھلا ان حالات میں کیا کر سکتے ہیں۔"

"خیر جناب۔ آپ کو یہ تو نہیں کہنا چاہیے، کیوں کر اس وقت تک آپ مسافروں کو کھانا تو پیش کر چکے تھے۔ اور کھانا کھا کر ان کا کیا حال ہوتا۔ یہ آپ سوچ ہی سکتے ہیں۔" آفتاب نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

"ہاں! آپ لوگوں کا یہ کارنامہ واقعی قابلِ تعریف ہے، لیکن ان حالات میں اور آپ کیا کر سکیں گے؟"

"یہ تو وقت بتائے گا جناب۔ ہم کیا کر سکتے ہیں اور کیا نہیں۔ کیا خبر ہم اس ٹائم بم کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ اور اسے بے کار کر دیں۔ اس صورت میں ہم سب مل کر ان پر حملہ آور ہو سکتے ہیں۔" شوکی نے جلدی جلدی کہا۔

"خیر۔ اب تو آپ آ ہی گئے ہیں۔" کپتان شومی بولا۔

"اگر آپ کو ہماری یہاں موجودگی اب پریشان کر رہی ہے تو ہم واپس چلے جاتے ہیں۔" آفتاب نے فوراً کہا۔

"دماغ تو نہیں چل گیا۔ ہم اس وقت سمندر میں ہیں۔" اشفاق نے منہ بنایا۔

"اوہ۔ واقعی۔ یہ بات تو میں بھول ہی گیا تھا۔ پھر تو مشکل ہے جناب۔ ہمیں جہاز پر ہی ٹھہرنا ہوگا۔" وہ جلدی سے بولا۔

"شوق سے رہیے۔ کاش آپ کوئی کام دکھا سکیں۔"

"اللہ سے دُعا کریں۔" اخلاق نے کہا۔

ایک گھنٹے بعد وہ باہر نکلے اور کپتان شومی نے اعلان کرنے والے انداز میں کہا:

"مسٹر ٹومین۔ ہم جہاز آپ کے حوالے کرنے کے لیے تیار ہیں۔"

"بہت خوب۔ اس کا مطلب ہے۔ تم لوگوں کو عقل آ گئی۔"

"جی نہیں۔ وُہ تو ہمارے پاس پہلے سے موجود ہے۔" آفتاب نے بلند آواز میں کہا۔

"نوٹنگ۔ جہاز کا کنٹرول سنبھال لو۔ انجن کے اندر بند ہو کر بیٹھ جاؤ۔ اب میری اجازت کے بغیر نہ تم باہر نکلو گے اور نہ کسی کو اندر داخل ہونے کی اجازت دو گے، تم ابھی اور اسی وقت جہاز کا رُخ تبدیل کر دو۔"

"او کے سر۔" ایک آواز فضا میں اُبھری۔ اور پھر دھم کی آواز آئی۔ ایک مستول پر سے۔ سیاہ رنگ کے ایک شخص نے چھلانگ لگائی تھی۔ دوسرے ہی لمحے وُہ انجن روم کی طرف چلا گیا۔ انھوں نے دروازہ بند ہونے کی آواز سُنی۔

"ایک مرحلہ تو سر ہوا۔ اب آپ سب لوگ اپنے اپنے ہتھیار پھینک دیں۔ اس کے بعد میرے آدمی مسافروں اور عملے کے دوسرے لوگوں سے ہتھیار خود بخود لے لیں گے۔"

کپتان اور نائب کپتان نے اپنے پستول نکال کر عرشے پر پھینک دیے۔ ایک اور دھم کی آواز آئی اور ایک نیلے لباس والے نے ان کے پستول سمیٹ لیے۔

"ان کی تلاشی بھی لے لو۔ کہیں کسی نے اپنے پاس کوئی ہتھیار رکھ نہ لیا ہو۔ خاص طور پر ان چاروں لڑکوں کی تلاشی لینا۔ یہ بہت شیطان ہیں۔"

"ہمارے پاس پستولوں کا کیا کام جناب۔ پستول تو ہمارے لیے بالکل بے کار چیز ہیں۔" آفتاب نے بُرا سا منہ بنایا۔

"وہ کیسے؟"

"ایسے کہ ہمیں پستول چلانے کا فن نہیں آتا۔"

"ارے تو سیکھ لیتے۔" ٹومین ہنسا۔

"جب بھی چلانے کی کوشش کی، پستول ہاتھ سے نکل گیا۔ اور ہم پیچھے کی طرف گر پڑے۔" اشفاق بولا۔

ٹومین کی ہنسی کی آواز اُبھری۔ اس کا ساتھی ان کی تلاشی لینے لگا، پھر دس آدمی عرشے پر کودے۔

"ایک ایک کیبن میں جاؤ۔ سب کی تلاشی لو۔ کیبنوں

کی بھی تلاشی لو۔ دیکھو کسی کے پاس کوئی ہتھیار نہ رہ جائے، پھر ہم سب لوگوں کو اوپر بلائیں گے اور میں ان کے سامنے تقریر کروں گا۔"

"او کے سر۔ آپ فکر نہ کریں۔ جوں ہی ہم نے اپنا کام مکمل کیا۔ ہم آپ کو اطلاع دے دیں گے اور ان سب کو اوپر بھی لے آئیں گے۔"

"بہت خوب!" اس نے کہا، اب وہ بھی ان کے سامنے کھڑا تھا۔ ان پر ایک نظر ڈالتے ہوئے بولا:

"آپ لوگ بھی اپنے اپنے کیبن میں جائیے۔ اب یہاں آپ کی ضرورت نہیں۔"

"بہت بہتر۔" کپتان شومی نے کہا اور وہ تھکے تھکے قدموں سے اپنے کیبنوں کی طرف چل پڑے۔

"ایسا لگتا ہے جیسے ایک فوج نے دوسری فوج کے سامنے ہتھیار ڈالے ہوں۔ مسٹر شومی۔ کیا آپ کی زندگی میں پہلے بھی کبھی ایسا موقع آیا؟" شوکی بولا۔

"نہیں۔ پہلا موقع ہے۔" اس نے کہا۔

"تب تو آپ کو مبارک ہو۔" آفتاب نے خوش ہو کر کہا۔

"گگ۔ کہیں آپ کا دماغ تو نہیں چل گیا۔" شومی نے

گھبرا کر کہا۔

"جی نہیں۔ ابھی نہیں چلا۔ جب بھی چلا بتا دوں گا۔ یہ اور بات ہے کہ دماغ کے چلنے کا مجھے خود پتا نہ چلے۔ اس صورت میں میں آپ کی کوئی خدمت نہیں کر سکوں گا۔" آفتاب نے جلدی جلدی کہا۔

کپتان شومی وغیرہ نے اسے واقعی ایسی نظروں سے دیکھا جیسے اس کا دماغ چل جانے کا یقین ہو چلا ہو۔ پھر وہ اپنے اپنے کیبن میں گھس گئے۔

"دروازہ اندر سے بند کر دو۔" شوکی نے سرگوشی کی۔

"کیوں۔ اب کیا بات رہ گئی ہے۔ جو آپ کرنا چاہتے ہیں۔"

"باتیں بہت ہیں۔ اور دیواروں کے کان ہوتے ہیں۔" وہ بولا۔

"اچھی بات ہے۔ آپ کہتے ہیں تو بند کر دیتا ہوں۔ ویسے بند کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" آفتاب نے کہا۔ اور دروازہ بند کر دیا۔

"لے دے کے۔ اب اس جہاز کو بچانا اور سارے سونے کو اپنے ملک واپس پہنچانا۔ ہماری ذمے داری رہ گئی ہے۔" شوکی نے سرگوشی کی۔

"وہ کیسے۔ کیا جہاز پر بس ہم ہی رہ گئے ہیں۔" اخلاق نے منہ بنایا۔

"نہیں۔ یہ بات نہیں۔ باقی تمام لوگوں میں کچھ کرنے کی ہمت کہاں۔ ہاں امیر رانا اور کپتان شومی وغیرہ شاید ضرورت پڑنے پر ہمارے کام آ سکیں۔"

"آخر آپ کرنا کیا چاہتے ہیں؟"

"کان نزدیک لے آؤ۔ ترکیب میرے ذہن میں آگئی ہے۔"

تینوں اپنے کان نزدیک لے آئے۔ اور شوکی دبی آواز میں انھیں بتانے لگا، جب وہ خاموش ہوا۔ تو ان کے چہرے امید کی روشنی سے چمک رہے تھے۔ تاہم اشفاق بولا:

"لیکن۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ شک میں مبتلا ہو سکتا ہے۔"

"نہیں ہو گا۔ لو سنو۔ میں بات کر کے دکھاتا ہوں۔" یہ کہہ کر شوکی نے ایک جملہ کہا اور وہ حیران رہ گئے۔

"میرا خیال ہے۔ بات بن جائے گی۔" آفتاب نے مطمئن ہو کر کہا۔

"تو پھر جاؤ۔ کپتان شومی کو بلا لاؤ۔"

آفتاب باہر نکلا اور ساتھ والے کیبن کے دروازے پر دستک دی:

"کون ہے؟" اندر سے خوف زدہ آواز میں پوچھا گیا۔

"یہ میں ہوں شومی صاحب۔ شوکی کا بھائی۔ آفتاب۔"

"اب کیا ہے؟"

"ایک بہت ضروری بات ہے۔ جلد دروازہ کھولیے۔" آفتاب نے کہا۔

کپتان شومی نے دروازہ کھول دیا۔ اور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا:

"ذرا ہمارے کیبن میں آجائیے۔"

"کیوں۔ خیر تو ہے۔"

"ہم نے کچھ کام دکھانے کا پروگرام بنایا ہے۔"

"او ہو اچھا۔ کیا واقعی۔" کپتان شومی کے لہجے میں حیرت تھی۔

"بس دیکھتے جائیے۔"

کپتان شومی نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ تلاشی لینے والے ابھی ادھر نہیں آئے تھے۔ نہ ہی برآمدے میں کوئی نگران تھا۔ وہ آفتاب کے ساتھ ان کے کیبن میں داخل ہو گیا۔ اور دروازہ اندر سے بند کرتے ہوئے بولا:

"ہاں! اب بتاؤ۔ کیا بات ہے؟"

شوکی اسے اپنا پروگرام بتانے لگا۔ آخر کپتان شومی

نے کہا:

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"ایسے۔" شوکی نے کہا اور پھر ایک جملہ بولا۔ جملہ سُن کر کپتان شومی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں ـــــ

نوٹ بک

وہ دبے پاؤں باہر نکلے۔ امیر رانا کو ساتھ لیا اور انجن روم
کی طرف آئے۔ انجن روم کے اندر نوٹنگ موجود تھا۔ اندر
روشنی بھی ہو رہی تھی، لیکن انجن روم کے باہر اندھیرا تھا۔
شوکی نے اپنے حلق سے آواز نکالی:

"نوٹنگ جلدی دروازہ کھولو۔"

آواز بالکل ٹومیز کی آواز جیسی تھی۔ جملہ ادا کرنے کے
بعد شوکی نے دم سادھ لیا، باقی لوگ بھی بتوں کی طرح
کھڑے رہے، آخر دروازہ کھل گیا۔ کپتان شومی اور امیر رانا
تیار کھڑے تھے۔ انھوں نے فوری طور پر اسے آگے کی
طرف جھٹکا دیا۔ وہ منہ کے بل گرا، اس سے پہلے کہ اس
کے منہ سے کوئی آواز نکل سکتی۔ کپتان نے اس کی کمر پر
بیٹھتے ہی دونوں ہاتھوں سے منہ دبا لیا۔ امیر رانا نے اس
کے سر پر تین چار زور دار ٹھوکریں رسید کیں۔ فوراً ہی اس

کے ہاتھ پیر ٹھنڈے پڑ گئے۔

"جلدی کرو رانا، اسے باندھ لو۔ منہ میں بھی کپڑا ٹھونس
دینا۔"

"اور باندھنے کے بعد؟" شوکی نے سوالیہ انداز میں کہا۔

"باندھنے کے بعد ہم اسے انجن روم میں ڈال دیں گے۔"

"جی نہیں۔ میرا پروگرام اس سے مختلف ہے۔ آپ اس
کے کپڑے پہن لیں۔ تاکہ دور سے آپ نوٹنگ ہی نظر آئیں۔
اور انجن روم اندر سے بند رکھیں۔ آپ ہم میں سے کسی کی
آواز سن کر بھی دروازہ نہیں کھولیں گے۔ بس صرف اور صرف
جہاز کو اپنے ملک کی طرف لے جانے سے کام رکھیں گے،
انجن روم سے باہر چاہے کچھ ہو جائے۔ چاہے ہم سب کو
ختم کر دیا جائے۔ آپ انجن روم سے نہیں نکلیں گے۔"

"اور اس کا کیا کرنا ہے؟" امیر رانا نے نوٹنگ کی
طرف اشارہ کیا۔

"یہ مچھلیوں کی خوراک بنے گا۔ آپ نے ابھی تک اپنا کام
شروع نہیں کیا۔" شوکی نے ناخوش گوار لہجے میں کہا۔

"ابھی کرتا ہوں۔" امیر رانا نے کہا اور انجن روم سے
رسی لے کر اسے باندھنے لگا۔ اس کے منہ میں کپڑا بھی ٹھونسا
گیا۔ تاکہ وہ سمندر میں گرتے وقت چیخ و پکار نہ کر سکے۔

"آئیے۔ پہلے اس کا کانٹا تو نکال دیں۔"

"آخر اسے سمندر میں پھینکنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ بھی تو بہت سے دشمن جہاز پر موجود ہیں۔" کپتان شومی نے کہا۔

"ان میں سے کوئی جہاز چلانا نہیں جانتا۔ اس کی موت کے بعد یہ لوگ بنگال پہنچنے کا خیال دلوں سے نکال دیں گے، لیکن جب تک یہ زندہ ہے۔ اس بات کا امکان ہے کہ کہیں وہ کامیاب نہ ہو جائیں۔" شوکی جلدی جلدی بولا۔

"ہوں! بات ٹھیک ہے۔ چلو بھئی امیر رانا۔ پھینک دو اسے۔"

امیر رانا نے اسے کندھے پر اٹھایا اور ریلنگ کی طرف چلا۔ وہ دم سادھے اپنی جگہ کھڑے رہے۔ عین اسی وقت قدموں کی آواز سنائی دی۔ امیر رانا گھبرا گیا۔ جلدی سے گھوم کر دیکھا تو ایک نیلے لباس والا ہاتھ میں رائفل اٹھائے چلا آ رہا تھا۔ اب تک تو پستول بردار نیلے لباس والے نظر آتے رہے تھے۔ یہ شخص رائفل اٹھائے ہوئے تھا۔ گویا ان کے پاس رائفلیں بھی تھیں۔

"خبردار۔ تم نے کندھے پر جو کچھ اٹھا رکھا ہے۔ اسے نیچے رکھ دو اور ہاتھ اوپر اٹھا کر کھڑے ہو جاؤ۔"

وہ ساکت رہ گئے۔ جیتی جتائی بازی کٹھائی میں پڑ چلی

تھی۔ امیر رانا نے بے چارگی کے عالم میں نیلے لباس والے کو دیکھا اور پھر بے ہوش نوٹنگ کو نیچے گرا کر ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔

"تم نے جو چیز نیچے گرائی ہے۔ اس سے دس قدم دور ہٹ جاؤ۔" اس نے حکم دیا۔

امیر رانا انجن کے مخالف سمت میں قدم اٹھاتا چلا گیا۔ اس کی کوشش یہ تھی کہ نیلے لباس والے کی نظر اس کے ساتھیوں پر نہ پڑے۔ اب نیلے لباس والا نیچے پڑے نوٹنگ کی طرف بڑھا، پھر جوں ہی اس نے جھک کر اسے دیکھا۔ چونک کر سیدھا ہو گیا:

"اوہو! یہ تو نوٹنگ ہے۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی اس نے انجن روم کی طرف دیکھا، لیکن انجن روم میں اسے کوئی بھی نظر نہیں آیا۔ نہ ہی دروازے کے باہر کوئی کھڑا نظر آیا۔ اسی وقت اسے ایک زوردار دھکا لگا۔ امیر رانا نے اس کا منہ انجن روم کی طرف دیکھ کر اس کی طرف چھلانگ لگائی تھی۔ دھکا اس قدر زوردار تھا کہ وہ منہ کے بل گرا اور رائفل اس کے ہاتھ سے نکل گئی اور پھسل کر انجن روم کے دروازے کے پاس آ گری۔ اس جگہ شوکی وغیرہ تختوں کے ساتھ چپکے ہوئے تھے۔

" مسٹر شوکی۔ رائفل اٹھا لیجیے۔" شوکی نے جلدی سے کہا، لیکن شومی کی طرف سے کوئی آواز سنائی نہ دی۔ تو اس نے گھبرا کر پیچھے دیکھا۔ وہاں شومی نہیں تھا۔ انجن روم کا دروازہ بند نظر آیا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ نیلے لباس والے کو دیکھتے ہی وہ انجن روم میں رینگ گیا تھا۔

ادھر امیر رانا اور نیلے لباس والا گتھم گتھا ہو رہے تھے، شوکی نے ڈرتے ڈرتے رائفل اٹھا لی۔ اسی وقت امیر رانا دبی آواز میں بولا:

" آپ لوگ کہاں ہیں۔ یہ مجھ سے بہت طاقت ور ہے۔ م۔ یں۔ یں گیا۔" اس کے حلق سے گھٹی گھٹی آواز نکلی تھی۔ چاروں بوکھلا گئے، پھر وہ جلدی سے آگے بڑھے۔ اب انہوں نے دیکھا۔ امیر رانا نیلے لباس والے کے نیچے دبا ہوا تھا اور وہ اس کے سینے پر چڑھا اس کا گلا گھونٹ رہا تھا۔ شوکی کو اور تو کچھ نہ سوجھا۔ رائفل کو نالی کی طرف سے پکڑ کر بٹ اس کے سر پر زور سے دے مارا۔ امیر رانا کے گلے پر سے اس کے ہاتھ فوراً اٹھ گئے اور اپنے سر کی طرف بڑھے، پھر وہ دوسری طرف الٹ گیا۔ امیر رانا نے جلدی سے رائفل شوکی کے ہاتھ سے لے لی اور نالی اس کے سینے پر رکھ دی، پھر دبی آواز میں بولا:

" خبردار۔ حلق سے آواز نہ نکلے۔ ورنہ جان سے جاؤ گے۔" لیکن اس کے جسم میں تو حرکت بھی نہیں ہوئی۔ شاید وہ بے ہوش ہو گیا تھا:

" مسٹر شوکی۔ کپتان شومی کہاں چلے گئے؟"

" بالکل ٹھیک جگہ پر۔ یعنی انجن روم میں۔"

" اوہ ٹھیک ہے۔ انہیں سب سے پہلے یہی کام کرنا چاہیے تھا۔ اب جہاز کا رخ ہمارے ملک کی طرف ہو جائے گا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہو گی اور ہم صبح ہونے سے پہلے ساحل سے جا لگیں گے۔" امیر رانا نے پر جوش آواز میں کہا، پھر ان پر نظر ڈال کر مسکراتے ہوئے بولا:

" اور یہ کارنامہ آپ کا ہے شوکی برادران۔ صرف آپ لوگوں کا۔ خیر۔ ایک کام اور کریں۔ میں اس کے پاس سے نہیں ہٹ سکتا۔ آپ مل کر نوٹنگ کو سمندر میں پھینک دیں۔"

عین اسی وقت ایک چھپاکا ہوا۔ وہ بوکھلا اٹھے:

" ارے! یہ سمندر میں کیا چیز گری ہے۔" امیر رانا نے حیرت زدہ آواز میں کہا۔

ان کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکل سکا۔ ان کی نظریں اس جگہ پر پڑیں۔ جہاں امیر رانا نے نوٹنگ کو گرایا تھا۔ لیکن وہ اب وہاں نہیں تھا۔

"ہائیں ۔ نوٹنگ کہاں گیا۔" امیر رانا کے منہ سے نکلا۔

"جا کہاں سکتا ہے ۔ وہ تو بندھا ہوا تھا ۔ شاید کپتان شومی نے ہی اسے اٹھا کر پھینکا ہے۔"

"لیکن کپتان صاحب تو انجن روم میں موجود ہیں۔"

"تب پھر۔" امیر رانا نے کانپ کر کہا۔

"شاید ۔ کوئی غیبی طاقت ہماری مدد کر رہی ہے۔"

وہ انجن روم کے دروازے پر آئے ۔ امیر رانا نے دروازے سے منہ لگا کر دبی آواز میں کہا:

"مسٹر شومی ۔ کیا نوٹنگ کو آپ نے سمندر میں پھینکا ہے۔"

"نہیں ۔ میں تو انجن سے نکلا ہی نہیں۔" اس کی پریشان آواز سنائی دی۔

"تب پھر اسے کس نے پھینکا ۔ یا وہ کہاں گیا۔"

"میرا خیال ہے ۔ ہمیں نوٹنگ کی بجائے ۔ پہلے نیلے لباس والے کا بندوبست کر لینا چاہیے۔" شوکی بولا۔

"اوہ ہاں ۔ آؤ۔"

وہ جلدی سے پھر نیلے لباس والے کے پاس آئے ۔ اس کے جسم میں حرکت ہو چلی تھی ۔ امیر رانا نے ایک بٹ اس کے اوپر رسید کیا اور پھر کندھے پر اٹھا کر ریلنگ کی طرف چلا ۔ دوسرے ہی لمحے ایک اور چھپاکا ہوا ۔ اسے

گرا کر وہ مڑا:

"یہ مرحلہ تو طے ہوا ۔ کاش ہم پہلے ہی عرشے کا جائزہ لے لیتے ۔ نہ جانے یہ کہاں دبکا ہوا تھا ۔ اس کا مطلب ہے ۔ نیلے لباس والے مختلف جگہوں پر دبکے ہوئے ہیں؛ خیر ۔ اب ہمیں ان کی کیا پروا ۔ ہم ساحل پر پہنچ کر حکام کو اطلاع دے دیں گے ۔ اور ان لوگوں سے نبٹ لیا جائے گا۔"

"لیکن نوٹنگ کہاں گیا۔" اخلاق ابھی تک حیرت زدہ تھا۔

"شاید ہمارے فرشتوں نے اسے اٹھا کر پھینک دیا ہے۔" آفتاب مسکرایا۔

اسی وقت انجن روم کا دروازہ کھلا ۔ انھوں نے دیکھا۔ کپتان شومی کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں ۔

"خ ۔ خیر تو ہے کیپٹن صاحب۔" اخلاق بے چین ہو گیا ۔

"وہ ۔ وہ ۔ وہ ۔" کپتان شومی ہکلا کر رہ گیا۔

"جی ہاں! یہاں تک تو ہم سمجھ گئے ہیں ۔ 'وہ' سے آگے کہیے۔" آفتاب نے بے چارگی کے عالم میں تینوں کی طرف دیکھا۔

"اور یہ آپ کے ہاتھ میں کیا ہے؟"

"چمڑے کی جلد والی ایک نوٹ بک ۔ اس میں ہمارے

ملک کی فوجی معلومات درج ہیں۔ غالباً یہ بھی اس غدار جماعت
نے کسی بڑے عہدے دار نے جہاز پر پہنچائی ہو گی۔ اور
ٹوٹنگ کے پاس ہو گی۔ ٹوٹنگ نے اسے جیب سے نکال کر
انجن روم میں رکھ دیا ہو گا، کیوں کہ اس کے خیال میں تو
اب انجن روم کی طرف ٹوبین کے علاوہ کسی کو آنا ہی نہیں تھا۔"

"ہوں ۔ لائیے ۔ یہ نوٹ بک مجھے دے دیجیے۔" شوکی جلدی
سے بولا۔

"آپ کو کیوں دے دوں؟" کپتان شومی بولا۔

"اس لیے کہ اس کی حفاظت بہت ضروری ہے۔ کہیں یہ
پھر نیلے لباس والوں کے ہاتھ نہ لگ جائے۔ ابھی ہم پوری
طرح خطرات میں گھرے ہوئے ہیں۔"

"ہوں۔ ٹھیک ہے۔ آپ لوگ بھی وطن کے سچے ہمدرد ہیں۔
لیجیے آپ ہی رکھ لیجیے۔" کپتان شومی بولا۔

"لیکن بھائی جان۔ ہم اس نوٹ بک کو سمندر میں کیوں نہ
پھینک دیں۔ اس کا تلف کر دینا اچھا ہے۔"

"نہیں ۔ اس طرح ہم اس غدار کا سراغ نہیں لگا سکیں
گے۔ اس نوٹ بک کے ذریعے اسے بہت آسانی سے گرفتار
کیا جا سکے گا۔" شوکی بولا۔

"اوہ ہاں! یہ بھی ٹھیک ہے۔"

شوکی نے نوٹ بک اپنی جیب میں رکھ لی۔ وہ تھی ہی
جیبی سائز کی۔

"میں آپ لوگوں کو ایک ہولناک خبر سنائے بغیر نہیں رہ
سکتا۔" کپتان شومی نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"شکریہ۔ ضرور سنائیے۔" آفتاب نے مسکرا کر جواب دیا۔

"خبر یہ ہے کہ میں جہاز کو اپنے ملک کی طرف نہیں
لے جا سکتا۔"

"کک۔ کیا مطلب؟" وہ اچھل پڑے۔

"کیا آپ بھی نیلے لباس والوں کے ساتھی ہیں؟" اخلاق بولا۔

"نہیں۔ یہ بات نہیں۔ ٹوٹنگ نے انجن روم میں داخل
ہونے کے بعد دو کام کیے ہیں۔ ایک تو یہ کہ جہاز کا رُخ اپنے
ملک کی طرف کر دیا اور دوسرے یہ کہ سمت بتانے والا
آلہ بے کار کر دیا ہے۔ اسے توڑ دیا ہے۔"

"نہیں!!!" وہ دھک سے رہ گئے۔

"ہاں! اس وقت جہاز بیگال کی طرف جا رہا ہے۔ میرے
رُخ تبدیل کرنے کا مقصد یہ ہو گا کہ ہم بیگال نہیں جا
رہے۔ لیکن یہ مطلب نہیں ہو گا کہ اپنے ملک کی طرف
جا رہے ہیں۔ بلکہ ہم کسی نامعلوم منزل کی طرف جا نکلیں
گے۔ اور یہ بھی کچھ کم خوفناک بات نہیں ہو گی۔"

ان کے جسموں میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی ۔ وہ سوچ میں ڈوب گئے ۔ یہ لمحات ان کی زندگی کے عجیب ترین لمحات تھے ۔ آخر امیر رانا بولا :

"تب پھر ۔ اب کیا کریں ۔ ہم کیا کر سکتے ہیں۔"

"کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ۔ کم از کم سونے سے لدے اس جہاز کو بیگال کی طرف نہیں جانا چاہیے ۔ ملک کی دولت چاہے ملک واپس نہ پہنچ سکے ۔ دشمن بیگال کے ہاتھ نہیں لگنی چاہیے۔" شوکی نے جلدی جلدی کہا۔

"ہوں ۔ بات ٹھیک ہے ۔ تب پھر ہمیں کسی نامعلوم منزل کی طرف جانا ہو گا ۔ یہ بھی ہو سکتا ہے ۔ ہم کسی بھی منزل تک نہ پہنچ سکیں اور سمندر میں ہی بھٹک کر مر جائیں۔" کپتان شومی نے کہا۔

"چلیے ۔ یہ اس سے تو بہتر ہو گا ۔ کہ ہمارے ملک کا سونا بیگال کے کام نہیں آ سکا۔" اخلاق بولا۔

"ہوں ۔ تو پھر یوں ہی سہی ۔ میں رخ تبدیل کرنے لگا ہوں۔"

"آپ اندازے سے کوشش ضرور کیجیے گا کہ جہاز ملک کی طرف ہو جائے۔"

سمندر میں اندازوں سے کام نہیں چلتا ۔ تاہم میں اپنی کوشش

ضرور کروں گا۔" اس نے کہا اور انجن روم میں گھس گیا۔

"میں ابھی تک نہیں سمجھ سکا ۔ کہ نوٹ بک کو کس نے سمندر میں پھینکا۔" شوکی بڑبڑایا۔

"سمجھنے کی ضرورت ہی کیا ہے ۔ ہم اسے سمندر میں پھینکنا چاہتے تھے ۔ سو وہ سمندر میں گر گیا۔" آفتاب نے منہ بنایا۔

"پھر بھی ۔ ذہن میں سوال تو ۔ تو ۔ تو۔"

شوکی تو تو کر کے رہ گیا ، جملہ مکمل نہ کر سکا۔

"کیوں ۔ کیا ہوا ۔ خیر تو ہے۔" امیر رانا نے اسے گھورا۔

"خیر ۔ پتا نہیں ۔ نظر تو نہیں آتی۔" شوکی نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

"آپ ۔ کیا کہنا چاہتے ہیں۔"

"افسوس ! میں کچھ بھی نہیں کہنا چاہتا ۔ ایک منٹ میں ابھی آیا ۔ آپ لوگ یہیں ٹھہرے رہیں۔" اس نے کہا اور ریلنگ کے ساتھ ساتھ چل پڑا ۔ وہ تیزی سے چکر کاٹ رہا تھا ۔ ان سے کچھ دور جا کر اس نے اپنی اس جیب میں ہاتھ ڈالا جس میں نوٹ بک رکھی تھی ۔

لیکن نوٹ بک اب جیب میں نہیں تھی ۔ شوکی نے اس لمحے ایسی حیرت محسوس کی کہ کیا کبھی زندگی میں محسوس کی ہو گی ۔ تھوڑی دیر پہلے ہی تو اس نے نوٹ بک

جیب میں رکھی تھی۔ ابھی چند منٹ پہلے اس کا ہاتھ اچانک جیب سے جو لگا تو وہ خالی محسوس ہوئی۔ جیب کا جائزہ لینے کے لیے ہی وہ ان سے دُور ہٹ آیا تھا۔

"اُف اللہ! نوٹ بک کہاں گئی۔" اس کے منہ سے نکلا۔

ایک نال اور سہی

انسپکٹر کامران مرزا کیبن میں داخل ہوئے، پھر چونک کر بولے:

"ارے۔ آفتاب کہاں چلا گیا؟"

"آپ کی واپسی میں دیر ہو گئی تھی۔ اس سے رہا نہ گیا، ہمیں یہیں چھوڑ کر باہر نکل گیا۔"

"اوہ۔ جہاز پر حالات بہت ہی عجیب و غریب ہیں۔ میں سوچ رہا ہوں۔ اب ہمیں سامنے آنا ہی ہوگا۔"

"آپ کیا دیکھ کر آئے ہیں؟"

"جہاز پر دشمنوں کا قبضہ ہو چکا ہے۔ انجن روم میں اب ان کا کپتان بیٹھا ہے۔ اس نے جہاز کا رُخ تبدیل کر دیا ہے۔ میں نے جہاز کے باقی حصوں کا بھی سرسری انداز میں جائزہ لیا ہے۔ نیلے لباس والے ایسی جگہوں پر موجود ہیں کہ ضرورت پڑنے پر ہم لوگوں کو نشانہ بنا سکتے ہیں۔ گویا عملی طور پر جہاز ان کے ہی قبضے میں ہے۔"

" اوہ — اب کیا ہوگا ؟"

" ہمیں میدان میں کودنا ہوگا — اب ہم یہ تو جان ہی چکے ہیں کہ اس جہاز کو اغوا کرکے لے جایا جا رہا ہے — اب ہم مزید تماشا نہیں دیکھ سکتے — ورنہ ہم نہ جانے کہاں کے کہاں پہنچ جائیں گے ۔"

" ٹھیک ہے انکل — اب ہمیں کام شروع کر ہی دینا چاہیے ۔" فرحت نے پُرجوش انداز میں کہا ۔

" لیکن کام شروع کرنے سے پہلے آفتاب کا انتظار کرنا ہوگا ۔" آصف نے منہ بنایا ۔

" اس کی ضرورت نہیں ۔"

اسی وقت دروازہ کھلا — اور آفتاب کی صورت نظر آئی :

" جی ہاں ! میں ٹھہرا نکما آدمی ۔" اس نے بُرا سا منہ بنا کر کہا —

" اوہو — معلوم ہوتا ہے — کوئی کام دکھا آئے ہو ۔" انسپکٹر کامران مرزا نے اسے گھورا ۔

" آپ — آپ نے یہ کیسے جان لیا ۔" آفتاب کے لہجے میں حیرت تھی ۔

" چہرے پر چھائے ہوئے جوش کو دیکھ کر — جلدی بتاؤ — کیا دیکھ کر آ رہے ہو اور کیا کرکے ۔"

" میں شوکی برادرز کی جھلک دیکھ آیا ہوں ۔" آفتاب مسکرایا ۔

" ارے ۔" آصف اور فرحت کے منہ سے نکلا ۔

" ہاں ! وہ اس وقت میدانِ عمل میں ہیں — انھوں نے انجن روم پر پھر سے قبضہ کر لیا ہے — اور مزے کی بات یہ کہ نیلے لباس والے اس تبدیلی سے بے خبر ہیں ۔"

" اوہ — اوہ — انھوں نے یہ کیسے کیا ؟"

" اس طرح کہ شوکی نے اپنے منہ سے بدلی ہوئی آواز نکالی تھی — انجن روم کا دروازہ کھل گیا — اور کپتان شومی اور امیر رانا نے مل کر دشمن کو باہر گھسیٹ لیا — ان کے درمیان جنگ ہوئی ، آخر نئے کپتان کو باندھ لیا گیا — لیکن پھر ایک اور نیلے لباس والا آ نکلا — اس سے بھی ان لوگوں کو لڑنا پڑا — جہاز کے نائب کپتان نے اس سے مقابلہ کیا — شوکی برادرز نے مدد کی — اس طرح وہ اسے گرانے میں کامیاب ہوئے — ادھر کپتان شومی کے ہاتھ ایک نوٹ بک لگی ، نوٹ بک انجن روم سے ملی تھی اور اس میں ہمارے ملک کی جنگی معلومات درج تھیں — جو ہمارے ہاں موجود کسی غدار نے درج کی تھیں — غالباً اب جہاز پھر ہمارے ملک کی طرف جا رہا ہے ۔"

" بھئی واہ — کمال ہوگیا — یہ لوگ تو کام دکھا گئے — لیکن نہیں — ابھی تو بہت سے نیلے لباس والے موجود ہیں اور پھر ٹومین موجود

ہے۔ ان سے نبٹنا آسان نہیں ہوگا۔" انسپکٹر کامران مرزا جلدی جلدی بولے۔

"انھوں نے نوٹنگ اور نیلے لباس والے کے ساتھ کیا سلوک کیا؟"

"نوٹ بک کے بارے میں معلوم ہونے کے بعد وہاں نہیں ٹھہرا۔ شوکی نے وہ کپتان سے لے لی تھی۔"

"اوہ۔ کیا مطلب؟" فرحت نے اسے گھورا۔

"خیر تو ہے۔ تم مجھے اس طرح کیوں گھورنے لگیں۔"

"وہ۔ وہ نوٹ بک اب کہاں ہے؟"

"تم یہ بات مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہو؟" آفتاب نے بُرا سا منہ بنایا۔

"تب پھر کس سے پوچھوں۔ اپنے فرشتوں سے؟" فرحت نے جھلا کر کہا۔

"ہاں! ان سے ضرور پوچھو۔ بلکہ شوق سے پوچھو۔" آفتاب ہنسا۔

"میں کہتی ہوں۔ نوٹ بک نکالو۔"

"کیا مطلب؟" آفتاب اُچھل پڑا۔

"یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ نوٹ بک کی حقیقت تمھیں معلوم ہو جاتی اور تم اسے کسی اور کے پاس رہنے دیتے، ایسی اہم

چیز تم جب تک حاصل نہیں کر لیتے۔ اس وقت تک چین نہیں آتا۔ اس لیے میں دعوے سے کہتی ہوں کہ نوٹ بک اب تمھارے پاس ہے۔"

"اور میں فرحت کی تائید کرتا ہوں، میرا بھی بالکل یہی خیال ہے۔" انسپکٹر کامران مرزا مسکرائے۔

"اوہو۔ انکل آپ کا بھی یہی خیال ہے۔" آصف نے جلدی سے کہا۔

"ہاں بھئی۔ کیا کیا جائے۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"اب تو آفتاب۔ تمھیں نوٹ بک نکال کر دینا ہی ہوگی۔" آصف بولا۔

"ہاں! مجبوری ہے۔" اس نے کہا اور اپنی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا، پھر اس کا ہاتھ جیب میں ہی رہ گیا۔ منہ کھلا کا کھلا رہ گیا، آنکھوں سے بلا کی حیرت جھانکنے لگی۔

"کیوں۔ کیا ہوا۔ کس بات پر حیران ہو۔" انسپکٹر کامران مرزا نے پریشان ہو کر کہا۔

"وہ۔ وہ۔ نوٹ بک" آفتاب کھوئے کھوئے انداز میں بولا۔

"ہاں! کیا ہوا نوٹ بک کو۔"

"وہ۔ اب میری جیب میں نہیں ہے۔"

"کیا !!!" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"لیکن ۔ وہ کہاں جا سکتی ہے ۔ تم اسے گرا تو نہیں سکتے۔"

"ہرگز نہیں ۔ اوہ ۔ اب یاد آیا ۔ میں واپسی میں کچھ اس طرح اندھا دھند ادھر آیا کہ ایک رسی میں پاؤں اُلجھ گیا تھا اور میں منہ کے بل گر گیا تھا ۔ نوٹ بک کہیں اس جگہ نہ گر پڑی ہو۔"

"تو پھر آؤ ۔ جلدی کرو۔" انسپکٹر کامران مرزا بے چین ہو گئے ۔

"اس سے تو بہتر تھا ۔ تم اسے شوکی کے پاس ہی رہنے دیتے۔" فرحت نے جھنا کر کہا۔

"یا پھر ہاتھ میں پکڑے رہتے۔"

"آؤ بھئی ۔ باتوں میں وقت ضائع نہ کرو۔" انھوں نے منہ بنایا۔

چاروں کیبن سے نکل کر اوپر والے حصے پر آئے ۔ آفتاب انھیں لے کر اس جگہ پہنچا ۔ جہاں وہ گرا تھا ۔ انھوں نے عرشے کو اچھی طرح چھان مارا ۔ لیکن نوٹ بک کا کہیں پتا نہ چلا۔

"اس کا مطلب ہے ۔ نوٹ بک کسی اور کے ہاتھ لگ گئی ۔ اور یہ بہت بُرا ہوا۔" انسپکٹر کامران مرزا بڑبڑائے۔

"تم ۔ مجھے ۔ مجھے بہت افسوس ہے۔" آفتاب ہکلایا۔

"میں سمجھ گیا ۔ نوٹ بک ضرور اس لمبے قد والے کے پاس ہے ۔ جو ٹوبین کہلاتا ہے ۔ شاید اس نے یہ کارروائی دیکھ لی اور اس طرح نوٹ بک کو اڑا لیا ۔ اس نے تمھارے راستے میں جان بوجھ کر رسی اڑائی ہوگی۔" وہ جلدی جلدی بولے۔

"اوہ ! اب کیا کریں؟"

"انجن روم کی طرف چلتے ہیں ۔ انجن پر اب کپتان شومی کا قبضہ ہے اور ہم اس قبضے کو برقرار رکھنے میں ان کی مدد کریں گے۔"

"لیکن ۔ ٹائم بم کا کیا کریں۔" آصف بولا۔

"ٹائم بم کی تلاش فرحت کے کان کریں گے ۔ ایک بار ہم اس ٹائم بم کی تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائیں ، پھر ان نیلے لباس والوں کو ہم دیکھ ہی لیں گے۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"آپ کا مطلب ہے ۔ میں اپنے کانوں کی مدد سے ٹائم بم تلاش کروں۔" فرحت بوکھلا اٹھی۔

"ہاں ۔ یہ کام تمھیں کرنا ہوگا ۔ آصف اور آفتاب تمھارے ساتھ ہوں گے ۔ میں انجن روم کے آس پاس رہوں گا ۔ گویا ہم میدان میں ہوتے ہوئے بھی نظروں سے اوجھل رہیں گے۔"

"بہت بہتر، لیکن اگر ٹائم بم نیلے لباس والوں کی نگرانی میں ہوا۔ میرا مطلب ہے۔ اس کے آس پاس کچھ نیلے لباس والے بھی ہوئے تو؟"

"تو تم اس کا صرف سُراغ لگا کر واپس آجانا۔ پھر میں دیکھ لوں گا۔"

"بہت بہت شکریہ انکل۔" فرحت مسکرائی۔

اور تینوں وہاں سے آگے بڑھے۔ اسی وقت انسپکٹر کامران مرزا بولے:

"یہ بات ذہن میں رکھنا۔ بم صرف اور صرف نچلے حصّے میں ہو سکتا ہے۔"

"جی بہتر!"

اور وہ جہاز کے نچلے حصّے کی طرف چل پڑے۔

"مجھے اب تک حیرت ہے۔ نوٹ بک میری جیب سے کس طرح نکال لی گئی۔ یہ اتنا آسان کام نہیں تھا کہ غیر محسوس طور پر نوٹ بک نکال لی جاتی۔"

"چلو خیر۔ اب اتنے بھی شرمندہ نہ ہو۔ کہ شرمندگی کا اثر ہم تک آجائے۔" آصف نے شوخ آواز میں کہا۔

"مذاق اڑا رہے ہو۔ خیر خیر۔ اڑا لو۔" آفتاب جل گیا۔

"ہم اس وقت مذاق اڑانے نہیں۔ ٹائم بم تلاش کرنے

نکلے ہیں، یہ بات ذہن میں رہے۔" فرحت بولی۔

"اچھا۔ ذہن میں رہے گی۔" آفتاب نے تلملا کر کہا۔

وہ مختلف حصّوں میں گھومتے رہے۔ کسی نے انھیں نہ ٹوکا، سب لوگ اپنے اپنے کیبنوں میں دبکے ہوئے تھے۔ نیلے لباس والے بھی انھیں نظر نہ آئے۔ شاید وہ خاص خاص جگہوں پر موجود تھے۔ یا پھر ایسی جگہوں پر جہاں سے انھیں آسانی سے دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔

"یہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہمارے لیے میدان بالکل صاف ہو۔"

"ایسی بات نہیں۔ تم پر برابر نظر ہے، لیکن ہمیں تمھاری حرکتوں پر ہنسی آ رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے تمھیں روکنے یا ٹوکنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ تاکہ ہنسنے کا موقع تو ملے۔"

ان کے نزدیک سے ہی ایک آواز ابھری۔ وہ چونک اٹھے، آواز ایک کیبن سے آئی تھی۔ کیبن کی کھڑکی ان کے بالکل قریب تھی۔ انھوں نے محسوس کیا۔ کھڑکی کی جھریوں میں سے انھیں بالکل صاف طور پر دیکھا جا رہا ہے۔ وہ دھک سے رہ گئے۔ گویا ہر منزل پر نیلے لباس والے اسی قسم کی جگہوں پر چھپے ہوئے تھے۔ اور کسی وقت بھی ان کی طرف سے دخل اندازی ہو سکتی تھی۔ اور اس کا یہ مطلب بھی تھا کہ انھیں کنٹرول

کرنے والا کوئی معمولی ذہن کا آدمی نہیں تھا۔

"اوہ۔ اس اطلاع کے لیے بہت بہت شکریہ جناب۔ آپ تو کچھ زیادہ ہی اچھے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔" آفتاب بولا۔

"تم لوگ شاید ٹائم بم کی تلاش میں نکلے ہو۔" کھڑکی پر سے ہنس کر کہا گیا۔

"ج۔ جی ہاں! آپ کا خیال بالکل درست ہے، اگر ہمیں اجازت نہ ہو تو ہم واپس چلے جائیں۔" آصف بولا۔

"ارے نہیں۔ تم اپنا شغل جاری رکھو۔ ہمیں تو خود بھی معلوم نہیں کہ ٹائم بم کہاں ہے۔ اگر معلوم ہے تو صرف مسٹر ٹومین کو۔ اس لیے کہ وہ انھوں نے ہی کہیں سیٹ کیا تھا۔"

"ویری گڈ۔ تب تو ہم ضرور اسے تلاش کرنے کی کوشش کریں گے اور اگر تلاش کرنے میں کامیاب ہوگئے تو مسٹر ٹومین کی طرف سے انعام کے حق دار ہوں گے۔"

"ہوں ٹھیک ہے۔ فکر نہ کرو۔ انعام ضرور دیا جائے گا، کیا تم لوگ شوکی برادرز ہو۔"

"شوکی برادرز۔ جی نہیں۔ ہمارا نام یہ نہیں ہے۔" آفتاب نے کہا۔

"اوہ۔ تب تم کون ہو؟" اندر سے چونک کر کہا گیا۔

"جی ہم کوئی خاص لوگ نہیں ہیں۔ بس عام سے انسان ہیں، آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔" آفتاب نے مسمسی صورت بنا کر کہا۔

"میں نے یہ پوچھا ہے کہ تم لوگ کون ہو۔" اس بار سخت لہجے میں کہا گیا۔

"اوہو۔ آپ کا پیار بھرا لہجہ تو بہت سخت ہوگیا۔ ایسی بھی کیا بے مروتی۔" آصف نے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔

"تم نے بتایا نہیں۔"

"بتا دیں گے۔ پہلے ٹائم بم تو تلاش کر لیں۔" فرحت نے منہ بنایا۔

"نہیں۔ پہلے تم نام بتاؤ گے اور اس کے بعد یہاں سے حرکت کرو گے۔"

"بہت بہتر۔ چلو آفتاب۔ بتاؤ نام۔"

"میں کیوں بتاؤں۔ میں بتاتا کیا اچھا لگوں گا۔ بتاؤ تم۔" اس نے فوراً کہا۔

"کیوں تمھیں بتاتے ہوئے شرم آتی ہے۔" فرحت نے اسے گھورا۔

"شاید تم لوگ وقت ضائع کرنے میں بہت ماہر ہو۔

اب مجھے حرکت میں آنا ہی ہوگا۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی کھڑکی کھل گئی۔ اور رائفل کی نال جھانکنے لگی۔

"اگر اب بھی تم نے نہ بتایا تو رائفل خاموش نہیں رہے گی۔"

"مم۔ میں آفتاب ہوں۔"

"اور میں آصف ہوں۔"

"میرا نام فرحت ہے۔ کیا اب ہم اپنا کام شروع کر سکتے ہیں۔"

"ہرگز نہیں۔" اس نے چلا کر کہا۔

"لیکن کیوں۔ ابھی ابھی تو آپ نے کہا تھا کہ شوق سے ٹائم بم تلاش کرو۔"

"اس وقت مجھے یہ بات معلوم نہیں تھی کہ تمھارے نام آفتاب، آصف اور فرحت ہیں، یہ نام تو ہمیں اچھی طرح نوٹ کرائے گئے ہیں۔"

"ارے باپ رے۔ کس نے نوٹ کرائے تھے؟"

"مسٹر ٹوین نے۔" نیلے لباس والے نے شوخ آواز میں کہا۔

"لیکن کیوں۔ ہم نے ان کا کیا بگاڑا کہ وہ ہمارے نام نوٹ کراتے پھر رہے ہیں۔ حد ہو گئی یعنی کہ۔"

"یہ وہ جانیں۔" اس نے کندھے اچکائے۔

"کیا انھوں نے صرف ہمارے نام نوٹ کروائے تھے؟"

"نہیں۔ کچھ نام اور بھی ہیں۔ اس بات کو چھوڑو۔ اب تم اس کیبن میں آ جاؤ۔ مجھے مسٹر ٹوین کو اطلاع دینا ہوگی۔"

"شکریہ۔ بہت بہتر۔ آؤ بھئی۔ کیبن میں۔" آفتاب نے خوش ہو کر کہا۔

ساتھ ہی دروازہ کھلا اور رائفل کی نال دروازے میں نظر آئی۔

"چلو اندر۔"

وہ اندر داخل ہو گئے۔ انھوں نے دیکھا۔ کیبن میں صرف ایک نیلے لباس والا تھا۔

"اب آپ کا کیا پروگرام ہے؟"

"پہلے تمھیں باندھوں گا۔ اور پھر۔"

اس کے الفاظ درمیان میں ہی رہ گئے۔ اسی وقت آفتاب نے رائفل کی پروا نہ کرتے ہوئے اس پر چھلانگ لگا دی۔

بس پھر کیا تھا۔ فوری طور پر آصف اور فرحت بھی حرکت میں آگئے۔ آصف نے رائفل پر ہاتھ ڈال دیا اور بلا کا جھٹکا مارا۔ وہ پہلے ہی آفتاب کا دھکا لگنے کی وجہ سے لڑکھڑا گیا تھا۔ رائفل اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ تاہم اس نے آصف کو دبوچنے کی پوری کوشش کی۔ یہ اور بات ہے کہ آصف

بھڑک کر پیچھے ہٹ گیا۔ اور وہ منہ کے بل گرا۔ ساتھ ہی فرحت
نے اس کی کمر پر چھلانگ لگائی۔ ادھر آفتاب نے ٹھوکر رسید
کی۔ صرف چند سیکنڈ کے اندر اس کے کس بل نکل گئے۔
آصف نے رائفل کی نال اس کے سینے پر رکھ دی اور بولا:

"اب اگر چوں بھی کی تو گولی چلا دوں گا، پھر چاہے
کچھ ہوتا رہے۔"

"دوسرے یہ کہ ٹومین کہاں ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ وہ کہاں ہیں۔"

"تم ہمارے بارے میں انھیں کس طرح اطلاع دیتے۔"

"حلق سے سیٹی کی خاص آواز نکال کر۔ ہمیں اس سیٹی کی
آواز کی تربیت دی گئی ہے۔"

"اس صورت میں کیا ہوتا۔ یہاں کوئی نیلے لباس والا آتا
یا خود ٹومین؟" آصف نے پوچھا۔

"میرا کوئی ساتھی۔ مجھ سے حالات معلوم کر کے اوپر جاتا
اور وہی آواز نکالتا۔ پھر مسٹر ٹومین اس کے ساتھ یہاں آتے۔"

"ہوں۔ اس کا مطلب ہے۔ ٹومین ہماری زد پر نہیں آ
سکتا۔ میرا مطلب ہے، اگر ہم تمہیں وہ آواز نکالنے پر مجبور
کر دیں تو ہمیں ایک اور نیلے لباس والے سے ٹکرانا ہوگا۔
جب کہ ہم صرف اور صرف مسٹر ٹومین سے ٹکرانا پسند کرتے

ہیں۔ تاکہ ایک ہی وار میں اس ساری جنگ کا خاتمہ ہو
جائے۔"

"ایسا نہیں ہو سکتا۔ تم لوگ مسٹر ٹومین کے ذہن کو نہیں
پہنچ سکتے۔"

"ہمیں ضرورت ہی کیا ہے، اس کے ذہن کو پہنچنے کی،
ہم تو آج تک اپنے ذہنوں کو نہیں پہنچ سکے۔ یہ ذہن بھی
عجیب چیز ہیں۔ کمپیوٹر بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔"

"وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں۔ اب کیا کرنا ہے۔"
فرحت نے منہ بنا کر کہا۔

"کرنا تو ہمیں صرف یہ ہے کہ ٹائم بم تلاش کریں۔ اور بس۔"

"اور اس کے لیے پہلے ان صاحب کا کچھ انتظام کرنا ہوگا۔"
آصف نے کہا، پھر بلا کی پھرتی سے نال ہٹائی اور اس
کے سر پر دے ماری۔ وہ فوراً ہی بے ہوش ہو گیا۔

"اس قدر جلد بے ہوش ہو گیا۔ کمال ہے۔ کہیں مکر تو
نہیں کر رہا۔" فرحت بولی۔

"تو ایک نال اور سہی۔" آصف نے رائفل بلند کی۔

"نن۔ نہیں۔ بس ایک ہی کافی ہے۔" نیلے لباس والے
نے لرز کر کہا۔

آصف مسکرایا اور نال دے ماری۔ اس کا سر ڈھلک گیا۔

تاہم مزید اطمینان کے لیے اس نے تیسری مرتبہ بھی نال اس کے سر پر رسید کر دی۔

"اب ہم اطمینان سے ٹائم بم تلاش کر سکتے ہیں" آفتاب نے پُرسکون آواز میں کہا۔

انھوں نے رائفل کو کیبن کی چٹائی کے نیچے چھپایا اور دروازہ بند کر کے باہر نکل آئے، پھر کھڑکی کا خیال آیا۔ اور اسے بھی اندر سے بند کیا۔ اب تینوں پھر آگے بڑھنے لگے یہاں تک کہ سٹور تک پہنچ گئے۔ انھیں معلوم تھا۔ سٹور میں دس نیلے لباس والے موجود ہیں، لیکن سٹور کو چیک کیے بغیر آگے نہیں جا سکتے تھے، کیوں کہ اس بات کا زبردست امکان تھا کہ ٹائم بم سٹور میں نہ چھپایا گیا ہو۔

"کیا ہم اندر آ سکتے ہیں جناب" آفتاب نے خوش گوار لہجے میں کہا۔

اس کی بات کا کسی نے جواب نہ دیا۔ انھوں نے حیران ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"کیا ہم اندر آ سکتے ہیں"

اب بھی جواب نہ ملا۔ آخر وہ ڈرتے ڈرتے اندر داخل ہوئے، کیوں کہ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ تڑاتڑ فائرنگ شروع ہو جائے۔ دوسرا لمحہ حیران کن تھا۔ اندر کوئی بھی نیلے

لباس والا نہیں تھا:

"حیرت ہے۔ یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے"

"یہاں ضرورت نہیں رہی ہو گی۔ بھئی۔ صرف ایک آدمی اگر باورچی خانے میں مقرر کر دیا جائے تو یہ کچّی خوراک کسی کے کام نہیں آ سکے گی۔ ظاہر ہے۔ پہلے اسے پکایا جائے گا۔ پھر استعمال کیا جائے گا۔ گویا پہلے تو مسٹر ٹومین نے رُعب ڈالنے کے لیے دس آدمی مقرر کر دیے، لیکن بعد میں ہٹا لیے۔ اب وہ دس آدمی ضروری جگہوں پر مقرر ہوں گے"

"اور اس سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ ٹائم بم یہاں نہیں ہو سکتا۔ اگر یہاں ہوتا تو ایک آدھ آدمی ضرور یہاں رہتا" آصف نے کہا۔

"یہ ضروری نہیں۔ ٹائم بم مسٹر ٹومین نے چھپایا ہے۔ اس کے کسی ساتھی کو بھی معلوم نہیں کہ کہاں ہے۔ دوسرے یہ کہ مسٹر ٹومین کوئی ضرورت سے زیادہ چالاک آدمی جان پڑتا ہے۔ ہو سکتا ہے۔ ٹائم بم جس جگہ ہو۔ وہاں کوئی آدمی بھی نہ ہو۔ تاکہ اس جگہ کے بارے میں کسی کا خیال تک نہ جا سکے" آفتاب نے جلدی جلدی کہا۔

"اوہ!" دونوں کے منہ سے نکلا۔

"لہٰذا ہمیں سٹور کو دیکھنا ہو گا۔"

وہ چند قدم آگے بڑھے اور پھر ٹھٹک کر رک گئے۔

فرحت کے چہرے پر حیرت کے آثار دوڑ گئے۔ اس نے دونوں ہاتھ آگے کر کے ان دونوں کو آگے بڑھنے سے روکا تھا:

"کیا بات ہے۔ خیر تو ہے۔" آفتاب نے اسے گھورا۔

"ذرا باہر آؤ۔"

"باہر آنے کی کیا ضرورت ہے۔ اب ٹائم بم کے بارے میں اطمینان کر کے ہی باہر نکلیں گے۔"

"اوہو۔ میں کہتی ہوں۔ باہر آؤ۔" فرحت نے بھنّا کر کہا اور واپس مُڑ گئی۔

"بہت اچھا۔ یہ لو آ گئے باہر۔ اب بتاؤ۔ کیا بات ہے۔" آصف نے بھنا کر کہا۔

"بات صرف اتنی سی ہے کہ اندر کوئی موجود ہے۔" فرحت نے سرگوشی کی۔

"کیا کہا۔ اندر کوئی موجود ہے۔ تب پھر اس نے جواب کیوں نہیں دیا۔" آفتاب نے منہ بنایا۔

"مجھے کیا پتا۔ کیوں جواب نہیں دیا۔ ملاقات ہونے پر پوچھوں گی اس سے۔" فرحت نے کہا۔

"ہو سکتا ہے، اندر ایک آدھ نیلے لباس والا موجود ہو۔" آصف نے خیال ظاہر کیا۔

"تب پھر۔ تم جا کر وہ رائفل اٹھا لاؤ۔ جو ہم نے چٹائی کے نیچے چھپائی ہے۔" آفتاب بولا۔

"ہوں۔ یہ ٹھیک رہے گا۔" آصف نے کہا اور ان دونوں کو وہیں ٹھہرے رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے دوسری طرف مڑ گیا۔

دونوں سٹور کے دائیں بائیں کھڑے رہے۔ آخر آصف آتا نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل موجود تھی۔

"تو۔ اس کیبن میں حالات جوں کے توں ہیں؟" آفتاب نے دبی آواز میں پوچھا۔

"ہاں! نیلے لباس والا ابھی تک بے ہوش ہے۔" اس نے بتایا۔

اب وہ سٹور کی طرف متوجہ ہوئے۔

"اندر کون ہے۔ جو کوئی بھی ہے، ہاتھ اوپر اٹھا کر کھڑا ہو جائے۔ اگر اس نے ہدایت پر عمل نہ کیا تو ہماری طرف سے فائر کر دیا جائے گا۔"

"مشکل ہے۔ تم فائر نہیں کر سکو گے۔" اندر سے ایک عجیب سی آواز اُبھری۔

"کیوں۔ تم یہ کس طرح کہہ سکتے ہو؟"

"اس طرح کہ فائر کرنے کی صورت میں سب نیلے لباس والے

یہاں آموجود ہوں گے۔ اور میرا خیال ہے تم یہ پسند نہیں کرو گے۔"

"ہوں۔ بات تو ٹھیک ہے۔ تم نے یہ اندازہ کس طرح لگا لیا؟"

"میں اندازے لگانے کا بہت ماہر ہوں۔ آگے کہو۔ کیا کہتے ہو؟"

"ہمیں اس سٹور کا اندر سے جائزہ لینا ہے۔ اور ہر حال میں لینا ہے۔"

"اگر ہم نہ لینے دیں۔"

"اس صورت میں ہم تم سے لڑیں گے۔ رائفل سے نہ سہی۔ ہاتھوں سے لڑیں گے۔ اتنا ہم بھی سمجھ چکے ہیں کہ فائرنگ تمھیں بھی منظور نہیں۔"

"اوہو۔ تم نے یہ اندازہ کس طرح لگا لیا۔"

"اس طرح کہ ہم بھی اندازے لگانے میں کچھ کم ماہر نہیں ہیں۔ اور میں تو یہ بھی اندازہ لگا چکا ہوں کہ اس وقت میرے ساتھ جو صاحب بات کر رہے ہیں، اپنی اصلی آواز میں بات نہیں کر رہے۔ شاید تمھیں ڈر ہے کہ ہم آواز پہچان نہ لیں۔ کیوں۔ ٹھیک ہے نا۔"

"ہاں! یہ تو خیر ٹھیک ہے۔"

"تب پھر۔ تم خود کو کیوں چھپا رہے ہو۔ اگر دوست ہو تو سامنے آجاؤ۔"

"اب شاید یہی کرنا پڑے گا۔ کیوں۔ کیا خیال ہے۔" اندر آواز ابھری۔

"خیال کس سے پوچھ رہے ہو۔"

"اپنے ساتھیوں سے۔"

"اوہو۔ تو تم بھی تنہا نہیں ہو۔"

"نہیں۔ ہم بھی تین عدد ہیں اور تم بھی تین عدد۔ ان حالات میں ہم چھپے رہ کر کیا کریں۔"

اس بار جو آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی، وہ محمود کی آواز تھی۔ تینوں زور سے اچھلے۔ اور پھر ایک ساتھ ان کے منہ سے نکلا:

"ارے۔"

"صرف ارے سے کام نہیں چلے گا۔ آگے بڑھ کر گلے بھی ملنا ہو گا۔" فاروق کی شوخ آواز کانوں سے ٹکرائی۔

"ہاں واقعی۔ یہ بہت ضروری ہے۔ خاص طور پر اس لیے بھی کہ اس بار ملاقات کچھ زیادہ وقفے کے بعد ہو رہی ہے۔ کیوں ٹھیک ہے نا۔" آفتاب نے بھی شریر لہجے میں کہا۔

"اب کھڑے باتیں ہی کرتے رہو گے یا گلے ملنے کا پروگرام بھی شروع کرو گے۔" فرزانہ نے جھلا کر کہا۔

اور وہ ہنس پڑے۔ پھر آصف محمود سے، آفتاب فاروق

سے اور فرحت فرزانہ سے چمٹ گئی۔ ایسے میں آصف نے کہا:

" اور سب سے زیادہ مزے کی بات یہ ہے کہ جہاز پر شوکی برادرز بھی موجود ہیں۔"

" بلکہ میں تم لوگوں کو اس سے بھی زیادہ مزے کی بات سنا سکتا ہوں۔" فاروق نے مسکرا کر کہا۔

" اوہو۔ اچھا۔ تو پھر دیر کا ہے کی۔"

" ہمارے ساتھ۔ ابا جان، انکل خان رحمان اور پروفیسر انکل بھی ہیں۔"

" کیا!!!" وہ چلا اٹھے۔ آواز کو بلند ہونے سے کسی طرح نہ روک سکے، اسی وقت ایک سرد آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی:

" یہ۔ یہاں کیا ہو رہا ہے۔"

وہ بوکھلا کر مڑے۔۔۔

بڑے میاں

دروازے میں ایک نیلے لباس والا کھڑا انہیں خون خوار نظروں سے گھور رہا تھا، اس کے ہاتھ میں رائفل تھی۔

" ہم آپس کی باتیں بعد میں کریں گے۔ پہلے ان سے بات کر لی جائے۔" محمود نے تجویز پیش کی۔

" ہاں ٹھیک ہے، ہم ایسا کرنے پر مجبور ہیں۔"

" کیا بکواس کر رہے ہو تم لوگ۔ ہاتھ اوپر اٹھا دو۔" وہ غرایا۔

" اس کی ضرورت نہیں مسٹر رائفل مین۔ اندر آ جائیے اور ہم سے دو دو باتیں کر لیجیے۔"

" ہاں ضرور کیوں نہیں۔ اندر آتے کیا میں ڈرتا ہوں۔ یہ لو آ گیا اندر۔ اب بتاؤ۔ تم لوگ یہاں کیا کر رہے ہو۔"

" جی ہم باتیں کر رہے تھے۔" فاروق نے کہا، ساتھ میں مسکرایا بھی۔

"کیا باتیں کر رہے تھے؟"

"آپس کی باتیں - آپس کی باتوں کا مطلب تو آپ جانتے ہی ہوں گے۔" آفتاب نے بھی مسکرا کر کہا۔

"اچھی طرح جانتا ہوں - میں نے تم لوگوں کی باتیں سُن لی ہیں - تم لوگ انسپکٹر کامران مرزا اور انسپکٹر جمشید کے بچے ہو - کیوں ٹھیک ہے نا؟" ان کی سوالیہ نظریں ان پر جم گئیں۔

"جی ہاں - بالکل ٹھیک ہے، آپ تو کمال کے نجومی معلوم ہوتے ہیں۔" آصف خوش ہو گیا۔

"دماغ تو نہیں چل گیا، میں نجومی وجومی نہیں ہوں۔" اس نے بُرا سا منہ بنایا۔

"تت - تو پھر؟"

"تو پھر یہ کہ تم لوگ ہاتھ اوپر اٹھا کر میرے آگے آگے چلو - میں تمہیں باس کے پاس لے جاؤں گا۔"

"بھئی واہ - اس سے اچھی بات بھلا کیا ہو سکتی ہے کہ آپ ہماری ملاقات باس سے کرا دیں - کیوں بھئی - کیا خیال ہے؟" محمود بولا۔

"تو پھر چلو - کھڑے میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو۔"

"ہمیں اس کمرے میں ایک کام کرنا ہے - اجازت دیجیے، ذرا وہ کر لیں۔" فرزانہ بولی۔

"کون سا کام؟" اس نے حیران ہو کر کہا۔

"بہت ہی اچھا اور نیک کام - یہ کہ اس کمرے میں ہمیں ٹائم بم تلاش کرنا ہے۔" فرحت مسکرائی۔

"ٹٹ - ٹائم بم۔" نیلے لباس والا حیرت زدہ رہ گیا۔

"ہاں! اس لیے کہ اگر اسے تلاش کر کے بے کار نہ کیا گیا تو وہ ہم سب کے لیے نقصان دہ ثابت ہو گا۔"

"تو تمہارے خیال میں ٹائم بم اس کمرے میں چھپایا گیا ہے۔"

"اس بات کا امکان ضرور ہے۔" محمود نے پُرزور لہجے میں کہا۔

"تب تو تم لوگ ضرور بے وقوف ہو۔" اس نے ہنس کر کہا۔

"بہت بہت - بہت بہت شکریہ۔" آفتاب نے خوش ہو کر کہا۔

"اس میں چار مرتبہ بہت کہنے کی کیا ضرورت ہے۔" فاروق نے اسے گھورا۔

"دیکھو بھئی - ابھی تو ہماری ملاقات پوری طرح ہو بھی نہیں سکی - اگر یہ صاحب تشریف نہ لے آتے تو ضرور ہم اس ملاقات کو پوری ملاقات بنا دیتے - لیکن ان حالات میں نہیں۔" محمود نے بُرا سا منہ بنایا، پھر نیلے لباس والے کی طرف مڑا:

"ہاں جناب۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہاں ٹائم بم ہو سکتا ہے۔ اور اس پورے جہاز کو اڑا سکتا ہے۔ لہٰذا کیوں نہ ہم اس کمرے کا بھی اچھی طرح جائزہ لے لیں۔ اس کے بعد آپ جو کہیں گے، ہم کریں گے۔"

"یہاں ٹائم بم نہیں ہو سکتا۔ وہ کسی بہت ہی خفیہ جگہ پر ہے اور اس کے بارے میں باس کے سوا کسی کو کچھ معلوم نہیں ہے۔" اس نے کہا۔

"آپ کو بھی اس خفیہ جگہ کے بارے میں کوئی اندازہ ہے۔" آصف نے بھی برا سا منہ بنایا۔

"نہیں۔" وہ بولا۔

"تو پھر ہمیں یہاں دیکھ لینے دیں، آپ کا کیا جاتا ہے۔" محمود بولا۔

"باس کی مرضی کے خلاف میں تم لوگوں کو کس طرح اجازت دے سکتا ہوں۔"

"اچھا! جیسے آپ کی مرضی۔ چلو بھئی۔ ان کے حکم کی تعمیل کریں۔" آصف نے بے چارگی کے عالم میں کہا۔

انھوں نے ہاتھ اٹھا دیے۔ اور اس کی طرف قدم اٹھانے لگے۔ ایسے میں فرزانہ چلتے چلتے رک گئی اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی:

"ن نہیں۔ میں آگے نہیں بڑھ سکتی۔"

"آگے نہیں بڑھ سکتیں۔ لیکن کیوں۔" محمود نے حیران ہو کر کہا۔

"میں اس سٹور کا جائزہ لوں گی، پھر یہاں سے جاؤں گی۔" اس نے کہا۔

"کیا تم اندھی ہو، تمھیں میرے ہاتھ میں رائفل نظر نہیں آ رہی۔"

"ہاں۔ نہیں نظر آ رہی۔ آؤ فرحت۔ دونوں ٹائم بم کو تلاش کریں۔" یہ کہہ کر فرزانہ فوراً مٹی اور بوریوں کی طرف بڑھی۔

"خبردار۔ گولی مار دوں گا۔"

"ضرور مار دو۔ ہم نہیں رکیں گے۔" فرحت نے بھی فرزانہ کا ساتھ دیا۔

"فرزانہ۔ تمھیں کیا ہو گیا ہے۔ یہ برا مان جائیں گے۔" فاروق نے گھبرا کر کہا۔

"برا مان جائیں گے تو تم کس لیے ہو۔ انھیں منانا شروع کر دینا۔" فرحت نے بھنا کر کہا۔

"ہاں واقعی۔ یہ بھی ٹھیک ہے۔ دیکھیے جناب۔ مان جائیے یہ جو ہماری بہنیں ہیں نا۔ بہت ہی ضدی واقع ہوئی ہیں۔" یہ کہتے ہوئے فاروق نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے یکدم

اس کے منہ کی طرف کر دیے۔ اسے ان سے بچنے کے لیے
فوراً پیچھے ہٹنا پڑا، کیوں کہ اس کے تو دونوں ہاتھ رائفل
پر تھے۔ جوں ہی وہ پیچھے کی طرف ہٹا۔ فاروق کو موقع
مل گیا۔ اس کے جڑے ہوئے دونوں ہاتھ رائفل پر جم
گئے اور اس نے رائفل کو نیچے جھکا دیا۔ ادھر نیلے لباس
والے نے رائفل کو اوپر اٹھانے کے لیے زور لگایا۔ فاروق
نے بھی پورا زور ڈال دیا۔ محمود کے لیے اتنا ہی موقع
کافی تھا۔ اس نے بلا کی رفتار سے مڑتے ہوئے اس کی
گردن پر دائیں ہاتھ کی ہڈی دے ماری۔ وہ لڑکھڑا گیا۔
محمود نے ایک اور وار کیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ دھڑام سے
گرا۔ اور گرتے گرتے اس کی انگلی ٹریگر پر دب گئی۔ گولی
چلنے کا زور دار دھماکا ہوا۔ گولی لکڑی کے فرش میں دھنس گئی۔
نیلے لباس والے کو ایک دھکا لگا اور فاروق نے جھٹکا مار
کر رائفل اس کے ہاتھ سے چھین لی۔

"گولی چل گئی۔ یہ بُرا ہوا۔ اب نیلے لباس والے اس طرف
دوڑ پڑیں گے۔" محمود بڑبڑایا۔

"لیکن ہم دونوں سٹور کا جائزہ لیے بغیر پھر بھی نہیں
جائیں گی۔ لہٰذا۔ دروازہ اندر سے بند کر دو۔" فرزانہ چلائی۔

"اوہ اچھا۔ یوں ہی سہی۔" محمود نے کہا اور دوڑ کر دروازے

کی طرف گیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ دروازہ بند کر چکا تھا۔

"اب جو کچھ کرنا ہے۔ جلد از جلد کر لو۔" آصف نے
منہ بنایا۔

"تھوڑی دیر کے لیے خاموشی اختیار کرو۔ ہم اپنی کانوں کی
طاقت کو آواز دے رہی ہیں۔" فرزانہ نے مسکرا کر کہا۔

اب وہ دونوں بوریوں کے پاس اکڑوں بیٹھ گئیں۔ اور
کان باریک سے باریک آواز سننے کے لیے لگا دیے، پھر فرحت
نے بڑبڑانے کے انداز میں کہا:

"ہو نہ ہو۔ بم سٹور میں ہی ہے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔"

"پھر تو ہمیں فوری طور پر اس کی تلاشی شروع کر دینی
چاہیے۔" آفتاب نے پُرجوش آواز میں کہا۔

وہ سٹور کی چیزوں کو جلدی جلدی اِدھر اُدھر کرنے لگے،
اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ اور ایک گرج دار آواز
ان کے کانوں سے ٹکرائی:

"اندر کون ہے۔ دروازہ کھولو۔"

"آپ کون ہیں جناب۔ اور دروازہ کیوں کھلوانا چاہتے ہیں۔"
محمود نے فوراً کہا۔ ساتھ ساتھ ان کے ہاتھ بھی چل رہے تھے۔

"مسٹر ٹومین کا ایک ادنیٰ خادم۔ دروازہ کھولو۔ ورنہ ہم

اسے توڑ دیں گے اور اس کے بعد تمہارا بُرا حشر کریں گے۔"

"یہ بہت بُری بات ہے۔ کہ لوگ بات بے بات ہمیں بڑے حشر کی دھمکیاں دینے لگتے ہیں۔"

"اگر ایک منٹ تک دروازہ نہ کھُلا تو ہم دروازہ توڑ دیں گے۔" باہر سے جھلا کر کہا گیا۔

"جوں ہی دروازہ کھلے گا۔ ہم گولی چلا دیں گے۔" آصف نے بھی تلملا کر کہا۔

"کیا کہا۔ گولی چلا دو گے۔"

"ہاں! کیا تم لوگوں نے فائر کی آواز نہیں سنی۔ گولی سٹور کے اندر ہی چلی تھی۔ اور اب نیلے لباس والا ہمارے قبضے میں ہے۔"

"اوہ۔ خیر کوئی بات نہیں۔ اب ہم سٹور کے سامنے باقاعدہ پوزیشن لیں گے اور اس کے بعد دروازہ توڑنا شروع کریں گے۔ جاؤ ٹام۔ مسٹر ٹومین کو اطلاع دو۔" باہر سے آواز آئی۔

"ضرور ضرور۔ مسٹر ٹومین کو ہی کیا۔ سب کو بلا لو۔ ہمیں کوئی پروا نہیں۔" فاروق ہنسا۔

"ضرور تم لوگوں کا دماغ چل گیا ہے۔ ورنہ تم فوراً دروازہ کھول دیتے۔"

"اب ہمیں کیا معلوم تھا کہ دروازہ نہ کھولنے کا مطلب ہے

دماغ خراب ہونا۔" آفتاب نے منہ بنایا۔

باہر خاموشی چھا گئی، پھر دروازے پر ٹھکریں ماری جانے لگیں۔ ادھر وہ بہت تیزی سے مصروف عمل تھے۔ ایسے میں انھوں نے بہت سے دوڑتے قدموں کی آواز سنی۔ پھر ایک تیز آواز سنائی دی:

"یہ کیا ہو رہا ہے۔"

"سٹور میں ایک فائر ہوا تھا۔ ہم دوڑ کر یہاں پہنچے تو دروازہ اندر سے بند تھا۔ پتا نہیں اندر کون لوگ ہیں۔ دروازہ نہیں کھول رہے۔ اب ہم نے توڑنے کی کوشش شروع کی ہے۔ اندر ان لوگوں کے پاس رائفل بھی ہے اور ہمارے ایک ساتھی کو انھوں نے شاید ہلاک کر دیا ہے، کیوں کہ ہم نے اب تک اس کی آواز نہیں سنی۔" اسی نے بتایا، جو اب تک ان کے ساتھ باتیں کرتا رہا تھا۔

"کوئی بات نہیں۔ دروازہ نہ توڑو۔" ایک بارعب سی آواز سنائی دی۔

فاروق کے چہرے پر حیرت کے آثار پھیل گئے۔ دوسروں نے اس کے چہرے پر حیرت کے آثار صاف محسوس کیے، لیکن یہ موقع آپس میں بات چیت کا نہیں تھا۔

"جی۔ دروازہ نہ توڑیں۔ تو پھر۔"

"دروازہ باہر سے بند کر دو۔ اور تالا لگا دو۔ جب یہ بھوکوں مرنے لگیں گے تو خود ہی کھولنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ ہمارے ساتھی کو تو یہ ہلاک کر ہی چکے ہیں۔ اب ہمیں انھیں باہر نکالنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"لیکن سر۔ یہ سٹور روم ہے۔ کھانے کی چیزیں کس طرح نکالی جائیں گی۔"

"صبح سے پہلے ہم کھانے کی چیزیں نہیں نکالیں گے۔"

"او کے سر۔ جو حکم۔ چلو ٹام لگا دو تالا۔"

تالا لگنے کی آواز سنائی دی اور پھر خاموشی چھا گئی۔

"اب بتاؤ فاروق۔ تمھیں کس بات پر حیرت ہوئی تھی۔" فرزانہ بے تابانہ انداز میں بولی۔

"مسٹر ٹوبین کی آواز سن کر۔ میرا ذہن کہہ رہا ہے۔ میں اس کی آواز سن چکا ہوں۔ اگرچہ وہ آواز کو بدل کر بول رہا تھا، لیکن اس کے باوجود آواز جانی پہچانی محسوس ہوئی تھی۔"

"گویا تم اندازہ نہیں لگا سکے۔" آصف نے منہ بنایا۔

"ابھی تک نہیں۔ تاہم میں کوشش کر رہا ہوں۔"

"لو بھئی۔ یہ رہا بم۔" فرزانہ کی آواز سنائی دی۔

انھوں نے دیکھا۔ لکڑی کی ایک پیٹی میں پیاز بھرا ہوا تھا۔ پیاز کے درمیان ایک ننھا سا بم موجود تھا۔ اس پر

ڈائل بھی بنا ہوا تھا۔ اس پیٹی کے علاوہ بھی آٹھ دس پیٹیاں پیاز کی وہاں موجود تھیں۔

"کیا یہ پیٹی اوپر رکھی تھی؟" محمود نے پوچھا۔

"نہیں۔ سب سے نیچے۔ لیکن تم خود سوچو۔ پیاز کی پیٹیوں کو بم والی پیٹی پر سے اٹھانے میں کتنا وقت لگتا ہے۔ گویا ٹوبین کسی وقت بھی آ کر بم کا وقت تبدیل کر سکتا ہے۔"

وہ بم پر جھک گئے۔ اس پر بارہ بجے کا وقت سیٹ کیا گیا تھا۔

"گویا بارہ بجے سے پہلے پہلے ہمیں اس کا وقت تبدیل کرنا ہے۔" محمود بولا۔

"لیکن کیسے۔ ہم نہیں جانتے وقت کس طرح تبدیل کریں۔" فرزانہ نے منہ بنایا۔

"ارے باپ رے۔ اگر ہم وقت تبدیل نہ کر سکے اور سٹور میں سے بارہ بجے تک باہر بھی نہ نکل سکے تو کیا ہوگا۔" آفتاب بوکھلا اٹھا۔

"حیرت ہے۔ تمھیں اتنا بھی نہیں معلوم کہ کیا ہوگا۔ پرخچے اڑیں گے۔ اور کیا ہوگا۔" فاروق بھنا اٹھا۔

"تو اس میں جلنے بھننے کی کیا ضرورت ہے۔" آفتاب نے اسے گھورا۔

"تم بتا دو، جلنے بھننے کی ضرورت کس میں ہوتی ہے۔" فاروق مسکرایا۔

"تم دونوں کا شروع ہونے کا ارادہ تو نہیں ہے؟" فرحت نے گھبرا کر پوچھا۔

"کیوں۔ تم بھی شریک ہونا چاہتی ہو؟"

"میرا خیال ہے۔ ابھی شوکی برادرز سے ملاقات ہو جانے دی جائے، پھر بیٹھ کر باتیں ہوں گی۔ ہیں تو وہ آخر جہاز..."

فرزانہ کے الفاظ درمیان میں ہی رہ گئے۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی تھی:

"کک۔ کون۔" آفتاب ہکلایا۔ لیکن باہر سے جواب دینے کی بجائے پھر دستک دی گئی۔

"میں نے پوچھا ہے، کون ہے۔ اور دستک دینے کی کیا ضرورت ہے۔ جب کہ دروازہ باہر سے بند ہے۔"

"جج۔ جی ہاں! یہ تو ہم بھی دیکھ رہے ہیں۔" باہر سے ایک گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

"ارے۔ شوکی۔ تم۔"

"پپ۔ پتا نہیں۔" باہر سے شوکی نے بوکھلا کر کہا۔

"کس بات کا پتا نہیں۔ اس بات کا کہ تم شوکی ہو یا نہیں۔" آفتاب نے حیران ہو کر کہا۔

"نہیں۔ بلکہ اس بات کا پتا نہیں کہ جب باہر تالا لگا ہوا ہے تو اندر کچھ لوگ کیوں موجود ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔" شوکی نے وضاحت کی۔

"دیکھو میاں شوکی۔ اِدھر اُدھر کی پھر ہانک لینا۔ پہلے تالا کھولو۔ ہمارا باہر نکلنا بہت ضروری ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم باہر نہ نکل پائیں اور بارہ بج جائیں۔"

"بارہ تو روز ہی بجتے ہیں۔ بلکہ ایک دن میں دو بار بجتے ہیں۔ انھیں بجنے سے کس طرح روکا جا سکتا ہے۔" باہر سے آفتاب کی آواز سنائی دی۔

"اوہو۔ یہ تو بھائی مکھن ہیں۔ کمال ہے۔" فرحت چہکی۔

"لیکن فرحت! اس میں کمال کی کیا بات ہے۔"

"بات کی کھال نہ اتارا کرو۔ کسی بات کو جانے بھی دیا کرو۔" فرحت نے جھنجلا کر کہا۔

"اچھا۔ تمھارے مشورے پر آیندہ عمل کروں گا۔ بھئی تم لوگ باہر کھڑے کس کا منہ دیکھ رہے ہو۔" محمود تلملا اٹھا۔

"جج۔ تت۔ تالے کا۔" اشفاق نے فوراً کہا۔

"تت تالے کا۔ اور یہ جی اور تالے کے دو دو ٹکڑے کرنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"تاکہ آپ لوگ آسانی سے سمجھ سکیں۔" اخلاق کی آواز سنائی

دی۔

"اور تم نے ہمیں ناسمجھ کب سے سمجھ لیا" فاروق جل گیا۔

"جب سے آپ تالا لگا کر اندر جا بیٹھے۔ آخر اس طرح تالا لگانے کی کیا ضرورت تھی" مکھن بولا۔

"یار سمندر کی آب و ہوا نے تم چاروں کا دماغ تو نہیں الٹ دیا" محمود نے چلا کر کہا۔

"نن۔ نہیں تو۔ یہ اندازہ کس طرح لگا لیا آپ نے" مکھن گھبرا گیا۔

"اس لیے کہ ہم تالا لگا کر اندر کس طرح بیٹھ سکتے تھے، جب کہ اس کمرے کا اور کوئی دروازہ نہیں۔ نہ کوئی کھڑکی ہے" آصف نے جلدی جلدی کہا۔

"اس کا مطلب ہے۔ تالا آپ لوگوں نے نہیں لگایا۔ تب تو ہمیں کچھ کرنا ہی ہوگا۔ اچھا تو آپ ایسا کریں۔ تالے کی چابی باہر کھسکا دیں" شوکی نے کہا۔

"اب ہمیں یقین ہو چلا ہے۔ تم لوگوں کے ضرور دماغ الٹ گئے ہیں۔ خیر باہر آ کر ہم درست کر دیں گے۔ فکر نہ کرو" فاروق چلا اٹھا۔

"لیکن آپ لوگ آئیں گے کیسے۔ باہر تو تالا لگا ہوا ہے" مکھن نے حیران ہو کر کہا۔

"دھت تیرے کی" محمود نے جھلا کر اپنی ران پر ہاتھ مارا۔

"ارے بابا۔ کچھ کرو۔ تالا کھولو۔ ہم باہر آنا چاہتے ہیں" آصف نے چیخ کر کہا۔

"کہ آپ لوگ ہمیں رہے ہیں ہمارے دماغوں کو۔ اور الٹ شاید آپ کے گئے ہیں۔ اس طرح چیخنے اور چلانے کی نوبت تو دماغ الٹنے کی ہی صورت میں آتی ہے" شوکی نے جھنجلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اچھا شوکی۔ باہر نکل کر تم سے سمجھیں گے" محمود نے منہ بنایا۔

"دھمکی دے رہے ہیں آپ لوگ؟" مکھن کے لہجے میں سوال تھا۔

"ہاں! دے رہے ہیں" آصف بولا۔

"ارے باپ رے۔ اب تو کھولنا ہی ہوگا تالا۔ مکھن اپنا چابیوں کا گچھا دینا"

"کوئی فائدہ نہیں ہوگا بھائی جان۔ یہ تالا اور طرز کا ہے" مکھن کی آواز سنائی دی۔

"اوہو تم دو تو سہی"

تالے میں کھڑکھڑاہٹ شروع ہوئی۔ شاید شوکی باری باری چابیاں لگا رہا تھا۔ ادھر ان کا مارے بے چینی کے برا حال تھا۔ آخر شوکی کی آواز ابھری:

"افسوس! ان میں سے کوئی چابی نہیں لگی"

"تو پھر میرا گچھا بھی آزمالیں۔" اشفاق بولا۔

"ارے! تو کیا تم میں سے ہر ایک کے پاس ایک ایک گچھا ہے۔" فرحت گھبرا کر بولی۔

"جی ہاں! لیکن آپ فکر نہ کریں۔ گچھے زیادہ بلے چوڑے نہیں ہیں۔ مطلب یہ کہ ان میں اتنی زیادہ چابیاں نہیں ہیں۔"

"اچھا بھائی۔ ذرا جلدی کرو۔" فرزانہ نے تنگ آکر کہا۔

ایک بار پھر تالے میں کھڑبڑ شروع ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد شوکی بولا:

"اخلاق۔ تم اپنا گچھا دو۔"

"ایک ہی بار گچھے لے لو نا بھئی۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"اس طرح گچھے آپس میں مل جائیں گے۔ اور یہ پتا نہیں چلے گا۔ کون سا گچھا کس کا ہے یا کون سا لگ چکا ہے، کون سا رہتا ہے۔"

"توبہ ہے۔ اگر اندر ایٹم بم پھٹ گیا تو جانتے ہو کیا ہو گا۔" آفتاب نے چیخ کر کہا۔

"ایٹم بم۔ ارے باپ رے۔ تو آپ کو بھی ایٹم بم کے بارے میں پتا ہے۔ واقعی اس جہاز پر ایک عدد ایٹم بم موجود ہے۔ لیکن سوائے مسٹر ٹوبین کے کسی کو معلوم نہیں کہ بم کہاں ہے۔" شوکی نے گھبرا کر کہا۔

"یہی تو تم لوگوں کی غلط فہمی ہے۔ ارے بھائی وہ بم اسی کمرے میں موجود ہے۔ جس میں اس وقت ہم بند ہیں۔"

"کیا!!! ارے باپ رے۔ پھر تو بھاگو یہاں سے۔" شوکی نے چیخ کر کہا اور دوڑ لگا دی۔ اس کے ساتھ وہ تینوں بھی بھاگ پڑے:

"ارے ارے۔ یہ کیا!!!" وہ ایک ساتھ چلّائے۔

"یہ انہیں کیا ہو گیا۔ اتنے بے وقوف تو نہیں ہیں۔" محمود نے منہ بنا کر کہا۔

"بے وقوف نہیں ہیں۔ بزدل تو ہیں ہی۔" آصف بولا۔

"جب کہ میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔ یہ بھاگے ہیں تو کچھ سوچ کر ہی بھاگے ہوں گے۔" فاروق بڑبڑایا۔

"خیر۔ دیکھتے ہیں۔ کیا ہوتا ہے۔" آفتاب نے کندھے اچکائے۔

اسی وقت پھر دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی۔ اور پھر دروازے کے قریب کچھ لوگوں کے رکنے کی آواز سنائی دی:

"یہ تم لوگ ہو شوکی۔" محمود نے بے تابانہ لہجے میں کہا۔

"خیال یہی ہے کہ یہ ہم ہی ہیں۔" آفتاب نے جواب دیا۔

"تم بھاگے کیوں تھے؟"

"وہ۔ وہ۔ مم۔ میں۔ کک۔" شوکی نے ٹوٹے پھوٹے الفاظ ادا کیے۔

" یہ کون سی زبان کے الفاظ ہیں ؟"

" ہر زبان کے " شوکی نے فوراً کہا - ساتھ ہی دروازہ کھل گیا۔

" ارے - یہ کیا - اب تالا کس طرح کھل گیا "

" بات دراصل یہ ہے کہ میں اپنا گچھا کیبن میں ہی چھوڑ آیا تھا - وہ لینے گیا تھا " شوکی نے شرما کر کہا۔

" اوہ - تو پھر آؤ گلے مل جائیں - بہت دنوں بعد ملاقات ہوئی ہے " آصف نے خوش ہو کر کہا۔

" نہ جانے ان ملاقاتوں کو کیا ہو گیا ہے - بہت دیر بعد ہونے لگی ہیں " فاروق نے منہ بنایا۔

" لیجیے - اور سنیے " آفتاب نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

اور پھر وہ ایک دوسرے کے گلے لگ گئے - اس کام میں انھوں نے دو منٹ لگا دیے - آخر اطمینان سے بیٹھنے کے بعد محمود بولا :

" سب سے پہلے تو ہمیں اس بم کا کچھ بندوبست کرنا چاہیے "

" اس کا ایک بندوبست تو یہ ہو سکتا ہے کہ سمندر میں پھینک دیں " شوکی بولا

" نہیں - اس طرح سمندری مخلوق بے تحاشا ماری جائے گی - ہمارے ساتھ پروفیسر داؤد موجود ہیں - میں انھیں یہیں لے آتا ہوں "

" بھئی واہ - پھر تو مزا آگیا - اور کیا انکل خان رحمان نہیں ہیں "

" وہ - وہ بھی ہیں "

" پھر تو مطلب یہ ہوا کہ گروپ پورا ہو چکا ہے - وہ بھی ایک سمندری جہاز پر " شوکی نے جلدی جلدی کہا۔

" اور جہاز بھی ایسا جسے اغوا کر لیا گیا ہے - اور جسے لے جایا بھی بیگال جا رہا ہے " اخلاق نے کہا۔

" خیر - اب یہ بیگال کی طرف تو نہیں جا رہا - انجن روم پر اب پھر کپتان شومی کا قبضہ ہے - ہاں یہ اور بات ہے کہ اب جہاز کی منزل کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا - کیوں کہ سمت بتانے والا آلہ تباہ کر دیا گیا ہے "

" اوہو اچھا - یہ اطلاع ہمیں نہیں مل سکی " محمود بولا۔

" آپ لوگ تھے کہاں ؟"

" جہاز کے ایک کیبن میں "

" اور جہاز پر کس طرح پہنچے - ہمارے خیال میں تو آپ لوگوں کا جہاز پر موجود ہونا ناممکن سی بات تھی " آصف نے کہا۔

" ہم ریوٹا اور شیلاک کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک آئے ہیں - وہ دونوں جہاز پر ہی موجود ہیں "

" کیا !!"

وہ ایک ساتھ چلائے اور ساتھ ہی ایک آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی:

"کیا ہو گیا بھئی۔ اس طرح کیوں چلا رہے ہو۔ مسٹر ٹومین کے کانوں تک آواز پہنچ گئی تو بُرا مان جائیں گے۔"

انھوں نے چونک کر نظریں اٹھائیں۔ انسپکٹر جمشید، انسپکٹر کامران مرزا، پروفیسر داؤد اور خان رحمان دروازے پر کھڑے تھے:

"لیجیے۔ آپ تو خود ہی آ گئے۔ اور آپ لوگ آپس میں کیسے مل گئے۔" آصف نے حیران ہو کر کہا۔

"ہم تم لوگوں کی تلاش میں نکلے تھے۔ ایک دوسرے کے سامنے آ گئے۔"

"اور یہ اچھا ہی ہوا۔ ہم تو خود آپ لوگوں کو یہاں لانے والے تھے۔ بس ذرا ہماری باتوں نے ہمیں الجھا لیا۔ اور ہمیں رکنا پڑ گیا۔"

"تمھاری باتیں۔ ارے باپ رے۔ انھیں تو ہم بھول ہی گئے۔" انسپکٹر کامران مرزا نے گھبرا کر کہا۔

"آپ کا اشارہ کن کی طرف ہے ابا جان۔" آفتاب بولا۔

"تمھاری باتوں کی طرف۔"

"آپ ان کی طرف سے پریشان نہ ہوں۔ انھیں ہم کنٹرول کر لیں گے۔ وہ آپ کو پریشان نہیں کریں گی۔"

"جی ہاں! پریشانی والی بات تو وہ ٹائم بم ہے۔ جو یہاں چھپایا گیا تھا۔"

"اوہو اچھا۔ جلدی مجھے دکھاؤ۔" پروفیسر داؤد گھبرا کر بولے۔

انھوں نے ٹائم بم نکال کر پروفیسر داؤد کی طرف بڑھا دیا۔ شوکی برادرز گھبرا کر پیچھے ہٹ گئے۔ ان کے چہروں پر خوف دوڑ گیا۔

"بس نکل گئی جان۔ ہم اس کے ساتھ کتنی دیر تک اندر رہے ہیں۔"

"آپ۔ آپ لوگوں کا کیا ہے۔ آپ ٹھہرے بموں کی صحبت میں رہنے والے۔" مکھن نے مسمسی صورت بنائی۔

"بھئی پہلے بم سے نبٹ لیں۔ پھر ایک دوسرے سے حالات سن لیں، اس کے بعد جہاز کی صورتِ حال کو دیکھ لیں، پھر تم اپنی باتیں شروع کرنا۔" انسپکٹر جمشید بُرا سا منہ بنا کر بولے۔

"ارے باپ رے۔ مارے گئے پھر تو۔" فاروق نے فکرمندانہ لہجے میں کہا۔

"مارے کیسے گئے۔" خان رحمان مسکرائے۔

"ابا جان نے تو بہت ہی لمبا چوڑا پروگرام بتا دیا۔ ہم اتنی دیر تک کس طرح صبر کر سکیں گے۔ یہ بھی تو دیکھیے کہ اس

بار ملاقات کتنی دیر بعد ہوئی ہے۔"

"ہاں! یہ بھی ٹھیک ہے۔ لیکن جمشید کا پروگرام بھی تو بہت اہم ہے۔"

"ان کا تو کوئی پروگرام بھی غیر اہم نہیں ہوتا۔" فاروق بولا۔

"خیر خیر۔ تم کچھ دیر تک تو صبر کر ہی لو۔ اسی میں بہتری ہے۔" انسپکٹر کامران مرزا نے کہا۔

"صبر نہیں۔ جبر۔" آفتاب نے منہ بنایا۔

"کم از کم صبر اور جبر کا چولی دامن کا ساتھ نہیں ہو سکتا۔" مکھن مسکرایا۔

"یہ تم نے صبر۔ یا جبر کیا ہے۔" انسپکٹر جمشید نے انھیں گھورا۔

"ابھی تو ان دونوں کا ذکر کیا ہے۔" فاروق نے فوراً کہا۔

"بس جمشید۔ اب تم روک چکے انھیں۔" پروفیسر داؤد ہنسے۔ ٹائم بم اب ان کے ہاتھ میں تھا اور انھوں نے اسے لاپروائی سے پکڑا ہوا تھا۔ جیسے وہ کوئی کھلونا ہو۔

"آپ تو کم از کم اس بم کا کچھ کریں۔"

"میں اسے بے کار کر چکا ہوں۔ اب جب تک اس کا ٹائم

سیٹ نہیں کیا جائے گا۔ یہ نہیں پھٹ سکے گا۔"

"تو پھر جائیے۔ اسے سمندر میں پھینک آئیے۔"

"مم۔ میں اکیلا جاؤں۔" وہ ہکلائے۔

"ارے نہیں۔ خان رحمان۔ میرا خیال ہے۔ یہ کام تم کرو، تم اکیلے ہی جا سکتے ہو۔"

"ہاں کیوں نہیں۔ یہ کیا مشکل کام ہے۔ لائیے پروفیسر صاحب مجھے دے دیں۔"

"بہتر ہوگا ابا جان۔ ہم میں سے کوئی ایک انکل کے ساتھ جائے۔" محمود نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ تم چلے جاؤ۔" وہ بولے۔

"مم۔ میں۔ یعنی کہ میں۔ لیکن ابا جان۔ ہماری تو یہاں مہابھارت شروع ہو چکی ہے۔"

"ابھی کہاں ہوئی ہے۔ سارے حالات سننے سنانے کے بعد ہو گی۔" فاروق نے کہا۔

"تو پھر تم ساتھ چلے جاؤ نا۔" محمود نے جلدی سے کہا۔

"جانے کو تو چلا جاؤں۔ لیکن۔ ان سب کو چھوڑ کر۔ جانے کو دل نہیں کرتا۔"

"یار میں تمھیں اپنے ملک کے ساحل پر جانے کے لیے نہیں کہ رہا۔ جہاز کے عرشے تک جانا ہے۔" انسپکٹر جمشید ہنستا

تھے۔

"آپ کو جلنے بھننے کی ضرورت نہیں انکل۔ اس کام کے لیے فرزانہ اور فرحت یہاں پہلے ہی موجود ہیں۔ میں ان کے ساتھ جاتا ہوں۔" آفتاب نے کہا۔

"ویری گڈ۔ یہ ہوئی نا بات۔" انسپکٹر جمشید خوش ہو گئے۔

"ہنہ۔ بڑے آئے جانے والے۔ بیٹھے رہو آرام سے میں خود چلا جاؤں گا۔" فاروق نے بھنا کر کہا۔

دونوں ایک ساتھ اٹھے۔ اور تیزی سے جو پروفیسر داؤد کی طرف جھپٹے تو ایک دوسرے سے ٹکرا گئے۔ اور ٹکرائے بھی اس زور سے کہ ایک محمود کے اوپر گرا، دوسرا آصف کے اوپر۔

"اوہو۔ کیا مصیبت آگئی ہے۔" انسپکٹر کامران مرزا نے جھنجلا کر کہا۔

"جہاں یہ جمع ہو جائیں۔ وہاں تو بے چاری مصیبت بھی آتی ڈرے گی۔" انسپکٹر جمشید ہنسے۔

"یہ دونوں تو جا چکے انکل۔ میں چلتا ہوں آپ کے ساتھ۔" محمود نے اٹھتے ہوئے کہا۔ اور تیزی سے جو خان رحمان کی طرف بڑھا تو دھڑام سے گرا۔ وہ آصف کی ٹانگوں میں الجھ گیا تھا جو ابھی تک نہیں اٹھ سکا تھا۔

یجے۔ جانے کا نیا طریقہ ملاحظہ فرمائیے۔" آصف نے طنزیہ
ے میں کہا اور پھر خود اٹھا، لیکن پوری طرح اٹھنے نہیں
تھا کہ لڑکھڑا گیا۔

ں کی نظریں دروازے پر جم گئیں۔ وہاں چار سادہ لباس
ے کھڑے تھے۔ ان کی نظریں ان سب پر جمی تھیں۔ اچانک
سے ایک نے کہا:

"بڑے میاں۔ ہم ہمارے حوالے کر دو۔"

باتوں کی جنگ

"کیا فرمایا آپ نے ۔ بم آپ کے حوالے کر دیں:" انسپکٹر جمشید پُرسکون آواز میں بولے ۔

"ہاں ! ہمیں اس کی ضرورت ہے۔"

"لیکن اسے تو ہم نے سمندر کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

"تمہارے فیصلے سے کیا ہوتا ہے ۔ جہاز پر اس وقت ہمارا قبضہ ہے۔"

"ارے نہیں بھئی ۔ ایسی کوئی بات نہیں ۔ جہاز پر تم لوگوں کا قبضہ نہیں ہے ۔ اگر یقین نہیں آتا تو جا کر انجن روم کا جائزہ لے آؤ۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے ۔

"کیا مطلب ؟"

"مطلب بعد میں پوچھنا ۔ پہلے انجن روم کا جائزہ لے آؤ۔"

"ٹام ۔ تم اور روڈلف یہیں ٹھہرو ۔ میں انجن روم تک ہو

کر آتے ہیں۔"

"بہت بہتر مسٹر شارن ۔ آپ بے فکر ہو کر جائیں۔"

"ان لوگوں کو بس رائفلوں کی زد پر رکھو ۔ اُلجھنے کی ضرورت نہیں۔"

"بہت بہتر۔"

شارن اپنے ساتھی کے ساتھ مڑ گیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا سیڑھیوں کی طرف چلا گیا ۔

"اب تم لوگ کیا کہتے ہو دوستو۔" آفتاب نے ان دونوں کی طرف دیکھا ۔

"ہم ۔ ہم کیا کہیں گے ۔ کچھ بھی نہیں۔" ٹام نے حیران ہو کر کہا ۔

"اس بم کے بارے میں کیا خیال ہے ۔ کیا یہ وصول نہیں کرنا۔"

"نن ۔ نہیں ۔ مسٹر شارن کے آنے کے بعد وصول کریں گے۔"

"لیکن ہم ابھی اور اسی وقت یہ آپ کے حوالے کرنے کے لیے تیار ہیں۔" آفتاب بولا ۔

"کیا مطلب۔" اس کے لہجے میں حیرت تھی ۔

"آخر ہم اس بم کا کیا کریں گے ۔ انکل ۔ بم ان کی طرف لڑھکا دیں۔"

"بم لڑھکا دوں۔ یہ تم کیا کر رہے ہو۔"

"جی میں ٹھیک کر رہا ہوں۔ ہماری نسبت اس بم کی انھیں ضرورت ہے۔ لڑھکا دیں۔"

پروفیسر داؤد نے بے چارگی کے عالم میں ان کی طرف دیکھا:

انسپکٹر جمشید نے جلدی سے کہا:

"ٹھیک تو کر رہا ہے آفتاب۔ ہمیں اس بے کار چیز کا کیا کرنا۔ لڑھکا دیں۔"

پروفیسر داؤد جھکے اور بم کو ان کی طرف لڑھکا دیا۔ دونوں بوکھلا کر پیچھے ہٹے۔ ذرا دیر کے لیے ان کی نظریں ان پر سے ہٹ گئیں۔ انسپکٹر جمشید اور انسپکٹر کامران مرزا کے لیے تو اتنا وقت بھی بہت تھا۔ انھوں نے بجلی کی سی تیزی سے ان پر چھلانگیں لگائیں اور انھیں چھاپ بیٹھے۔ گرتے وقت رائفلیں ان کے ہاتھوں سے نکل گئیں۔ ساتھ ہی ان کے سروں پر زور دار ہاتھ لگے اور وہ بے ہوش ہوگئے۔

"موقع اچھا ہے۔ کیوں نہ میں بم سمندر میں پھینک دوں۔" خان رحمان بولے۔

"ٹھیک ہے خان رحمان جلدی کرو۔ محمود کو ساتھ لے جاؤ۔"

"آؤ بھئی۔" یہ کہتے ہوئے خان رحمان نے فرش پر پڑا بم اٹھا لیا اور تیزی سے اوپر کی طرف چلے۔ محمود ان کے پیچھے تھا۔

اسی وقت شارن کی حیرت زدہ آواز سنائی دی:

"یہ کیا۔ تم اوپر چلے آ رہے ہو۔ ہمارے ساتھیوں کا کیا بنا۔"

"آرام فرما رہے ہیں۔"

"کیا مطلب۔ ارے۔ تمھارے ہاتھ میں تو بم بھی ہے۔"

"تو کیا ہوا۔ بم ہی ہے۔ ایٹم بم تو نہیں ہے۔" محمود مسکرایا۔

"خبردار۔ واپس چلو۔ ہاتھ سر سے بلند کر لو۔"

"اس صورت میں کہیں بم گر نہ پڑے اور پھٹ نہ جائے۔" خان رحمان بولے۔

"بم میرے حوالے کر دو۔" شارن بولا۔

"افسوس۔ یہ تو نہیں ہو سکتا۔ میں تو اسے صرف اور صرف سمندر کے حوالے کروں گا۔" خان رحمان بولے۔

"گولی سے اڑا دو اسے۔ جہاز پر حالات پہلے ہی خراب ہو چکے ہیں۔ انجن روم میں واقعی کپتان شومی موجود ہے۔"

شارن کے ساتھی نے رائفل ان کی طرف تان دی۔ اس کی انگلی ٹریگر پر دباؤ ڈالتی محسوس ہوئی۔ اچانک دونوں سیڑھیوں کے نیچے چھلانگ لگا گئے۔ اور ساتھ ہی فائر ہوا۔ گولی سامنے دیوار میں لگی۔ اب شارن کے ساتھی نے نالی گھمائی اور سیڑھیوں کے نیچے کی طرف کی، لیکن وہ دونوں تو

وہاں نہیں تھے۔ ان کی تلاش میں نظریں دوڑا رہے تھے کہ
بیک وقت دو فائر ہوئے۔ ان کی آخری چیخیں لرزہ خیز تھیں،
وہ سیڑھیوں پر لڑھکتے چلے گئے۔ ان کے لڑھکنے کی آواز نے
سنسنی کی تیز لہر دوڑا دی۔ انھوں نے دیکھا، فائر انسپکٹر جمشید
نے کیے تھے۔

"جاؤ خان رحمان۔ ایسا نہ ہو، کچھ اور نیلے لباس والے
راستے میں آ جائیں۔"

خان رحمان اور محمود تیزی سے اوپر کی طرف دوڑ پڑے۔
یہاں تک کہ عرشے پر پہنچ گئے۔ خان رحمان نے فوری طور پر
ریلنگ کا رخ کیا اور پھر دھڑام سے گرے، ساتھ ہی انھوں
نے سنا۔ کسی نے کہا تھا:

"بھئی اتنی بھی کیا جلدی۔ دیکھ کر چلیں۔"

محمود دوڑتا ہوا ان سے آگے نکل گیا تھا۔ فوراً پلٹ پڑا،
ادھر خان رحمان اُٹھے۔ دوسرے ہی لمحے دونوں ٹھٹک گئے۔
ان کے سامنے لمبے قد کا آدمی کھڑا تھا، اس کے جسم پر نیلا
لباس تھا۔ چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ تھی۔ اس کے
پیچھے ایک اور نیلے لباس والا موجود تھا۔

"میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ تم لوگ اس جہاز پر بھی
موجود ہو گے۔"

"یہ۔ یہ کون ہیں مسٹر ٹومین؟"

"انسپکٹر جمشید کو جانتے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"جی ہاں! اچھی طرح۔"

"یہ اس کے ساتھی ہیں۔ بم کو اُٹھا لو۔" اس نے پُرسکون
آواز میں کہا۔

"خان رحمان جب گرے تھے، بم ان کے ہاتھ سے نکل
گیا تھا۔ اور لڑھک کر دُور چلا گیا تھا۔ ٹومین کا حکم سن کر اس
کا ساتھی بم کی طرف لپکا۔ خان رحمان نے ایک لمبی چھلانگ
لگائی اور اس پر جا پڑے۔ وہ اس حملے کے لیے تیار نہیں
تھا۔ دھڑام سے گرا۔ ادھر محمود نے بم کی طرف دوڑ لگا
دی۔ یہ دیکھ کر ٹومین مسکرایا اور ایک اونچی چھلانگ لگائی۔
اس سے پہلے کہ محمود بم تک پہنچتا۔ ٹومین بم کے پاس گرا۔
اسی وقت محمود اس سے ٹکرایا اور عرشے پر گرا۔ ٹومین نے
بم کو ٹھوکر مار کر دور لڑھکا دیا اور خان رحمان کی طرف
بڑھا۔ جو اس کے ساتھی کے کس بل نکال چکے تھے۔ اس نے
ان کے نزدیک پہنچ کر انھیں سر کے بالوں سے پکڑا اور بلا کی
رفتار سے ٹھوڑی پر ایک زوردار مکا دے مارا۔ خان رحمان
کو یوں لگا جیسے کسی نے لوہے کا گرز دے مارا ہو۔ دونوں
ہاتھوں سے ٹھوڑی پکڑے وہ نیلے لباس والے پر سے لڑھک

گئے۔ نیلے لباس والے نے اٹھتے ہی ایک ٹھوکر ان کی پسلیوں
پر دے ماری، یہ دیکھ کر محمود تڑپ اٹھا۔ بلبلا کر وہ اس
کی طرف دوڑ پڑا۔ ٹوبین نے اس منظر کو پُر مسرت انداز
میں دیکھا اور ساکت کھڑا رہا۔ یہاں تک کر محمود نیلے لباس
والے سے ٹکرا گیا۔ وُہ اوندھے منہ گرا۔ اور تابڑ توڑ انداز
میں اس کی پسلیوں پر ٹھوکریں مارتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ وُہ بے دم
ہو گیا۔ خان رحمان بُجھی بُجھی مسکراہٹ سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔

"بچو محمود۔ ٹوبین سے۔" اچانک وہ بولے۔

محمود یک دم نیچے گر گیا اور لڑھکتا ہوا دور چلا گیا۔ ایسے
میں اس نے ٹوبین کو چھلانگ لگاتے دیکھا۔ اس نے بچنے
کی لاکھ کوشش کی۔ لیکن لپیٹ میں آئے بغیر نہ رہ سکا۔ دوسرے
ہی لمحے محمود کو اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ پھر سارا جہاز
گھومتا دکھائی دیا۔ اور آخر اس نے اپنا سر عرشے پر لگا دیا،
لیکن جہاز اب بھی تیزی سے گھومتا محسوس ہو رہا تھا۔ یہاں
تک کہ وُہ بے ہوش ہو گیا۔ اسے بے ہوش ہوتے دیکھ
کر ٹوبین بم کی طرف مڑا اور اس سمت میں قدم اٹھا
دیئے۔ جس سمت میں بم لڑھک گیا تھا۔ لیکن اس جگہ پہنچ
کر اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ بم وہاں نہیں تھا —
اس نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر تیزی سے نیچے

اُترنے لگا۔

○

"اب ہم پر باقاعدہ حملہ ہو گا۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"ہاں! اور ہمارے پاس صرف تین رائفلیں ہیں۔ ان تین
رائفلوں سے کیا ہم مقابلہ کر سکیں گے؟" پروفیسر داؤد بولے۔

"جی ہاں، کیوں نہیں۔ مقابلہ بالکل کیا جائے گا، ہمیں
جلدی جلدی پوزیشن لے لینی چاہیے۔"

انھوں نے زینے کو نظر میں رکھتے ہوئے پوزیشن لے
لی اور بالکل تیار بیٹھ گئے، لیکن پورا ایک منٹ گزرنے پر
بھی کوئی نیلے لباس والا نیچے نہ آیا۔

"کہیں یہ لوگ کوئی چال تو نہیں چل رہے۔"

"ہو سکتا ہے۔ یہی بات ہو۔"

"مجھے اجازت دیں۔ میں ایک نظر اوپر ڈال آؤں۔" ایسے
میں شوکی بولا۔

"اچھی بات ہے۔ یہ ٹھیک رہے گا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔
اجازت ملتے ہی شوکی تیر کی طرح زینے کی طرف بڑھا
اور سیڑھیاں چڑھتا چلا گیا۔ وہ اس کا انتظار کرتے رہے —

پھر ایک منٹ گزرنے کے بعد شوکی آتا نظر آیا۔

"ٹومین نے انکل خان رحمان اور محمود بھائی کو شکست دے دی ہے۔ اور اب وہ اس طرف آ رہا ہے۔"

"اوہ۔" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"ہم چاہیں تو۔ مسٹر ٹومین کو نشانہ بنا سکتے ہیں۔" آصف نے پُر جوش لہجے میں کہا۔

"نہیں آصف! ابھی ہمیں ٹومین سے باقاعدہ ملاقات کرنا ہے۔ اگر اسے نشانہ بنا دیا گیا تو یہ ملاقات نہیں ہو سکے گی۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"جی بہتر۔" اس نے کہا۔

اسی وقت ٹومین آتا نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک عجیب سی وضع کا پستول تھا:

"خبردار مسٹر ٹومین۔ تم ہمارے نشانے پر ہو۔"

"یہ بات مجھے پہلے ہی معلوم تھی۔"

"اور پھر بھی تم چلے آ رہے ہو۔"

"ہاں! اس لیے کہ تمھاری رائفلیں میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکیں گی۔ میرے جسم پر بلٹ پروف لباس ہے۔ یہاں تک کہ آنکھوں پر بھی بلٹ پروف شیشے چڑھے ہوئے ہیں۔ یہ ایسے شیشے ہیں جو تمھیں نظر بھی نہیں آ سکتے۔ ان حالات میں بھلا مجھے

نیچے آنے میں کیا خطرہ ہو سکتا ہے۔"

"بہت خوب۔ معلوم ہو گیا۔ اب تم کیا کہتے ہو۔ کیا ہم سے بات چیت کرنے آئے ہو۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"میں اور تم سے بات کروں گا۔ ہنہ۔ تم کیا اور تمھاری بساط کیا۔ وہ بم کس کے پاس ہے؟"

"کون سا بم؟"

"جو تم سمندر میں پھینکنے چلے تھے۔"

"وہ تو خان رحمان لے کر گئے تھے، انھوں نے پھینک دیا ہو گا۔"

"نہیں۔ وہ میں نے ان کے ہاتھ سے چھین لیا تھا اور عرشے پر لڑھکا دیا تھا، لیکن اب وہ وہاں نہیں ہے۔ وہ بم مجھے دے دو۔ ورنہ تمھیں ہم سے جنگ کرنا پڑے گی۔"

"جنگ تو بم نہ دینے کی صورت میں بھی کرنا ہو گی۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"اس کا مطلب ہے، بم نہیں دو گے۔"

"ہمارے پاس ہے نہیں۔ ہوتا تو بھی نہیں دے سکتے تھے۔"

"تب پھر مقابلے کے لیے تیار ہو جاؤ۔" اس نے غرا کر کہا۔

" پروا نہیں۔" یہ کہہ کر انسپکٹر کامران مرزا نے اس کی آنکھ
کا نشانہ لیتے ہوئے فائر کیا، گولی نشانے پر لگی، لیکن
ٹومین کھڑا مسکراتا رہا۔
" یہ تو واقعی بلٹ پروف لباس میں ہے۔"
" کوئی بات نہیں۔ ایک فائر اور سہی۔" انسپکٹر جمشید نے
کہا اور فائر کر دیا۔ اس مرتبہ گولی اس کی پیشانی پر لگی،
لیکن اس کا کچھ بھی نہ بگڑا۔
" کوئی اور گولی چلانا ہے تو چلا لو۔ اس کے بعد میری
باری ہے۔"
" ضرور۔ اب تم اپنا کام دکھاؤ۔" آصف بولا۔
اس نے پستول والے ہاتھ کو حرکت دی۔ وہ حرکت میں
آ گئے۔ لیکن اس سے پہلے کہ کچھ کر سکتے۔ پورے کمرے
میں دھواں بھر گیا۔ نیلے رنگ کا دھواں۔ اور انھوں نے
محسوس کیا۔ وہ گہری نیند میں ڈوبے جا رہے ہیں۔ انھیں کچھ
اندازہ نہیں ہو سکا کہ وہ کتنی دیر بے ہوش رہے۔ ہوش
میں آئے تو سب کے سب عرشے پر موجود تھے اور اوپر
تاروں بھرا آسمان تھا۔ ان کے درمیان چاند بھی پوری آب وتاب
سے چمک رہا تھا۔ اب ان کے ہاتھ اور پیر بندھے ہوئے
تھے۔ انھوں نے دیکھا۔ ٹومین ایک کرسی پر بیٹھا انھیں

اداس نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ جیسے وہ اس کے عزیز ہوں
اور اچانک بیمار ہو گئے ہوں۔
" ہوش میں آنا مبارک ہو۔" اس نے خوش ہو کر کہا۔
" آپ کو بھی مبارک۔" انھوں نے محمود کی آواز سنی۔
" محمود۔ تم بھی یہیں ہو۔"
" تو میں کہاں چلا جاتا۔ وہ بھی انکل خان رحمان کو چھوڑ
کر۔" اس نے کہا۔
" افسوس!" فاروق نے درد بھرے انداز میں کہا۔
" کس بات پر افسوس ہے۔"
" اس بات پر کہ ہم ملاقات کی خوشی میں باتوں کی جنگ
نہ لڑ سکے۔"
" باتوں کی جنگ۔ یہ کیا بات ہوئی۔" ٹومین نے حیران ہو
کر کہا۔
" مسٹر ٹومین۔ تمھاری آواز مجھے جانی پہچانی کیوں لگتی
ہے۔ دوسروں نے یہ بات محسوس نہیں کی۔" فاروق الجھن کے
عالم میں بولا۔
" میں کیا جانوں۔" اس نے برا سا منہ بنایا، پھر بولا:
" مجھے تو حیرت بس ایک بات پر ہے۔"
" اور وہ کس بات پر؟"

"یہ کہ بم کہاں چلا گیا۔ تم لوگوں کو بے ہوش کر کے ہم نے پورے عرشے پر تلاش کیا تھا۔"

"آخر آپ بم کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں۔" آفتاب نے اُلجھن کے عالم میں کہا۔

"اس لیے کہ بم ان کی بہت بڑی کمزوری ہے۔" مکھن نے کہا۔

"کیا مطلب؟" وُہ چونکے۔

"بم کے بغیر یہ اس جہاز پر قبضہ نہیں کر سکتے تھے اور اب بھی عملے اور مسافروں کو کنٹرول کرنے کے لیے انھیں اس بم کی ضرورت ہے۔"

"ہاں! یہ بات ٹھیک ہے۔"

"مجھے افسوس ہے۔ مسٹر ٹوبین۔" شوکی بولا۔

"کس بات پر افسوس ہے۔ اور سُن لو۔ مجھے وہ لوگ زہر لگتے ہیں جو اپنی بات اُدھوری چھوڑ دیتے ہیں۔"

"اس بات پر کہ۔ وُہ بم اب آپ کے ہاتھ نہیں لگ سکتا۔"

"لگ۔ کیوں؟" ٹوبین نے بوکھلا کر کہا۔

"اس لیے کہ میں نے وُہ سمندر میں پھینک دیا ہے۔" شوکی نے شوخ آواز میں کہا۔

"تم۔ تم کیسے پھینک سکتے تھے؟"

"ہاتھوں کی مدد سے۔" اس نے کہا۔

"مذاق نہیں۔ میں بہت سنجیدہ ہوں۔"

"اوہو اچھا۔ تو پہلے کیوں نہیں بتا دیا تھا۔"

"کیا نہیں بتا دیا تھا۔" ٹوبین نے تلملا کر کہا۔

"یہ کہ آپ بہت سنجیدہ ہیں۔"

"اب تو بتا دیا ہے نا۔ آگے بات کرو۔"

"میں نے واقعی وہ بم سمندر میں پھینک دیا تھا۔"

"نہیں!!!" ٹوبین کی دھاڑ نے پورے جہاز کو لرزا دیا۔

وہ حیرت زدہ رہ گئے، کیوں کہ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ آخر اس بم کی کیا اہمیت ہے۔ آخر فاروق نے پُوچھ ہی لیا:

"آپ اس بم کے لیے کیوں مرے جا رہے ہیں۔ ہمارے ساتھ ہمارے ملک چلیے۔ ہم آپ کو بموں سے لاد دیں گے۔"

"کیا کہا۔ بموں سے لاد دوگے۔" ٹوبین نے گھبرا کر کہا۔

"جی ہاں۔ یا یُوں کہ لیں کہ بموں کے ہار تحفے میں دے دیں گے۔"

"ٹر ٹر نہ کرو۔ کام کی بات کر لینے دو۔"

"پہلے تو آپ کام کی بات بتائیں نا۔ اس بم کی آپ کو کیا

ضرورت ہے؟"

"سونا جہاز سے اُتار کر اس بم کے ذریعے جہاز کو اڑانا ہے۔ وُہ ایک ہی بم پورے جہاز کو کافی ہے۔ اگر یہ بات مجھے پہلے معلوم ہو جاتی کہ بم کو سمندر میں پھینک دیا گیا ہے تو میں اسی جگہ جہاز کو رکوا دیتا اور اپنے کچھ غوطہ خور ساتھیوں کو سمندر میں اتار دیتا۔ لیکن اب اس جگہ تک پہنچنا بہت مشکل ہے۔"

"تو پھر صبر کریں۔ اور ہمیں یہ بتائیں۔ آپ کا پروگرام کیا ہے۔"

"پروگرام تو بنگال پہنچنے کا تھا، لیکن اب معلوم نہیں ہم کہاں جا رہے ہیں۔" اس نے کہا۔

"خیر کوئی بات نہیں۔ جہاں قسمت ہوئی چلے جائیں گے۔" فاروق نے فوراً کہا۔

"تو وُہ تم ہو۔ جسے میری آواز جانی پہچانی محسوس ہو رہی ہے۔"

"جی ہاں! کیا نہیں محسوس ہونی چاہیے۔" فاروق نے گھبرا کر کہا۔

"میری بلا سے، ہوتی رہے۔"

"کم از کم اتنا بتا دیں کہ جانی پہچانی کیوں محسوس ہو رہی ہے۔"

"میں کیا جانوں؟" وُہ جھلا کر بولا۔

"خیر۔ کیا آپ کبھی مجھے دیکھ چکے ہیں؟"

"مجھے یاد نہیں۔" اس نے کہا۔

"خیر۔ آپ بتانا نہیں چاہتے۔ لیکن میں بتا سکتا ہوں کہ میں آپ کو کب اور کہاں دیکھ چکا ہوں۔"

"کیا واقعی۔ ذرا بتانا تو۔"

"بتا تو یہ لوگ بھی سکتے تھے، اگر آپ اپنی اصلی آواز میں بولتے۔ آپ دراصل اس آواز میں بول رہے ہیں۔ جب آپ پہلی بار ہمارے گھر آئے تھے۔ اس وقت آپ گل داؤد کے روپ میں تھے۔"

"کیا!!!" انسپکٹر جمشید وغیرہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"جی ہاں۔ یہ مسٹر رونل ہیں۔ ہمارے پرانے مہربان۔" فاروق مسکرایا۔

"یہ۔ یہ ہم کیا سن رہے ہیں۔ ہم تو یہاں۔ ہم تو یہاں۔" محمود کہتے کہتے رک گیا۔

"کیوں۔ رک کیوں گئے۔ ہم تو یہاں سے آگے بھی کچھ کہیے نا۔"

"ہم تو یہاں ریوٹا اور شیلاک کی تلاش میں آئے تھے۔" فرحت نے جلدی سے کہا۔

"فکر نہ کرو۔ ان سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔" رونل مسکرایا۔

عین اسی وقت کیبن کا دروازہ کھلا۔ اور وہی عرب مرد اور
عورت اندر داخل ہوتے نظر آئے۔ جنھیں سوار ہوتے وقت
دیکھا گیا تھا:

"کیا ہم اندر آ سکتے ہیں مسٹر ٹومین" مرد نے چہکتی آواز
میں کہا۔

"ٹومین نہیں بھئی۔ مسٹر رونل کہیے۔ ان لوگوں نے مجھے
پہچان لیا ہے۔"

"ارے!" دونوں کے منہ سے نکلا۔

اس بار وہ سب بھی اپنی حیرت پر قابو نہ رکھ سکے۔
کیوں کہ یہ آوازیں ریوٹا اور شیلاک کی تھیں۔

بنڈل

چند لمحے تک وہ انھیں گھورتے رہے، آخر محمود نے کہا:
"اس کا مطلب ہے۔ ہم سب کے سب ایک جہاز پر جمع ہیں۔"

"ہاں! اور ہمارے رحم و کرم پر ہو۔ جہاز پر پوری
طرح ہمارا قبضہ ہے۔ بس سمت کے معاملے میں گڑ بڑ ہو گئی
ہے۔ خیر اس کا بھی کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ مسٹر شیلاک
اور مس ریوٹا مجھے آپ سے کچھ مشورہ کرنا ہے۔ جو ان لوگوں
کی موجودگی میں نہیں کیا جا سکتا۔ آئیے ذرا میرے کیبن تک۔"

تینوں ایک کیبن کی طرف بڑھ گئے اور پھر کیبن کا دروازہ
بند ہو گیا۔ اب عرشے پر ان کے سوا کوئی نہیں تھا۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم پوری طرح ان کے شکنجے میں
کے جا چکے ہیں۔"

"ہاں! اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے۔" فرزانہ بڑبڑائی۔

"اور جہاز پر ہمارے ملک کا سونا لدا ہوا ہے۔ اُف اللہ!

ہم اس جہاز کو اپنے ملک واپس کس طرح لے جائیں۔"

"اس کے لیے ہمیں ان سے جنگ کرنا ہوگی۔ سب سے خطرناک مسئلہ ٹائم بم کا تھا۔ وہ حل ہو چکا ہے۔ اب ہم ان سے جنگ کر سکتے ہیں۔ اور اس کے لیے ہمیں باقاعدہ منصوبہ بندی کرنا ہوگی اور یہ منصوبہ بندی خان رحمان کریں گے۔"

"میرا مشورہ یہ ہے کہ ہم پہلے کسی منزل پر پہنچیں اور اس کے بعد جنگ کریں۔" خان رحمان بولے۔

"لیکن کیوں انکل۔ کسی نہ کسی منزل پر تو آخر ہم پہنچ ہی جائیں گے۔ کیوں نہ جہاز پر اس سے پہلے ہی ہمارا قبضہ ہو۔" محمود نے جلدی سے کہا۔

"یہ تجویز بھی معقول ہے۔" خان رحمان نے رائے دی۔

"کیوں انسپکٹر جمشید۔ کیا ان لوگوں سے یہیں نبٹ لیا جائے۔"

"اگر یہ ممکن ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔" انھوں نے کہا۔

عین اسی وقت ایک گولی ان کے سروں پر سے گزر کر سمندر میں جا گری۔ ساتھ ہی ایک آواز ابھری:

"تم لوگوں کے لیے یہ ممکن نہیں۔ پوری طرح ہماری نظروں میں ہو۔"

یہ آواز جہاز کے عرشے پر سے ہی آئی تھی۔ گویا نیلے لباس والوں نے بہت سلیقے سے پوزیشن لے رکھی تھی۔ اسی وقت

تینوں واپس آتے نظر آئے۔

"فائر کیوں کیا گیا تھا شارن؟"

"یہ لوگ ہم سے جنگ کرنے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ میں نے اطلاعاً عرض کیا ہے کہ ہم لوگ پوری طرح چوکس ہیں اور ان کا کوئی وار کامیاب نہیں ہونے دیں گے۔" شارن کی آواز سنائی دی۔

"بہت خوب شارن۔ پوری طرح ہوشیار رہو۔ یہ لوگ بہت زیادہ خطرناک ہیں۔ اتنے کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔" یہ کہہ کر رونل ان کی طرف مڑا۔

"ہم ایک جزیرے کے پاس پہنچنے والے ہیں۔ جزیرہ بے آباد نظر آ رہا ہے۔ ہو سکتا ہے درندوں وغیرہ سے ملاقات ہو جائے۔ آبادی کے آثار تو ہیں نہیں۔ بہر حال ہم جزیرے پر اتریں گے ضرور۔ بلکہ رات یہیں گزاریں گے۔ شاید صبح سمت کے بارے میں کچھ معلوم ہو جائے۔ لہٰذا میں نے سوچا ہے کہ تم لوگوں کو باندھ لیا جائے۔ باقی مسافروں کی طرف سے تو ہمیں کوئی خطرہ ہے نہیں۔ صرف تم لوگوں کو باندھنا ہوگا اور یہ کام ہم تینوں خود کریں گے۔"

"آپ بلاوجہ تکلیف کریں گے۔ ہم خود ہی اپنے آپ کو باندھ لیتے ہیں۔" فاروق نے فوراً کہا۔

"دوسری بات یہ کہ ہمیں باندھ کر آپ تکلیف اٹھائیں گے۔"

آفتاب مسکرایا۔

"وہ کیسے؟"

"آپ کو ہمیں اٹھا کر جزیرے پر لے جانا پڑے گا۔"

"ارے نہیں — تم غلط سمجھے۔" شیلاک ہنسا۔

"مہربانی فرما کر وضاحت کر دیں کہ ہم کیا غلط سمجھے۔"

"تم لوگوں کو جزیرے پر نہیں لے جایا جائے گا — یہیں چھوڑ دیں گے — جزیرے پر صرف ہم جائیں گے۔"

"اور مسافر لوگ؟"

"مسافروں کو ہم ان کے کیبنوں میں بند کر دیں گے — اس وقت بھی ہر کیبن کا دروازہ باہر سے بند ہی ہے — اور ان لوگوں کو دھمکی دے دی گئی ہے — کہ جس نے بھی اپنے کیبن سے نکلنے کی کوشش کی، اسے گولی مار دی جائے گی، وہ لوگ بری طرح سہمے ہوئے ہیں — تم لوگوں کو پوری طرح باندھ کر ہم جزیرے پر اتر جائیں گے — صرف کپتان شومی ہمارے ساتھ ہوگا۔"

"جیسے آپ کی مرضی — بہتر تو یہ تھا کہ ہم بھی جزیرے کی سیر کر لیتے — تنگ آ گئے ہیں سمندر کو دیکھتے دیکھتے۔" آفتاب بولا۔

"ابھی اس قدر لمبا سفر تو نہیں کیا تم لوگوں نے۔" ریوٹا نے

منہ بنایا۔

"ہمیں تو یہی محسوس ہو رہا ہے — جیسے سمندر میں سفر کرتے صدیاں بیت گئی ہوں۔" محمن نے پریشان ہو کر کہا۔

"ارے نہیں — ابھی تو کچھ گھنٹے گزرے ہیں۔" ریوٹا ہنسی۔

"اچھا — جیسے آپ کی مرضی — بھلا ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔"

"تو پھر آؤ — انہیں باندھیں — ریشم کی رسی شارن کے پاس موجود ہے — شارن رسی پھینک دو۔"

"او کے باس۔"

فوراً ہی رسی کا ایک لچھا ان کے قدموں میں آ کر گرا۔

"میرے آدمیوں نے مستولوں پر پوزیشن لے رکھی ہے — وہ نہایت آسانی سے تم لوگوں کو نشانہ بنا سکتے ہیں — اس لیے حرکت کرنے کی کوشش جان کو لے سکتی ہے — اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔"

"بہت بہتر — نہیں کریں گے حرکت — اور فرمائیں۔" فاروق نے خوش ہو کر کہا۔

تینوں انہیں باندھنے لگے — انھوں نے پہلے ہاتھ کمر پر باندھے، پھر پاؤں باندھے — اس کے بعد ریوٹا نے چہکتی آواز میں کہا:

"میری ایک تجویز ہے مسٹر ڈونل۔"

"ضرور کہو ریوٹا۔"

"سنا ہے، یہ لوگ بہت خطرناک ہیں۔ کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو آزاد کرا لیتے ہیں۔ کیوں نہ ہم ان سب کو ایک ساتھ بھی باندھ دیں۔ میرا مطلب ہے۔ انھیں ایک دوسرے کے ساتھ کھڑا کرکے رسی کے بل ان کے گرد کس دیے جائیں۔ اس طرح ان سب کا ایک بہت بڑا بنڈل بن جائے اور یہ حرکت تک نہیں کر سکیں گے۔ کتنا پُر لطف نظارا ہو گا۔ وہ بھی۔"

"ترکیب واقعی شان دار ہے۔" رونل ہنسا۔

"اور انوکھی بھی۔" شیلاک بولا۔

اس ترکیب پر عمل کیا گیا۔ انھیں ایک جگہ نزدیک نزدیک کھڑا کیا گیا اور پھر ریشم کی ڈوری ان کے گرد لپٹنے لگی۔ آخر بے شمار بل دینے کے بعد رونل بولا:

"لو انسپکٹر جمشید تمھارا بنڈل تیار ہے۔"

"شکریہ۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"کیا اب ہم اُترنے کی تیاری کریں۔" شیلاک نے جزیرے کی طرف منہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"ابھی ایک کام رہتا ہے۔ بہت ضروری کام۔" رونل نے پُر اسرار انداز میں کہا۔

"کون سا کام؟"

"آپ دونوں کا دراصل انسپکٹر جمشید پارٹی سے سابقہ نہیں پڑا۔ یہ لوگ اس قسم کی قید اور بند سے آزاد ہونے میں بہت ماہر ہیں۔ اور عام طور پر ریشم اور نائیلون کی رسیاں انھیں جکڑے نہیں رکھ سکتیں۔"

"وہ کیسے۔ یہ لوگ کیا کرتے ہیں؟"

"ان کے پاس ایک چاقو ہے۔ یہ اس چاقو سے کام نکال لیتے ہیں۔"

"لیکن ہم تو ان کے ہاتھ کمر پر باندھ چکے ہیں۔ یہ چاقو کیسے نکالیں گے۔"

"نکال لیتے ہیں۔ اس کا صرف اور صرف یہ طریقہ ہے کہ۔"

یہ کہتے ہوئے رونل نیچے بیٹھ گیا۔ اور محمود کا دایاں پاؤں پکڑ لیا۔

"ارے ارے۔ یہ کیا بھئی۔ مسٹر رونل۔ آپ میرے پیر کیوں پکڑ رہے ہیں۔ مجھے گناہ گار نہ کریں۔ مم۔ میں نے آپ کو معاف کیا۔"

"دماغ تو نہیں چل گیا۔ بھلا مسٹر رونل تم سے معافی مانگیں گے۔" ریوٹا بھنا اٹھی۔

"اور کیا۔ معافی مانگیں ان کے دشمن۔" فرحت مسکرائی۔

"یہ رہا وہ چاقو۔ جس کی مدد سے یہ رسیاں کاٹ لیتے ہیں۔"

"ارے! یہ کہاں تھا؟" ریوٹا حیران رہ گئی۔

"محمود کے جوتے کی ایڑی میں۔"

"اوہ۔" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

ادھر ان پر اوس پڑ گئی۔ بنڈل کی صورت میں بندھ جانے کے بعد بھی انہیں امید تھی۔ وہ کسی نہ کسی طرح چاقو نکال ہی لیں گے اور رسیاں کاٹ لیں گے، لیکن چاقو قبضے سے نکل جانے کی صورت میں آزاد ہونے کے بارے میں وہ پُر امید نہیں رہے تھے۔

رونل، ریوٹا اور شیلاک چند سیکنڈ تک ان کی طرف دیکھتے رہے۔ آخر رونل نے کہا:

"اچھا بھئی۔ ہم لوگ ذرا جزیرے کا جائزہ لے لیں۔ ہمیں امید ہے۔ جب ہم لوٹیں گے۔ تم لوگ اسی پوزیشن میں ہمیں ملو گے۔"

ان کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکلا۔ وہ تینوں انجن روم کی طرف چلے گئے، پھر جہاز رک گیا اور انھوں نے بھی جزیرے کو صاف طور پر دیکھ لیا۔ نیلے لباس والوں نے چھلانگیں لگائیں اور نیچے آ رہے۔ اس وقت انھوں نے دیکھا۔ ان کی تعداد بیس کے قریب تھی۔ ان سب کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔ وہ ان

پر طنزیہ نظریں ڈالتے ہوئے انجن روم کی طرف بڑھ گئے۔ رونل کی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی:

"مسٹر شومی۔ انجن روم سے باہر آ جاؤ۔"

"اور اگر میں آنے سے انکار کر دوں۔" اس نے چلا کر کہا۔

"اس صورت میں ہم آپ کو زبردستی نکالیں گے۔ بس ذرا انجن روم کا دروازہ توڑنا ہو گا۔"

"اچھی بات ہے۔ میں باہر آ رہا ہوں۔"

"شارن۔ امیر رانا کو بھی اس کے کیبن سے نکال لاؤ۔ جہاز چلانے کا تجربہ اسے بھی ہے۔ ہم کوئی ایسا آدمی جہاز پر نہیں چھوڑ سکتے۔ جو جہاز چلانا جانتا ہو۔"

"او کے سر۔" شارن بولا اور تیز تیز قدم اٹھاتا چلا گیا۔

جلد ہی شارن امیر رانا کو لیے ان کے پاس سے گزرا۔ اس کے ہاتھ سر سے بلند تھے۔ اس نے بوکھلائی ہوئی نظروں سے ان سب کو دیکھا۔ اور بولے بغیر نہ رہ سکا:

"یہ۔ یہ کیا ہے؟"

"بنڈل۔ انسانی بنڈل۔ شاید تم نے زندگی میں ایسا بنڈل پہلے کبھی نہیں دیکھا ہو گا۔" شارن ہنسا۔

"نن۔ نہیں۔" وہ ہکلایا۔

"تو پھر جی بھر کے دیکھ لو۔" اس نے کہا۔

"نہیں شارن۔ جی بھر کر دیکھنے کی مہلت دینا تمھارا کام نہیں۔ ہمیں جزیرے پر اُترنا ہے۔ اور امیر رانا کو بھی اپنے ساتھ لے جانا ہے۔"

"لیکن اس جزیرے پر اُترنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟" امیر رانا نے حیران ہو کر کہا۔

"کاش ہمیں معلوم ہوتا۔ ہم کس سمت جا رہے ہیں۔ اس صورت میں ہم ہرگز نہ اُترتے۔"

"لیکن سمت معلوم کرنے کے سلسلے میں یہ جزیرہ کیا مدد کرے گا؟" امیر رانا نے حیران ہو کر کہا۔

"مدد نہ کرے، لیکن ہم اس جزیرے کا جائزہ ضرور لیں گے۔"

"ارے! میں سمجھ گیا۔ یہ لوگ کیا چاہتے ہیں۔" انسپکٹر جمشید کے منہ سے اچانک نکلا۔

"کیا چاہتے ہیں؟" رونل کی حیرت زدہ آواز سنائی دی۔

"آپ جزیرے پر جائیں۔ یہ بات میں صرف اپنے ساتھیوں کو بتاؤں گا۔"

"ہمیں ضرورت بھی نہیں۔ معلوم کرنے کی۔ آؤ چلیں۔"

وہ انھیں جہاز کی سیڑھی اترتے دیکھتے رہے۔ اور جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے تو محمود نے بے تابانہ لہجے میں کہا:

"یہ۔ یہ یہاں کیا کرنا چاہتے ہیں ابا جان؟"

"حالات غیر یقینی ہو گئے ہیں۔ ایک تو ان کے پاس ایٹم بم نہیں رہا، دوسرے سمت بتانے والا آلہ انھوں نے خود ہی تباہ کر دیا۔ اب یہ کریں تو کیا۔ بیگال تک پہنچنے کے فی الحال کوئی آثار نظر نہیں آ رہے۔ تم ہی بتاؤ۔ ان حالات میں یہ کیا کر سکتے ہیں۔ رات کے وقت انھیں اس جزیرے پر اُترنے کی کیا ضرورت تھی؟" انسپکٹر جمشید نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔

"تو بتایئے نا۔ یہ کیا کرنا چاہتے ہیں؟" آصف نے بے چین ہو کر کہا۔

"اتنا کچھ میں نے بتا دیا۔ اب تم بھی کچھ بتاؤ۔"

"میں سمجھ گیا جمشید۔ یہ لوگ سونا اس جزیرے پر منتقل کرنا چاہتے ہیں؟" خان رحمان بول پڑے۔

"اوہ!" سب کے منہ سے نکلا۔

"ہاں خان رحمان۔ بالکل یہی بات ہے۔ ورنہ ان کے سر نہیں پھرے کہ رات کے وقت ایک بے آباد جزیرے پر اُتر جائیں۔"

"اب سوال یہ ہے کہ ہم کیا کریں؟" آصف نے پریشان آواز میں کہا۔

"کیوں نہ ذرا دیر کے لیے بیٹھ جائیں۔ اس طرح کب تک کھڑے رہیں گے؟"

"لیکن بیٹھنا بھی تو بہت مشکل ہے۔ رسی کا دباؤ اور بڑھ جائے گا۔"

"اگر ہم کسی طرح انجن روم کے پاس پہنچ جائیں تو شاید کچھ کر سکیں۔" انسپکٹر کامران مرزا نے کچھ سوچ کر کہا۔

"جی انکل۔ بھلا کیا کر سکیں گے۔" فرحت نے حیران ہو کر کہا۔

"یہ بعد کی بات ہے۔ پہلے تو وہاں پہنچنے کی کوشش کریں۔"

"آخر کیسے ہم سب کے پاؤں بندھے ہوئے ہیں۔ اور پھر جسم مجموعی طور پر آپس میں جکڑے ہوئے ہیں، حرکت کریں تو کیسے؟" فاروق نے منہ بنایا۔

"ہم پیروں کے انگوٹھوں کو آگے کھسکا کھسکا کر انجن کے نزدیک پہنچ سکتے ہیں۔" انسپکٹر جمشید نے مسکرا کر جواب دیا۔ لمحے بھر کے لیے وہ حیران رہ گئے۔ پھر ان سب نے اپنے اپنے انگوٹھوں کو انجن روم کی طرف کھسکانا شروع کیا۔ انھوں نے محسوس کیا۔ ان کا بنڈل چیونٹی کی رفتار سے انجن روم کی طرف بڑھنے لگا تھا۔

ان پر جوش کا عالم طاری ہو گیا۔ وہ انگوٹھوں کو اور بھی تیزی سے حرکت دینے لگے۔ اور پھر۔ آخر کار۔ پورے پندرہ منٹ کی مسلسل کوشش کے بعد وہ انجن روم کے نزدیک

پہنچ گئے۔ جب کہ عام حالات میں یہ فاصلہ صرف چند سیکنڈ کا تھا۔ اب ان کے منہ انسپکٹر کامران مرزا کی طرف مڑ گئے۔ محمود کی آواز ابھری:

"اب کیا کرنا ہے انکل؟"

جزیرے پر

"انجن روم میں میں نے ایک شکاری چاقو اڑسا ہوا دیکھا تھا، اگر کسی طرح ہم وہ چاقو حاصل کر لیں تو مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔" انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"لیکن کیسے انکل۔ ہم یہاں تک تو بے شک پہنچ گئے۔ انجن کے اندر تو کسی صورت بھی داخل نہیں ہو سکتے، کیوں کہ بنڈل اتنا بڑا ہے کہ دروازہ چھوٹا پڑ جائے گا۔" فرحت نے اُلجھن کے عالم میں کہا۔

"جس وقت ہم عرشے سے انجن کی طرف چلے تھے، یہ بات اس وقت بھی انکل کے ذہن میں ہو گی، اس کے باوجود وہ ہمیں یہاں کھینچ لائے ہیں تو لازمی بات ہے۔ ان کے ذہن میں کوئی ترکیب ہو گی۔"

"ہاں! اس میں کوئی شک نہیں۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔ سب پر ایک نظر ڈالی اور کہنے لگے:

"ہم سب کو بہت زور لگانا پڑے گا۔"

"جی۔ کیا مطلب۔ کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ زور لگا کر ریشم کی ڈوری کے بل توڑ دیں گے۔" محمود نے حیران ہو کر کہا۔

"نہیں۔ میں جانتا ہوں۔ بل ہم سے نہیں توڑے جا سکیں گے۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ ہم سب مل کر رسی پر باہر کی طرف زور لگائیں۔ اس طرح شاید ہمارے درمیان والا شخص کچھ ہلنے جلنے کے قابل ہو جائے۔ اور ہمارے درمیان سے نکل جائے۔"

"لیکن کیسے۔ نکل تو وہ اس صورت میں سکتا ہے، جب اس کے ہاتھ پیر کھلے ہوں۔" پروفیسر داؤد نے اعتراض کیا۔

"ہاں! آپ بھی ٹھیک کہتے ہیں۔ خیر میں وضاحت کرتا ہوں، اس وقت اشفاق ہم سب کے درمیان میں ہے۔ اس کی کمر کی طرف فرزانہ ہے۔ اشفاق کا قد لمبا ہے۔ اگر وہ اپنے پنجوں پر کھڑا ہو جائے تو اور بھی اونچا ہو جائے گا۔ ادھر فرزانہ خود کو تھوڑا سا جھکا دے اور اپنا منہ نیچے کر کے اس کے ہاتھوں تک لے جائے تو شاید یہ اپنے دانتوں کے ذریعے اس کی رسیاں کھول سکے۔"

"اوہ!" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"ترکیب قابلِ عمل ہے۔" فاروق نے خوش ہو کر کہا۔

"تو پھر۔ اشفاق بھائی۔ آپ ذرا اونچے ہونے کی کوشش کریں اور میں نیچے۔" فرزانہ نے بے چارگی کے عالم میں کہا۔

"اچھی بات ہے، لیکن مشکل یہ ہے کہ ہم بہت بُری طرح جکڑے ہوئے ہیں۔" اشفاق نے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ ہم سب باہر کی طرف زور لگاتے ہیں، اس طرح تم خود کو قدرے اوپر اٹھا سکو گے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اچھی بات ہے۔" اشفاق نے بوکھلا کر کہا۔

"اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے۔" شوکی نے تیز آواز میں کہا۔

"م۔ میں۔ گھبرا اس لیے رہا ہوں کہ آپ سب کے سب صرف اور صرف میری طرف دیکھ رہے ہیں۔"

"تم غلط فہمی میں مبتلا ہو۔ ہم فرزانہ کی طرف بھی دیکھ رہے ہیں۔" فاروق نے ہنس کر کہا۔

"شش۔ شکریہ۔" اشفاق بولا۔

"یہاں شکریے کا کیا مقام؟" فرزانہ حیران ہو کر بولی۔

"آپ کا بھی شکریہ۔ کہ آپ میرے ہاتھ کھولنے کی کوشش کریں گی۔" اشفاق بولا۔

فرزانہ نے جہاں تک ممکن ہو سکا، نیچے ہونے کی کوشش کی اور اشفاق نے اوپر۔ اس کوشش کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے

دانت رسی سے ٹکرا گئے۔

"مبارک ہو۔ میرے دانت رسیوں سے جا لگے ہیں۔"

"مبارک بعد میں دینا۔ پہلے گرہ کھولنے کا کام کرو۔" آصف نے جل کر کہا۔

"تو اس میں جلنے بھننے کی کیا ضرورت ہے۔" فرزانہ نے بھی تلملا کر کہا۔

"اوہو۔ بھئی یہ موقع مہابھارت شروع کرنے کا ہرگز نہیں۔" انسپکٹر جمشید گھبرا گئے۔

"جی بہتر۔ فکر نہ کریں۔ میں اب خیال رکھوں گا۔" اشفاق نے فوراً کہا۔

"کیا خاک خیال رکھو گے۔ باتیں کیے جا رہے ہو اور گرہ کھلواتے نہیں۔" آصف نے جل کر کہا۔

"مجھے خاموش رہنے کا موقع دو گے تو گرہ کھلواؤں گا نا۔" اشفاق نے بھی بھنا کر کہا۔

"معلوم ہوتا ہے۔ اب گرہ مشکل ہی کھلے گی۔" انسپکٹر کامران مرزا مایوسانہ انداز میں بولے۔

"کیوں انکل۔ آپ نے یہ اندازہ کیسے لگا لیا۔" فرزانہ بولی۔

"اس لیے کہ رسی دانتوں سے کھولنی ہے۔ اور دانت بولنے کے سلسلے میں رسی پر جم ہی نہیں سکتے۔"

"جی ہاں۔ بات تو ٹھیک ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ ٹھیک بات ان کی سمجھ میں نہیں آ رہی۔"

"اللہ اپنا رحم فرمائے۔" فرحت نے منہ بنایا۔

آخر اشفاق نے تنگ آکر اعلان کرنے والے انداز میں کہا:

"میں نے ایک فیصلہ کیا ہے۔"

"کیا۔ یہ کہ رسی نہیں کھلواؤ گے۔" فاروق ہنس کر بولا۔

"نہیں۔ صرف یہ کہ جب تک رسی نہیں کھلے گی۔ کسی سے قطعاً کوئی بات نہیں کروں گا۔"

"بھئی واہ۔ اس سے اچھا فیصلہ تو ان حالات میں کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ فرزانہ کو اس فیصلے کی اور بھی زیادہ ضرورت ہے۔"

"لیکن مزہ تو تب ہے۔ جب اس پر عمل بھی کیا جائے۔" فرحت بولی۔

"کیوں نہیں۔ میں اور اشفاق بھائی اب نہیں بولیں گے۔ کیوں اشفاق بھائی ٹھیک ہے نا۔"

"میں اس سوال کا جواب بھی نہیں دے سکتا۔ ورنہ خاموش کیسے رہ سکوں گا۔" اشفاق نے بے چارگی کے عالم میں کہا۔

"بھئی واہ۔ یہ ہوئی نا بات۔" فاروق ہنس پڑا۔

"خان رحمان۔ آؤ ہم مل کر دعا کریں۔" ایسے میں انسپکٹر جمشید

بول پڑے۔

"کیسی دعا جمشید؟" خان رحمان کی بجائے پروفیسر داؤد بولے۔

"یہ کہ جب تک رسی نہ کھل جائے۔ اللہ تعالیٰ انھیں خاموش رہنے کی توفیق عطا فرما دے۔"

"اوہ اچھا۔" وہ ہنسنے لگے۔

فرزانہ نے اپنے دانت گرہ پر جما دیے۔ ان پر سنسنی سی طاری ہو گئی۔ اب سب کے دل دھک کر رہے تھے۔ کیوں کہ ان کے کامیاب یا ناکام ہونے کا دارومدار گرہ کھلنے پر تھا۔ گرہ نہ کھلنے کی صورت میں ان کے ملک کا سونا بنگال پہنچ سکتا تھا۔ اور ان کی زندگیاں بھی داؤ پر لگی ہوئی تھیں۔ فرزانہ پورے تین منٹ تک گرہ سے الجھی رہی۔ اشفاق ایڑیاں اٹھائے تنگ آگیا، لیکن ضبط کیے کھڑا رہا۔ کر بھی کیا سکتا تھا۔ ادھر فرزانہ کے دانت بری طرح دکھ رہے تھے، رسی اگر ریشم کی نہ ہوتی تو یہ کام زیادہ مشکل ثابت نہ ہوتا۔ لیکن ریشم کی ڈوری کی گرہ کھولنا۔ وہ بھی صرف دانتوں سے، آسان کام نہیں تھا۔ آخر تین منٹ بعد فرزانہ بول اٹھی:

"گرہ کھسک رہی ہے۔"

"تم پھر بولیں۔ پہلے پوری طرح کھسکا لو۔ پھر جی بھر کر بول لینا۔" محمود نے برا مان کر کہا۔

"اوہ اچھا۔" وہ بولی اور پھر گرہ پر جٹ گئی۔

آخر مزید تین منٹ بعد گرہ کھل گئی۔ فرزانہ اشفاق کے ہاتھوں کے بل کھولتی چلی گئی۔ جلد ہی اس کے ہاتھ الگ ہو گئے۔ اس نے چہک کر کہا:

"میرے ہاتھ آزاد ہو گئے ہیں۔"

"اب تم ہمارے درمیان سے نکل جاؤ۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"لل۔ لیکن کیسے نکلوں۔ ٹانگوں کے درمیان تو جگہ نہیں ہے نکلنے کی۔"

"تو پھر ہمارے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر نکل جاؤ۔" شوکی نے پُر جوش آواز میں کہا۔

"اوہ ہاں! یہ ٹھیک رہے گا۔" اس نے کہا اور لگا کوشش کرنے۔

بنڈل میں سے نکلنے میں بھی اسے چار منٹ لگ گئے۔ اب اس نے اپنے پیروں کی رسی کھولی۔ پھر جلدی سے انجن روم میں داخل ہو گیا۔ دوسرے ہی لمحے اس کی آواز سنائی دی:

"انکل۔ یہاں تو کوئی چاقو نہیں ہے۔"

"اوہو۔ اچھا۔ پھر شاید وہ چاقو ساتھ لے گئے ہیں۔ خیر۔ تم کوئی اور چیز تلاش کر لو۔ جس سے رسی کاٹی جا سکے،

اگر نہ ملے تو پھر تمہارے ہاتھ تو آزاد ہو ہی چکے ہیں۔"

"جج۔ جی ہاں!" اشفاق بولا۔

اشفاق کو رسی ہاتھ سے بھی کھولنا پڑی۔ پھر جس کے ہاتھ کھلتے چلے گئے وہ دوسرے کی رسیاں کھولنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد سب کے سب آزاد کھڑے تھے۔

انسپکٹر جمشید اور انسپکٹر کامران مرزا نے سب سے پہلے انجن روم کا جائزہ لیا۔ پھر وہ نیچے کی طرف دوڑے۔ سٹور اور اس کے آس پاس سے انھیں تین رائفلیں مل گئیں۔ رونل اور اس کے ساتھیوں نے ان رائفلوں کی طرف کوئی توجہ نہیں دی تھی۔

اب انھوں نے مناسب جگہوں پر پوزیشن لے لی۔ اور دشمنوں کا انتظار کرنے لگے۔ انھیں ایک گھنٹے تک انتظار کرنا پڑا، پھر چند سائے اوپر آتے نظر آئے۔

"دیکھو بھئی۔ ہمیں جہاز پر کپتان شومی اور امیر دانا کی ضرورت ہے۔ جب تک وہ اوپر نہیں آ جاتے۔ اس وقت تک باقاعدہ جنگ شروع نہیں کر سکتے، کیوں کہ اس صورت میں رونل اور اس کے ساتھی ان دونوں کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔" انسپکٹر جمشید نے سرگوشی کی۔

"ہوں۔ بات ٹھیک ہے۔" خان رحمان بولے۔

انھوں نے دم سادھ لیے۔ آخر تین آدمی عرشے پر آ گئے۔ وہ انجن کے پاس سے گزرے اور آگے بڑھے۔ اچانک ایک کے منہ سے نکلا:

"ارے ۔ وہ ۔ وہ ۔ کہاں گئے۔"

"کک ۔ کون۔" دوسرا بولا۔

"وہ سب لوگ ۔ جنھیں ہم نے بنڈل کی صورت میں یہاں کھڑا کر دیا تھا۔"

"اوہ!" دو کے منہ سے نکلا۔

پھر وہ بلا کی رفتار سے مڑے اور طوفانی انداز میں سیڑھی اترتے چلے گئے۔ جلد ہی ساحل کی طرف سے آواز آئی:

"کیا بات ہے شارن ۔ اتنی جلدی واپس آ رہے ہو۔" آواز رونل کی تھی۔

"باس ۔ وہ ۔ وہ لوگ نہیں ہیں۔"

"کون لوگ؟"

"انسپکٹر جمشید وغیرہ ۔ جہاں ہم نے انھیں بنڈل کی صورت میں کھڑا کیا تھا ۔ اب وہاں نہیں ہیں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے ۔ شاید تمھیں غلط فہمی ہوئی ہے ۔ ٹھہرو ۔ میں دیکھتا ہوں ۔ مسٹر شیلاک تم کپتان شومی اور امیر رانا کا خیال رکھنا۔"

"ٹھیک ہے ۔ فکر نہ کریں۔"

جلد ہی رونل اوپر آتا نظر آیا ۔ وہ سیدھا اس جگہ پہنچا ۔ جہاں پہلے بنڈل موجود تھا۔

"ارے ۔ وہ لوگ تو واقعی یہاں نہیں ہیں۔" اس کے منہ سے نکلا۔

"اس کا مطلب ہے جہاز پر خطرہ ہے ۔ ہم بھی آ رہے ہیں مسٹر رونل۔" ادھر سے ریوٹا کی آواز سنائی دی۔

"ہاں! ٹھیک ہے ۔ سب لوگ آ جائیں ۔ وہ ضرور ادھر ادھر چھپ گئے ہیں ۔ مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ انھوں نے خود کو کھول کس طرح لیا ۔ اب تو ان کے پاس چاقو بھی نہیں تھا۔" رونل نے بلند آواز میں کہا۔

"خیر کوئی بات نہیں ۔ وہ اب بھی کامیاب نہیں ہو سکتے، کپتان اور نائب کپتان تو ہمارے قبضے میں ہیں۔" شیلاک بولا۔

"ہوں ۔ جلدی آ جائیں۔"

وہ اب بھی دم سادھے دبکے رہے ۔ یہاں تک کہ سب لوگ اوپر آ گئے ۔ کپتان شومی اور امیر رانا بھی آ گئے۔

"انسپکٹر جمشید ۔ تم لوگ کہاں ہو ۔ بزدلوں کی طرح چھپ کیوں گئے ۔ سامنے آؤ نا۔"

"ہم وہیں ہیں ۔ جہاں سے ہم کو بھی کچھ اپنی خبر نہیں

آتی؟" فاروق گنگنایا۔

"کیا مطلب؟" رونل حیران ہو کر بولا۔

"مطلب یہ کہ ہم وہاں ہیں جہاں کچھ دیر پہلے تم لوگوں نے پوزیشن لے رکھی تھی۔"

"اوہ!" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"اور یہ بھی خیال نہ کریں کہ ہم خالی ہاتھ ہوں گے۔ ہمارے پاس رائفلیں بھی ہیں۔ رائفلیں جو سٹور میں پڑی رہ گئی تھیں۔ مسٹر رونل۔ تمہارے آدمیوں کو رائفلیں چھوڑ کر جہاز سے نہیں جانا چاہیے تھا۔" انسپکٹر کامران مرزا کے لہجے میں طنز تھا۔

"یہ۔ یہ تم سے کیا غلطی ہوئی۔" رونل دھاڑا۔

"خیر۔ اب ان پر گرجنے اور برسنے کی ضرورت نہیں۔ مہربانی فرما کر اب تم لوگ ہاتھ اوپر اٹھا دو۔ تاکہ ہم تمہارے ساتھ وہی سلوک کر سکیں جو تم نے ہم سے کیا تھا۔ اسے کہتے ہیں اینٹ کا جواب پتھر سے دینا۔" فاروق نے چہک کر کہا۔

"ہم ہاتھ نہیں اٹھائیں گے۔" شیلاک غرّایا۔

"ک۔ کیوں؟" شوکی نے بوکھلا کر پوچھا۔

"اس لیے کہ تمہارے پاس رائفلیں نہیں ہیں۔ تم جھوٹ بول رہے ہو۔"

"بھئی ہم مسلمان ہیں اور مسلمان جھوٹ نہیں بولتا۔ یہ لو۔ ثبوت کے طور پر اپنے ایک ساتھی سے ہمیشہ کے لیے رخصت لے لو۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی انسپکٹر جمشید نے گولی چلا دی۔ ایک دھماکا ہوا۔ ایک چیخ اُبھری اور رونل کا ایک آدمی اچھل کر سمندر میں جا گرا۔ ان سب پر سکتہ طاری ہو گیا۔

"اب کیا خیال ہے مسٹر رونل؟"

"ہم اب بھی ہاتھ نہیں اٹھائیں گے۔ بلکہ حالات کی باگ ڈور اب بھی ہمارے ہاتھ میں ہے۔ تم خود کو سمجھتے کیا ہو۔"

"کیسے۔ ذرا ہمیں بھی بتانا۔" انسپکٹر کامران مرزا نے اُلجھن کے عالم میں کہا۔

"تم لوگ یہ بات بھول گئے ہو کہ تمہارا واسطہ رونل، شیلاک اور ریوتا سے ہے۔ ہم تینوں اس وقت بلٹ پروف لباس میں ہیں۔ لہٰذا تمہاری گولیاں ہمارا کیا بگاڑ سکتی ہیں، رہ گئے ہمارے ساتھی۔ تم ان کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتے۔"

"کیوں جناب۔ آنکھ اٹھا کر دیکھنے میں کیا حرج ہے؟" فاروق نے گھبرا کر پوچھا۔

"لو دیکھو۔ ایک پستول کپتان شومی کی کن پٹی پر ہے اور

دوسرا امیر رانا کی۔ اب اگر تم نے رائفلیں نیچے نہ پھینکیں تو ہم ان دونوں کو جان سے مار دیں گے۔ ان کے مرنے کا نتیجہ کیا ہوگا۔ یہ تم لوگ جانتے ہی ہو گے۔" یہ کہہ کر رونل خاموش ہو گیا۔

"ہاں جانتے ہیں۔ لیکن کیا تم یہ بات بھول گئے کہ تمھارا واسطہ انسپکٹر جمشید اور انسپکٹر کامران مرزا سے ہے۔"

"اب۔ با۔ جان۔ ہم کہاں گئے۔" آفتاب نے گھبرا کر کہا۔

"ہم یہ بات جانتے ہیں۔ تو پھر۔ اس سے کیا۔" شیلاک نے بھنا کر کہا۔

"اس سے یہ کہ یہ دونوں جتنے ضروری ہمارے لیے ہیں، اتنے ہی ضروری تمھارے لیے بھی ہیں، اس لیے ہم جانتے ہیں، تم لوگ کم از کم ان دونوں کو گولی نہیں مار سکتے۔"

"اوہ!" ان تینوں کے منہ سے نکلا۔

چند لمحے خاموشی کے عالم میں گزر گئے۔ ان سب کے دل دھک دھک کر رہے تھے۔ ادھر کپتان شومی اور امیر رانا کے رنگ بالکل سفید پڑ چکے تھے۔

چند لمحے تک وہ ایک دوسرے کو اُلجھی نظروں سے دیکھتے رہے، آخر فاروق نے کہا:

"اس کا مطلب ہے۔ ہم سب کے سب ایک ہی جہاز

پر جمع ہو گئے ہیں۔"

"لیکن ہمیں سب سے زیادہ حیرت آپ لوگوں پر ہے۔ آخر آپ جہاز پر کس طرح پہنچ گئے۔" آفتاب بولا۔

"ہم مس ریوٹا اور مسٹر شیلاک کے تعاقب میں تھے۔ انھوں نے ہم سے پیچھا چھڑانے کے لیے ایک چال چلی۔ وائرلیس کے ذریعے ہمارے مُلک میں موجود اپنے ساتھیوں سے مدد طلب کی۔ ایک نیلی کار ان کی مدد کو ان سے آگے پہنچ گئی۔ انھوں نے سُرخ کار کو ایک کھڈ میں گرا کر آگ لگا دی۔ ظاہر یہ کرنا چاہتے تھے کہ یہ اس کار میں جل کر مر گئے۔ خود دُوسری کار میں بیٹھ کر آگے روانہ ہوئے۔ ہم نے کار کا جائزہ لیا تو لاشوں کا وہاں نام و نشان تک نہ تھا؛ چنانچہ اسی سمت میں اپنا سفر جاری رکھا۔ یہ سیدھے اس بحری جہاز تک آئے۔ غالباً ان کے ساتھیوں نے پہلے ہی ان کے سفر کا انتظام کر دیا تھا۔ یہ بغیر کسی دقّت کے جہاز میں سوار ہو گئے۔ ہم نے بھی ریڈی میڈ میک اپ کا سہارا لیا اور خصوصی اجازت نامہ دکھا کر جہاز میں سوار ہو گئے۔ سوال تو یہ ہے کہ آپ جہاز پر کس طرح آ گئے۔" یہاں تک کہہ کر فاروق خاموش ہو گیا۔

"ہم پکنک منانے گھر سے نکلے تھے۔ ایک ہوٹل میں ریوٹا اور شیلاک سے ملاقات ہو گئی۔ تعاقب کرتے ہوئے جنوبی جھنڈے

میں پہنچے۔ لیکن یہ نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ ہم نے سوچا۔ کیوں نہ شوکی برادرز سے ملاقات کر لی جائے۔ یہ گھر نہیں ملے۔ لیکن آئی جی صاحب سے معلوم ہوا، یہ لوگ اس جہاز پر سوار ہوتے دیکھے گئے ہیں۔ ہمیں حیرت بھی ہوئی اور اُلجھن بھی۔ آخر یہی فیصلہ ہوا کہ ہم بھی جہاز پر سوار ہو جائیں، چنانچہ ہم نے بھی ریڈی میڈ میک اپ کا سہارا لیا اور یہاں آ گئے۔ حیرت تو اس بات پر ہے کہ شوکی برادرز یہاں کیا کرنے آئے ہیں۔" آفتاب نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔

"اگر آپ کو اس بات پر حیرت ہے تو اس میں منہ بنانے کی کیا ضرورت ہے۔ خیر میں بتاتا ہوں۔ کپتان شومی نے اس جہاز پر گڑبڑ محسوس کی۔ انھوں نے جب جہاز کے سامان کی چیکنگ شروع کی تو مسٹر ٹوبین آڑے آئے اور انھیں دھمکی دی کہ خبردار۔ جہاز کی چیکنگ نہیں کی جا سکتی۔ اگر ان کی مرضی کے خلاف کوئی قدم اٹھایا گیا تو پورا جہاز بم سے اڑا دیا جائے گا۔ اس پر ٹائم بم سیٹ کر دیا گیا ہے۔ ساتھ ہی یہ دھمکی بھی دی گئی کہ پولیس کو ہرگز اطلاع نہ دی جائے۔ یہ بے چارے اُلجھن میں پڑ گئے اور ان کی اُلجھن انھیں ہمارے پاس لے آئی۔ انھوں نے فون کے ذریعے ہمیں ایک ہوٹل میں بلایا اور وہاں سے سیدھے جہاز پر لے آئے،

ہمیں گھر والوں کو اطلاع تک دینے کی اجازت نہیں دی گئی۔ نہ جانے آئی جی صاحب کو کس طرح یہ بات معلوم ہو گئی کہ ہم جہاز پر سوار ہوئے ہیں۔ ارے ہاں۔ انکل کاشان نے ہمیں دیکھ لیا تھا۔" شوکی بھی یہاں تک کہہ کر خاموش ہو گیا۔

"یہ کام ارشد نے دکھایا۔ اس نے تم لوگوں کا تعاقب کیا تھا، پھر انسپکٹر کاشان کو اطلاع دی۔ انھوں نے ساحلِ سمندر تک تعاقب کیا اور پھر چکر کاٹ کر تم لوگوں کے سامنے آ گئے۔ تم نے جس انداز میں ان سے بات کی، اس سے انھوں نے اندازہ لگایا کہ تم پُر اسرار حالات کا شکار ہو۔ چنانچہ انھوں نے آئی جی صاحب کو اطلاع دی۔ اس طرح ہمیں اطلاع ملی۔ نتیجہ یہ کہ ہم سب یہاں جمع ہیں۔" آصف بولا۔

"اور یہ سب بھی جمع ہیں۔ یعنی مسٹر رونل، مسٹر شیلاک اور مس ریٹوٹا۔ یہ لوگ ہمارے مُلک کا سونا اس جہاز میں لے جا رہے ہیں۔ سونے کو یہ بیگال لے جانا چاہتے ہیں۔ تاکہ ان کے مُلک کی حالت اور بھی بہتر اور ہمارے مُلک کی حالت بالکل ردی ہو جائے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ جہاز اب کسی نا معلوم منزل کی طرف بڑھ رہا ہے۔ پہلے یہ ضرور بیگال کی طرف جا رہا تھا، لیکن شوکی کی عقل مندی نے نوٹنگ کو

ٹھکانے لگوا دیا اور کپتان شومی نے جہاز کا رخ بدل دیا۔ سمت بتانے والا آلہ یہ پہلے ہی تباہ کر چکے ہیں۔ لہٰذا ہمیں نہیں معلوم کہ اب کس طرف جا رہے ہیں۔" انسپکٹر کامران مرزا نے کہا۔

"ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔" فرزانہ بڑبڑائی۔

"حیرت ہے۔ ایک بات کی کیا مجال کہ تمہاری سمجھ میں نہ آئے۔ ضرور اس سے کوئی غلطی ہو گئی ہے۔" فاروق نے حیرت زدہ انداز میں کہا۔

"کس سے غلطی ہو گئی ہے؟" فرحت نے اسے گھورا۔

"ایک بات سے۔" فاروق نے معصومانہ انداز میں کہا۔

"توبہ ہے تم سے۔ ہاں فرزانہ تم کیا کہہ رہی تھیں؟" آفتاب نے بے چین ہو کر کہا۔

"میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ مسٹر رونل کا پروگرام اس جہاز کو بیگال لے جانے کا ہے۔ سونا اتار کر یہ جہاز کو اس بم کے ذریعے اڑانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ تو پھر بم کے لیے اس قدر پریشان کیوں تھے۔ کیا بیگال سے انہیں کوئی اور ٹائم بم نہیں مل سکتا تھا؟"

"بات زور دار ہے۔ لیکن اس کا جواب بہت آسان ہے۔" فرحت مسکرائی۔

"بہت خوب۔ جلدی بتاؤ۔ کیا جواب ہے؟" آفتاب نے خوش ہو کر کہا۔

"جہاز کو بیگال کے آس پاس کسی جزیرے تک لے جانے کا پروگرام بنایا گیا ہو گا۔ تاکہ بیگال کے ساحل پر کوئی اس جہاز کو نہ دیکھ سکے۔ دوسرے یہ کہ اپنے ساحل پر جہاز کو تباہ بھی تو نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا کسی جزیرے کے ساحل پر اسے تباہ کیا جانا تھا۔"

"ہوں۔ یہ بات ٹھیک ہے، لیکن میرے ذہن میں بم کی وجہ سے پریشان ہونا اور وجہ سے ہے۔" انسپکٹر جمشید نے پُراسرار انداز میں کہا۔

"جی۔ کیا مطلب؟" محمود نے فوراً کہا۔

"مطلب یہ کہ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہم نے بم کو سمندر میں نہ پھینکا ہو۔ جہاز پر ہی کہیں چھپا دیا ہو۔ اور اب یہ بات ہم جانتے ہوں کہ بم کس وقت پھٹے گا۔ اس چیز سے فائدہ اٹھا کر ہم ان لوگوں پر دباؤ ڈال سکتے تھے۔" وہ کہتے کہتے چلے گئے۔

"اوہ۔ اوہ۔" کئی آوازیں اُبھریں۔

"واقعی اس بات کی طرف ہمارا دھیان نہیں گیا۔" فاروق بولا۔

"تو کیا۔ آپ لوگوں نے بم کو واقعی کسی جگہ چھپا رکھا ہے۔"
رونل نے تیز آواز میں پوچھا۔

"نہیں ۔ شوکی اسے واقعی سمندر میں پھینک چکا ہے ۔
لہٰذا اب بم کے بارے میں کسی کو بھی فکر کرنے کی ضرورت
نہیں۔" انسپکٹر جمشید بولے ۔

"چلیے ایک قصہ تو ختم ہوا۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ یہ
لوگ ہمارے ملک کا سونا کسی نہ کسی طرح اپنے ملک لے جانا
چاہتے ہیں اور ہم انہیں اس کوشش میں کامیاب نہیں ہونے
دینا چاہتے ۔ ادھر جہاز نامعلوم منزل کی طرف جا رہا ہے۔"
آصف نے بڑبڑانے کے انداز میں کہا۔

"اور انسپکٹر جمشید۔ تم تو بیگال کا ایٹمی پلانٹ تباہ کرنے چلے
تھے۔ اس پروگرام کا کیا رہا۔" رونل کے لہجے میں گہرا طنز تھا۔

"تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" انسپکٹر جمشید نے جواب دینے کی بجائے
سوال کر ڈالا۔

"ہم جانتے ہیں ۔ تمھارے ملک کی حکومت نے تمھیں اس
کی اجازت نہیں دی ۔ کیوں ٹھیک ہے نا۔"

"ہاں! اس میں کوئی شک نہیں۔"

"وہ تمھیں اجازت دے بھی کس طرح سکتی تھی ۔ ہم نے
تمھاری حکومت کو ہولناک جنگ کی دھمکی دے ڈالی ۔ اور

حکومت کو اپنی فکر پڑ گئی۔ ہمارے ایٹمی پلانٹ کا خیال تک
اس کے دل و دماغ سے نکل گیا۔"

"ہاں! یہی بات ہے۔" انسپکٹر جمشید بجھے بجھے انداز میں بولے۔

"مجھے بہت افسوس ہے، میں نے تو سوچا تھا، چلو ذرا
تفریح رہے گی۔" رونل ہنسا۔

"تفریح کا کیا ہے جناب ۔ وہ تو اس جہاز پر بھی رہ
سکتی ہے۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"اس کا مطلب ہے۔ ہمارا یہ خواب پورا نہیں ہوگا۔" محمود
نے منہ بنایا۔

"بھئی دل چھوٹا کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم لوگ حکومت
کی پالیسیوں کے خلاف تو نہیں چل سکتے۔" انسپکٹر کامران مرزا
بولے ۔

"اور یہ لوگ جب چاہے دندناتے ہوئے ہمارے ملک
میں آ جائیں اور جو جی میں آئے کر گزریں۔ اس وقت کی
مثال ہی لے لیں۔ یہ ہمارے ملک کا سونا اور جہاز اڑائے
لیے جا رہے ہیں ۔ کیا حکومت اس کی بھی اجازت دے گی؟"
آصف نے جل بھن کر کہا۔

"نہیں ۔ لیکن حکومت کر ہی کیا سکتی ہے ۔ اوّل تو یہ بات
اس کے علم میں ہی نہیں کہ قومی بنک میں اصلی سونے کی

بجائے نقلی سونا موجود ہے، دوسرے اس جہاز کے بارے میں وہ مطمئن ہیں۔ کہ ہم اس پر سوار ہو چکے ہیں، حالات کو دیکھ لیں گے۔" انسپکٹر کامران مرزا نے کہا۔

"خیر۔ سوال یہ ہے کہ اب کیا پروگرام ہے۔" فرزانہ بولی۔

"جب تک یہ جہاز کسی کروٹ نہیں بیٹھ جاتا، اس وقت تک کیا کہا جا سکتا ہے۔ کیوں مسٹر رونل۔" دیوتا نے پہلی مرتبہ گفتگو میں حصہ لیا۔

"ہاں۔ آخر ہم کسی نہ کسی ساحل پر تو لگیں گے۔ اس کے بعد سوچا جائے گا۔ کہ کیا کرنا ہے۔" شیلاک بولا۔

"تو پھر اس طرح کب تک کھڑے رہیں گے۔ کپتان شومی سے کہا جائے کہ وہ جہاز کو یہاں سے لے چلیں۔" انسپکٹر جمشید نے بھناتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"یہ صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ تم رائفلیں پھینک دو اور خود کو ہمارے حوالے کر دو۔ اتنا اندازہ تو تم لوگوں کو ہے ہی کہ یہ رائفلیں ہم تینوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔"

"یہ تمھارے ساتھیوں کا تو صفایا کر سکتی ہیں۔" فاروق چہکا۔

"ہمارے زیادہ تر ساتھی اِدھر اُدھر پوزیشن لے چکے ہیں۔ کچھ ابھی ساحل پر ہیں۔ لہٰذا ہمیں ان کے بارے میں کوئی پریشانی نہیں ہے۔"

"ہوں۔ پھر فیصلہ کیسے ہو، ہم بھی رائفلیں پھینکنے پر تیار نہیں، کیوں نہ اسی پوزیشن میں روانہ ہو جائیں۔" انسپکٹر کامران مرزا نے تجویز پیش کی۔

"نہیں۔ ہم غیر یقینی حالات میں سفر کرنے کے عادی نہیں ہیں۔ یا تو تم خود کو ہمارے حوالے کر دو یا پھر ہمیں اپنے قبضے میں لے لو۔" رونل نے بلند آواز میں کہا۔

"بات پسند آئی، لیکن اس کا طریقۂ کار کیا ہوگا؟"

"ایک عدد مقابلہ۔ ہم تین سے تم میں سے کوئی تین مقابلہ کر لیں۔ جس پارٹی کے دو آدمی جیت گئے، فیصلہ اسی کے حق میں ہو جائے گا۔ دوسری پارٹی ہتھیار ڈال دے گی۔"

"ترکیب بری نہیں۔ سوال یہ ہے کہ مقابلہ کس طرح ہوگا۔"

"ہتھیاروں کے بغیر مقابلہ ہوگا۔ تمام ہتھیار پہلے ہی سمندر میں پھینک دیے جائیں گے۔" رونل نے کہا۔

"میرے خیال میں یہ عقل مندی نہیں ہوگی۔ جہاز کو کوئی اور خطرہ بھی تو پیش آ سکتا ہے۔ اس وقت رائفلوں کی ضرورت پیش آئی تو افسوس ہوگا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"یہ بات بھی ٹھیک ہے۔ تو پھر رائفلوں کو ایک جگہ باندھ

کر ڈال دیا جائے۔ جو پارٹی جیت جائے۔ رائفلیں اسی کی۔" شیلاک نے پُر جوش لہجے میں کہا۔

"ہمیں منظور ہے۔" انسپکٹر کامران مرزا نے اعلان کیا۔

"اپنی رائفلیں پھینک دو۔"

"ہم انھیں باندھ کر مستول سے لٹکا رہے ہیں۔ اس کے بعد ہم نیچے چھلانگیں لگائیں گے۔" انسپکٹر جمشید نے فوراً کہا۔

"چلیے۔ یوں ہی سہی۔"

رائفلیں باندھ کر لٹکا دی گئیں۔ رونل اور اس کے ساتھیوں نے بھی اسلحہ باندھ کر ایک طرف ڈال دیا۔ ساتھ ہی انھوں نے نیچے چھلانگیں لگا دیں۔ پروفیسر داؤد عرشے پر ہی ایک کونے میں دبکے ہوئے تھے۔ وہ وہاں سے نکل آئے۔

"یہاں لڑنے کے لیے کافی جگہ نہیں ہے۔ مزا نہیں آئے گا۔" انسپکٹر جمشید نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

"تو پھر۔ آپ کیا چاہتے ہیں؟" ریوٹا نے انھیں گھورا۔

"کیوں نہ مقابلہ جزیرے پر ہو۔" انھوں نے کہا۔

"میرے خیال میں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔" رونل نے اپنے دونوں ساتھیوں کی طرف دیکھا۔

"ٹھیک ہے، ہمیں بھی کوئی اعتراض نہیں۔" شیلاک نے کہا۔

"تو پھر یہ مقابلہ ابھی اور اسی وقت چاند کی روشنی میں ہوگا۔" ریوٹا ہنسی۔

"لیکن آنٹی۔ اس میں ہنسی کی کیا بات ہے۔" فرحت نے منہ بنایا۔

"رونے کی بھی تو کوئی بات نہیں ہے۔ کیوں ٹھیک ہے نا۔" ریوٹا اور بھی زور سے ہنسی۔

"پتا نہیں۔ رونے کی بات ہے یا نہیں، کم از کم ہنسنے کی نہیں ہے۔" فرزانہ نے فرحت کا ساتھ دیا۔

"مجھے باتوں میں الجھانے کی کوشش نہ کرو۔" ریوٹا بولی۔

"بہت اچھا۔ اب نہیں کریں گے۔ ہاں۔ ذرا یہ بتا دیں۔ اب کس کو الجھانے کی کوشش کریں۔" فرحت نے جلدی سے کہا۔

ریوٹا نے اسے اس طرح گھورا جیسے اس کا دماغ چل گیا ہو۔ اور پھر وہ جہاز سے اترنے لگے۔ رونل نے سب سے پہلے کپتان شومی اور امیر رانا کو اترنے کا اشارہ کیا تھا۔

"شارن تم ان دونوں کا خیال رکھو گے۔ کہیں یہ جزیرے سے کھسک کر جہاز پر نہ پہنچ جائیں۔"

"اوکے سر۔" شارن بولا۔

وہ سب جزیرے پر آگئے۔ درمیان میں ایک بہت کھلا میدان تھا۔ اس میدان کے چاروں طرف بڑے بڑے درخت

تھے ۔ چاند کی روشنی نے جزیرے کو پوری طرح روشن کر دیا:

" سب سے پہلے تو یہ فیصلہ ہو جانا چاہیے کہ کس کا مقابلہ کس کے ساتھ ہوگا۔" رونل نے ان کی طرف دیکھا۔

" انسپکٹر کامران مرزا ۔ آپ کس سے مقابلہ کرنا پسند کریں گے۔"

" ان میں سے جو بھی میرے حصے میں آیا۔" وہ مسکرائے۔

" ٹھیک ہے ۔ مسٹر رونل ۔ آپ سے میرا مقابلہ ہوگا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

" تو پھر شیلاک سے میں لڑوں گا۔" انسپکٹر کامران مرزا نے کہا۔

" رہ گئی آنٹی ریوٹا ۔ ان سے کون لڑے گا۔" فاروق گنگنایا۔

" میں جو موجود ہوں۔" خان رحمان سینے پر ہاتھ رکھ کر آگے بڑھے۔

انسپکٹر جمشید نے الجھن کے عالم میں ریوٹا اور خان رحمان کو دیکھا ، آخر بولے:

" خان رحمان ۔ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ریوٹا سے فرزانہ مقابلہ کرے ۔ تم ایک عورت کا مقابلہ کرتے ہوئے اچھے نہیں لگو گے۔"

" تت ۔ تو کیا تمھارے خیال میں فرزانہ اس کا مقابلہ کر لے گی۔" انھوں نے بوکھلا کر کہا۔

" ہاں کیوں نہیں۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

" نہیں بھئی ۔ یہ جوڑ برابر کا نہیں ہوگا۔" خان رحمان نے

نفی میں سر ہلایا:

" میرا بھی یہی خیال ہے ۔ اپنے سے کافی چھوٹی بچی سے لڑتے ہوئے مجھے ذرا بھی مزا نہیں آئے گا۔" ریوٹا نے منہ بنایا۔

" تو پھر میری ایک تجویز ہے۔" ایسے میں فرحت بول اٹھی۔

" چلو ۔ تم بھی اپنی تجویز بتاؤ۔"

" میں اور فرزانہ مل کر ریوٹا صاحبہ کا مقابلہ کریں گی۔"

" ویری گڈ ۔ یہ ہوئی نا بات۔" ریوٹا خوش ہوگئی۔

" چلیے ۔ ایک بات تو طے ہوئی ۔ اب یہ بھی فیصلہ کر لیا جائے کہ تینوں مقابلے ایک ساتھ ہوں گے یا پھر باری باری۔" رونل نے جلدی جلدی کہا۔

" جو مزا الگ الگ مقابلے میں ہے ، ایک ساتھ کئی مقابلوں میں کہاں ۔ دیکھنے والے تین تین طرف کس طرح دیکھیں۔"

" ہوں ٹھیک ہے ۔ واقعی اس طرح لطف نہیں رہے گا ۔ سب سے پہلے میرے اور انسپکٹر جمشید کے درمیان مقابلہ ہوگا۔" رونل نے کہا اور میدان میں آگیا ۔ انسپکٹر جمشید بھی اس کی طرف بڑھے ۔ ایسے میں ایک درخت پر سے آواز آئی:

" مسٹر رونل ۔ اب آپ لوگوں کو مقابلہ کرنے کی ضرورت نہیں ۔"

وہ چونک اٹھے ۔ آواز شارن کی تھی۔

"کیا مطلب۔ شارن تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"میں چار پستول جزیرے پر گرا کر چلا گیا تھا۔ یہاں آتے ہی ہم نے وہ اٹھا لیے۔ اب سب لوگ میری زد پر ہیں۔ میرے دونوں پستولوں میں چودہ گولیاں ہیں۔ اور میرا نشانہ بہت پختہ ہے۔ ان کی تعداد بھی کل چودہ ہے۔ گویا ہر ایک کے حصے میں ایک گولی آجائے گی۔ ادھر میں دو آدمیوں کے ساتھ کپتان شومی اور ایرانا کو جہاز پر بھیج چکا ہوں۔ ان کی کن پٹیوں پر بھی پستول رکھ کر جہاز تک لے جایا گیا ہے۔ گویا جہاز پر اب پھر ہمارا قبضہ ہے۔ اب ہم ان لوگوں کو یہیں چھوڑ کر روانہ ہو سکتے ہیں۔ آپ لوگ جلد از جلد جہاز پر پہنچیں۔"

جزیرے پر سناٹا طاری ہو گیا۔ وہ بتوں کی طرح کھڑے رہ گئے۔

انعام

انھوں نے گردنیں گھما کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا، پھر رونل نے چلا کر کہا:

"شارن۔ تم میری طرف سے انعام کے حق دار ہو گئے اور تعریفی سرٹیفکیٹ کے بھی۔"

"شکریہ سر۔" شارن کی آواز سنائی دی۔

"جب کہ میرے خیال میں اس نے کوئی قابلِ تعریف کام نہیں کیا۔ اُلٹا معاہدے کی خلاف ورزی کی ہے۔" محمود نے جل کر کہا۔

"تمھارے نزدیک۔" شیلاک نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"ایسے موقعوں پر ہمیں جیرال یاد آتا ہے۔ اُف۔ وہ کس قدر با اُصول تھا۔" فاروق نے سرد آہ بھری۔

"اسی لیے تو تمھارے ہاتھوں مارا گیا۔ اتنا با اُصول نہ ہوتا تو شاید اب تک زندہ ہوتا۔" شیلاک ہنسا۔

"خیر- یہ تو نہیں ہو سکتا- موت کا ایک وقت مقرر ہے۔"

"مسٹر رونل- مجھے آپ سے ایسی امید نہیں تھی- مہربانی فرما کر اپنے آپ کو بہادر ثابت کیجیے- مکار اور دھوکے باز نہیں-"

"میں اپنے ملک کے لیے مکار، دھوکے باز اور سبھی کچھ کہلانے کو تیار ہوں- میرا سب سے بڑا مسئلہ سونے کے اس جہاز کو اپنے ملک پہنچانا ہے- ایک بار یہ وہاں پہنچ جائے- پھر میں تم لوگوں سے ہر میدان میں مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہوں گا-"

"اس کا مطلب ہے- تمھیں اپنے اوپر بھروسا نہیں- ورنہ مقابلہ ضرور کرتے۔"

"یہ بات نہیں- اس وقت اپنے اوپر بھروسا کرنے کی بجائے- جہاز کو یہاں سے لے جانا زیادہ اہم ہے- ہم صرف یہ دیکھتے ہیں، ملک اور قوم کے لیے زیادہ مفید بات کیا ہے، لو شارن- ہم جا رہے ہیں- تم کس طرح آؤ گے؟"

"آپ میری فکر نہ کریں- میں پہنچ جاؤں گا۔"

"نہیں شارن- یہ لوگ بہت تیز ہیں- کہیں تم ان کے چنگل میں پھنس نہ جاؤ- لہٰذا ہم وہ کام کریں گے کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے- ہم ان سب کو باندھ کر

یہاں سے جائیں گے۔"

"نہیں- اس کی ضرورت نہیں- اس طرح وقت ضائع ہو گا- میں حساب لگا چکا ہوں- یہ مجھ تک نہیں پہنچ سکیں گے- میرے دونوں ہاتھوں میں پستول ہوں گے- میں انھیں اپنے نزدیک نہیں آنے دوں گا- ادھر آپ لوگ جہاز پر پہنچ کر رائفلوں کے رُخ ان کی طرف کر دیں گے- لہٰذا یہ لوگ حسرت سے ہمیں دیکھتے رہ جائیں گے- باندھنے کی صورت میں یہ نہیں رہ جائیں گے اور وہ پُر لطف نظارہ نہیں دیکھ سکیں گے۔"

"تم- تم ٹھیک کہتے ہو شارن- لو ہم چلے- آئیے مسٹر شیلاک اور مس ریٹا۔"

تینوں نے ساحل کی طرف دوڑ لگا دی- وُہ سکتے کے عالم میں کھڑے رہ گئے- ان کے دماغ بھائیں بھائیں کر رہے تھے، آخر بہت دُور سے رونل کی آواز سُنائی دی:

"ہم جہاز پر پہنچ چکے ہیں شارن- کپتان شومی انجن روم میں موجود ہے اور اس کے سر پر ہمارا ایک ساتھی پستول لیے کھڑا ہے- جوں ہی ہم حکم دیں گے- وہ جہاز کو چلا دے گا- لہٰذا اب تم جلد از جلد یہاں آنے کی کوشش کرو- یہ کارنامہ تمھارا ہے شارن- ہم تمھیں ساتھ لے کر

فخر سے روانہ ہوں گے۔"

"شکریہ باس۔ میں آرہا ہوں، لیکن میں رفتار تیز نہیں رکھ سکوں گا، کیوں کہ مجھے اُلٹے قدموں آنا ہوگا۔" اس نے بھی بلند آواز میں کہا۔

"ہوں ٹھیک ہے۔ یوں ہی سہی۔ ہم انتظار کر رہے ہیں۔"

دھم کی آواز سنائی دی اور شارن زمین پر نظر آیا۔ اس کے ہاتھوں میں واقعی دو پستول تھے اور وہ ان سے کافی فاصلے پر کودا تھا۔ وہ اگر دوڑ کر اس تک پہنچنے کی کوشش کرتے تو ان میں سے کئی جان سے جاتے۔

"ہمیں اجازت دیں ابا جان۔ اسے روک لیں۔" محمود بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"نہیں محمود۔ ایسا کرنے کی ضرورت نہیں۔" انسپکٹر جمشید اس پر نظریں جمائے ہوئے بولے۔ وہ اُلٹے قدموں پیچھے ہٹ رہا تھا اور یہ آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے۔

"آگے ضرور بڑھتے رہو انسپکٹر صاحبان۔ لیکن درمیانی فاصلہ گھٹنے نہ پائے۔ میں خود چاہتا ہوں کہ تم ساحل تک پہنچ جاؤ۔ اور ہمیں رخصت ہوتے اپنی آنکھوں سے دیکھو۔ اتنی شان دار شکست سے تم شاید ہی کبھی دوچار ہوئے ہوگے۔"

شارن کی زہر میں ڈوبی ہوئی آواز ان کے کانوں

سے ٹکرائی۔

"ایسی کوئی بات نہیں مسٹر شارن۔ فتح اور شکست کا تو ہے ہی چولی دامن کا ساتھ۔ ہم تو ایسی ایسی شکست سے دوچار ہوئے ہیں کہ تمہارے فرشتے بھی دوچار نہیں ہوئے ہوں گے۔" فاروق نے بھنا کر کہا۔

"کیا کر رہے ہو فاروق۔ دماغ تو نہیں چل گیا۔" محمود نے اسے گھورا۔

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" آصف فوراً بولا۔

"کیا خیال ہے۔" فاروق اس کی طرف پلٹا۔

"کاٹ کھانے کو نہ دوڑو۔ صرف یہ خیال ہے کہ اس سے بھی کہیں بڑی شکستوں سے ہمیں پالا پڑ چکا ہے۔"

"اور میں تمہیں کاٹ کھانے کو دوڑ رہا تھا۔" فاروق نے جل کر کہا۔

"اوہو۔ تو کیا نہیں دوڑ رہے تھے۔" فاروق کے لہجے میں حیرت تھی۔

عین اسی وقت شارن دھڑام سے منہ کے بل گرا۔ ساتھ ہی کسی نے اس کی کمر پر چھلانگ لگائی۔ دوسرے ہی لمحے ان کی آنکھوں میں حیرت دوڑ گئی۔ ادھر انھوں نے دیکھا۔ کمر پر چھلانگ فرزانہ نے لگائی تھی۔ اس کی کمر

پر ٹکر بھی اسی نے رسید کی تھی ۔

" ارے ۔ یہ ہم کیا دیکھ رہے ہیں " انسپکٹر جمشید نے پُرجوش انداز میں آگے بڑھتے ہوئے کہا ۔ اور پھر انھوں نے دونوں پستول اپنے قبضے میں لے لیے ۔

" حیرت ہے ۔ ہمیں پتا ہی نہیں چلا ۔ فرزانہ کب ہم سے الگ ہو کر اس کے پیچھے پہنچ گئی "

" بہت پہلے ۔ جوں ہی میں نے اس کی آواز درخت پر سے آتی سنی ۔ کھسک لی ۔ کیوں کہ اندازہ لگا لیا تھا کہ اب پانسہ پلٹ کر رہے گا " اس نے بتایا ۔

" مسٹر شارن اُٹھ کر کھڑے ہو جاؤ ۔ اب تم ہمارے آگے آگے چلو گے ۔ ہم رائفلوں کی زد سے باہر رہ کر رونل سے بات کریں گے ۔ دیکھنا یہ ہے کہ تم واقعی ان کے لیے اہم ہو یا نہیں " انسپکٹر جمشید نے مسکراتے ہوئے کہا ۔

" کیا مطلب ؟ " اس نے بوکھلا کر کہا ۔

" پہلے سیدھے کھڑے ہو جاؤ اور ساحل کی طرف چلنا شروع کر دو ۔ بہت جلد جان جاؤ گے کہ میری بات کا مطلب کیا ہے " انھوں نے کہا ۔

ان کے قدم اُٹھنے لگے ۔ یہاں تک وہ مناسب فاصلے پر پہنچ گئے :

" بس مسٹر شارن ۔ اب تم آگے نہیں بڑھو گے ۔ یہیں ٹھہر جاؤ " انسپکٹر جمشید نے کہا اور پھر بلند آواز میں بولے :

" مسٹر رونل ۔ صورتِ حال ذرا بدل گئی ہے "

" کیا مطلب ۔ کیا شارن تمھاری کسی چال میں آگیا ہے "

" یوں ہی سمجھ لو ۔ اب یہ ہمارے سامنے ہاتھ اوپر اٹھائے کھڑا ہے ۔ اب تم کیا کہتے ہو "

" تم کیا چاہتے ہو ؟ " رونل نے بھنا کر کہا ۔

" اگر شارن کی زندگی بچانا چاہتے ہو تو نیچے اتر آؤ ۔ اعلان کے مطابق مقابلہ کرو ۔ ہار اور جیت اللہ کے ہاتھ ہے ۔ اس نے جس کے حق میں فیصلہ دیا ۔ وہی پارٹی جہاز یہاں سے لے جائے گی "

" ہمیں یہ سودا منظور نہیں "

" اس صورت میں تم شارن کو نہیں پا سکو گے ۔ اس سے جُدا ہونا ہوگا ۔ پھر تم اپنے مُلک میں اسے وہ انعام نہیں دے سکو گے جس کا ابھی تھوڑی دیر پہلے اعلان کیا تھا "

" اوہ ! " اس کے منہ سے نکلا ۔

" جلدی فیصلہ کرو مسٹر رونل "

جہاز پر کھسر پھسر ہونے لگی ، شاید رونل ، شیلاک اور ریوٹا سے مشورہ کر رہا تھا ، آخر اس نے کہا :

"ہم رک نہیں سکتے انسپکٹر جمشید۔"

"گویا تم نے مسٹر شارن کی جدائی منظور کر لی ہے۔" انسپکٹر جمشید نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"ہاں! ہم مجبور ہیں۔ شارن کی خاطر خطرہ مول نہیں لے سکتے۔"

"باس۔ یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔" شارن نے روتی آواز میں کہا۔

"ہاں شارن۔ ملک اور قوم کے لیے ایسی قربانیاں دینا ہی پڑتی ہیں۔ تم یہی خیال کرتے رہو کہ ملک پر قربان ہو رہے ہو۔"

"نن۔ نہیں۔ نہیں مسٹر رونل۔ ایسا نہ کریں۔ ان لوگوں سے مقابلہ کر لیں۔ اور انھیں شکست دے کر مجھے بچا لیں۔"

"نہیں۔ شارن۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ ایک جان کے لیے اتنا بڑا خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا۔ یہ ہمارے اصولوں کے خلاف ہے۔ چلو کپتان شومی۔ سفر شروع کرو۔"

"مسٹر رونل۔ اگر جہاز نے اپنی جگہ سے حرکت کی تو شارن کی لاش کو تڑپتے دیکھنا ہوگا۔"

"پروا نہیں۔ دیکھ لیں گے۔"

"باس!" شارن چلایا۔

"شومی۔ تم نے سنا نہیں۔" رونل دھاڑا۔

جوں ہی جہاز چلنا شروع ہوا، انسپکٹر جمشید کی انگلی حرکت میں آئی۔ انھوں نے کہا:

"مسٹر شارن۔ تمھارا باس تمھیں وہ انعام نہیں دے سکا جس کا اس نے وعدہ کیا تھا۔ ہم نے تم سے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا، پھر بھی تمھیں انعام سے نواز رہے ہیں۔ ہمارا شکریہ ادا نہیں کرو گے۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی انھوں نے ایک پستول کا ٹریگر دبا دیا۔ شارن گرا اور تڑپنے لگا۔ جہاز کے عرشے پر کھڑے رونل، شیلاک اور ریٹا نے یہ منظر صاف دیکھا۔ رونل کی آواز ابھری:

"تم سے شارن کا انتقام لیا جائے گا انسپکٹر جمشید۔"

"تو پھر ہم سے دور کیوں جا رہے ہو۔ اسی وقت انتقام کیوں نہیں لے لیتے۔" انسپکٹر کامران مرزا مسکرا کر بولے۔

رونل نے کوئی جواب نہ دیا۔ جہاز لمحہ بہ لمحہ دور ہوتا جا رہا تھا۔

○

"اب کیا کیا جائے — کیا ہم کسی طرح جہاز تک پہنچ سکتے ہیں۔"

"ہم سب نہیں پہنچ سکتے — کم از کم پروفیسر داؤد نہیں پہنچ سکتے۔"

"میری فکر نہ کرو — تم لوگ جہاز کی طرف روانہ ہو جاؤ، اگر اسے روک سکتے ہو تو روک لو۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے انکل — ہم وہ کام کس طرح کر سکتے ہیں — جو ہمارے دشمنوں نے کیا — یعنی انھوں نے اپنے ایک ساتھی کی پروا نہیں کی — اس کی موت منظور کر لی — لیکن رُکے نہیں۔"

"لیکن اس وقت میں خود کر رہا ہوں — شارن تو زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا۔"

"اس کے باوجود ہم ایسا نہیں کر سکتے — ہاں! میں نے ایک فیصلہ کیا ہے۔" انسپکٹر جمشید نے پُرعزم لہجے میں کہا۔

"اللہ کا شکر ہے — ان حالات میں بھی آپ نے کوئی فیصلہ تو کیا۔"

"ہاں! فیصلہ یہ ہے کہ ہم بھی یہاں سے اپنے گھر نہیں جائیں گے — اب ہمیں بنگال جانا ہی ہوگا — نہ صرف اپنے آدمی اور اپنا جہاز واپس لینے — بلکہ ان کی ایٹمی تنصیبات

اڑانے کے لیے بھی — یہ کارروائی سونے کے جہاز کے بدلے میں ہوگی — کیا خیال ہے؟"

"یہ خیال ہم سب کے دل کی آواز ہے — اس سے اچھا خیال تو کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔" انسپکٹر کامران مرزا نے فوراً کہا۔

"بالکل — ہم اس کے لیے تیار ہیں — لل — لیکن — انکل — ہم تو ایک جزیرے پر ہیں — ہمارے پاس تو کوئی ٹوٹی پھوٹی کشتی بھی نہیں — ہم جائیں گے کیسے۔"

"یہی تو وہ مقام ہے — جب انسان کو اللہ کے سوا کوئی مددگار نظر نہیں آتا — اللہ تعالیٰ ہی کوئی سبب بنائیں گے — آخر کوئی جہاز — کوئی کشتی، کوئی لانچ تو اس طرف سے گزرے گی ہی۔"

"اللہ کرے جلد گزرے — کہیں ہم انتظار کرتے کرتے سوکھ کر کانٹا نہ ہو جائیں۔" آفتاب نے آسمان کی طرف دیکھا۔

"بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹ ہی جائے گا۔" محمود نے مسکرا کر کہا۔

"بلی — چھینکا — ہمیں تو یہاں نہ کوئی بلی نظر آ رہی ہے نہ چھینکا۔" آفتاب نے اِدھر اُدھر دیکھا۔

"عقل کے ناخن لو — محمود نے تمھیں بلی کہا ہے۔"

"کیا کہا - مجھے بلی کہا ہے - محمود کی یہ مجال - میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔" آفتاب نے تلملا کر کہا اور چھلانگ لگا کر محمود کے سامنے آ گیا۔

"ارے ارے - دماغ تو نہیں چل گیا - جزیرے کی ہوا نے ہوش تو نہیں گم کر دیے۔" انسپکٹر کامران مرزا نے اسے گھورا۔

"نہیں ابا جان - آپ نہ بولیے گا - آج فیصلہ ہو کر رہے گا۔" اس نے آستینیں چڑھاتے ہوئے کہا۔

"پھر تو ہو چکی باتوں کی جنگ - دھری کی دھری رہ جائے گی مہا بھارت۔" فاروق بول اٹھا۔

"کک - کیا مطلب۔" آفتاب چونکا۔

"اگر ہم نے ہاتھوں اور پیروں سے لڑنا شروع کر دیا تو پھر زبانی لڑائی کیسے ہو سکے گی۔"

"اوہ ہاں - واقعی - ا ا ، بات کا تو مجھے خیال ہی نہیں رہا۔" آفتاب نے گھبرا کر کہا اور اس کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے۔ پھر اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا:

"مجھے افسوس ہے - امید ہے محمود - معاف کرو گے۔"

"معافی کس بات کی بھئی - یہ بات بھی کوئی معافی مانگنے والی بات ہے۔" محمود بھی دوستانہ انداز میں بولا۔

"اب ہم یوں بھی فارغ ہیں - باتوں کی جنگ چھڑ ہی جائے پہلے تفصیل سے اپنی اپنی کہانی سنانی چاہیے۔" شوکی نے شرمائے شرمائے انداز میں کہا۔

"اس سے پہلے ہمیں کچھ کام کرنا ہو گا۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"جی فرمائیے - ہم ہر کام کرنے کے لیے تیار ہیں۔"

"لکڑیوں کا ایک بڑا ڈھیر ساحل پر جمع کر دو - تاکہ اسے آگ دکھا دی جائے۔ دھواں دیکھ کر کوئی جہاز اس طرف کا رخ ضرور کرے گا۔"

"بہت بہتر - ابھی لیجیے۔"

سب لوگ درختوں سے شاخیں توڑنے میں مصروف ہو گئے - آدھ گھنٹے بعد ہی ایک بڑا ڈھیر لگ گیا - اب ان لکڑیوں کو لائٹر کی مدد سے آگ دکھا دی گئی - خشک بھی تھیں اور گیلی بھی - خشک لکڑیوں نے فوراً آگ پکڑ لی - اور گیلی لکڑیاں سلگنے لگیں - وہ گہرا دھواں چھوڑنے لگیں - دھواں لہریے کی صورت میں اوپر اٹھنے لگا۔

"اب تم لوگ اپنا کام شروع کر سکتے ہو۔" خان رحمان مسکرا کر بولے۔

"شاید ان کی نسبت تم زیادہ بے چین ہو ، ان کی باتیں

سننے کے لیے۔" پروفیسر داؤد ہنسے۔

"نج۔ جی۔ اور آپ کا اپنے بارے میں کیا خیال ہے۔"
خان رحمان نے گڑبڑا کر کہا۔

"وہی جو تمہارا۔" وہ بولے۔

"لل۔ لیکن۔ مہابھارت شروع نہیں ہو سکتی۔" فرحت نے
پریشان آواز میں کہا۔

"کیسے۔ کیوں شروع نہیں ہو سکتی؟"

"اس لیے کہ مجھے بھوک بہت لگ گئی ہے اور شاید سبھی
کو لگ گئی ہو گی۔ ہم نے رات کا کھانا ابھی تک نہیں کھایا۔"

"یہاں رات اور دن کے کھانے کا کیا سوال۔ بس کچھ
ملنا چاہیے۔"

لیکن ان کے پاس کیا تھا۔ سب کے سب پریشان ہو گئے،
بھوک اچانک ہی چمک اٹھی۔ اور ایسا فرحت کے خیال دلانے
کی وجہ سے ہوا۔

"سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ ہم مچھلی کا شکار
کھیلیں اور ان لکڑیوں پر انھیں بھون کر کھا لیں۔" انسپکٹر
جمشید بولے۔

"لیکن شکار کس چیز سے کھیلا جائے۔ کیا صرف ہاتھوں
سے۔"

"ڈوری کا ایک گولا میری جیب میں ہے۔ یہ وہی ریشم
کی ڈوری ہے جس سے ہمیں جکڑا گیا تھا۔ میں نے اس
وقت اس خیال سے جیب میں رکھ لیا تھا کہ شاید ضرورت
پڑ جائے۔ میں اس کی مدد سے ایک چھوٹا سا جال بنا سکتا
ہوں۔ ہم سمندر میں کسی قدر آگے جا کر اس جال کو پھینک
دیں گے۔ کوئی نہ کوئی مچھلی تو جال میں آ ہی جائے گی۔"

"ویری گڈ۔ لیکن جال کون بنائے گا؟"

"یہ کام خان رحمان کر سکیں گے۔ کیوں خان رحمان۔ ٹھیک
ہے نا۔" انسپکٹر جمشید نے ان کی طرف مسکرا کر دیکھا۔

"ہاں جمشید۔ فوج میں ہر طرح کی تربیت دی جاتی ہے،
مجھے جال بنانا آتا ہے۔ ڈوری کا گولا مجھے دے دو۔"

وہ جال بنانے لگے۔ سب لوگ بے تابانہ انداز میں
ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ بھوک نے انھیں ہر بات بھلا
دی تھی۔ بس صرف اور صرف یہ خیال موجود تھا کہ جال
کب بنے گا اور کب ہم اس کے ذریعے کوئی مچھلی پکڑنے
میں کامیاب ہو سکیں گے۔ آخر ایک گھنٹے کی محنت کے بعد
جال تیار ہوا۔ انسپکٹر جمشید نے جال لیا اور پانی میں اتر گئے،
جلد ہی انھیں تیر کر آگے جانا پڑا۔ پھر تیرنے کے ساتھ
ساتھ انھوں نے جال پانی میں ڈال دیا اور اس کا ایک سرا

پکڑ کر آگے بڑھتے چلے گئے۔ پھر کچھ دُور جا کر وہ واپس
مڑے اور تیزی سے ساحل کی طرف آنے لگے:

"معلوم ہوتا ہے۔ جال میں کوئی بڑی مچھلی پھنس گئی
ہے۔" فرحت خوش ہو کر بولی۔

"بڑی نہیں تو چھوٹی تو ضرور پھنسی ہے۔" فاروق نے کہا۔

"نہیں۔ میرا خیال ہے۔ بہت بڑی مچھلی آ پھنسی ہے،
ورنہ انکل اس قدر تیزی سے ہرگز نہ آتے۔" فرحت نے کہا۔

"لڑنے اور جھگڑنے کی ضرورت نہیں۔ ابھی ابّا جان
ساحل پر پہنچ جائیں گے تو معلوم ہو جائے گا۔ ہمیں تو یہ
طے کر لینا چاہیے کہ مچھلی کون بھونے گا۔" محمود نے مسکرا
کر کہا۔

"فرحت اور فرزانہ کے سوا کون بھون سکتا ہے۔ اگر
یہ کام کسی اور نے کرنے کی کوشش کی تو کیا یہ بُرا نہیں
مانیں گی۔" مکھن نے منہ کھولا۔

"ہاں! یہ بھی ٹھیک ہے۔ فکر نہ کرو۔ ہم ہی بھونیں
گی۔ لیکن مچھلی صاف تم کرو گے۔"

"مم۔ میں۔ یعنی کہ میں۔" مکھن ہکلایا۔

"ہاں کیوں۔ مچھلی صاف کرنا کیا مشکل کام ہے۔"

"ل۔ لیکن مجھے ایسا اتفاق کبھی نہیں ہوا۔" اس نے

گھبرا کر کہا۔

"کیوں نہیں ہوا۔" محمود نے اسے گھورا۔

"اس لیے کہ ایسے کام امّی جان کرتی ہیں۔"

"خیر کوئی بات نہیں۔ صاف کرنے کا کام میں اور آصف
کر لیں گے۔" محمود بولا۔

اتنے میں انسپکٹر جمشید نزدیک آ گئے۔ پھر وہ پانی سے نکل
آئے۔ اور یہ دیکھ کر ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ جال
خالی تھا:

"یہ کیا انکل۔ ہمارا تو خیال تھا کہ کوئی بڑی مچھلی
جال میں پھنس گئی ہے۔ آپ تو خالی جال لوٹ آئے۔" فرحت
نے پریشان ہو کر کہا۔

"اور اگر مچھلی نہیں لگی تھی تو پھر آپ کو اس قدر جلد
واپس آنے کی کیا ضرورت تھی۔" اخلاق بولا۔

"کوئی نہ کوئی ضرورت تو ہو گی ہی۔ ورنہ ابّا جان
خالی ہاتھ کس طرح آ سکتے تھے۔" فرزانہ نے بے چین
ہو کر کہا۔

"ہاں فرزانہ۔ تمہارا خیال بالکل ٹھیک ہے۔ میں
بلاوجہ خالی ہاتھ نہیں آیا۔ ایک خاص وجہ ہے۔" انسپکٹر جمشید
بولے۔

"خاص وجہ!!!" ان سب کے منہ سے نکلا۔

"ہاں ۔ جس جگہ میں نے جال ڈالا تھا۔ وہاں مچھلیوں کی اچھل کود محسوس ہوئی تھی ۔ اچھل کود برابر جاری رہی ، لیکن کوئی مچھلی جال میں نہیں پھنسی ۔ میں نے ہاتھ پاؤں چلا کر دیکھے تو میرا ایک پاؤں کسی سخت چیز سے ٹکرایا۔"

"اوہ!"

"اس سخت چیز کو تنہا ساحل تک کھینچ کر لانا میرے بس کی بات نہیں ۔ اس کے لیے ہم سب کو جانا ہوگا ۔ البتہ پروفیسر صاحب یہاں ٹھہر سکتے ہیں۔"

"لیکن انکل۔ پہلے تو بھوک کا انتظام ہونا چاہیے تھا۔" فرحت نے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔

"ہاں ۔ بات ٹھیک ہے۔ لیکن اس سخت چیز نے میری بھوک اڑا دی ۔ مجھے افسوس ہے فرحت۔"

"خیر کوئی بات نہیں انکل۔" فرحت مسکرائی۔

"تو پھر چلو چلیں ۔ میں اور انسپکٹر کامران مرزا پہلے اس جگہ غوطہ لگا کر دیکھیں گے۔"

وہ پانی میں اتر گئے۔ آگے چل کر تیرنے لگے ۔ آخر ایک جگہ پہنچ کر انسپکٹر جمشید نے کہا:

"یہی وہ جگہ ہے۔"

"چلیے ۔ ہم غوطہ لگاتے ہیں۔"

دونوں نے غوطہ لگایا اور ان کی آنکھوں سے اوجھل ہو گئے ۔ جلد ہی وہ سطح پر ابھرے تو ان کے ہاتھوں میں چند رسیاں تھیں ۔

"وہ مارا ۔ نیچے ایک بڑی کشتی یا لانچ موجود ہے ۔ شاید اس میں کسی جگہ کچھ مچھلیاں بھی پھنسی ہوئی ہیں ، کیوں کہ مچھلیوں نے کھڑ بڑ مچا رکھی ہے۔" انسپکٹر جمشید نے خوش خبری سنائی۔

"اسے کہتے ہیں چپڑی اور دو دو۔" اشفاق بولا۔

اب انھوں نے ان رسیوں کی مدد سے لانچ کو ساحل کی طرف کھینچنا شروع کیا ۔ اس کام میں انھیں بہت محنت کرنا پڑی ۔ یوں لگا جیسے وہ رسہ کشی کا مقابلہ کر رہے ہوں ۔ آخر کار آدھ گھنٹے بعد وہ لانچ کو ساحل تک لانے میں کامیاب ہو گئے ۔ اب انھوں نے دیکھا ۔ وہ لانچ نہیں تھی ۔ ایک کشتی تھی ۔ اس کے چپو بھی لوہے کے حلقوں میں پھنسے ہوئے تھے ۔ کشتی پر ایک بڑا جال موجود تھا ۔ اس جال میں بے شمار چھوٹی بڑی مچھلیاں پھدک رہی تھیں ۔

"لیجیے - آپ ایک دو مچھلیاں پکڑنے چلے تھے ۔ اللہ تعالیٰ نے اَن گنت مچھلیاں عطا فرما دیں۔" فاروق نے خوش ہو کر کہا۔

"اور ساتھ میں ایک عدد کشتی بھی۔"

"اسی لیے تو کہتے ہیں کہ حرکت میں برکت ہے۔" مکھن مسکرایا۔

"پہلے پیٹ کی آگ بُجھا لیں۔"

وہ مچھلیاں صاف کرنے پر جٹ گئے ۔ فرحت اور فرزانہ انھیں بھوننے لگیں اور اس طرح انھوں نے ڈٹ کر مچھلیاں کھائیں ۔

"اب کیا خیال ہے - کیا اس کشتی پر سفر کرنا شروع کریں ۔ خوراک کی صورت میں مچھلیاں ہمارے پاس موجود ہی ہیں۔"

"چاند کی روشنی میں کشتی پر سفر کرنا خطرناک ہوگا - چاند بھی چودھویں کا ہے شاید - سمندر میں جوار بھاٹا اُٹھ رہا ہوگا - اس لیے ہم سفر صبح شروع کریں گے - اس وقت تک شاید کوئی جہاز دُھواں دیکھ کر ادھر آ جائے۔"

"تو پھر اب - ہم - وہ شروع کریں گے؟" فاروق نے سوالیہ انداز میں کہا۔

"وہ کیا؟" خان رحمان مسکرائے۔

"وہ - انکل وہ - اب میں آپ کو وہ کا کیا مطلب بتاؤں۔"

"ارے!" فرحت کے منہ سے نکلا۔

وہ چونک کر اس کی طرف مڑے - اس کے چہرے پر خوف کا عالم تھا ۔

وہ دیکھیے

"خیر تو ہے فرحت۔ اب کیا ہوا؟" انسپکٹر کامران مرزا پریشان ہو گئے۔

"ہم۔ انکل ہم ایک چیز بھول گئے۔ بالکل بھول گئے۔" اس نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

"وہ کیا؟" انھوں نے پوچھا۔

"حیرت ہے۔ کسی کو بھی اس کا خیال نہیں آیا۔ سوائے میرے۔"

"آخر وہ کیا چیز ہے۔ پہیلیاں کیوں بجھوا رہی ہو؟" فرزانہ نے جھلا کر کہا۔

"پپ پانی۔"

"پپ پانی۔ یہ کیا ہوتا ہے؟" آفتاب نے حیران ہو کر کہا۔

"فرحت۔ تمھارا مطلب ہے۔ پانی۔"

"ہاں! ہم نے مچھلی تو سیر ہو کر کھا لی۔ پانی کا کسی کو خیال تک نہیں آیا۔ آخر ہم پییں گے کیا۔ اب نہیں تو تھوڑی دیر بعد پیاس لگے گی۔ مچھلی یوں بھی بہت گرم ہوتی ہے۔ پیاس لگا کر رہے گی۔ اس وقت ہماری کیا حالت ہو گی۔"

"اوہ!" ان سب کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔ ان کی پیشانیوں پر فکر مندی کے آثار ابھر آئے۔

"واقعی۔ بات بہت پریشانی کی ہے۔ سمندر کا پانی ہم پی ہی نہیں سکتے۔ فوراً قے ہو جائے گی۔ لے دے کے ہم اس جزیرے کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ شاید جزیرے کے کسی گڑھے میں بارش کا پانی جمع ہو۔ یا پھر ناریل یا ناریل کی قسم کا کوئی پھل دار درخت یہاں موجود ہو۔"

"تو پھر انکل۔ اللہ کے لیے پہلے جزیرے کا جائزہ لے لیں، اس لیے کہ مجھے بہت پیاس لگی ہے۔" فرحت نے گھبرا کر کہا۔

"اوہ۔ اچھا۔" وہ بولے۔

"فرحت۔ تم نے بہت برا کیا۔" اخلاق نے جل کر کہا۔

"کیا برا کیا؟" فرحت اس کی طرف پلٹی۔

"پانی یاد دلا دیا۔ اب تو مجھے بھی پیاس لگ گئی ہے۔"

"اور مجھے بھی۔" شوکی گھبرا گیا۔

"شاید ہم سب کو پیاس لگ گئی ہے۔ یا لگنے والی ہے۔ اس لیے آؤ۔ جزیرے کا جائزہ لے لیں۔ ابھی تک ہم نے جزیرے پر کسی پرندے یا جانور کی آواز نہیں سُنی۔ کہیں یہ بالکل بے آباد تو نہیں۔ اس صورت میں ہمیں نہ تو پانی ملے گا اور نہ کوئی پھل۔ کیوں کہ جہاں پھل دار درخت ہوں اور پانی ہو۔ وہاں چرندے پرندے اور دوسرے جانور ضرور ہوتے ہیں۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"یا اللہ رحم۔ آپ تو ہمیں ڈرائے دے رہے ہیں انکل۔"

"ہم میں کیا کروں۔ مجبور ہوں۔" وہ بولے۔

"جی کس بات پر مجبور ہیں۔" آفتاب نے حیران ہو کر کہا۔

"ڈرانے پر۔" انھوں نے مسکرا کر کہا۔

"مہربانی فرما کر سب لوگ ایک کام کریں۔" ایسے میں انسپکٹر جمشید بولے۔

"جی فرمائیے۔ جو آپ کہیں گے۔ وہی کریں گے۔" محمود نے کہا۔

"بالکل۔ اس کے سوا چارہ بھی کیا ہے۔" خان رحمان بولے۔

"مجھے تو پیاس نے کچھ زیادہ ہی بے چین کر دیا ہے۔ خیر۔ بتاؤ جمشید تم کیا کہنا چاہتے ہو۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"صرف اور صرف یہ کہ صبر کا دامن تھام لو۔ ساری پریشانی دُور ہو جائے گی۔ صرف یہ بات ذہن میں لے آؤ کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو بھی پیاس کی تکلیف برداشت کرنا پڑی تھی اور انھوں نے صبر کیا تھا، کیوں کہ صبر کے سوا کر ہی کیا سکتے تھے۔"

سب ساکت رہ گئے۔ کسی کے منہ سے چند سیکنڈ تک کوئی بات نہ نکل سکی۔ آخر پروفیسر داؤد بولے:

"تم نے ٹھیک کہا جمشید۔ میرے منہ سے تو اب تم پانی کا لفظ نہیں سنو گے۔ چاہے میری جان کیوں نہ نکل جائے۔"

"ہم بھی یہی کہتے ہیں۔" کئی آوازیں اُبھریں۔

"بہت خوب! لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اپنی کوشش بھی نہ کریں۔ ہم کوشش ضرور کریں گے۔ آئیے چلیں۔"

انھوں نے جزیرے کو دیکھنا شروع کیا، لیکن چاند کی روشنی میں صاف طور پر کچھ نہ پتا چل سکا کہ درختوں پر کسی قسم کے پھل ہیں یا نہیں۔ آخر اسی کوشش میں رات گزر گئی۔ انھوں نے سمندر کے پانی سے وضو کر کے نماز

ادا کی اور دن کا اُجالا پھیلنے پر پھر سے درختوں کا جائزہ لینے کے لیے اُٹھے ہی تھے کہ فرزانہ چلا اُٹھی:

"ابا جان۔ وہ دیکھیے۔"

○

سب نے مڑ کر اُدھر دیکھا۔ جس طرف فرزانہ نے اشارہ کیا تھا۔ فرزانہ کا منہ کسی درخت کی طرف نہیں۔ ساحل کی طرف اٹھا ہوا تھا۔ ان کی نظریں سمندر کو دیکھنے لگیں۔ دُور بہت دُور ایک دھبا سا دکھائی دے رہا تھا:

"ہو سکتا ہے، یہ کوئی جہاز ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے، کہ کوئی چٹان ہو۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"لیکن انکل۔ آتے ہوئے تو ہم نے کوئی چٹان نہیں دیکھی تھی۔"

"اس وقت ہم اس طرف سے نہیں آئے تھے۔"

"اوہ۔" ان کے منہ سے نکلا۔

"لیکن مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ مایوسی گناہ ہے، دس پندرہ منٹ بعد اگر یہ دھبا بڑا ہو گیا تو پھر یہ ضرور جہاز ہو گا۔"

ان کی نظریں دھبے پر جم کر رہ گئیں۔ اور پھر دھبا بڑا ہونے لگا۔ ان کی رگوں میں خون تیزی سے گردش کرنے لگا۔ آدھ گھنٹے بعد ایک بحری جہاز کا اوپر والا حصّہ دکھائی دینے لگا۔ اب تو وہ خوشی سے اُچھل پڑے اور ساحل کی طرف دوڑے۔

ساحل پر پہنچتے ہی وہ زور زور سے ہاتھ ہلانے لگے۔ لیکن انھیں ایسا کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ جہاز کا رُخ جزیرے کی طرف ہی تھا اور اس کا مطلب ہے، جہاز والوں نے انھیں دیکھ لیا تھا۔ بلکہ وہ تو دُھوئیں تو دیکھ کر اس طرف مڑے ہوں گے یا پھر ان کی منزل کا راستا ہی یہ تھا۔۔۔ آخر جہاز نزدیک آگیا اور مناسب فاصلے پر رُک گیا۔ عرشے پر رائفلوں کی دو نالیں انھیں صاف دکھائی دینے لگیں، پھر سپیکر پر ایک آواز اُبھری:

"تم لوگ کون ہو اور یہاں تک کیسے پہنچے؟"

"ایک لمبی کہانی ہے، فی الحال اتنا جان لیں کہ ہم مسلمان ہیں، اگر یہ جہاز بھی مسلمانوں کا ہے تو آپ لوگوں کو اُلجھن میں مبتلا ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔" انسپکٹر جمشید نے بلند آواز میں کہا۔

"اللہ کا بہت احسان ہے، ہم مسلمان ہیں۔"

"بھئی واہ۔ پھر تو مزا آگیا۔ آپ کا تعلق کون سے ملک سے ہے:" انسپکٹر کامران مرزا خوش ہو کر بولے۔

"ہم افریقہ جا رہے ہیں۔ یہ ایک تجارتی جہاز ہے۔ اس پر تجارتی سامان لدا ہوا ہے۔ جو ہم اپنے ملک لے جا رہے ہیں، اس جہاز پر صرف تاجر لوگ سوار ہیں۔ عام مسافر نہیں اور ایک قیدی بھی ہمارے ساتھ ہے۔"

"قیدی۔ کیا مطلب؟" خان رحمان چونکے۔

"وہ بھی تم لوگوں کی طرح ایک جزیرے پر پھنس گیا تھا۔ ہم نے اسے اس شرط پر جہاز میں سوار کیا تھا کہ وہ قیدی کی حیثیت سے ہمارے ساتھ جا سکتا ہے، اپنے ملک پہنچ کر ہم اسے حکومت کے حوالے کر دیں گے۔ اگر وہ ہمارے کسی دوست ملک کا ثابت ہوا تو حکومت اسے وہاں پہنچا دے گی۔ ورنہ جو حکومت نے مناسب سمجھا، کر لے گی۔ آپ جیسے لوگوں کے بارے میں ہماری حکومت کی یہی ہدایات ہیں۔"

"کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ ہمیں بھی قیدیوں کی صورت میں لے جائیں گے۔"

"ہاں! اگر تم لوگ ہمارے جہاز پر سوار ہو کر اپنے ملک پہنچنا چاہتے ہو تو قیدیوں کی صورت میں جانا ہو گا اور

اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم اپنا اسلحہ جزیرے پر ہی گرا دو اور ہماری طرف سے بھیجی جانے والی کشتی میں بیٹھ کر جہاز پر آ جاؤ۔ پھر ہمارا ایک آدمی جزیرے پر اُتر کر اسلحہ اُٹھا لے گا۔ اور ہم آگے روانہ ہو جائیں گے۔ تمہارے پاس نقدی وغیرہ جو کچھ بھی ہے۔ کپتان صاحب کے پاس جمع کرانا ہو گا۔"

"ہمیں منظور ہے۔" انسپکٹر جمشید تھکے تھکے لہجے میں بولے۔

تھوڑی دیر بعد وہ جہاز پر سوار ہو چکے تھے۔

"انھیں قید خانے میں پہنچا دو۔" جہاز کے کپتان نے کہا، وہ ایک بہت موٹا آدمی تھا، آنکھیں چھوٹی تھیں۔

"ہم کوئی اعتراض کرنے کا حق نہیں رکھتے جناب۔ اس لیے کریں گے بھی نہیں۔" انسپکٹر کامران مرزا نے مسکرا کر کہا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب صرف یہ ہے کہ ہم اپنوں کے لیے بالکل بے ضرر ہیں۔ مسلمان ہونے کے ناتے دوسرے مسلمانوں کے کام تو آ سکتے ہیں۔ انھیں کوئی تکلیف نہیں پہنچا سکتے۔"

"مجھے افسوس ہے۔ میں حکومت کے احکام کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔"

"کوئی بات نہیں جناب۔ ہم تو پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ کوئی اعتراض نہیں کریں گے۔ کم از کم تعارف تو ہو جانا چاہیے تھا۔" انسپکٹر کامران مرزا نے کہا۔

"تعارف جہاز سے اُتر کر ہوگا۔" کپتان نے منہ بنایا۔

اور انھوں نے مزید بحث بے کار سمجھی۔ آخر جہاز کے چار آدمیوں کی نگرانی میں وہ قید خانے کی طرف چل پڑے۔

"یہ تو کچھ بھی نہ ہُوا۔ اس طرح تو ہم زیادہ سے زیادہ اپنے ملک پہنچ سکیں گے۔" محمود مایوسانہ انداز میں بولا۔

"دیکھا جائے گا۔" آصف نے سر کو جھٹکا دیا۔

"مشکل یہ ہے کہ یہ لوگ ہماری کہانی سننے تک کے لیے تیار نہیں۔ اگر ہم انھیں حالات سُنا دیتے تو شاید یہ ہمارے ساتھ ایسا سلوک نہ کرتے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"کیا کیا جا سکتا ہے۔ ہم بھی تو یہ وعدہ کر کے جہاز پر سوار ہوئے ہیں کہ قیدیوں کی طرح جانا منظور کرتے ہیں۔" خان رحمان نے تھکی تھکی آواز میں کہا۔

ایک دروازے پر لگا تالا کھول کر انھیں اندر داخل ہونے کا اشارہ کیا گیا۔ یہ ایک بڑا سا کمرہ تھا۔ وہ اس میں داخل ہو گئے۔ اندر ایک چھوٹا سا بلب جل رہا تھا۔

کمرے کے بیچوں بیچ کوئی شخص گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا تھا۔ وہ ٹھٹک کر رہ گئے۔

"شاید۔ یہی وہ قیدی ہے۔" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔

ان کی آواز سُن کر قیدی نے مُنہ اُوپر اُٹھایا۔ دوسرے ہی لمحے ان سب کے مُنہ سے ایک ساتھ نکلا:

"ارے!"

ان کے سامنے منور علی خان بیٹھے تھے۔ بس پھر کیا تھا، وہ اُچھل کر کھڑے ہو گئے اور باری باری سب سے ملنے لگے۔ آخر میں فرحت کی باری آئی۔ وہ ابا جان کہہ کر ان کی طرف دوڑی اور چمٹ گئی۔

"یہ اتفاق حیرت انگیز ہے۔" پروفیسر داؤد حیران ہو کر بولے۔

"نہ صرف حیرت انگیز بلکہ سنسنی خیز بھی ہے۔" فاروق نے جلدی سے کہا۔

"سنسنی خیز ہی نہیں۔ ہنگامہ خیز بھی ہے۔" آفتاب بول پڑا۔

"بس بس۔ پہلے ہمیں ایک دوسرے کے حالات جان لینے دو۔" انسپکٹر کامران مرزا گھبرا کر بولے۔

"ہاں واقعی۔ یہ بہت ضروری ہے۔" منور علی خان مسکرائے۔

"انکل! اگر یہ اتنا ہی ضروری ہے، تو پھر مجبوری ہے، لہٰذا پہلے آپ ہی حالات شروع کریں" شوکی نے شرما کر کہا۔

"اوہو۔ آپ لوگ بھی ہیں" انھوں نے چونک کر کہا۔

"جی بس۔ کیا بتائیں" مکھن نے مسمسی صورت بنائی۔

"کیوں کیوں۔ کیا ہوا؟"

"یہی تو مشکل ہے۔ کہ کچھ بھی نہیں ہوا" شوکی نے کہا۔

"بھئی یوں مزا نہیں آئے گا۔ پہلے ہم منور علی خان کی کہانی سنیں گے" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"جی بہت بہتر۔ اگر مزا صرف اسی طرح آ سکتا ہے تو ہم کیا کر سکتے ہیں" فاروق نے فوراً کہا۔

"اوہو۔ اب چپ بھی کرو" آفتاب نے بھنا کر کہا۔

"اور کیا۔ بولے چلے جا رہے ہیں۔ اس طرح خاک حالات سنے جا سکیں گے" مکھن نے برا سا منہ بنایا۔

"ہاں! ایک میں ہی تو بول رہا ہوں۔ تم سب تو بالکل خاموش ہو گئے ہو نا" فاروق نے جل کر کہا۔

"میں ایک ترکیب بتا سکتی ہوں" ایسے میں فرزانہ بول اٹھی۔

"کیسی ترکیب۔ اور کس سلسلے میں؟" پروفیسر داؤد مسکرائے۔

"حالات سننے کی ترکیب" فرزانہ گنگنائی۔

"لیجیے۔ اور سنیے۔ اب حالات سننے کی بھی ترکیبیں ہونے لگیں" اشفاق نے حیران ہو کر کہا۔

"جب تم لوگ خاموش نہیں رہو گے تو ظاہر ہے، کوئی نہ کوئی ترکیب ہی کرنا پڑے گی"

"خیر بھئی۔ فرزانہ کی ترکیب سن تو لو" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"ترکیب یہ ہے کہ ہم فاروق، آفتاب اور مکھن کو اس کمرے کے ایک کونے میں بٹھا دیں اور باقی سب دوسرے کونے میں جا بیٹھیں۔ اس صورت میں ہم فوری طور پر حالات سن سکتے ہیں۔ اگر یہ ہمارے ساتھ موجود رہے تو پھر مشکل ہے"

"ترکیب معقول ہے۔ کیوں بھئی۔ تم کیا کہتے ہو؟"

"معقول ضرور ہے، لیکن ہم انکل کے حالات نہیں سن سکیں گے۔ لہٰذا میں ایک دوسری ترکیب بتائے دیتا ہوں جو اس سے بھی معقول ہے" فاروق نے کہا۔

"جلدی بتاؤ" انسپکٹر جمشید نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔

"دوسری ترکیب یہ ہے کہ پہلے ہمیں خوب جی بھر

کر باتیں کر لینے دیں۔ آپ لوگ بھی انھیں جی بھر کر سُنیں ۔ جب ہم تھک جائیں گے تو خود ہی خاموش ہو جائیں گے ۔ اس وقت کسی کو یہ کہنے کی ضرورت تک پیش نہیں آئے گی کہ بھئی اب چُپ بھی رہو۔" فاروق جلدی جلدی بولا۔

" منور علی خان ۔ تم نے ترکیب سُنی؟" خان رحمان نے مسکرا کر کہا۔

" صرف میں نے ہی نہیں ۔ سب نے سُنی ہے ۔" وہ بوکھلا کر بولا۔

" پھر ۔ اس ترکیب کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

" اس میں کوئی شک نہیں ۔ ترکیب یہ بھی اچھی ہے، لیکن ۔" منور علی خان کہتے کہتے رُک گئے ۔

" اور یہ لیکن کہاں سے آ ٹپکا انکل ۔" فاروق نے گھبرا کر کہا۔

" لیکن اگر ۔ ان کی باتیں ختم نہ ہوئیں اور سفر ختم ہو گیا ۔ تو ؟" وہ بولے ۔

" اوہ ۔ تب تو بڑی مشکل ہو گی ۔ لہٰذا دوسری ترکیب نا منظور ۔ پہلی بھی نا منظور ۔ ہم سب ایک جگہ ہی بیٹھیں گے اور یہ لوگ مُنہ سے ایک لفظ نہیں نکالیں گے ۔" انسپکٹر

جمشید نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

" وہ کیسے جمشید ؟" پروفیسر داؤد نے حیران ہو کر کہا۔

" بذریعہ حکم ۔ میں انھیں حکم دیتا ہوں کہ اب ان کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکلے ۔ جب تک منور علی خان اپنی کہانی مکمل نہ کر لیں ۔" انھوں نے سرد آواز میں کہا۔

وہ سہم گئے ۔ چہروں پر خوف دوڑ گیا ۔ اور اس حد تک دوڑا کہ ان کے چہرے عجیب سے لگنے لگے ۔ یہ دیکھ کر خان رحمان ، پروفیسر داؤد اور منور علی خان کسی طرح بھی ہنسے بغیر نہ رہ سکے :

" اب ۔ اب آپ کیوں ہنسے ؟" محمود نے ڈرے ڈرے انداز میں کہا ۔

" دراصل آپ لوگوں نے ہی انھیں سر چڑھا رکھا ہے ۔" انسپکٹر جمشید بولے ۔

" سر چڑھانے کے لیے اور ہمارے پاس ہے ہی کیا ۔" پروفیسر داؤد بولے ۔

" خیر خیر ۔ اب یہ نہیں بولیں گے ۔ چلیے خان صاحب شروع کیجیے ۔"

" لل ۔ لیکن ۔ کیا شروع کروں ۔" منور علی خان نے حیران ہو کر کہا ۔

"یہی کہ آپ اس جہاز تک کس طرح پہنچے؟" خان رحمان بولے۔

"یہ کوئی لمبی چوڑی کہانی نہیں ہے۔ میں ایک جنگل میں شکار کھیل رہا تھا۔ اپنے ملک سے بہت دُور۔ وہاں میری ملاقات چند اور شکاریوں سے ہوگئی۔ جو غیر ملکی تھے۔ وہ میری نشانہ بازی اور دوسرے ہتھکنڈوں سے بہت متاثر ہوئے۔ انھوں نے میرے ساتھ رہ کر شکار کا پروگرام بنایا۔ ان کے پاس ایک آب دوز بھی تھی۔ آب دوز کے ذریعے وُہ مجھے اپنے ساتھ ایک اور جنگل میں لے گئے۔ وہاں سے ہم اور آگے پہنچے۔ لیکن پھر اچانک ہمیں چند فوجیوں نے آگھیرا۔ اور گرفتار کر لیا۔ ہم نے بہت شور مچایا۔ لیکن انھوں نے ایک نہ سُنی۔ پھر انھوں نے ہمیں ایک کشتی میں بٹھایا۔ اور سمندر میں بہت دُور لے آئے۔ وہاں ہمارے ہاتھ پاؤں کھول دیے گئے۔ اور ہمیں سمندر میں دھکّا دے دیا گیا۔ ہم سمندر میں غوطے کھانے لگے۔ میں نہیں جانتا۔ میرے ساتھیوں کا کیا بنا۔ میں ایک جزیرے تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ وہاں سے یہ جہاز مجھے اٹھا لایا۔"

"لیکن ان فوجیوں نے آپ لوگوں کو کیوں پکڑ لیا تھا؟"

انسپکٹر جمشید بولے۔

"پتا نہیں۔ انھوں نے وجہ نہیں بتائی تھی۔"

"کیا آپ کو کچھ اندازہ ہے۔ وہ کس ملک کے تھے؟"

"ہاں! جہاں تک میرا خیال ہے۔ وہ بنگالی تھے۔"

"کیا!!!" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

برابر کے شریک

منور علی خان نے پہلے تو ان کی طرف حیران ہو کر دیکھا، پھر جلدی سے بولے:

"کیوں! اس میں حیران ہونے کی کیا ضرورت ہے؟"

"اس لیے کہ اس بار ہمارا پروگرام بھی بیگال جانے کا ہے۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"اوہ۔ تب ہمیں اس جہاز پر نہیں جانا چاہیے تھا۔" منور علی خان نے پریشان ہو کر کہا۔

"کیوں۔ اور ہم کیا کر سکتے ہیں؟"

"وہ جزیرہ۔ جس پر میں نے پناہ لی۔ پیچھے رہ گیا۔ اور وہ جنگل اس جزیرے سے زیادہ دور نہیں ہے، کیوں کہ میں آخر کتنی دیر تک تیرا ہوں گا۔" وہ بولے۔

"لیکن آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ آپ اس جنگل کے دوسری طرف ہی تیر کر گئے ہوں گے۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے

کہ آپ بیگال کی طرف ہی تیرتے رہے ہوں۔ اور اس جہاز کا رُخ بھی اس سمت میں ہو۔" انسپکٹر جمشید نے پُرخیال لہجے میں کہا۔

"اوہ ہاں! یہ بھی ہو سکتا ہے۔" انھوں نے پُرزور انداز میں سر ہلایا۔

"تب پھر ہمیں اسی جہاز پر اپنا سفر جاری رکھنا چاہیے۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"اب آپ لوگ اپنی کہانیاں سنائیے۔" منور علی خان مسکرائے۔

اور وُہ انھیں حالات سُنانے لگے۔ سب لوگ خاموشی سے سنتے رہے۔ منور علی خان کے چہرے پر حیرت کے آثار گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ آخر جب تمام حالات سنائے جا چکے تو وُہ بولے:

"میں تو یہی کہوں گا کہ قدرت ہمیں ایک بار پھر ملانے پر تُلی بیٹھی تھی۔ سو اس نے ہمیں ملا دیا۔ ورنہ یہ کس قدر عجیب لگتا ہے۔ اس انداز میں ملاقات ہو جانا۔"

"عجیب کے ساتھ ساتھ انکل۔ غریب بھی لگتا ہے۔" فاروق بول اٹھا۔ انسپکٹر جمشید تلملا کر اس کی طرف مُڑے ہی تھے کہ وہ بول اُٹھا:

"وہ۔ وہ آپ کی عاید کردہ پابندی ختم ہو گئی ابّا جان، حالات ایک دوسرے کو سنائے جا چکے ہیں۔"

"ہاں جمشید۔ بات بالکل ٹھیک ہے۔ آخر ہم کب تک ان کی زبانوں پر تالے ڈالے رہیں گے۔"

"جیسے آپ کی مرضی۔" انھوں نے بے چارگی کے عالم میں کندھے اچکائے۔

"اس کا مطلب ہے۔ اب ہم اپنی بات کا آغاز کر سکتے ہیں۔"

"ہاں ضرور۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"لیکن بھئی۔ آغاز ذرا اچھا ہونا چاہیے۔" منور علی خان نے ہنس کر کہا۔

"فکر نہ کریں انکل۔ اس قید کی ساری تھکن دُور ہو جائے گی۔" آفتاب چہکا۔

"لیکن اس قید نے مجھے تھکایا ہی کب ہے۔" وہ حیران ہو کر بولے۔ اور سب مسکرانے لگے۔

"بہت بہت شکریہ انکل۔" شوکی نے خوش ہو کر کہا۔

"کس بات کا شکریہ ادا کر رہے ہو بھئی۔" وہ بولے۔

"آپ ہم میں برابر کے شریک ہو گئے۔ شکریہ نہ ادا کریں تو کیا کریں۔"

"یوں تو ہم انکل خان رحمان اور پروفیسر انکل کو بھی برابر کا شریک کر سکتے ہیں۔ لیکن کچھ سوچ کر نہیں کرتے۔" فاروق نے شریر انداز میں کہا۔

"کیا سوچ کر نہیں کرتے۔" خان رحمان کے لہجے میں حیرت تھی۔

"کمال ہے۔ تم بھی ان کی باتوں میں الجھے چلے جا رہے ہو۔" انسپکٹر جمشید نے برا سا منہ بنایا۔

"یار نہ ٹوکو مزا آ رہا ہے۔" خان رحمان ہنسے۔

"عجیب بے وقوف مزا ہے۔ جو سوچے سمجھے بغیر چلا آتا ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ہائیں ہائیں، جمشید۔ یہ جُملہ تم نے بولا ہے۔" پروفیسر داؤد کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ہاں کیوں۔ اس میں عجیب بات کیا ہے۔" وہ بولے۔

"اور کیا۔ عجیب بات تو بس مزے میں ہے۔" آصف ہنسا۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے آج یہ ہم سب کو اپنے ساتھ لپیٹ کر رہیں گے۔" انسپکٹر کامران مرزا نے بے بسی کے عالم میں کندھے اچکائے۔

"تو لپیٹ جائیے نا انکل۔" فرحت نے گویا درخواست کی۔

"ہرگز نہیں۔ تم کون ہوتے ہو ہمیں لپیٹنے والے۔"

انسپکٹر جمشید بولے۔

"واہ۔ ثابت ہو گیا۔" منور علی خان خوش ہو کر بولے۔

"ج۔ جی۔ کیا ثابت ہو گیا۔" انسپکٹر جمشید نے گھبرا کر کہا۔

"یہ کہ یہ سب ہمیں اپنے ساتھ شامل کرنے میں پوری طرح کامیاب ہو گئے ہیں، اس بات سے اب انکار ممکن نہیں رہا۔"

"اوہ!" انسپکٹر جمشید اور انسپکٹر کامران مرزا نے ایک ساتھ کہا۔

"اور اب۔ جب کہ آپ لوگ شامل ہو گئے ہیں تو پھر جھجک کیسی۔ کھل کر شامل ہو جائیں۔" خان رحمان بولے۔

"آپ دونوں نے ان کے ساتھ ساز باز تو نہیں کر رکھی۔" انسپکٹر کامران مرزا نے کہا۔

"لیکن ابا جان۔ ہماری تو انکل منور علی خان سے ملاقات ہی یہاں ہوئی ہے۔" فاروق نے کہا۔

"اور انکل خان رحمان سے بھی ابھی تک علیحدگی میں بات کرنے کا موقع نہیں ملا۔" آفتاب جلدی سے بولا۔

"اچھا بابا۔ جو جی میں آئے کرو۔ ہم تو ذرا۔" انسپکٹر کامران مرزا کہتے کہتے رک گئے۔

"ہم تو ذرا کیا؟"

"مجھے خیال نہیں رہا تھا کہ اس جہاز پر ہم قیدی ہیں۔ سوچا تھا۔ ذرا عرشے کی سیر کر آئیں۔ لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے، دروازے پر تو تالا لگا ہوا ہے۔"

"تالے کی تو خیر کوئی بات نہیں۔ ہم جب چاہیں کمرے سے نکل سکتے ہیں۔ لیکن چوں کہ وعدہ کر چکے ہیں، اس لیے ایسا کریں گے نہیں۔"

"ہاں! ٹھیک ہے۔"

"مجھے تو اس جہاز کا فکر کھائے جا رہا ہے۔ ابا جان! کیا آپ اب بھی پُر امید ہیں۔ ہم وہ جہاز واپس حاصل کر سکیں گے۔" محمود نے انسپکٹر جمشید کی طرف دیکھا۔

"جہاز کے بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتا۔ سونا ہم ضرور ان سے واپس حاصل کریں گے۔" وہ بولے۔

"لیکن کیسے۔ کیا اپنے سروں پر اُٹھا کر اپنے ملک تک جائیں گے۔" آفتاب نے اُلجھن کے عالم میں کہا۔

"فکر نہ کرو۔ ہم حالات کے مطابق قدم اُٹھانے کے عادی ہیں۔" وہ بولے۔

"جی ہاں۔ یہ تو خیر۔"

اسی وقت جہاز کا گانگ زور دار آواز میں بجا۔ منور علی خان نے جلدی سے گھڑی پر نظر ڈالی اور پریشان ہو

کر بولے:

"ابھی کھانے کا وقت تو نہیں ہوا — پھر گانگ کیوں بجایا گیا؟"

"گانگ کو چیک کر رہے ہوں گے کہ ٹھیک ہے یا نہیں۔" شوکی نے خیال ظاہر کیا اور وہ مسکرانے لگے۔

"اس میں مسکرانے کی کیا بات ہے؟" اس نے برا مان کر کہا۔

"تو کیا رونے کی بات ہے؟" فاروق فوراً بولا۔

"نہیں — رونے کی بھی نہیں ہے۔"

"رونے کی بھی نہیں — مسکرانے کی بھی نہیں — تو پھر کس کی بات ہے؟" شوکی نے برا مان کر کہا۔

"تو برا ماننے کی بھی کیا بات ہے۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"اس کا مطلب ہے — کسی بھی قسم کی کوئی بات ہے ہی نہیں — اور ہم بے بات ہی جھگڑ رہے ہیں۔" محمود نے بھنا کر کہا۔

"ہاں — بات ٹھیک ہے۔"

عین اسی وقت دوڑتے قدموں کی آواز ابھرنے لگی — لوگ ادھر سے ادھر دوڑ رہے تھے:

"جہاز پر ضرور کوئی خطرہ ہے — شاید طوفان کی آمد کا

امکان ہے۔" منور علی خان بڑبڑائے۔

"کاش! یہ ہم لوگوں سے بھی مدد لیں۔" انسپکٹر جمشید نے سرد آہ بھری۔

دو تین بار دوڑتے قدم قید خانے کے بالکل قریب سے بھی گزرے — آخر وہ دروازے سے جا لگے۔ پھر جوں ہی دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی — انسپکٹر کامران مرزا چلا اٹھے:

"یہ کیا ہو رہا ہے — کچھ ہمیں بھی بتاؤ۔"

لیکن انہیں کسی نے کوئی بات نہ بتائی — وہ بے چین ہو گئے۔

"اب — اب میں رہ نہیں سکتا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"پھر آپ کیا ارادہ رکھتے ہیں؟"

"ہم اس دروازے کو توڑیں گے — ہمیں عرشے پر جا کر حالات معلوم کرنا ہوں گے۔"

"لیکن کیا یہ معاہدے کی خلاف ورزی نہیں ہو گی؟" منور علی خان بولے۔

"جہاز پر غیر یقینی حالات پیدا ہو گئے ہیں — وہ معاہدہ پر سکون حالات کے تحت تھا۔" انسپکٹر کامران مرزا فوراً بولے —

"جیسے آپ لوگوں کی مرضی" خان رحمان نے کندھے اچکائے۔

وہ ابھی دروازہ توڑنے کے ارادے سے اُٹھے ہی تھے کہ باہر تالا کھلنے کی آواز سنائی دی۔ پھر دروازہ کھلا اور عملے کے ایک آدمی کی صورت نظر آئی:

"کپتان صاحب آپ لوگوں کو بُلا رہے ہیں۔"

"خیر تو ہے۔ کیا کوئی خطرہ در پیش ہے؟" انسپکٹر جمشید بولے۔

"جی ہاں! بہت بڑا خطرہ۔ آپ کپتان صاحب کے پاس چلیے۔" اس نے پریشان آواز میں کہا۔

وہ تیز تیز سیڑھیاں چڑھتے اوپر پہنچے۔ کپتان ریلنگ سے لگا کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں سے دُور بین لگی تھی۔ انھوں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ عملے کے سب لوگ اور تمام تاجر بھی عرشے پر موجود تھے۔ ان سب کے چہرے دُودھ کی طرح سفید تھے۔ آنکھوں میں خوف کا ایک ایسا عالم طاری تھا کہ خود وہ بھی خوف زدہ ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

"کپتان صاحب۔ یہ لوگ آ گئے ہیں۔"

"ان منحوسوں کو سمندر میں پھینک دو۔ ان کی نحوست سے ہم اس خطرے سے دوچار ہوئے ہیں۔" کپتان نے حکم

دیا اور وہ بوکھلا گئے۔ پھر جہاز کا عملہ یک دم ان کی طرف بڑھنے لگے۔

"کیا مطلب؟" وہ ایک ساتھ چلّائے اور پھر انھوں نے اِدھر اُدھر منتشر ہونے میں دیر نہ لگائی۔ ساتھ ہی انسپکٹر جمشید چلّا کر بولے:

"خبردار۔ اگر کوئی ہماری طرف بڑھا تو ذمّے داری خود اس پر ہو گی۔"

آگ کی بارش

کپتان نے جلدی سے نظریں دُور بین سے ہٹالیں اور ان کی طرف دیکھا۔

"کیا مطلب؟" اس نے چونک کر کہا۔

"آپ معاہدے کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ آپ نے ہمیں اپنے مُلک تک لے جانے کی ذمّے داری لی تھی اور شرط یہ رکھی تھی کہ ہمیں قیدیوں کی طرح لے جائیں گے، یہ نہیں کہا تھا کہ سمندر میں غرق کر دیں گے۔"

"لیکن اس وقت ہمیں یہ معلوم نہیں تھا کہ تم لوگ منحوس ہو۔" اس نے منہ بنایا۔

"اب یہ بات کس طرح ثابت ہو گئی؟" خان رحمان جل کر بولے۔

"اس طرح کہ میری زندگی بحری جہاز چلاتے گزر گئی۔ آج تک ڈاکوؤں کے کسی جہاز سے سابقہ نہیں پڑا۔ آج تم

لوگوں کو پناہ دی تو ہم مصیبت میں گھر گئے ہیں۔ ڈاکوؤں کا ایک جہاز ہماری طرف بہت تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ ہم اس کے مخالف سمت چلیں تو بھی وہ ہم تک پہنچ جائے گا۔"

"اس سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ہم منحوس ہیں۔ بلکہ اس سے تو ایک اور بات ثابت ہوتی ہے۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"ایک اور بات ثابت ہوتی ہے۔ کیا مطلب؟"

"یہ کہ آپ لوگ بہت خوش قسمت ہیں۔ اگر ہمیں جہاز پر سوار نہ کرتے تو اس وقت حالات نہ جانے کیا ہوتے۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟" نائب کپتان نے منہ بنا کر کہا۔

"یہ بات یہ ہوئی کہ ہم ڈاکوؤں کا مقابلہ کریں گے۔"

"تم لوگ مقابلہ کرو گے۔ دماغ تو نہیں چل گیا۔ ہم چار ہلکی توپیں اس جہاز پر نصب دیکھ چکے ہیں اور ہم اپنے جہاز کو ان توپوں سے کسی طرح بھی نہیں بچا سکتے۔"

"چار کیا۔ آٹھ توپیں بھی ہوں تو ہم ان سے نبٹ لیں گے۔"

"کیا تم۔ ہمیں چکر دینے کی فکر میں ہو؟" اس نے

انہیں گھورا —

" ہم چکر دینے کے عادی نہیں ۔ ہمیں سمندر میں دھکیل کر آپ کا کوئی مسئلہ حل نہیں ہوگا ۔ ہمیں اپنے ساتھ رہنے دیں ۔ ہم مل کر ان ڈاکوؤں کا مقابلہ کریں گے ۔ اپنی طاقت کم کیوں کرتے ہیں "

" اِدھر اُدھر کی نہ ہانکو ۔ بہتر یہ ہوگا کہ خود ہی سمندر میں چھلانگیں لگا دو ۔ جوں ہی ہمیں تمھاری نحوست سے نجات ملی ۔ ہم ڈاکوؤں کی زد میں آنے سے بچ جائیں گے "

" یہ وہم ہے ۔ صرف وہم " انسپکٹر جمشید بلند آواز میں بولے —

" نہیں ۔ بحری زندگی میں ایسی باتیں وہم نہیں ہیں "

" ہم تو آپ لوگوں کو مسلمان خیال کر بیٹھے تھے " خان رحمان نے طنزیہ لہجے میں کہا ۔

" ہم مسلمان ہی ہیں " کپتان نے بھنا کر کہا ۔

" لیکن آپ کا کام مسلمانوں والا نہیں ، ہندوؤں والا کر رہے ہیں ، نحوست وغیرہ کے قائل وہ لوگ ہوتے ہیں "

" بھئی تم لوگ کھڑے منہ کیا دیکھ رہے ہو ۔ انہیں پھینک کیوں نہیں دیتے " کپتان نے چیخ کر کہا ۔

ایک بار پھر عملے کے لوگ ان کی طرف بڑھے ۔ اور

وہ ان کا استقبال کرنے کے لیے تیار ہو گئے ۔ تھے بھی یہ لوگ ریلنگ کے پاس ۔ پھر جوں ہی ایک آدمی انسپکٹر جمشید کے نزدیک آیا ۔ وہ بلا کی رفتار سے جھکے اور اسے دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر سمندر میں پھینک دیا ۔ اس کی چیخ نے عرشے پر سکتہ طاری کر دیا ، ایسے میں انسپکٹر جمشید کی آواز گونج اُٹھی :

" اب بھی عقل کے ناخن لو کپتان ۔ ورنہ ہم تم سب کو سمندر میں پھینک کر تنہا ڈاکوؤں کا مقابلہ کریں گے "

کپتان نے حیران ہو کر ان کی طرف دیکھا ، اسی وقت انسپکٹر جمشید بولے :

" خان رحمان ۔ اس کارکن کی مدد کرو "

ان الفاظ کے ساتھ ہی خان رحمان نے سمندر میں چھلانگ لگا دی ۔ دوسرے ہی لمحے انھوں نے دیکھا ۔ وہ اس آدمی کو سہارا دینے سیڑھی کی طرف لا رہے تھے ۔ جلد ہی وہ اوپر آتے نظر آئے ۔

" اب کیا پروگرام ہے کپتان صاحب " انسپکٹر کامران مرزا نے طنزیہ لہجے میں کہا ۔

" م ۔ میں ۔ میں " وہ ہکلا کر رہ گیا ۔

" ہماری مانیے ۔ ہمیں ان کا مقابلہ کرنے دیں ۔ بہت جلد

آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ہم منحوس ہیں یا مبارک۔"

"اچھ۔ چھا۔" اس کے منہ سے نکلا۔

"تو پھر۔ جہاز پر جس قدر اسلحہ موجود ہے۔ عرشے پر ڈھیر کرا دیں۔ تاکہ ہم اپنا کام شروع کریں۔ بارود ہے یا نہیں؟"

"تھوڑا بہت ہے۔"

"چلیے خیر۔ جتنا بھی ہے۔ لے آئیے۔"

پندرہ منٹ بعد ڈاکوؤں کا جہاز صاف نظر آنے لگا تھا اور ادھر وہ اسلحے سے چمٹے ہوئے تھے۔ وہ بارود کی چھوٹی چھوٹی تھیلیاں بنا رہے تھے۔ آخر انسپکٹر جمشید بولے:

"خان رحمان۔ اس چھوٹی سی فوج کی کمان میں تمہارے سپرد کرتا ہوں۔"

"اور یہ کوئی نئی بات نہیں جمشید۔ تم ہمیشہ چھوٹی سی فوج کی کمان میرے حوالے کر دیتے ہو۔ خیر۔ چار آدمی بارود کی چار تھیلیاں اٹھا کر ڈاکوؤں کے جہاز کی طرف پوری قوت سے اُچھالیں گے۔ اور جس قدر اونچی اچھال سکیں، اچھالیں گے۔ چار آدمی ان تھیلیوں کو گولیوں کا نشانہ بنائیں گے۔ کوشش یہ ہوگی کہ وہ عین جہاز کے اوپر پھٹیں۔"

"بہت بہتر کمانڈر۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

انسپکٹر جمشید، انسپکٹر کامران مرزا، منور علی خان اور خان رحمان نے چار تھیلیاں اٹھا لیں اور چھوٹی فوج کی طرف دیکھا۔ وہ ہاتھوں میں رائفلیں لیے تیار تھی۔ رائفلیں ریلنگ سے لگی تھیں اور ان کی نالیں قدرے اوپر اُٹھی ہوئی تھیں۔ پروفیسر داؤد اور شوکی برادرز البتہ الگ تھلگ کھڑے تھے۔ انھیں اس جنگ کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔

"گولیاں چار کی بجائے چھے چلیں گی۔" محمود نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ کوئی حرج نہیں۔ کوئی گولی خطا بھی تو جا سکتی ہے۔"

"آپ نے ان کی جوابی کارروائی کے بارے میں کیا سوچا ہے۔ کیا وہ توپیں نہیں داغیں گے؟"

"توپیں داغنے کا وقت گزر چکا ہوگا۔ آگ انھیں اپنی لپیٹ میں لے چکی ہوگی۔" خان رحمان بولے۔

"ہم تیار ہیں۔" محمود نے کہا۔

"اور ہم بھی۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"تو پھر بسم اللہ کریں۔ نعرۂ تکبیر۔" خان رحمان بلند آواز میں بولے۔

"اللہ اکبر۔" انھوں نے ایک ساتھ کہا اور بارود کی تھیلیاں پوری قوت سے جہاز کی طرف اچھال دیں۔ جوں ہی تھیلیاں اونچائی

سے نیچے کی طرف جانے لگیں۔ خان رحمان بولے:

"فائر۔"

بیک وقت چھے فائر ہوئے۔ چھے دھماکے جہاز پر ہوئے اور چار دھماکے فضا میں ہوئے۔ فوری طور پر انھیں یوں محسوس ہوا جیسے جہاز پر آگ کی بارش ہونے لگی ہو۔ اسی وقت خان رحمان بولے:

"چار تھیلیاں اور۔"

چار تھیلیاں اور فضا میں تیرتی نظر آئیں۔

"فائر۔" خان رحمان بولے۔

پھر جہاز پر آگ کی بارش ہوئی۔ انھوں نے دیکھا۔ ڈاکوؤں کے جہاز پر قیامت کا منظر شروع ہو چکا تھا۔ توپیں داغنے کا خیال تک ان کے پاس نہیں پھٹک سکا تھا۔ اور پھر پورا جہاز شعلوں میں گھر گیا۔ چیخ و پکار کی آوازیں ان تک آنے لگیں۔ آگ سے جلنے والے جہاز کی چیخ چیخ اور چڑچڑ کی آوازیں گونجنے لگیں۔ بہت سے ڈاکو سمندر میں چھلانگ لگا گئے۔ کتنے ہی جل مرے۔ اور پھر جہاز پانی میں ڈوبتا چلا گیا۔ پھر پانی کی سطح پر جلتے ہوئے تختے دیکھے گئے۔ آگ اور دھوئیں نے منظر کچھ دیر کے لیے ان کی آنکھوں سے اوجھل کر دیا۔ جب وہ دیکھنے کے قابل ہوئے تو جہاز غائب

ہو چکا تھا۔

"اُف اللہ۔ یہ۔ یہ ہم نے کیا دیکھا ہے۔" کپتان کی تھرتھر کانپتی آواز سنائی دی۔

"چند منحوس لوگوں کی ایک ادنیٰ سی کوشش۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"نن۔ نہیں۔ نہیں۔ میں غلطی پر تھا۔"

"یہ بات تو ہم آپ کو پہلے ہی بتا چکے ہیں۔" آفتاب مسکرایا۔

"مجھے۔ معاف کر دیں۔"

"معاف کر دینے والی کوئی بات بھی تو ہو جناب۔ بس آئندہ کے لیے آپ اس قسم کے وہموں سے توبہ کر لیں۔ یہ نحوست وحوست کوئی چیز نہیں ہے۔"

"مم۔ میں۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔"

"ارے۔ ارے۔ وہ دیکھیے۔" ایسے میں نائب کپتان چلّا اُٹھا۔

انھوں نے اس کی انگلی کی سمت میں دیکھا۔ چار ڈاکو تیرتے ہوئے جہاز کی طرف آ رہے تھے۔ ان کی رائفلوں کے رُخ ان کی طرف ہو گئے۔ ڈاکوؤں نے بھی انھیں رائفلیں سیدھی کرتے دیکھ لیا۔

"نن ـ نہیں ـ نہیں ـ گولی نہ چلانا ـ ہم تم لوگوں کے بہت کام آسکتے ہیں۔"

"چلو بھئی ـ نہ چلاؤ گولی ـ ذرا دیکھیں تو سہی ـ یہ ہمارے کیا کام آسکتے ہیں۔" خان رحمان نے ہنس کر کہا۔

پھر وہ نزدیک آگئے ـ اور سیڑھی پر چڑھنے لگے ـ

"تم لوگوں کے پاس کوئی ہتھیار تو نہیں ہے؟"

"نہیں ـ بالکل نہیں۔"

"اگر ہے تو پھینک دو ـ ورنہ انجام موت ہوگا۔" خان رحمان بولے۔

"نہیں ہے ـ ہم جھوٹ نہیں بول رہے۔"

"اچھا تو پھر آجاؤ ـ تم بھی کیا یاد رکھو گے۔" انسپکٹر جمشید بولے ـ

"کپتان صاحب ـ اپنے آدمیوں کو چاروں طرف کھڑا کر دو ـ کہیں کچھ اور لوگ جہاز کی طرف نہ آجائیں ـ کم ازکم وہ ہماری لاعلمی میں جہاز تک نہیں پہنچنے چاہییں۔"

"بہت بہتر۔" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

چاروں ڈاکو اوپر آگئے ـ عرشے پر پاؤں رکھتے ہی انھوں نے ہاتھ اوپر اٹھا دیے ـ وہ ان کے چہروں کو بغور دیکھنے لگے ـ آخر انسپکٹر جمشید نے حیران ہو کر کہا:

"تم لوگ یہودی معلوم ہوتے ہو۔"

"جی ـ جی ہاں۔" ایک نے کہا۔

"کیا تمھارا تعلق بیگال سے ہے؟" انسپکٹر کامران مرزا نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

"جی ہاں!"

"جہاز لوٹنے کا کام اپنی مرضی سے کرتے ہو یا۔" انسپکٹر جمشید نے سوال اُدھورا چھوڑ دیا۔

"حکومت کی مرضی سے ـ حکومت نے ہمیں صرف مسلمانوں کے جہاز لوٹنے پر مامور کر رکھا ہے۔"

"اوہ!" انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"گویا بیگال مسلمانوں کا اس حد تک دشمن ہے۔"

ان میں سے کوئی کچھ نہ بولا ـ ایسے میں محمود بولا:

"تم ہمیں فائدہ پہنچانے کی بات کر رہے تھے۔"

"ہاں! اگر تم ہمیں بیگال پہنچا دو تو ہم تمھیں ایک خزانے کا پتا بتا سکتے ہیں ـ ایک بہت بڑے خزانے کا پتا۔"

"اوہ!" کپتان اور نائب کپتان کے منہ سے نکلا۔

"ہمیں خزانوں سے کوئی دلچسپی نہیں ـ تاہم ہم تمھیں بیگال ضرور پہنچا سکتے ہیں ـ راستا تو تم جانتے ہی ہو گے؟"

"بالکل ـ ہم ایک کشتی کے ذریعے بیگال کی سمندری حدود

تک جا سکتے ہیں۔"
"آپ نے کیا کہا جناب۔ آپ کو خزانوں سے کوئی دلچسپی
نہیں۔" کپتان نے حیرت زدہ آواز میں کہا۔
"ہاں! آپ ان چاروں کو کچھ دیر کے لیے قید خانے میں بند
دیں۔ تاکہ ہم ان کے بارے میں فیصلہ کر سکیں۔"
"بہت بہتر۔ آپ لوگ اس پورے جہاز کے محسن ہیں۔ ہم
آپ کا ہر حکم بجا لائیں گے۔" کپتان بولا۔
"شکریہ۔" خان رحمان مسکرائے۔
جلد ہی انھیں قید خانے میں بند کر دیا گیا۔ اب انھوں
نے کپتان کو اپنے بارے میں مختصر طور پر بتایا۔ اور جب
بتا چکے تو بولے:
"اب آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔"
"ہاں! آپ لوگ ان چاروں کے ذریعے بیگال میں داخل
ہونا چاہتے ہیں۔"
"بالکل ٹھیک۔ آپ کو ہمیں ایک کشتی دینا ہوگی اور اپنی یہ
شرط ختم کرنا ہوگی کہ ہمیں آپ اپنے ملک لے جائیں گے۔"
"ٹھیک ہے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن یہ چاروں کہیں
آپ لوگوں کے لیے خطرناک ثابت نہ ہوں۔"
"آپ فکر نہ کریں۔ ہم ان سے نبٹ لیں گے۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔ میں ابھی کشتی کا انتظام کیے دیتا ہوں۔"
"اور انھیں بھی قید سے نکلوا لیں۔"
"اچھا۔" اس نے کہا اور اپنے ماتحتوں کو ہدایت دی۔ جلد
ہی وہ چاروں ان کے سامنے کھڑے تھے۔
"ہم نے تم لوگوں کو تمھارے ملک پہنچا دینے کا فیصلہ کیا
ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ تم ہمیں خزانے کا پتا بتا دو گے۔"
"ٹھیک ہے۔ راستے میں ایک جزیرہ آئے گا۔ ہم وہ آپ
کو دکھا دیں گے۔ ہمیں ہمارے ملک پہنچا کر آپ لوگ واپس
اس جزیرے پر آ سکتے ہیں۔"
"بہت خوب۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔
"لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہو گی کہ تم ہمارے بارے
میں اپنی حکومت کو اطلاع نہیں دے دو گے اور وہ ہمیں آ کر
گرفتار نہیں کرے گی۔" محمود نے کچھ سوچ کر کہا۔
ایک لمحے کے لیے ان کے رنگ اڑ گئے۔ پھر ان میں سے
ایک نے جلدی سے کہا:
"ہم صرف وعدہ ہی کر سکتے ہیں۔ آپ لوگ اس سلسلے میں
کوئی ترکیب بتا سکتے ہیں تو ضرور بتائیں۔"
"نہیں۔ کوئی ترکیب نہیں سوجھ رہی۔ ہمیں تم لوگوں
کے وعدے پر ہی اعتبار کرنا ہوگا۔" فرزانہ جلدی سے بولی۔

انھوں نے فرزانہ کی طرف حیرت زدہ انداز میں دیکھا جیسے
کہ رہے ہوں - فرزانہ تمھیں اور ترکیب نہیں سوجھ رہی
یہ ہم کیا سن رہے ہیں - فرزانہ نے ان کی نظروں کا مطلب
سمجھ لیا اور پُراسرار انداز میں مسکرا دی -

آخر آدھ گھنٹے بعد وہ کپتان اور دوسرے لوگوں سے
رخصت ہو رہے تھے - سب لوگ ہاتھ ہلا ہلا کر انھیں الوداع
کہ رہے تھے - کپتان نے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا :

" کپتان کرید ۔۔زی - آپ لوگوں کو ہمیشہ یاد رکھے گا ---
کاش ہم پھر بھی مل سکیں "

" زندگی باقی ہے ، تو ملاقات کا امکان بھی باقی ہے - فکر
نہ کریں " فاروق نے شوخ آواز میں کہا -

اور کشتی جہاز سے دور ہوتی چلی گئی - ہلتے ہوئے
ہاتھ چھوٹے ہوتے گئے - یہاں تک کہ ہاتھ نظر آنے بند
ہو گئے - پھر جہاز چھوٹا ہوتا گیا اور آخر وہ بھی نظروں
سے اوجھل ہو گیا -

" تم لوگوں کو سمت کا اندازہ ہے نا ؟ " کچھ دیر بعد انسپکٹر جمشید
بولے -

" ہاں ! آپ فکر نہ کریں - ہم سمندر کے اس حصے سے بہت
اچھی طرح واقف ہیں " ان میں سے ایک نے کہا -

" شکریہ ! پہلے تم ہمیں وہ جزیرہ دکھاؤ گے ، پھر ہم آگے
چلیں گے " انسپکٹر کامران مرزا بولے -

" یہ بھی طے ہے ، ہم یہی کریں گے " دوسرے نے کہا -

" ہمیں کتنی دیر سفر کرنا ہو گا ؟ "

" خزانے والا جزیرہ یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے - ہم
لوٹا ہوا مال اسی جزیرے پر جمع کرتے رہے ہیں "

" لیکن تم لوگ تو حکومت کے اشارے پر مسلمانوں کے جہازوں
کو لوٹتے رہے ہو - تو کیا حکومت تم سے اپنا حصہ نہیں مانگتی ؟ "
محمود نے کہا -

" مانگتی ہے ، ان کا حصہ پہلے ہی ان کے حوالے کر دیا
جاتا ہے - اس کے بعد جو کچھ بچتا ہے ، وہ ہم اس جزیرے
پر جمع کرتے رہتے ہیں "

" لیکن کس لیے - آخر تم اس دولت کا کیا کرو گے ، یہ تمھارے
کس دن کام آئے گی "

" ہم میں سے کوئی بھی کسی وقت بھی اپنا حصہ لے کر
اپنے بیوی بچوں کے پاس جا سکتا ہے ، کسی کو کوئی اعتراض
نہیں ہوتا - جانے والے کی جگہ ہم نیا آدمی رکھ لیتے ہیں " اس
نے کہا -

" ہوں - اب تو تمام ڈاکو ہلاک ہو چکے ہیں - صرف تم چار

"بچے ہو۔ اس خزانے کو حاصل کرنا پسند نہیں کرو گے۔" فاروق نے
ان کی طرف تیز نظروں سے دیکھا۔

انھوں نے بھی فاروق کو گھورا، پھر ایک نے کہا:

"ہم نے اپنی زندگیوں کے بدلے میں یہ سودا کیا ہے اور
جان سے زیادہ قیمتی چیز کوئی نہیں ہو سکتی۔"

"بات تو یہ بھی ٹھیک ہے۔"

آدھ گھنٹے بعد ان میں سے ایک نے دور بہت دور دیکھتے
ہوئے کہا:

"ہم جزیرے کے نزدیک پہنچ گئے ہیں۔"

"تیار ہو جاؤ دوستو۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

سب نے اپنے ہتھیار سنبھال لیے، یہ دیکھ کر چاروں
ڈاکو چونک اٹھے:

"یہ کیا۔"

"ہو سکتا ہے۔ تمھارے کچھ ساتھی تیر کر اس جزیرے
تک پہنچ گئے ہوں۔ یا خزانے کی حفاظت کے لیے تم لوگوں
نے کچھ لوگوں کو مقرر کر رکھا ہو۔ ان حالات میں ہم بغیر کسی
حفاظتی اقدام کے جزیرے پر کس طرح اتر سکتے ہیں۔"

"اوہ۔" ان کے منہ سے نکلا۔ چند لمحے انھیں عجیب سی نظروں
سے دیکھتے رہنے کے بعد ایک نے کہا:

"تم لوگ ہمیں بہت ہی عجیب لگ رہے ہو۔ شاید تم عام
انسان نہیں ہو۔ خیر۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ ہم اس وقت
تو جزیرے پر اتریں گے ہی نہیں۔"

"کیوں اتریں گے کیوں نہیں۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"آپ کا ہم سے وعدہ ہے۔ ہمیں ہمارے ملک کی حدود
تک پہنچا کر ادھر آئیں گے۔" ایک نے کہا۔

"اور ہمیں یہ وعدہ اچھی طرح یاد ہے۔"

"تو پھر آپ لوگ اس وقت اس جزیرے پر اتر کر کیا
کریں گے۔" دوسرا حیران ہو کر بولا۔

"یہ دیکھیں گے کہ خزانہ اس جزیرے پر موجود ہے یا نہیں۔"
انسپکٹر کامران مرزا بھرپور انداز میں مسکرائے۔

"اوہ!" وہ دھک سے رہ گئے۔

"کیوں۔ کیا بات ہے۔" آصف نے فوراً کہا۔

"کک۔ کچھ نہیں۔ ہم نے آپ لوگوں کے بارے میں بالکل
غلط اندازہ لگایا تھا۔ آپ لوگ ضرورت سے زیادہ چالاک ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے۔ یہ وہ جزیرہ نہیں ہے۔" محمود نے
کہا۔

"ہاں! یہی بات ہے۔ خیر۔ اب ہم آپ کا اطمینان کرنے
کے بعد ہی آگے جائیں گے۔ اس جزیرے کے پاس سے گزر

جائیے، رُکنے کی ضرورت نہیں۔" ایک ڈاکو نے تھکی تھکی آواز میں کہا۔

ان کے چہروں پر مسکراہٹیں دوڑ گئیں۔ آخر ایک گھنٹے کے سفر کے بعد ایک جزیرے کے آثار نظر آئے۔ ایک ڈاکو فوراً ہی بول اُٹھا:

"یہی ہے وہ جزیرہ۔ اس بار ہم غلط نہیں کہہ رہے۔"

"شکریہ۔ ہمارا بھی یہی خیال ہے کہ آپ لوگ اس مرتبہ غلط نہیں کہہ رہے، لیکن ہم جب تک خزانے کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ لیں گے۔ اس وقت تک آگے نہیں بڑھیں گے۔"

"آپ لوگ بہت ضدی ہیں۔ ضرورت سے زیادہ ہوشیار ہیں ہماری دال آپ لوگوں کے سامنے نہیں گل سکتی۔"

"فکر نہ کریں، دال کو ہم خود گلا دیں گے۔" آفتاب نے منہ کھولا۔

"تو کیا۔ خزانے والا جزیرہ یہ بھی نہیں ہے۔"

"جزیرہ تو خیر یہی ہے۔"

"شکریہ!" ان کے منہ سے نکلا۔

اور پھر وہ جزیرے کے بالکل نزدیک پہنچ گئے۔ دوسرا لمحہ حیران کن تھا۔ جزیرے کے دوسری سمت میں انھیں ایک جہاز کی جھلکیاں نظر آئی تھیں۔ ادھر چاروں ڈاکو بھی جہاز کو دیکھ کر حیران رہ گئے:

"یہ۔ یہ کس کا جہاز ہے۔" ایک کے منہ سے نکلا۔

"یہ تو جومی ہی بتا سکے گا۔"

"جومی کون؟" انسپکٹر جمشید نے چونک کر کہا۔

"خزانے کا محافظ۔" اس نے جواب دیا۔

"اس کے ساتھ اور کتنے لوگ ہیں جزیرے پر؟"

"پندرہ۔" اس نے ہنس کر کہا۔

"کیا تم ہم پر ہنس رہے ہو؟" فرزانہ نے بھنا کر کہا۔

"ہاں! آخر تم لوگ ہمارے جال میں آ ہی گئے۔"

"وہ کیسے؟" فاروق نے انھیں گھورا۔

"اس جزیرے کے چاروں طرف جومی کے ماتحت درختوں پر موجود رہتے ہیں اور چاروں طرف کا جائزہ لیتے رہتے ہیں۔ گویا وہ ہمیں بھی دیکھ چکے ہیں اور ہم اب ان کی رائفلوں کی زد میں ہیں۔ کیا سمجھے۔" اس نے ہنس کر کہا۔

"یہ کہ تم پکے دھوکے باز ہو۔"

"اور تم تو جیسے ہمیں دھوکا دینے کا ارادہ رکھتے ہی نہیں تھے۔" ایک نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"دھوکا ہم بھی دیتے، لیکن ہمارا دھوکا ذرا مختلف قسم کا ہوتا۔ ہم تم لوگوں کو جان سے ہرگز نہ مارتے۔ خیر کوئی بات نہیں، دیکھا جائے گا۔ اب کیا پروگرام ہے؟"

"ہاتھ اوپر اٹھا دو۔ اور کشتی سے اُتر کر جزیرے پر چلو۔"

"اس طرح نہیں۔ پہلے ثبوت دو، ہم جومی کے ماتحتوں کی زد پر ہیں۔"

"مسٹر جومی۔ یہ اپنا اطمینان چاہتے ہیں۔" ان میں سے ایک نے چلّا کر کہا۔

فوراً ہی چار فائر ہوئے اور گولیاں ان کے سروں پر سے گزر گئیں۔

"ٹھیک ہے۔ ہم ہاتھ اُٹھا کر جزیرے پر چلیں گے۔"

"اور اپنی رائفلیں ہمارے حوالے کرنا ہوں گی۔" ایک نے کہا۔

"اچھا۔" وہ بولے۔ پھر رائفلیں ان کے حوالے کر دیں۔

محمود اور آصف نے سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا بھی۔ جیسے کہہ رہے ہوں۔

"یہ ہم کیا کر رہے ہیں۔ خود کو ان کے حوالے کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہم ان سے مقابلہ کیوں نہ کریں۔"

لیکن انسپکٹر کامران مرزا اور انسپکٹر جمشید معنی خیز انداز میں مسکرا دیے۔ ہاتھ سروں سے بلند کیے وہ جزیرے پر اتر گئے اور آگے بڑھنے لگے۔ چاروں ڈاکو رائفلیں اُٹھائے ان کے پیچھے چل رہے تھے۔ آخر وہ جزیرے کے درمیان میں پہنچ گئے۔

"بس یہیں رُک جاؤ۔" اوپر سے ایک آواز آئی۔

پھر دھم دھم کی آواز گونجی اور قریباً دس آدمی درختوں سے نیچے آ رہے۔

"یہ کون لوگ ہیں اور تم انھیں کشتی پر یہاں کیوں لائے ہو؟" ان میں سے سب سے لمبے چوڑے آدمی نے کہا۔

"مسٹر جومی۔ ہمارا جہاز تباہ ہو چکا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"ہم نے ان لوگوں کا جہاز لوٹنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اس سے پہلے کہ ہم کچھ کرتے، ان کی طرف سے عجیب انداز میں گولا باری شروع ہو گئی۔ اور آن کی آن میں ہمارے جہاز کو آگ لگ گئی۔"

"آگ لگ گئی۔ آخر کس طرح۔ اور عجیب انداز کی گولا باری سے تمھاری کیا مراد ہے؟" جومی نے حیران ہو کر پوچھا۔

وہ اسے تفصیل سنانے لگا۔ جومی کی پیشانی پر پہلے تو بل پڑتے چلے گئے۔ پھر اس کے چہرے کا رنگ سُرخ ہونے لگا۔

"تو سردار بھی ڈوب گیا۔ باقی سب ساتھی بھی دوسری دنیا میں چلے گئے۔"

"اگر ایک آدھ گھنٹے تک ان میں سے کوئی یہاں نہ پہنچا تو

یہی سمجھا جائے گا۔"

" اس کا مطلب ہے ۔ اب اس سارے خزانے کے ہم بیس آدمی مالک ہیں۔"

" جی ہاں! بالکل یہی بات ہے۔"

" بھئی واہ ۔ پھر تو مزا آگیا۔"

" لیکن پہلے ان کا کچھ کرنا ہے ۔ یہ لوگ بہت چالاک ہیں۔"

" ہوں گے ، ہمیں کیا ۔ چلو بھئی ۔ ان کا کام تمام کر دو۔" جومی نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

فوراً ہی ان کی طرف اٹھی ہوئی رائفلیں بالکل سیدھی ہو گئیں ۔ انگلیاں ٹریگروں پر دباؤ ڈالنے لگیں ، ایسے میں انسپکٹر کامران مرزا پُر سکون آواز میں بولے :

" تم لوگ ان رائفلوں کی مدد سے ہمیں ختم نہیں کر سکتے۔"

" کیا مطلب؟" جومی نے حیران ہو کر کہا۔

" پہلے تو یہ بتاؤ ۔ یہ جہاز یہاں کیسا کھڑا ہے؟"

" اس پر ہمارے ملک کی چند بہت ہی اہم ہستیاں یہاں تک آئی ہیں ۔ ان کے ساتھ کچھ قیدی بھی تھے ۔ وہ ان قیدیوں کو لے کر کشتیوں میں بیٹھ کر وطن کی طرف جا چکے ہیں۔"

" قیدیوں کے علاوہ وہ اور بھی کچھ لے گئے؟"

" نہیں ۔ صرف قیدی لے گئے ہیں ۔ کیوں ۔ تم یہ کیوں پوچھ

رہے ہو۔"

" اور انھیں گئے کتنی دیر ہوئی ہے؟"

" چار پانچ گھنٹے۔"

" ہوں ۔ اس کا مطلب ہے ۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔" انھوں نے پُر اسرار انداز میں کہا۔

" نہ جانے تم کیا کر رہے ہو ۔ شاید ہمارا وقت ضائع کر رہے ہو یا پھر کوئی چال چلنے کے موڈ میں ہو ۔ لیکن یہاں تمھاری کوئی چال نہیں چلے گی ۔ تم لوگ کھڑے منہ کیا دیکھ رہے ہو ۔ ختم کر دو۔"

" اس جہاز پر جانتے ہو کیا ہے۔" انھوں نے جیسے اس کے الفاظ سنے ہی نہیں ۔

" کیا ہے۔"

" اس جزیرے کے خزانے سے بھی بڑا خزانہ ۔ تم میں سے جو بھی اس جہاز کو یہاں سے لے بھاگا ۔ خزانہ اسی کا ہوگا۔"

" نن ۔ نہیں ۔ یہ جھوٹ ہے۔"

" یہ تو بعد میں پتا چلے گا کہ جھوٹ ہے یا سچ۔"

" ٹھہرو ۔ میں ابھی دیکھتا ہوں۔" جومی نے کہا اور جہاز کی طرف دوڑ لگا دی ۔

اسی وقت پانچ آدمی اور درختوں پر سے کودنے اور یہ کہتے

ہوئے جہاز کی طرف دوڑ پڑے:

"کہیں مسٹر جومی اکیلے ہی جہاز کو لے کر نہ نکل جائیں۔"

"وہ یہی کرے گا۔" انسپکٹر جمشید نے مسکرا کر کہا۔

"تو پھر ہم یہاں کیوں ٹھہریں۔" یہ کہتے ہی باقی ساتھی بھی دوڑ پڑے۔

صرف وہ چار ڈاکو وہاں کھڑے رہ گئے جو ان کے ساتھ آئے تھے، اب وہ انھیں عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ آخر ایک نے کہا:

"تم لوگ آخر کیا چیز ہو؟"

"کیوں بھئی۔ خیر تو ہے۔" آصف ہنسا۔

"اپنی موت کو چٹکیوں میں پرے دھکیل دیا۔ کمال ہے۔"

"کیا تم چاروں کو اس خزانے سے کوئی دلچسپی نہیں۔" محمود نے جلدی سے کہا۔

"ہمارے لیے اس جزیرے والا ہی خزانہ کافی ہے۔"

"تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ اس جہاز پر پورے ایک ملک کا سونا لدا ہوا ہے۔"

"کیا!!" وہ چلا اٹھے۔

"اگر یہ بات غلط ہو تو جو چور کی سزا وہ ہماری۔"

"تب۔ تب ہم بھی جائیں گے۔ جومی اس خزانے کا

اکیلا مالک نہیں بن سکتا۔" ایک نے کہا اور انھوں نے بھی دوڑ لگا دی۔

"موقع اچھا ہے۔ اب ہمیں درختوں پر چڑھ جانا چاہیے۔" خان رحمان بولے۔

"کیوں انکل۔ درختوں پر کیوں چڑھیں۔ کیوں نہ ہم بھی جہاز پر چلیں۔ کہیں یہ لوگ اس جہاز کو یہاں سے کسی اور سمت میں نہ لے جائیں۔" فرزانہ نے بے تابانہ لہجے میں کہا۔

"بالکل ٹھیک۔ میں فرزانہ کی تائید کرتا ہوں۔" منور علی خان بولے۔

"تو پھر آیئے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

عین اسی وقت جہاز پر گولیاں چلنے کی آواز سنائی دی۔

ترکیب کی تہ

وہ ٹھٹک کر رک گئے ۔ گولیوں کی آوازیں تیز ہوتی
چلی گئیں :
"ٹھن گئی ان کی آپس میں ۔" فرحت بڑبڑائی ۔
"کیوں نہ ہم ان کے درمیان فیصلہ ہونے کا انتظار
کریں ۔ کہیں کوئی بھولی بھٹکی گولی ہماری طرف نہ آجائے ۔"
فاروق نے پریشان ہو کر کہا ۔
"بھئی بھولی بھٹکی گولیوں سے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے ۔"
آفتاب نے منہ بنایا ۔
"تو پھر ۔ کیا صرف نشانے پر لگنے والی گولیوں سے ڈرنے
کی ضرورت ہے ۔" فاروق نے منہ بنایا ۔
"ہمیں کسی سے بھی ڈرنے کی ضرورت نہیں ۔ بس ایک اللہ
سے ڈرنا چاہیے ۔" اشفاق بولا ۔
"ہاں واقعی ۔ یہ بات بالکل فٹ ہے ۔" فرزانہ نے اس

کی تائید کی ۔
"لیکن ایسا ہوتا نہیں ۔ ہم لوگ اور بھی بہت سی چیزوں سے
بے تحاشا ڈرتے رہتے ہیں ۔" فرحت نے کہا ۔
"ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہم ڈر کے موضوع پر باتیں
کرنے پر تُل گئے ہیں ۔" محمود نے منہ بنایا ۔
"ان حالات میں اور کیا کریں ، کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہو گا ،
کیوں نہ تُل ہی جائیں ۔" آصف مسکرایا ۔
"اُدھر گولیاں برس رہی ہیں اِدھر جُملے ۔" آفتاب مسکرایا ۔
"یہ تو پھر ایسا لگتا ہے جیسے جُملوں کا گولیوں سے چولی
دامن کا ساتھ ہو گیا ہے ۔" اخلاق نے منہ بنایا ۔
"شاید ہم سب ایک ایک جُملہ بول چکے ہیں ، لیکن بڑے
ابھی تک خاموش ہیں ۔" اخلاق نے گویا اطلاع دی ۔
"نہیں ۔ ابھی میں نے اپنا حق محفوظ رکھا ہوا ہے ۔ مطلب
یہ کہ میں کچھ نہیں بولا ۔" شوکی نے شوخ آواز میں کہا ۔
"ارے تو کیا میں اس گفتگو میں حصّہ لے چکا ہوں ۔"
مکھن نے حیران ہو کر کہا ۔
"بھئی تمھاری بجائے میں بول گیا ہوں گا ۔" آفتاب ہنسا ۔
"بڑے بے چارے کیا خاک بولیں گے ۔ تمھاری باتوں نے
انھیں گھن چکر بنا کر رکھ دیا ہے ۔ گولیوں کی بوچھاڑ میں بھی تم

لوگ باز نہیں رہ سکتے۔" انسپکٹر جمشید نے تلملا کر کہا۔
"لیکن جمشید۔ گولیوں کی بارش جہاز پر یا اس کے آس پاس ہو رہی ہے۔ یہاں نہیں۔" پروفیسر داؤد مسکرا دیے۔
"ہاں بالکل۔ یہ تو اس وقت خاموش ہو سکتے ہیں جب گولیاں ان کے سروں پر سے گزرنے لگیں۔" انسپکٹر کامران مرزا نے بھی جل بھن کر کہا۔
"اس وقت بھی نہیں۔ انسپکٹر کامران مرزا۔ ہاں سروں پر سے پانی گزر جائے تو شاید یہ خاموش ہو جائیں۔"
"آخر آپ لوگ ہم سب کو خاموش کرنے کے لیے ہاتھ دھو کر کیوں پیچھے پڑ گئے ہیں۔" آفتاب نے برا سا منہ بنایا۔
"اس لیے کہ تم لوگ موقع محل نہیں دیکھتے۔ یہ عمل کا وقت ہے۔ باتوں کا نہیں۔ غور کرو۔ اگر ہم لوگ اس جہاز پر قبضہ نہ کر سکے اور اسے کسی اور مقام پر نہ پہنچا سکے۔ تو ہماری کسی بھی قسم کی کامیابی کامیابی نہیں سمجھی جائے گی۔" انسپکٹر جمشید سرد آواز میں بولے۔
"ہوں۔ واقعی بات بالکل ٹھیک ہے۔ خیر۔ باتوں کا دفتر بالکل بند۔ اب فرمائیے۔ کیا کریں۔"
"ہمیں درختوں کی اوٹ لیتے ہوئے جہاز سے نزدیک ہو جانا چاہیے۔ ہمیں اس وقت اسلحے کی شدید ضرورت ہے۔" انھوں

نے کہا اور وہ سر ہلاتے ہوئے آگے بڑھے۔ درختوں کی اوٹ لیتے۔ وہ جہاز سے نزدیک ہوتے چلے گئے۔ ادھر جہاز پر تڑا تڑ گولیاں برس رہی تھیں۔
اب جہاز انھیں صاف دکھائی دینے لگا۔ وہ نیا چاند ہی معلوم ہوتا تھا، وہی جہاز۔ جس پر انھوں نے ایک حیرت انگیز سفر کیا تھا۔ اور جس پر ان کے ملک کا سونا لدا ہوا تھا، اب اس سونے کے لیے بنگال کے ڈاکوؤں میں جنگ ہو رہی تھی۔ ایک خون ریز جنگ۔ ان میں سے ہر ایک یہ چاہتا تھا کہ وہ باقی سب کو ختم کر دے اور خزانے پر خود قبضہ کر لے۔
اچانک تین آدمی انھیں تین درختوں کے پیچھے سے گولیاں برساتے نظر آئے۔ وہ جہاز پر گولیاں برسا رہے تھے۔ اب انھیں رک جانا پڑا۔ اگر وہ اس جگہ سے آگے بڑھتے تو گولیوں کی زد میں آ سکتے تھے اور یہ لوگ بھی انھیں دیکھ لیتے، جہاز کی طرف سے بھی ان لوگوں پر گولیاں برسائی جا رہی تھیں۔ لیکن چوں کہ وہ درختوں کی بالکل اوٹ میں تھے۔ اس لیے پوری طرح محفوظ تھے۔ ادھر جہاز پر بھی چیخ پکار مچی تھی۔ شاید وہاں آپس میں بھی گولیاں چل رہی تھیں۔
"انسان دولت کا کتنا بھوکا ہے۔ اپنی جان سے بھی باز نہیں آتا۔ حالاں کہ مر کر دولت کسی کام نہیں آتی۔" منور علی خان

نے افسوس زدہ لہجے میں کہا۔

گولیوں کا تبادلہ پندرہ منٹ جاری رہا، پھر اچانک جہاز جزیرے سے دور ہونے لگا۔ یہ دیکھ کر درختوں کے پیچھے چھپے ہوئے تین آدمی چیختے چلاتے جہاز کی طرف دوڑ پڑے۔ اور یہی ان کی غلطی تھی۔ فوراً ہی گولیاں انھیں چاٹ گئیں۔ ان کے لاشے تڑپنے لگے۔

"ہم ان لوگوں کو جہاز نہیں لے جانے دیں گے۔ باقی لوگ یہیں ٹھہریں۔ صرف میں اور انسپکٹر کامران مرزا جائیں گے۔" انسپکٹر جمشید نے دبی آواز میں کہا۔

"لیکن کیوں ابا جان۔ ہم کیوں نہ ساتھ جائیں۔"

"تب پھر پروفیسر صاحب یہاں اکیلے رہ جائیں گے۔"

"میری فکر نہ کریں۔" انھوں نے فوراً کہا۔

"جی نہیں۔ سب لوگ یہیں ٹھہریں۔ ہم دونوں جائیں گے۔ اور ان شاء اللہ جہاز واپس لائیں گے۔"

یہ کہتے ہی وہ وہاں سے چل پڑے۔ لیکن وہ سیدھے جہاز کی طرف نہیں جا رہے تھے۔ بلکہ جزیرے کا چکر کاٹ کر دوسری سمت کا رخ کر رہے تھے۔ وہ بھی ان کے پیچھے چل پڑے۔ اور پھر انھوں نے پانی میں چھلانگیں لگا دیں اور صرف سر پانی سے باہر رکھ کر سمندر میں تیرنے لگے۔

وہ درختوں کی اوٹ میں کھڑے ان کی طرف دیکھتے رہے۔ جہاز پر ابھی تک فائر ہو رہے تھے۔ لیکن اب ان میں تیزی نہیں رہ گئی تھی۔ غالباً زیادہ تر ڈاکو مارے جا چکے تھے۔ جو چند ایک رہ گئے تھے۔ ان کے درمیان فیصلہ ہونا باقی تھا۔ ادھر وہ لمحہ بہ لمحہ جہاز سے نزدیک ہوتے جا رہے تھے۔ آخر سیڑھی تک پہنچ گئے۔ اور ایک ایک سیڑھی کر کے اوپر چڑھنے لگے۔ جوں ہی انسپکٹر جمشید کا سر عرشے تک پہنچا، کوئی چیز پوری طاقت سے ان کے سر پر لگی۔ چوٹ اس قدر زبردست تھی کہ سیڑھی کا ڈنڈا ان کے ہاتھ سے نکل گیا اور وہ چھپاک سے پانی میں جا گرے۔ انسپکٹر کامران مرزا گھبرا گئے۔ وہ انسپکٹر جمشید سے صرف تین ڈنڈے نیچے تھے۔ انھوں نے سر اوپر اٹھا کر دیکھا۔ جومی عرشے پر کھڑا نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کشتی کا چپو تھا۔ اس نے یہی چپو انسپکٹر جمشید کے سر پر رسید کیا تھا۔

چند لمحے تک انسپکٹر کامران مرزا اس کی اور وہ ان کی طرف دیکھتے رہے۔ آخر جومی نے ہنس کر کہا:

"رک کیوں گئے بھئی۔ آؤ نا۔"

"آ رہا ہوں۔" وہ جھلا کر بولے۔

انھوں نے قدم اٹھایا ہی تھا کہ چپو سر کی طرف آتا نظر

آیا - بلا کی رفتار سے وُہ سیڑھی کے نیچے لٹک گئے - چپو
ڈنڈے پر لگا ، انھوں نے فوراً دوسرا ہاتھ چپو پر ڈال
دیا - اور اس کے سہارے ڈنڈے پر آ گئے - ادھر جومی
چپو چھیننے کے لیے پورا زور لگا رہا تھا ، اس کے دونوں ہاتھ
چپو پر جمے تھے - جب کہ انسپکٹر کامران مرزا نے چپو کو صرف
ایک ہاتھ سے پکڑ رکھا تھا - دونوں طرف سے چپو کے لیے پورا
زور لگ رہا تھا - اچانک انسپکٹر کامران مرزا نے چپو چھوڑ دیا ،
جومی اپنے زور میں پیچھے کی طرف گرا - ان کے لیے اتنا ہی
موقع کافی تھا - فوراً عرشے پر کُود گئے - ادھر جومی اُٹھ
چکا تھا - اور چپو کو سر سے بلند کر چکا تھا - دوسرے ہی لمحے
اس نے ان پر وار کیا - وہ دائیں طرف لڑھک گئے - چپو عرشے
پر لگا - اس نے پھر چپو اٹھایا - اتنے میں انسپکٹر کامران مرزا
اٹھ چکے تھے - اسی وقت چپو ان کی طرف آیا ، انھوں
نے ایک اونچی چھلانگ لگائی - چپو ان کے نیچے سے نکل گیا -
ساتھ ہی وہ جومی سے ٹکرائے - وہ دھڑام سے گرا اور چپو
اس کے ہاتھ سے نکل گیا -

دوسرے ہی لمحے انسپکٹر کامران مرزا چپو اٹھا چکے تھے ،
جومی نے چپو اپنے سر کی طرف آتا دیکھا تو اس کی آنکھوں
میں خوف دوڑ گیا - لیکن اب وُہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا ،

چپو پوری طاقت سے اس کے سر پر لگا - سر پھٹ گیا اور جومی
تڑپنے لگا -

اب وُہ نیچے کی طرف متوجہ ہوئے اور بولے :

" انسپکٹر جمشید - آپ کہاں ہیں ؟ "

" میں آ رہا ہوں - فکر نہ کریں " سیڑھی پر سے آواز آئی -
انھوں نے دیکھا - ان کے سر سے خون بہ رہا تھا - پھر
جوں ہی وُہ اوپر آئے - انسپکٹر کامران مرزا نے ان کے سر
پر پٹی باندھ دی - اب دونوں انجن روم کی طرف متوجہ
ہوئے - جومی کا ایک ساتھی انجن روم میں موجود تھا - شاید
اسے جہاز چلانا آتا تھا - وہ انجن روم کے دروازے پر
پہنچے - دروازہ اندر سے بند تھا :

" دروازہ کھول دو بھئی " انسپکٹر کامران مرزا بولے -

" نہیں - دروازہ نہیں کھلے گا "

" تب ہم شیشے کی دیوار توڑ دیں گے - تمہارے سب
ساتھی مارے جا چکے ہیں - جومی بھی ختم ہو چکا ہے - لہٰذا
ہتھیار ڈال دو "

" اس نے کچھ سوچا اور پھر دروازہ کھول دیا - ساتھ ہی
بولا :

" مجھے خزانے میں برابر کا شریک کرو "

"اگر تم نے ہمارا پوری طرح ساتھ دیا تو تمہیں تمہارا حصّہ ضرور ملے گا۔ جہاز کو واپس جزیرے تک لے چلو۔ ابھی ہمیں اپنے ساتھیوں کو بھی سوار کرنا ہے۔"

"اچھی بات ہے۔"

جلد ہی جہاز پھر جزیرے سے لگا۔ سب لوگ بے تابانہ انداز میں ساحل پر کھڑے تھے۔ انسپکٹر جمشید کے سر پر رومال بندھا دیکھ کر وہ بُری طرح بے چین ہو گئے۔

"یہ کیا ہوا ابا جان؟" فرزانہ چلائی۔

"فکر کی کوئی بات نہیں۔ بس ذرا سر پھٹ گیا ہے۔" وہ مسکرائے۔

"سر پھٹ گیا ہے۔ اور فکر کی کوئی بات نہیں۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ابا جان۔" محمود بولا۔

"ارے! خون تو اب بھی رس رہا ہے۔"

"ہاں! باقاعدہ مرہم پٹی کرنا ہو گی، لیکن اتنا وقت نہیں۔ جزیرے کا خزانہ جہاز پر لاد لو۔"

"جزیرے کا خزانہ، لیکن ہمیں کیا معلوم۔ خزانہ کہاں ہے؟"

"جوی کا ایک ساتھی اب ہمارا ساتھی ہے۔ یہ ہمیں بتائے گا۔ کیوں بھئی۔ تمہارا نام کیا ہے؟"

"راگو" اس نے کہا۔

"جلدی کرو راگو۔ سارا خزانہ جہاز پر منتقل کرا دو۔ تاکہ ہم یہاں سے کسی اور جگہ پہنچ سکیں۔ جو لوگ اس جہاز کو یہاں تک لائے ہیں۔ وہ بہت جلد یہاں پہنچنے والے ہیں۔ پھر تم خزانہ حاصل نہیں کر سکو گے۔"

"ہاں! آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ مسٹر رونل کہ گئے تھے کہ ان کے ماتحت بہت جلد یہاں پہنچیں گے اور جہاز سے چیزیں اتار کر کشتیوں پر لاد کر لے جائیں گے۔"

"ویری گڈ۔ تب تو ہمیں سوچنا ہو گا۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"جی۔ کیا سوچنا ہو گا؟"

"یہ کہ ہم اب کیا کریں۔ خیر۔ تم لوگ خزانہ تو جہاز پر پہنچاؤ۔ اتنی دیر میں ہم کوئی فیصلہ کر لیں گے۔"

وہ سب کام میں مصروف ہو گئے۔ انسپکٹر کامران مرزا بھی سامان لدوانے میں مدد کر رہے تھے۔ صرف انسپکٹر جمشید زخم کی وجہ سے ایک طرف بیٹھے تھے۔ اب ان کے سر پر دوسری پٹی باندھ دی گئی تھی۔ ایک گھنٹے کی محنت کے بعد سارا خزانہ جہاز پر لے آیا گیا۔

"آپ نے کیا سوچا؟"

"خزانے کو کسی اور جزیرے پر دفن کر دیا جائے۔ اور

جہاز کو کسی اور جزیرے پر کھڑا کر دیا جائے۔ پھر ہم بنگال کا رُخ کریں گے۔"

"بنگال کا رُخ۔ کیا مطلب؟" راگو نے چونک کر کہا۔

انھوں نے پریشان ہو کر راگو کی طرف دیکھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ راگو ان کی اس بات کو پسند نہیں کرے گا۔ ان کے خیال میں تو راگو ایک ڈاکو تھا اور اسے صرف دولت سے محبت تھی۔

"مسٹر راگو۔ ہماری منزل تمھارا ملک ہے۔ ہم اس ملک کو ایک عظیم نقصان پہنچانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔"

"ن۔ نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔"

"کیوں۔ کیوں نہیں ہو سکتا۔" محمود نے بُرا سا منہ بنایا۔

"اس لیے کہ میں اپنے ملک کا وفادار ہوں۔"

"تب پھر تمھارے ملک کے لوگوں کو یہ کیوں زیب دیتا ہے کہ وہ دوسرے ملکوں کو نقصان پہنچاتے پھریں۔ ایک دُنیا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ دُنیائے اسلام کا سکون تمھارے ملک نے برباد کر رکھا ہے۔ آخر کیوں؟"

"میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں۔ میں تو بس یہ جانتا ہوں کہ میں اپنے ملک کو نقصان پہنچتے نہیں دیکھ سکتا۔"

"اور ہم اپنے ملک کے وفادار ہیں۔ جو ہمارے ملک کی طرف میلی آنکھوں سے دیکھتا ہے، ہم اسے ہرگز معاف نہیں کر سکتے۔"

"اوہ۔ تت۔ تو کیا۔" وہ ہکلایا۔

"ہاں! تمھارا مُلک ہمیں نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ اس کے بے شمار جاسوس ہمارے ملک میں کارروائیاں کر رہے ہیں۔ مرتدوں کی ایک پوری جماعت تمھارے مُلک کے لیے کام کر رہی ہے۔"

"ہاں! یہ ہو سکتا ہے۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود میں اپنے ملک کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گا۔"

"تب ہم ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے۔ اور اس صورت میں ہم تمھیں زندہ بھی نہیں رکھ سکتے۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی انسپکٹر کامران مرزا نے وہی چھچو اس کے سر پر دے مارا۔ جو جومی کے سر پر مارا تھا۔ اور جس سے جومی نے انسپکٹر جمشید کو زخمی کیا تھا۔

چھچو کچھ اس قدر زور سے لگا کہ اس کے منہ سے چیخ تک نہ نکل سکی۔ دوسرے ہی لمحے وہ دوسری دُنیا کے سفر پر روانہ ہو چکا تھا۔

"اس کے کپڑے خون میں خراب نہ ہونے پائیں۔" انسپکٹر

جمشید جلدی سے بولے۔

"جی - کیا مطلب - ہم اس کے کپڑوں کا کیا کریں گے؟"

"بہت ضرورت ہے۔" وہ بولے۔

خان رحمان آگے بڑھے، اور اس کے دھڑ کو پکڑ کر اوپر کر دیا - اب اس کا سر نیچے ہو گیا - اس طرح اس کے کپڑے خون آلود ہونے سے بچ گئے -

"اب سوال یہ ہے کہ جہاز کون چلائے گا۔"

"میں اور انسپکٹر کامران مرزا مل کر کوشش کرتے ہیں۔" خان رحمان بولے۔

"میں بھی تمہارا ساتھ دوں گا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"تم زخمی ہو جمشید۔" پروفیسر داؤد نے انھیں گھورا۔

"خیر - اب میں اتنا بھی زخمی نہیں۔"

تینوں انجن روم میں داخل ہو گئے - آدھ گھنٹے کی کوشش کے بعد آخر جہاز چل پڑا - اب اس کا رخ اس جزیرے کی طرف تھا جو انھیں راستے میں ملا تھا۔

"کیا آپ واقعی سارے خزانے کو کسی جزیرے پر دفن کرنا چاہتے ہیں؟"

"اس کے علاوہ کوئی صورت نہیں خزانے کو محفوظ کرنے کی۔" انھوں نے کہا۔

"لیکن ابا جان - وہ لوگ آس پاس کے تمام جزیروں کو کھود ڈالیں گے۔" فرزانہ نے اعتراض کیا۔

"ہاں! یہ تو وہ کریں گے۔"

"تب پھر ہم ایسا کیوں کریں۔" اس نے جواب دیا۔

"اچھا - تم بتاؤ - کیا کریں۔"

"مجھے مہلت دیں - صرف چند منٹ کی مہلت۔" فرزانہ نے کہا۔

"نہ صرف فرزانہ کو بلکہ مجھے بھی مہلت دیں۔" فرحت مسکرائی۔

"جب فرزانہ کو مہلت دے دی گئی تو گویا سبھی کو مہلت مل جائے گی۔" فاروق نے جل کر کہا۔

"ہاں یہ بھی ٹھیک ہے، لیکن اس میں جلنے کی کیا بات ہے۔" فرحت نے بھی جل کر کہا۔

"دیکھو بھئی - ہم اس وقت جلنے کا مقابلہ کرنے کے موڈ میں نہیں ہیں۔" آصف گھبرا گیا۔

وہ سوچ میں گم ہو گئے - آخر فرزانہ نے ہی پہل کی:

"وہ مارا - میں نے ترکیب سوچ لی۔"

"ایک ترکیب میں نے بھی سوچی ہے۔"

"اور - اور مم - میں نے بھی۔" مکھن کی آواز گونجی۔

"گویا تم اپنی ٹیم میں فرحت اور فرزانہ کے ہم پلہ ہو۔" فاروق

نے شریر آواز میں کہا۔

"بڑے بھائی ہیں۔ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔" مکھن نے شرما کر کہا اور وہ مسکرانے لگے۔

"کہیں ایسا تو نہیں کہ تم تینوں نے ایک ہی ترکیب سوچی ہو۔" محمود نے منہ بنا کر کہا۔

"پہلے سُن لو۔ اس کا فیصلہ بعد میں ہو گا کہ ایک ترکیب سوچی گئی ہے یا تین۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔ چلو فرزانہ۔ پہلے تم بتاؤ۔"

"میں نے سوچا ہے۔ جہاز اسی جزیرے کے ساحل پر کھڑا رہنے دیں اور خزانہ جزیرے پر منتقل کر دیں۔ تاکہ ہم رخصت ہوتے وقت آسانی سے یہاں سے جا سکیں۔"

"شاید اس سے بھونڈی ترکیب فرزانہ نے آج تک نہیں سوچی ہو گی۔" فاروق نے کہا۔

"بھئی، ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ فرزانہ کی ترکیبوں کا تجربہ تو تم لوگوں کو ہی ہے۔" آفتاب مسکرایا۔

"چلو فرحت۔ تم بتاؤ۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"میں نے بھی بالکل یہی ترکیب سوچی ہے۔"

"کیا کہا۔ بالکل یہی ترکیب سوچی ہے۔ تب پھر تمہارا بھی شاید دماغ چل گیا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح فرزانہ

کا چل گیا ہے۔" آصف بولا۔

"اے۔ خبردار۔ تم نے غلط کہا۔ میرا دماغ نہیں چلا۔" فرزانہ نے کاٹ کھانے والے انداز میں کہا۔

"جو ترکیب تم نے بتائی۔ اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے۔" وہ بولا۔

"ابھی تم اس ترکیب کی تہ تک نہیں پہنچے۔"

"ترکیب کی تہ۔ تت۔ تو۔ کیا ترکیب کی بھی تہ ہوتی ہے۔" شوکی بوکھلا اُٹھا۔

"ہاں بالکل۔ ہوتی ہے۔ اور پھر تہ کا کیا ہے۔ کسی بھی چیز کی ہو سکتی ہے۔ یہاں تک کہ چٹانیں بھی تہ دار ہوتی ہیں۔" فاروق بولا۔

"لیجیے۔ تہ سے چٹانوں تک جا پہنچے یہ حضرت۔" آفتاب نے بُرا سا منہ بنایا۔

"لیکن تم سے تو اتنا بھی نہیں ہو سکا۔" فاروق مسکرایا۔

"بھئی ابھی مکھن رہتا ہے۔ پہلے اس کی ترکیب سُن لو۔ اور اس بات کا خاص خیال رکھو کہ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"ہاں مکھن بتاؤ۔ تم نے کیا ترکیب سوچی ہے۔ ان دونوں کو تو ایک ہی ترکیب سوجھی ہے۔"

"مم۔ میں۔ میں۔ گگ۔" مکھن ہکلا کر رہ گیا۔

"یہ کیا ترکیب ہوئی۔" فاروق حیران ہو کر بولا۔

"شاید مکھن نے کسی اور زبان میں ترکیب بتائی ہے۔" آفتاب بولا۔

"بھئی۔ اس غریب کو کچھ کہنے کا موقع تو دے دو۔"

"جی ہاں اور کیا۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ مم۔ میں نے۔" وہ پھر اٹکنے لگا۔

"بس کر چکے تم تو۔" محمود جل گیا۔

"مکھن۔ تمہیں کیا ہوگیا ہے۔" شوکی نے بھنا کر کہا۔

مکھن نے بے چارگی کے عالم میں ان کی طرف دیکھا اور پھر بولا:

"اب نہیں اٹکوں گا۔ میں نے بھی بالکل یہی ترکیب سوچی ہے۔"

"یہ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" خان رحمان نے بوکھلا کر کہا۔

"جی کیا مطلب۔ کیا۔ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"یہ کہ تم تینوں نے ایک ہی ترکیب سوچی ہو۔ اور ترکیب بھی وہ جو سب کی نظروں میں بالکل ٹھس ہے۔ کیوں بھئی،

ٹھس ہے نا۔"

"جی ہاں بالکل انکل۔ بلکہ ٹھس سے بھی دو ہاتھ آگے ہے۔" فاروق نے فوراً کہا۔

"مکھن۔ ہمیں تم سے یہ امید نہیں تھی کہ تم بھی یہی ترکیب سوچ ڈالو گے۔" اشفاق نے برا مان کر کہا۔

"اس میں میرا کیا قصور۔ ذہن میں یہی ترکیب آئی ہے۔"

"بھئی میرا خیال ہے۔ سب لوگ غلط لائن پر چلے ہیں۔ پہلے ان کی ترکیب کی تفصیل تو معلوم کر لو۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"ترکیب کی تفصیل۔ کیا مطلب؟"

"بات دراصل یہ ہے کہ خود میرے ذہن میں بھی یہی ترکیب آئی ہے۔"

"کیا!!!" ان سب کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔ لفظ کیا کی گونج عرشے پر سنی گئی اور ان کے چہروں پر حیرت دوڑ گئی۔

"اب تو ہمیں اس ترکیب کا سنجیدگی سے نوٹس لینا ہوگا۔" انسپکٹر کامران مرزا مسکرائے۔

"جی ہاں! لیکن یہ نوٹس کان میں لیا جائے گا۔" فرزانہ

نے کہا۔

"کان میں - کیا مطلب"

"تاکہ کانوں کان رونل، شیلاک اور ریوٹا کو خبر نہ ہو"

"تت - تو کیا" فاروق ہکلا کر رہ گیا۔

"کیا کہنا چاہتے ہو بھئی - ایک تو ہم تمھارے ہکلانے سے تنگ آگئے ہیں"

"ارے - تو پہلے کیوں نہیں بتایا تھا - میں ہکلانا بالکل بند کر دیتا" فاروق بولا۔

"جلدی کہو - کیا کہنا چاہتے ہو" انسپکٹر جمشید نے اسے گھورا۔

"صرف یہ کہ - کیا جہاز کی دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں" اس نے مسمسی صورت بنا کر کہا۔

"دھت تیرے کی" محمود نے جلا کر اپنی ران پر ہاتھ مارا۔

ختم کرو - اور جلدی ترکیب بتاؤ - چاہے کانوں میں ہی بتاؤ"

اور وہ ان سب کے کانوں میں ترکیب کی تفصیل سنانے لگے - تھوڑی دیر بعد وہ ترکیب پر عمل شروع کر چکے تھے - اس کام میں انھیں دو گھنٹے لگ گئے - آخر انھوں نے ایک بہت بڑی لانچ کو جزیرے کی طرف آتے دیکھا۔

ترکیب کے مطابق انھوں نے فوراً درختوں کا رُخ کیا - گھنے درختوں کے پتوں میں وہ اس طرح چھپ کر بیٹھ گئے جیسے جزیرے پر کوئی انسان موجود ہی نہ ہو -

لانچ لمحہ بہ لمحہ جزیرے سے نزدیک ہوتی جا رہی تھی -

"مم - میں - میں - لک" مکھن ہکلا کر رہ گیا۔

"یہ کیا ترکیب ہوئی" فاروق حیران ہو کر بولا۔

"شاید مکھن نے کسی اور زبان میں ترکیب بتائی ہے" آفتاب بولا۔

"بھئی - اس غریب کو کچھ کہنے کا موقع تو دے دو"

"جی ہاں اور کیا - میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ مم - میں نے -" وہ پھر اٹکنے لگا۔

"بس کرو چلے تم تو" محمود جل گیا۔

"مکھن - تمہیں کیا ہو گیا ہے -" شوکی نے بھنا کر کہا -

مکھن نے بے چارگی کے عالم میں ان کی طرف دیکھا اور پھر بولا:

"اب نہیں اٹکوں گا - میں نے بھی بالکل یہی ترکیب سوچی ہے"

"یہ - یہ کیسے ہو سکتا ہے" خان رحمان نے بوکھلا کر کہا -

"جی کیا مطلب - کیا - کیسے ہو سکتا ہے"؟

"یہ کہ تم تینوں نے ایک ہی ترکیب سوچی ہو - اور ترکیب بھی وہ جو سب کی نظروں میں بالکل ٹھس ہے - کیوں بھئی،

ٹھس ہے نا"

"جی ہاں بالکل انکل - بلکہ ٹھس سے بھی دو ہاتھ آگے ہے" فاروق نے فوراً کہا۔

"مکھن - ہمیں تم سے یہ امید نہیں تھی کہ تم بھی یہی ترکیب سوچ ڈالو گے" اشفاق نے برا مان کر کہا۔

"اس میں میرا کیا قصور - ذہن میں یہی ترکیب آئی ہے -"

"بھئی میرا خیال ہے - سب لوگ غلط لائن پر چلے ہیں - پہلے ان کی ترکیب کی تفصیل تو معلوم کر لو" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"ترکیب کی تفصیل - کیا مطلب"؟

"بات دراصل یہ ہے کہ خود میرے ذہن میں بھی یہی ترکیب آئی ہے"

"کیا !!" ان سب کے منہ سے ایک ساتھ نکلا - لفظ کیا کی گونج عرشے پر سنی گئی اور ان کے چہروں پر حیرت دوڑ گئی -

"اب تو ہمیں اس ترکیب کا سنجیدگی سے نوٹس لینا ہوگا" انسپکٹر کامران مرزا مسکرائے۔

"جی ہاں ! لیکن یہ نوٹس کان میں لیا جائے گا" فرزانہ

نے کہا۔

"کان میں - کیا مطلب۔"

"تاکہ کانوں کان رونل ، شیلاک اور ریوٹا کو خبر نہ ہو۔"

"تت - تو کیا۔" فاروق ہکلا کر رہ گیا۔

"کیا کہنا چاہتے ہو بھئی - ایک تو ہم تمھارے ہکلانے سے تنگ آگئے ہیں۔"

"ارے - تو پہلے کیوں نہیں بتایا تھا - میں ہکلانا بالکل بند کر دیتا۔" فاروق بولا۔

"جلدی کہو - کیا کہنا چاہتے ہو۔" انسپکٹر جمشید نے اسے گھورا۔

"صرف یہ کہ - کیا جہاز کی دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔" اس نے مسمسی صورت بنا کر کہا۔

"دھت تیرے کی۔" محمود نے جلّا کر اپنی ران پر ہاتھ مارا۔

ختم کرو - اور جلدی ترکیب بتاؤ۔ چاہے کانوں میں ہی بتاؤ۔"

اور وُہ ان سب کے کانوں میں ترکیب کی تفصیل سُنانے لگے - تھوڑی دیر بعد وہ ترکیب پر عمل شروع کر چکے تھے - اس کام میں انھیں دو گھنٹے لگ گئے - آخر انھوں نے ایک بہت بڑی لانچ کو جزیرے کی طرف آتے دیکھا۔

ترکیب کے مطابق انھوں نے فوراً درختوں کا رُخ کیا - گھنے درختوں کے پتوں میں وہ اس طرح چھپ کر بیٹھ گئے جیسے جزیرے پر کوئی انسان مُوجود ہی نہ ہو -

لانچ لمحہ بہ لمحہ جزیرے سے نزدیک ہوتی جا رہی تھی -

دشمن شہر

لانچ جزیرے پر آ کر رُک گئی۔ اس پر سے کتنے ہی
آدمی جزیرے پر اُتر پڑے، ساتھ ہی ایک نے بلند آواز میں کہا:
"جومی! ہم آ گئے ہیں، جہاز کی چیزیں اس لانچ کے ذریعے
لے جائیں گے۔ تم کہاں ہو؟"
آواز جزیرے پر گونج کر رہ گئی۔ لیکن جومی دُنیا میں
کہاں تھا کہ جواب دیتا۔ ایک منٹ بعد پھر وہی جملہ دہرایا
گیا۔ اس کے بعد وہ لوگ آپس میں باتیں کرنے لگے:
"حیرت ہے۔ جومی اور اس کے ساتھی کہاں چلے گئے۔
باس نے تو بتایا تھا کہ وہ جہاز ان کے حوالے کر آئے ہیں۔"
"ہمیں جزیرے میں دیکھنا چاہیے۔ کہیں ان کے ساتھ کوئی
گڑبڑ تو نہیں ہو گئی۔"
"ہوں۔ آؤ۔ چار آدمی جہاز کے پاس ٹھہریں۔" اس نے
کہا اور پھر قدموں کی آواز ابھرنے لگی۔ وہ جوں کے توں درختوں

پر جمے رہے۔ دل ہی دل میں مسکرا رہے تھے۔ پندرہ منٹ بعد
وہ پھر جہاز کے پاس جمع ہوئے:
"جومی اور اس کے ساتھیوں کا کہیں نام و نشان تک نہیں،
حیرت ہے۔ یہ لوگ کہاں چلے گئے۔ خیر ان سے جواب طلب
کیا جائے گا کہ انھوں نے اتنی غیر ذمہ داری کا ثبوت کیوں
دیا۔ آؤ ہم اپنا کام کریں۔"
وہ جہاز پر چڑھ گئے۔ ایک طویل خاموشی طاری ہو گئی۔
آخر ایک آواز اُبھری:
"حیرت انگیز۔ سر انتہائی حیرت انگیز۔"
"کیا چیز انتہائی حیرت انگیز ہے۔ اور تم خالی ہاتھ کیوں
نظر آ رہے ہو۔" اس آدمی نے کہا، جس کی وہ اب تک آواز
سنتے رہے تھے۔
"خالی ہاتھ نظر نہ آئیں تو کیا کریں۔ جہاز پر سونا نہیں
ہے۔"
"کیا کہا۔ سونا نہیں ہے، یہ کیسے ہو سکتا ہے، کیا تم نے
چاولوں کی نشان زدہ بوریوں کو اچھی طرح دیکھ لیا ہے؟"
"چاول اب بوریوں میں نہیں ہیں۔"
"کیا!!! چاول بوریوں میں نہیں ہیں، یعنی کر سونا نکال
لیا گیا ہے۔ ارے۔ تت تو۔ تو کیا جومی اور اس کے ساتھی۔"

جملہ اُدھورا چھوڑ دیا گیا۔

"جی ہاں! اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے مسٹر تُوشا۔"

"ٹھہرو۔ جزیرے والے خزانے کا بھی جائزہ لے لو۔" تُوشا بولا۔

"ہمیں نہیں معلوم۔ وہ کہاں چھپایا گیا ہے۔"

"اگر وہ لوگ جہاز کا سونا لے کر بھاگ نکلے ہیں تو جزیرے والا خزانہ بھی یہاں چھوڑ کر نہیں گئے۔ اس لیے جگہ کھدی ہوئی نظر آ جائے گی۔ اگر جزیرے پر کسی جگہ کھدائی کے آثار نظر نہ آئیں تو پھر ہمیں وہ جگہ تلاش کرنا ہو گی۔" تُوشا نے انھیں حکم دیا۔

"بہت بہتر۔ ابھی لیجیے۔"

اب وہ جزیرے پر دوڑتے نظر آئے۔ پندرہ منٹ کی بھاگ دوڑ کے بعد پھر وہیں آ گئے۔

"آپ کا خیال بالکل ٹھیک نکلا مسٹر تُوشا۔ وہ جزیرے کا خزانہ بھی لے جا چکے ہیں۔"

"اوہ۔ یہ بہت بُرا ہوا۔ انھوں نے اپنے ملک سے خوفناک غداری کی۔ ہم انھیں ایسا نہیں سمجھتے تھے۔ حیرت تو یہ ہے کہ انھیں جہاز پر سونا لدا ہوا ہونے کا پتا کس طرح چل گیا۔"

"شاید انھیں جہاز کو دیکھ کر حیرت ہوئی ہو گی۔ باس کے

یہاں سے جانے کے بعد انھوں نے جہاز کی تلاشی لی اور چاولوں کی بوریوں میں سے سونا نکل آیا۔"

"اب۔ اب ہم کیا کریں، باس ہم پر بگڑیں گے۔" ایک ساتھی نے کہا۔

"نہیں۔ ہم پر کیوں بگڑنے لگے۔ یہ غلطی خود باس کی ہے، انھیں یہاں کچھ آدمی چھوڑ کر جانے چاہییں تھے۔"

"تو پھر چلیے، انھیں اطلاع دیں، ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا۔ باس ان کی تلاش میں ہر طرف آدمی دوڑا سکتے ہیں۔"

"ہاں آؤ چلیں۔"

وہ سب پھر لانچ پر بیٹھ گئے اور تھوڑی دیر بعد وُہ لانچ کی آواز آہستہ ہوتی سُن رہے تھے۔ آخر وہ درختوں سے اُتر آئے۔

"یہ جزیرہ اب ہمارا ہیڈ کوارٹر ہو گا، لیکن خفیہ ہیڈ کوارٹر۔ ان لوگوں کو یہ معلوم نہیں ہو سکے گا کہ ہم یہاں ہیں، وہ یہی خیال کرتے رہیں گے کہ اس جزیرے پر اب کوئی نہیں۔" انسپکٹر جمشید نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اس کا مطلب ہے۔ فرزانہ وغیرہ کی ترکیب درست ثابت ہوئی۔"

"ان کا کیا ہے۔ ترکیبیں سوچنا تو ان پر ہے ہی ختم۔"

فاروق نے فوراً کہا۔

" اور تم پر درختوں پر چڑھنا" فرحت نے جل کر کہا۔

" ابھی نہیں - پہلے کام - ہمیں بہت ضروری کام انجام دینے ہیں - یہاں ہمیں تین سوٹ کیس پڑے ملے تھے - جن کی طرف ہم نے اس وقت کوئی توجہ نہیں دی تھی - اور نہ توشا اور اس کے ساتھیوں نے توجہ دی - ان میں جومی اور اس کے ساتھیوں کے کپڑے موجود ہیں، شاید انھیں کئی کئی دن مسلسل یہاں رہنا پڑتا ہوگا، اس لیے وہ کپڑے ساتھ ہی رکھتے تھے - ہمیں جلد از جلد ان کپڑوں کو پہننا ہوگا" انسپکٹر کامران مرزا نے جلدی جلدی کہا۔

"جی - جج - جی کیا مطلب" فرزانہ نے بوکھلا کر کہا۔

" یہ - یہ کیسے ہو سکتا ہے انکل" آصف نے بھی پریشان ہو کر کہا۔

" بھئی فکر نہ کرو - تم لوگوں کا بھی بندوبست ہو جائے گا، پہلے ہم تو ان کے لباس پہن لیں"

انسپکٹر جمشید، انسپکٹر کامران مرزا، خان رحمان، پروفیسر داؤد اور منور علی خان نے بنگالیوں کے لباس پہن لیے - اب جو وہ ان کے سامنے آئے، شوکی پکار اٹھا:

" بھئی واہ - آپ تو آدھے بنگالی لگ رہے ہیں"

" اور ہمارے پاس بنگالیوں کے شناختی کارڈ وغیرہ بھی ہیں" خان رحمان مسکرائے۔

" لیکن ان پر تصاویر آپ لوگوں کی نہیں ہیں" اخلاق نے پریشان ہو کر کہا۔

" فکر نہ کرو - اب یہی کام کرنا ہے" انسپکٹر جمشید بولے۔

اب انھوں نے میک اپ کا کام شروع کیا - انسپکٹر جمشید اور انسپکٹر کامران مرزا اپنی جیبوں میں ہلکی پھلکی چیزیں ہر وقت رکھتے تھے - جن کی مدد سے ضروری قسم کا میک اپ ہو جاتا تھا - انھوں نے کارڈوں پر لگی تصاویر سامنے رکھ لیں اور میک اپ کرنے لگے - ایک گھنٹے بعد ان کی صورتیں قریب قریب ان تصاویر کے مطابق نظر آنے لگیں - وہ پانچوں ان کے سامنے آکھڑے ہوئے - انسپکٹر جمشید مسکرا کر بولے:

"کیوں بھئی - اب کیا خیال ہے؟"

" آپ - آپ تو بالکل بنگالی نظر آرہے ہیں" مکھن نے بوکھلا کر کہا -

" تو اس میں بوکھلانے کی کیا بات ہے" محمود نے منہ بنایا۔

" پتا نہیں - کوئی نہ کوئی ضرورت تو ہوگی" آفتاب نے فوراً کہا -

" میں نے تم سے نہیں کہا" محمود بھنا اٹھا۔

"اوہ اچھا۔ معاف کر دو۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم نے اس جزیرے سے یہ الفاظ کہے ہیں۔" آفتاب مسکرایا۔

"بھئی سب کو اپنے جیسا ماہر خیال نہ کرو۔ اگر تم جزیرے سے باتیں کر سکتے ہو تو اس کا یہ مطلب نہیں۔ سبھی کر سکتے ہیں۔" فاروق نے شریر آواز میں کہا۔

"بس تم لوگوں میں یہی بُری بات ہے۔ بات بات پر لڑنے لگتے ہو۔" فرزانہ نے پاؤں پٹخے۔

"ہم تم لوگوں کے لیے لباس لینے جا رہے ہیں۔ پروفیسر صاحب، خان رحمان اور منور علی خان یہیں ٹھہریں گے۔"

"بھئی واہ۔ یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔"

"لیکن انکل۔ آپ لباس کس طرح لائیں گے۔ آپ کے پاس یہاں کی کرنسی کہاں ہے۔ اور زبان کس طرح بولیں گے۔"

"زبان تو خیر انگریزی بھی چل جائے گی۔ عام طور پر یہ لوگ انگریزی ہی بولتے ہیں، لیکن کرنسی کا معاملہ ضرور اُلجھن والا ہے۔ لیکن خیر۔ تم فکر نہ کرو۔ ہم نے اپنے ملک میں جو کام کبھی نہیں کیا۔ وہ یہاں کر لیں گے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"جی۔ کیا مطلب۔ کون سا کام؟"

"لوٹ مار کا کام۔" انسپکٹر کامران مرزا مسکرائے۔

"اوہ! لیکن ابا جان۔ آپ زخمی ہیں۔ بھاگ دوڑ کا کام کس طرح کر سکیں گے۔" فرزانہ نے پریشان ہو کر کہا۔

"فکر نہ کرو۔ سر پر پٹی بہت مضبوطی سے بندھی ہے۔ ارے ہاں۔ ہم پہلے پٹی کیوں نہ کرائیں۔" انسپکٹر جمشید کہتے کہتے چونک اُٹھے۔

"ہاں ٹھیک ہے۔ ہم پہلے کسی ڈاکٹر سے ملاقات کریں گے، کہیں زخم خراب نہ ہو جائے۔"

"اچھا تو پھر ہم چل دیے۔"

یہ کہہ کر وہ جہاز کی طرف چل پڑے۔ جہاز پر ایک موٹر لانچ ہنگامی حالات کے لیے موجود تھی۔ لٹکانے کے لیے اسے پہلے ہی اس طرح پرو کر رکھا گیا تھا کہ ایک طرف کی زنجیر کھینچتے ہی وہ نیچے جا سکتی تھی۔ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ اور پھر اس لانچ پر بیٹھ کر۔ ان کی طرف الوداعی انداز میں ہاتھ ہلائے اور روانہ ہو گئے۔ توشا اور اس کے ساتھیوں کو جاتے ہوئے وہ دیکھ ہی چکے تھے۔ لہٰذا سمت کا اندازہ انہیں تھا۔ وہ اگرچہ دشمن ملک میں جا رہے تھے؛ تاہم ان کے چہروں پر پریشانی کے آثار قطعاً نہیں تھے۔ ایک گھنٹے کے سفر کے بعد انھیں شہر کے آثار نظر آنے لگے۔

"کیا خیال ہے ۔ ہمیں کسی بے آباد ساحل پر اُترنا چاہیے۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"ہاں ۔ چیکنگ سے بچنے کا یہی طریقہ ہے۔" وہ بولے۔

اب وہ ساحل سے دُور رہ کر لانچ موڑتے چلے گئے ۔ یوں جیسے سمندر کی سیر کے لیے نکلے ہوں ۔ آخر ایک جگہ انھیں بالکل ویران ساحل نظر آگیا ۔ وہ لانچ کو ساحل تک لیتے چلے گئے ۔ اسے ایک درخت سے باندھا اور پیدل روانہ ہوئے ۔ راستے پر ان کی نظر تھی ، کیوں کہ ابھی واپس بھی آنا تھا ۔ آدھ گھنٹے تک چلنے کے بعد وہ ایک سڑک پر پہنچے ۔ کئی سُرخ رنگ کی کاریں ان کے پاس سے گزر گئیں ۔ یہ دیکھ کر انسپکٹر جمشید بولے :

"کمال ہے ۔ کیا یہاں سب کاریں سرخ رنگ کی ہی ہیں۔"

"کہیں یہاں ٹیکسیوں کا رنگ سُرخ نہ ہو۔" انسپکٹر کامران مرزا چونک کر بولے۔

"اوہ ہاں ۔ ضرور یہی بات ہے۔"

"تب تو ہمیں کوئی ٹیکسی روک لینی چاہیے۔"

جلد ہی پھر ایک سرخ کار آتی نظر آئی ۔ انسپکٹر جمشید نے ہاتھ کا اشارہ دیا اور وُہ ان کے پاس آکر رک گئی ۔ دونوں کچھ کہے بغیر اس میں بیٹھ گئے ۔

"جی ۔ کہاں جانا ہے؟" ڈرائیور نے انگریزی میں پوچھا۔

"میرے ساتھی زخمی ہیں ۔ نزدیک ترین ڈاکٹر کے پاس لے چلو۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"ڈاکٹر یا ہسپتال؟"

"ڈاکٹر ۔ ہسپتال میں بہت وقت ضائع ہوگا۔"

"لیکن ۔ ڈاکٹروں کے اخراجات ۔ اُف۔"

"کوئی بات نہیں ۔ آپ جلدی چلیے۔"

"اچھی بات ہے۔" اس نے کہا اور ٹیکسی آگے بڑھ گئی۔

اب سڑک پر آنے جانے والوں کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی ۔ گویا وُہ بھری پری آبادی والے علاقے میں آ گئے تھے ۔ ادھر ڈرائیور دکانوں کے بورڈ پڑھتا بڑھتا چلا جا رہا تھا ۔ پھر اس نے ٹیکسی روک دی ۔ انھوں نے دیکھا ۔ سبز رنگ کی ایک عمارت پر ڈاکٹر کا بورڈ لگا ہوا تھا۔

"لیجیے ۔ ڈاکٹر کا کلینک آگیا۔"

"شکریہ ۔ ہمیں ابھی آگے بھی جانا ہے ۔ کیا آپ انتظار کریں گے۔"

"جی ہاں ! کیوں نہیں۔" وہ بولا۔

دونوں اندر داخل ہوئے ۔ ایک کمرے میں ایک لڑکی چھوٹی سی میز کے پیچھے بیٹھی نظر آئی ۔ کمرے کے دروازے پر

ایک تختی لگی تھی ، اس پر لکھا تھا۔ پہلے ادھر تشریف لائیں۔

دونوں اس کمرے میں داخل ہوگئے۔

"جی فرمائیے۔ کیا خدمت کر سکتی ہوں۔"

"میرے ساتھی زخمی ہو گئے ہیں۔ ان کی پٹی کرانا ہے۔"

"ایک سو روپے فیس جمع کرا دیں ، تاکہ میں آپ کو چٹ بنا دوں۔"

"انھیں بہت تکلیف ہے۔ پہلے پٹی کرانے دیں۔" انسپکٹر کامران مرزا نے منہ بنا کر کہا۔

"ہم اپنے طریقے کے خلاف نہیں چل سکتے۔ سمجھے آپ۔"

"جی ہاں۔ سمجھ گیا۔" انسپکٹر کامران مرزا نے کہا اور جیب میں ہاتھ ڈالا۔ ان کا ہاتھ کارڈ سے ٹکرایا۔ کچھ سوچ کر انھوں نے کارڈ نکال لیا اور اسے کھول کر لڑکی کے سامنے کر دیا۔

"آپ مجھے کارڈ کیوں۔ ارے اوہ۔"

"اچانک اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس نے فون کا ریسیور اُٹھایا اور کانپتی آواز میں بولی :

"ہیلو ڈاکٹر۔ دو سُرخ کارکن میرے پاس موجود ہیں۔ ان میں سے ایک زخمی ہے۔ کک کیا۔ میں ان سے فیس" وہ کہتے کہتے رک گئی۔ پھر ریسیور رکھ کر جلدی سے بولی :

"تشریف لے جائیے۔ فیس کی ضرورت نہیں۔"

"ابھی تو آپ کہ رہی تھیں ، آپ لوگ اپنے طریقے کے خلاف نہیں چلتے۔"

"آپ لوگوں کے معاملے میں اُصول نہیں چل سکتے۔" وُہ مسکرائی۔

"شکریہ۔" انھوں نے کہا اور اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"کس طرف جانا ہے؟"

"دائیں ہاتھ تیسرا کمرہ۔"

وُہ تیسرے کمرے میں داخل ہوئے ، اندر ایک موٹے جسم والا ڈاکٹر بیٹھا تھا۔

"تشریف لائیے۔" اس نے قدرے خوف زدہ آواز میں کہا۔

"شکریہ ڈاکٹر۔" انسپکٹر کامران مرزا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

ڈاکٹر اُٹھ کھڑا ہوا ، اس وقت تک انسپکٹر جمشید ایک کرسی پر بیٹھ چکے تھے۔ ڈاکٹر ان کے سر کی پٹی اتارنے لگا۔ عین اسی وقت ریڈیو پر آواز اُبھری :

"آپ کو ہدایات دی گئی تھیں کہ اپنے ریڈیو آن رکھیں ، کسی وقت بھی کوئی اہم ترین پیغام آپ لوگوں تک پہنچایا جا سکتا ہے ، امید ہے ، سب کے ریڈیو سیٹ کھلے ہوں گے۔ اگر کچھ لوگوں

نے نہیں کھول رکھے تو ایک منٹ کی مہلت دی جاتی
ہے - سیٹ آن کر کے بیٹھ جائیے - بہت اہم اعلان
کیا جانے والا ہے۔"

ڈاکٹر کے ہاتھ رُک گئے - وہ ریڈیو کو گھورنے لگا :

"رُک کیوں گئے ڈاکٹر - آپ اپنا کام جاری رکھیے نا۔"
انسپکٹر جمشید بولے -

"میں جانتا ہوں - آپ تکلیف میں ہیں - لیکن - یہ اعلان
بھی تو آخر آپ کے باس کی طرف سے ہونے والا ہے۔"

"ج - جی ہاں - لیکن میں بہت تکلیف میں ہوں۔"

"خیر - میں پٹی کھولے دیتا ہوں۔" ڈاکٹر نے کہا اور پھر
پٹی کے بل کھولنے لگا - لیکن ابھی پٹی پوری طرح نہیں اُتری
تھی کہ ریڈیو پر پھر آواز اُبھری :

"سب کام چھوڑ دیجیے - پہلے پیغام سُنا جائے گا،
پیغام کے دوران کوئی کام نہیں ہو گا - اگر کسی
کو کام کرتے دیکھ لیا گیا ، تو اسے گرفتار کیا
جا سکتا ہے - اب پیغام شروع ہوتا ہے - واضح
ہو کہ کچھ غیر مُلکی جاسوس - جو حد درجے خطرناک بھی
ہیں - ہمارے شہر میں داخل ہونے والے ہیں یا ہو
چکے ہیں - ان کی طرف سے ہوشیار رہیں - سڑکوں

پر ان کی تصاویر جلد ہی نظر آئیں گی - پورے شہر
میں عملہ تصاویر لے کر پہنچ چکا ہے - جہاں کہیں بھی
یہ لوگ نظر آئیں - فوراً سُرخ ہیڈ کوارٹر کو اطلاع
دی جائے - فون ہے تھری زیرو - اعلان ختم ہوا -
اب آپ لوگ اپنا کام شروع کر سکتے ہیں۔"

ایک منٹ تک کمرے میں موت کا سناٹا طاری رہا - آخر
ڈاکٹر نے پٹی کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا :

"حیرت ہے - ہمارے ملک میں اور غیر ملکی جاسوس - سُرخ
کارکن پھر یہاں کیا کر رہے ہیں - کیوں جناب آپ بھی تو
سُرخ کارکن ہیں۔"

"ہاں ! لیکن سُرخ کارکن بھی انسان ہیں۔" انسپکٹر کامران
مرزا نے منہ بنا کر کہا -

"یہ بھی ٹھیک ہے - یہ کس طرح زخمی ہوئے تھے؟" ڈاکٹر
بولا -

"غیر ملکی جاسوس سے لڑائی کے دوران - اس نے کشتی
کا چپو دے مارا تھا۔" انھوں نے بتایا -

"اوہ - ارے - یہ کیا۔" اس نے چونک کر کہا -

"کہاں ؟" انسپکٹر کامران مرزا چونک کر بولے اور پھر وہ
دھک سے رہ گئے ، ادھر انسپکٹر جمشید فوری طور پر جان گئے کہ

کیا معاملہ ہے۔ دراصل میک اَپ کرتے وقت ان سے یہ بھول
ہو گئی تھی کہ پٹی اُتار کر میک اَپ نہیں کیا تھا۔ اب ان کی
جلد کا رنگ بیگالیوں جیسا تھا اور پٹی جس جگہ سے اُتری تھی،
وہاں جلد کا رنگ اور تھا:

"پٹی بندھی رہنے سے ایسا ہو گیا ہو گا۔" انسپکٹر کامران مرزا
جلدی سے بولے۔

"پٹی بندھی رہنے سے۔ کیا مطلب؟" ڈاکٹر نے حیران ہو کر کہا۔

"کیوں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا؟" انسپکٹر کامران مرزا نے
حیرت زدہ انداز میں کہا۔

"نہیں۔ یہ پٹی زیادہ سے زیادہ ایک دو گھنٹے پہلے کی
گئی تھی۔ اتنی سی دیر میں جلد کا رنگ نہیں بدل جایا کرتا،
اور۔ اور اس کا مطلب ہے۔ تت۔ تم۔ تم لوگ سُرخ کارکن
نہیں ہو۔"

اس کے مُنہ سے ڈری ڈری آواز نکلی۔

"ڈاکٹر۔ اگر سمجھ ہی گئے ہو تو پھر خاموشی سے پٹی کر دو۔"
یہ کہتے ہوئے انسپکٹر کامران مرزا نے سرجری کے سامان والی
ٹرے میں سے نشتر اٹھا لیا۔ اور ڈاکٹر کی کن پٹی پر لگا دیا۔

"تت۔ تم۔ تم ایسا نہیں کر سکتے۔" ڈاکٹر نے کانپ کر کہا۔

"کیسا۔ مَیں تو کچھ بھی نہیں کر رہا ہوں۔" وہ مُسکرائے۔

"ادھر میں پٹی کروں گا۔ ادھر تم میرا کام تمام کر دو گے۔"
اس کا رنگ سفید پڑتا جا رہا تھا۔

"تم بہت ذہین ہو ڈاکٹر۔ بہت تیزی سے اندازے لگا لیتے
ہو۔ لیکن ایک شرط پر ہم تمہیں چھوڑ بھی سکتے ہیں۔ کیوں کہ
بہر حال۔ یہ پٹی کر کے تم ہم پر احسان کرو گے۔ ہمیں پھر
بھی پٹی کرانا ہو گی۔ فوری طور پر تو ہم یوں بھی تمہیں ختم
نہیں کر سکتے۔ لیکن اگر تم نے ہمارا ساتھ دیا تو پھر ہمارے
ہاتھوں ہرگز موت کا پیالہ نہیں پیو گے۔"

"تت۔ تم کیا چاہتے ہو؟" وہ ہکلایا۔

"تمہیں ہمارے ساتھ چل کر رہنا ہو گا۔ اس وقت تک،
جب تک ہم اپنا کام ختم نہیں کر لیتے۔ کام ختم کرنے کے
بعد ہم تمہیں باندھ کر چھوڑ جائیں گے اور تم تفتیش کرنے والوں
کو کہہ سکو گے کہ ہم نے تمہیں باندھ کر رکھا تھا۔"

"لیکن میں کس طرح یقین کر لوں کہ تم اپنا یہ وعدہ پورا
کرو گے"

"ہم مسلمان ہیں ڈاکٹر۔ مسلمان اپنے پر احسان کرنے والے
کو دھوکا نہیں دیتا اور جو وعدہ کر لیتا ہے، اسے ہر حال
میں پورا کرتا ہے۔"

"اور قید کے دوران مجھے صرف مرہم پٹی کرنا ہو گی؟" اس

نے پوچھا۔

"اس کے علاوہ ہم تم سے کچھ معلومات بھی حاصل کریں گے، اگر تم نے ضروری معلومات بہم پہنچا دیں تو ہم تمہارے لیے اور بھی آسانیاں پیدا کر دیں گے۔"

"ہوں۔ ٹھیک ہے۔ جو کچھ میں بتانے کے قابل ہوں۔ ضرور بتاؤں گا۔ مجھے اپنے بیوی بچے بہت عزیز ہیں۔ کہاں چلنا ہو گا۔"

"بتا دیں گے۔ تم اپنی اسسٹنٹ سے صرف اتنا کہہ دو کہ ایک مریض کے ساتھ کچھ روز رہنا پڑے گا۔ بہت اہم معاملہ ہے۔"

"اچھا۔ پہلے تو میں ان کی پٹی کر دوں۔ ارے۔" اچانک وہ زور سے اُچھلا، اس کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیل گئیں۔

سیاہ چیز

"لو بھئی۔ اب میدان میں آ جاؤ۔ ابا جان اور انکل تو چلے گئے دشمنوں کے شہر۔" فاروق نے چہک کر کہا۔

"میدان میں آ جاؤ تو اس طرح کہہ رہے ہو جیسے کشتی لڑنا ہو۔" آفتاب نے فوراً کہا۔

"اگر تم کشتی لڑنا پسند کرو تو میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔" فاروق اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

"اور میں تم سے کمزور نہیں ہوں۔ ہو جائیں دو دو ہاتھ۔ تم بھی کیا یاد رکھو گے۔" آفتاب نے بھی اٹھتے ہوئے کہا۔

"ارے ارے ۔ یہ کیا۔" فرزانہ گھبرا گئی۔

"کیوں ۔ اس میں گھبرانے اور پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔" فرحت نے اس کی طرف حیران ہو کر دیکھا۔

"یہ دونوں لڑنے پر تلے ہیں ۔ ایک دوسرے کے سامنے خم ٹھونکے کھڑے ہیں اور تم کہتی ہو، اس میں پریشان ہونے

کی کیا بات ہے ۔ کمال ہے۔" فرزانہ نے آنکھیں نکالیں۔

"بھئی یہ کشتی لڑیں گے ۔ تلوار بازی نہیں کریں گے۔" فرحت نے مذاق اڑانے کے انداز میں کہا۔

"ہوں ۔ تو تم نے بھی ان کی کشتی کرانے کی ٹھان لی ہے۔" فرزانہ بولی۔

"ہاں ! ذرا مزا رہے گا۔"

"ذرا نہیں ۔ خوب مزا رہے گا۔" فاروق نے جلدی سے کہا، پھر آفتاب سے بولا :

"آؤ نا ۔ رک کیوں گئے۔"

"لیکن بھئی ۔ اس میں ایک نقصان ہے۔" محمود نے جلدی سے کہا۔

"یہاں نفع نقصان کا سوال کیسے پیدا ہو گیا ۔ ہم کوئی کاروبار تو کر نہیں رہے۔" آصف نے گھبرا کر کہا۔

"ہو چکا ہے۔" محمود مسکرایا۔

"اوہو اچھا ۔ ذرا ہم بھی تو سنیں ۔ کون سا سوال پیدا ہو گیا ہے۔"

"اس صورت میں ہم محاورات کی جنگ نہیں لڑ سکیں گے ۔ باتوں کی مہابھارت نہیں چھڑ سکے گی۔"

"ہوں ۔ بات تو قدرے دل کو لگتی ہے ۔ لیکن ۔ جی

چاہتا ہے ۔ یہ مقابلہ بھی ہو ہی جائے۔" شوکی نے رائے ظاہر کی۔

"اس لیے جی چاہ رہا ہے تاکہ مقابلہ تمھیں نہیں کرنا پڑے گا ۔ تم صرف تماشائی ہو گے۔" محمود نے منہ بنایا۔

"کیا مطلب ۔ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں بھی کشتی کے میدان میں کود پڑوں۔" شوکی نے بوکھلا کر کہا۔

"لیجیے انکل ۔ کشتی کا میدان بھی نکل آیا۔" محمود نے منہ بنایا۔

"نکلنے کو تو یہاں سے کچھ بھی نکل سکتا ہے ۔ کوئی سانپ بچھو بھی نکل سکتا ہے۔" اخلاق نے فوراً کہا۔

"سانپ اور بچھو کی تم فکر نہ کرو ۔ ان سے میں خود دو دو ہاتھ کر لوں گا۔" منور علی خان ہنسے۔

"شکریہ انکل ۔ چلیے ۔ ایک طرف سے تو بے فکری ہوئی۔" اشفاق مسکرایا۔

"میرا خیال ہے ۔ کشتی کا یہ مقابلہ ہو ہی جانا چاہیے ۔ ورنہ حسرتیں دلوں میں ہی رہ جائیں گی۔" مکھن نے بھی منہ کھولا۔

"ہماری طرف سے تو تم بھی میدان میں آ سکتے ہو۔" فاروق نے اعلان کیا۔

"پہلے آپ آپس میں تو فیصلہ کرلیں۔"

"ہاں ضرور۔ آؤ آفتاب۔ ابھی معلوم ہو جاتا ہے۔ ہم دونوں کتنے پانی میں ہیں۔" فاروق بولا۔

"کیوں نہیں۔ یہ کشتی تمہیں زندگی بھر یاد رہے گی۔" آفتاب نے کہا۔

"ایک منٹ۔" آصف چلا اٹھا۔

"کیوں۔ کیا آفتاب کی شکست کا خوف محسوس کر رہے ہو۔" محمود مسکرایا۔

"یہ بات نہیں۔ اس معاملے میں ابھی تک ہم نے بڑوں سے مشورہ نہیں لیا۔ آپ لوگ کیا کہتے ہیں انکلز۔" محمود ان کی طرف مڑا۔

"آپس میں لڑنا بری بات ہے۔ ہم اپنی طاقت دشمنوں کے خلاف کیوں نہ استعمال کریں۔" پروفیسر داؤد مسکرائے۔

"لیکن انکل۔ یہ لڑائی نہیں۔ صرف ایک مقابلہ ہو گا۔"

"بالکل۔ اور بہت دلچسپ ہو گا۔" خان رحمان نے خوش ہو کر کہا۔

"تو آپ بھی اس مقابلے کے حق میں ہیں۔"

"ہاں۔ بالکل۔" وہ بولے۔

"اور آپ انکل۔" آصف منور علی خان کی طرف مڑا۔

"بھئی۔ میں کیا کہوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ دیکھو نا۔ دونوں کے درمیان مقابلہ ہو گا۔ ایک کو تو ہارنا ہی پڑے گا۔ وہ دوسروں کے سامنے شرمندہ ہو گا۔ لہٰذا کیوں نہ باتوں کی جنگ چھیڑ دی جائے۔ موسم بھی ہے۔ موقع بھی ہے اور محل بھی۔" منور علی خان بولے۔

"بھئی واہ۔ آپ نے تو موقع اور محل بھی پیدا کر دیا۔ مزا آ گیا۔" محمود نے خوش ہو کر کہا۔

"بالکل ٹھیک مشورہ ہے۔ میں تم دونوں کو حکم دیتا ہوں کہ بیٹھ جاؤ۔ ہم خود تم لوگوں کی باتیں سننے کے لیے بے چین ہیں، بلکہ بری طرح بے چین۔" پروفیسر داؤد نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"اوہو انکل۔ آپ نے پہلے کیوں نہ بتایا۔ ہم تو اتنی باتیں کریں گے۔ اتنی باتیں کریں گے اور ایسی باتیں کریں گے، ایسی باتیں کریں گے کہ۔" محمود کہتے کہتے رک گیا۔

"بس بس۔ اتنا ہی کافی ہے۔ انکلز کو اندازہ ہو ہی گیا ہو گا۔" آصف نے گھبرا کر کہا۔

"ہاں۔ ٹھیک ہے۔ بالکل ٹھیک ہے۔" وہ خوش ہو کر بولے۔

"اس کا مطلب ہے۔ ہم دونوں بیٹھ جائیں۔"

"ہاں! بالکل۔"

"بچ گئے آفتاب۔ آج میں تمہیں تگنی کا ناچ نچانے کا ارادہ

رکھتا تھا۔" فاروق نے شوخ آواز میں کہا۔

" اور میرا ارادہ تھا۔ تمھیں دن میں تارے دکھا دوں گا۔"

آفتاب مسکرایا۔

" بھئی ڈینگیں مارنے اور شیخی بگھارنے سے بہتر ہے، تم دو دو ہاتھ کر ہی لو۔" محمود نے جلا کر کہا۔

" پروفیسر انکل کے حکم کے خلاف کس طرح کر سکتے ہیں۔" فاروق نے منہ بنایا۔

" تو پھر صبر کرو۔ تگنی کے ناچ اور دن میں تارے تو باتوں کے مقابلے میں بھی نچائے اور دکھائے جا سکتے ہیں۔" آصف نے بُرا سا منہ بنایا۔

" بلکہ آسمان سے تارے تک توڑ کر لائے جا سکتے ہیں۔" فرزانہ بولی۔

" اوہو۔ میں سمجھی۔ محاورات کی رُوح ہم میں آگھسی ہے۔" فرحت نے چونک کر کہا:

" کیا سوچتے ہوں گے بے چارے۔" فرحت نے سرد آہ بھری۔

" کک۔ کون؟" شوکی نے کانپ کر کہا۔

" بے چارے محاورے۔ غریب ضرب الامثال اور مظلوم کہاوتیں۔" فرحت بولی۔

" سارے زمانے کا ظلم ان پر ہی تو نہیں ٹوٹ پڑا۔" فرزانہ نے گھبرا کر کہا۔

" انھیں سوچنے کی ایسی کیا خاص ضرورت پڑ گئی۔" اخلاق نے جلدی سے بولا۔

" سوچنے کی بھی ایک ہی کہی۔" اشفاق بولا۔

" ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے ہم یہاں یہی اوٹ پٹانگ باتیں کرنے کے لیے جمع ہوئے تھے۔" مکھن نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

" اگر تمھیں کوئی اعتراض ہے۔ یا تمھارا جی گھبرا رہا ہے تو واپس چلے جاؤ۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ کیوں بھئی۔ کسی کو اعتراض ہے۔" فاروق نے سب پر ایک نظر ڈالی۔

" ہرگز نہیں۔" سب ایک ساتھ بولے۔

" ٹھیک ہے۔ میرے لیے جہاز کا انتظام کر دو۔ میں چلا جاتا ہوں۔" مکھن نے فوراً کہا۔

پروفیسر داؤد، خان رحمان اور منور علی خان کے چہروں پر اب بار بار مسکراہٹیں آ رہی تھیں۔

" انکل۔ آپ لوگ تو بالکل خاموش ہو کر رہ گئے۔ کچھ آپ بھی حصہ لیجیے نا۔ اس جنگ میں۔"

"بھئی ہمیں نہ گھسیٹو۔ ہم سُن لیں۔ یہی کافی ہے۔" خان رحمان بولے۔

"لیکن کبھی کبھار تو لقمہ دے دیا کریں۔" آصف بولا۔

"اچھا خیر۔ جہاں ضرورت ہوئی۔ ایسا کر گزریں گے۔" منور علی خان مسکرائے۔

"جو مزا سُننے میں ہے۔ کچھ کہنے میں کہاں۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"لیکن انکل۔ آج کل تو لوگ اس کے بالکل الٹ چلتے ہیں، اپنی بات جوں شروع کرتے ہیں، ختم کرنے کا نام نہیں لیتے، اور دوسروں کو تو بالکل موقع ہی نہیں دیتے۔"

"ہاں! یہ بہت بُری عادت ہے۔ اپنی بھی کہو اور دوسروں کو بھی پورا موقع دو۔ بلکہ دوسروں کی زیادہ سننا بہتر ہے۔ اپنی بات کم از کم کہو۔" وہ بولے۔

"لیکن یہاں تو۔ ہمارے لیے اس اصول پر عمل کرنا بہت مشکل ہے۔" فاروق نے گھبرا کر کہا۔

"یہاں بھی اس حد تک عمل ضروری ہے کہ ایک جب تک بات مکمل نہ کرلے۔ اس وقت تک دوسرا بات شروع نہ کرے۔"

"بہت بہتر انکل۔ ہم اس پر عمل کریں گے۔ لیجیے۔

میں ایک بات شروع کرتا ہوں۔ ایک دن میں نے ایک سڑک پر سیاہ رنگ کا۔" فاروق کہتے کہتے رُک گیا۔

"رُک کیوں گئے۔ کہو نا۔" آفتاب نے جھلا کر کہا۔

"دیکھا آپ نے انکل۔ اس نے مجھے بات مکمل نہیں کرنے دی۔" فاروق ہنسا۔

"لیکن تم درمیان میں رُکے ہی کیوں تھے۔"

"اس لیے رُکا تھا کہ ایک سیاہ چیز مجھے نظر آگئی تھی۔" فاروق نے خوف زدہ انداز میں کہا۔

"دھت تیرے کی۔" محمود نے جھلا کر اپنی ران پر ہاتھ مارا۔

"اس میں دھت تیرے کی کیا بات ہے۔" فاروق نے بُرا مان کر کہا۔

"بھئی سیاہ چیز کا ہی تو تم ذکر کر رہے تھے۔ وہ تو پہلے ہی تمہیں نظر آگئی تھی۔ اب کیوں رُکے۔" آصف نے جھنجلا کر کہا۔

"اس لیے کہ اب پھر ایک سیاہ چیز نظر آگئی ہے۔" اس نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

"کیا کہا۔ سیاہ چیز نظر آگئی ہے۔ کہاں؟" وہ ایک ساتھ بول اُٹھے۔

"وہ دیکھیے — وہ رہی سیاہ چیز" اس نے انگلی سے اشارہ کیا۔

ان سب کی نظریں اس سمت میں اٹھ گئیں۔ سیاہ رنگ کا ایک کیڑا رینگتا ہوا ان کی طرف آرہا تھا۔ انھوں نے اس قسم کا کیڑا کبھی نہیں دیکھا تھا؛ تاہم وہ کنکھجورے سے ملتا جلتا تھا، لیکن رنگ بالکل سیاہ تھا۔

"لیجیے انکل — آپ کا کام نکل آیا" محمود نے فوراً کہا۔

منور علی خان کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا تو انھوں نے جلدی سے ان کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں خوف دیکھ کر وہ چونک اٹھے۔ وہ تو ضرورت سے کچھ زیادہ ہی خوف زدہ تھے:

"خیر — خیر تو ہے انکل؟"

"یہ — یہ یہاں کہاں سے آگیا" وہ بولے۔

"جی کیا مطلب — کیا جزیروں پر اس کیڑے کا آنا منع ہے" فاروق نے حیران ہو کر کہا۔

"نن — نہیں — یہ بات نہیں — اس کیڑے کا تعلق صرف اور صرف ایک خاص جھاڑی سے ہے — یہ اس جھاڑی پر ہی زندہ رہ سکتا ہے — اس کے پتے کھاتا ہے اور پتوں کی نمی اس کے لیے پانی کا کام دیتی ہے — لہٰذا یہاں اس کی موجودگی حیرت انگیز

ہے، کیوں کہ جزیرے پر میں نے ایسی کوئی جھاڑی نہیں دیکھی"

"خیر — ہمیں کیا۔ آگیا ہوگا کہیں سے — مار کر پرے پھینک دو — خطرناک تو نہیں ہے؟"

"نہیں اتنا خطرناک نہیں ہے"

"آپ نے کہا ہے — کہ یہ صرف اس جھاڑی کے پتے کھاتا ہے اور ان پر ہی زندہ رہتا ہے — تو اس وقت یہ زندہ کس طرح ہے" شوکی نے سوال کیا۔

"اس کا یہ مطلب نہیں کہ جوں ہی جھاڑی سے باہر نکل کر مٹی یا سخت زمین پر آئے گا — فوراً مر جائے گا — مرنے میں کچھ وقت تو لگے گا؛ تاہم یہ بے چین ضرور ہے — دیکھتے نہیں — دُم کس طرح ہل رہی ہے"

"ہوں — واقعی — بہت تیزی سے ہل رہی ہے — آپ — آپ اسے مار دیں نا ابا جان" فرحت نے گھبرا کر کہا۔

"اوہ اچھا — میری بیٹی اس سے ڈر گئی"

"پتا نہیں — کیا بات ہے — میں اسے دیکھ کر گھبراہٹ سی محسوس کرنے لگی ہوں"

"پریشانی والی کوئی بات نہیں"

یہ کہہ کر منور علی خان آگے بڑھے اور اپنا جوتا اس کیڑے پر رکھ کر دباؤ ڈال دیا — پیر اٹھایا تو وہ بس چکا تھا اور

اس کے جسم میں سے سیاہ رنگ کا خون نکل کر تھوڑی سی جگہ کو رنگین بنا چکا تھا۔

"اُف ۔ اس کا تو خون بھی سیاہ ہے۔"

"ہاں ! خیر ۔ یہ تو ہوا ختم ۔ اب تم اپنی بات چیت شروع کرو۔" منور علی خان بولے۔

"معلوم ہوتا ہے ۔ ابھی تمہارا پیٹ نہیں بھرا۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"نہیں ۔ پیٹ اور ان کی باتوں سے بھر جائے ۔ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔" وہ مسکرائے۔

"ہاں تو میں کہہ رہا تھا ۔ میں نے ایک دن ایک سڑک کے کنارے ایک سیاہ چیز۔" فاروق نے کہنا شروع کیا ، لیکن پھر رُک گیا۔

"کیا مصیبت ہے ، پھر بریک لگ گئی۔ بھئی اب اس پرانی عادت سے باز آؤ۔" آصف نے تلملا کر کہا۔

"اور کیا ۔ یہ کوئی اچھی عادت نہیں ہے۔" آفتاب نے کہا۔

"اب تو مجھے بھی یہی کہنا پڑے گا۔" محمود بولا۔

"لیکن ۔ مشکل یہ ہے کہ میں ایک بار پھر فاروق کی آنکھوں میں خوف دیکھ رہی ہوں۔" فرزانہ نے بے چین ہو کر کہا۔

"خوف ہی نہیں ۔ میں تو اُلجھن بھی محسوس کر رہا ہوں۔"

فاروق بڑبڑایا۔

"کیسی اُلجھن ؟"

"اگر ہم اس وقت کسی جزیرے پر نہ ہوتے اور یہ کیڑا ہم تک پہنچ جاتا تو یہ خیال کیا جا سکتا تھا کہ آس پاس کوئی جھاڑی موجود ہے ، لیکن مشکل یہ ہے کہ ہم جزیرے پر موجود ہیں اور جزیرے پر ویسی کوئی جھاڑی نہیں ہے۔"

"فاروق نے واقعی ایک بہت کام کی بات کہی ۔ خیر ۔ میں اس کا جواب دیتا ہوں ۔ جواب یہ ہے کہ یہ کیڑا ضرور اس لانچ میں تھا ۔ جو رونل کے آدمی لے کر آئے تھے ۔ اور لانچ سے یہ ان میں سے کسی کے کپڑوں پر چڑھ گیا ۔ جب وہ لوگ جزیرے پر خزانہ تلاش کرتے پھر رہے تھے تو یہ کپڑوں پر سے گر گیا ۔ یہ ہے جواب۔"

"ٹھیک ہے ۔ بات تو طے ہو گئی ۔ اس میں اُلجھن کیسی ۔ خوف کہاں سے ٹپک پڑا۔" مکھن نے حیران ہو کر کہا۔

"اُلجھن یہ ہے کہ کیا یہاں آس پاس کوئی ویسی جھاڑی موجود ہے ۔ اگر موجود ہے تو اس سے لانچ کا کیا تعلق ہے ۔ لانچ تو سمندر تک محدود رہتی ہے ۔ سڑکوں یا ریگستانوں میں تو نہیں چلتی پھرتی۔" اس نے جلدی جلدی کہا۔

"واقعی ۔ بات سوچنے والی ہے۔"

فاروق بڑبڑایا۔

"کیسی اُلجھن؟"

"اگر ہم اس وقت کسی جزیرے پر نہ ہوتے اور یہ کیڑا ہم تک پہنچ جاتا تو یہ خیال کیا جا سکتا تھا کہ آس پاس کوئی جھاڑی موجود ہے، لیکن مشکل یہ ہے کہ ہم جزیرے پر موجود ہیں اور جزیرے پر ویسی کوئی جھاڑی نہیں ہے۔"

"فاروق نے واقعی ایک بہت کام کی بات کہی۔ خیر۔ میں اس کا جواب دیتا ہوں۔ جواب یہ ہے کہ یہ کیڑا ضرور اس لانچ میں تھا۔ جو رونل کے آدمی لے کر آئے تھے۔ اور لانچ سے یہ ان میں سے کسی کے کپڑوں پر چڑھ گیا۔ جب وہ لوگ جزیرے پر خزانہ تلاش کرتے پھر رہے تھے تو یہ کپڑوں پر سے گر گیا۔ یہ ہے جواب۔"

"ٹھیک ہے۔ بات تو طے ہو گئی۔ اس میں اُلجھن کیسی۔ خوف کہاں سے ٹپک پڑا۔" محمود نے حیران ہو کر کہا۔

"الجھن یہ ہے کہ کیا یہاں آس پاس کوئی ویسی جھاڑی موجود ہے۔ اگر موجود ہے تو اس سے لانچ کا کیا تعلق ہے۔ لانچ تو سمندر تک محدود رہتی ہے۔ سڑکوں یا ریگستانوں میں تو نہیں چلتی پھرتی۔" اس نے جلدی جلدی کہا۔

"واقعی۔ بات سوچنے والی ہے۔"

"اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ یہاں کوئی جھاڑی ضرور ہے۔ یا پھر لانچ پر آنے والوں میں سے کوئی اس جھاڑی کی طرف سے بھی آیا ہوگا اور یہ کیڑا اسی کے کپڑوں سے چپکا ہوا ہوا ہوگا۔ کیوں انکل۔ کیا یہ کپڑوں سے چپک سکتا ہے؟" فرزانہ نے بے تابانہ انداز میں کہا۔

"ہاں! کیوں نہیں؟"

"لیکن۔ اب ہمیں یہ کون بتائے کہ یہاں ویسی جھاڑی ہے یا نہیں؟" محمود نے کہا۔

"آخر یہ جاننے کی ہمیں کیا ضرورت ہے؟" منور علی خان اُلجھن کے عالم میں بولے۔

"تم نہیں جانتے منور علی۔ یہ سراغرسان ہیں۔ ہر معاملے میں جاسوسیت نکال لیتے ہیں؟" پروفیسر داؤد نے مسکرا کر کہا۔

"پھر بھی پروفیسر صاحب۔ آخر ہم اس بات کے پیچھے کیوں پڑ جائیں؟"

"بھئی یہ ان کا کام ہے۔ کسی بات کے پیچھے پڑنا یا نہ پڑنا۔ بعض اوقات یہ بہت اہم باتوں کو بھی خاطر میں نہیں لاتے اور ان کے پیچھے تو کیا آگے بھی نہیں پڑتے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بہت ہی غیر اہم چیز کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جاتے ہیں۔ اب اس کیڑے کی مثال لے لیں؟"

"اس میں عجیب بات صرف یہ ہے جناب کہ یہ کیڑا ایک خاص جھاڑی پر رہتا ہے۔ اس سے الگ نہیں ہوتا۔ جزیرے پر ویسی کوئی جھاڑی نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ کہاں سے آیا اور کس کے ذریعے آیا؟"

"لو بھئی۔ باتوں کی جنگ کا نقشہ پلٹ گیا۔ جاسوسی جنگ شروع ہوگئی۔ اب کیا کریں؟" پروفیسر داؤد گھبرا گئے۔

"مجبور ہیں۔ یہ جس موضوع پر بھی بات چیت کریں، ہمیں سننا ہوگی؟" خان رحمان نے کندھے اچکائے۔

"ہم آپ کو بھی اس معاملے میں دلچسپی لینے کی دعوت دیتے ہیں؟" شوکی نے مسکرا کر کہا۔

"لو۔ دعوت بھی دی تو کس چیز کی؟" خان رحمان ہنسے۔

"اس لیے انکل کہ اس جزیرے پر کھانے پینے کی چیزوں کی دعوت تو ہم دے ہی نہیں سکتے؟" مکھن نے بے چارگی کے عالم میں کہا۔

"ہوں۔ اپنے گھر پر تو جیسے ہمیں روز ہی دعوتیں دیتے رہتے ہو نا؟" آفتاب نے جل بھن کر کہا۔

"اور آپ لوگ تو جیسے روز ہی آتے رہتے ہیں؟" اخلاق نے منہ بنایا۔

"گئے تھے بھئی۔ گئے تھے۔ تم لوگ ملے ہی نہیں؟" آفتاب

نے فوراً کہا۔

"اس کا افسوس زندگی بھر رہے گا۔"

"افسوس کو کیا ہم چاٹتے پھریں۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"ہم کیڑے کو بھول گئے۔" محمود نے گویا یاد دلایا۔

"ہاں واقعی۔ کیڑا بھولنے والی چیز تو ہے نہیں۔" آصف نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ اسے یاد کرتے رہو۔ اس کی یاد کو ساری زندگی سینے سے لگائے رکھو۔" فرحت جل بھن کر بولی۔

"شکر ہے۔ ان دونوں میں سے کوئی جلا تو۔ میں تو پریشان ہو گیا تھا۔ یہ جل بھن کیوں نہیں رہیں۔" فاروق نے خوش ہو کر کہا۔

"اگر ہمارے جلنے سے تمھیں اس قدر خوشی ہوتی ہے تو پھر ہم اس مرتبہ اتنا جلیں گی۔ اتنا جلیں گی کہ۔" فرزانہ کہتی چلی جا رہی تھی کہ آفتاب نے اس کی بات کاٹ دی:

"کہ جل جل کر سیاہ ہو جاؤ گی۔"

"بالکل اس کیڑے کی طرح سیاہ۔" مکھن مسکرایا۔

"پھر وہی کیڑا۔ اُف۔" خان رحمان نے منہ بنایا۔

"ہمیں سوچنا ہی ہوگا انکل۔ وہ کیڑا یہاں کہاں سے آ گیا۔" محمود نے مسکرا کر کہا۔

"آخر کیوں۔ اس کی کیا ضرورت ہے۔" خان رحمان اُلجھن کے عالم میں بولے۔

"اس لیے کہ یہ جزیرہ ہمارے دشمنوں کا ہے۔ دشمن کے آدمی تھوڑی دیر پہلے ہی یہاں آئے تھے۔ کیا خبر یہ ان میں سے کسی کے کپڑوں سے چمٹ کر یہاں تک آ گیا ہو۔ اس طرح ہمیں دشمنوں کا ٹھکانہ معلوم ہو سکتا ہے۔" محمود نے پُرجوش انداز میں کہا۔

"اوہ!" ان کے منہ سے حیرت زدہ انداز میں نکلا۔ آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ عین اسی وقت انھوں نے دُور سے پھر ایک لانچ کو آتے دیکھا۔

پھر وہیں

ڈاکٹر کے منہ سے ارے کچھ اس قدر اچانک نکلا تھا کہ وہ
گھبرا گئے۔ انھوں نے بوکھلا کر اِدھر اُدھر دیکھا، پھر اس کے
چہرے پر نظریں ڈال کر انسپکٹر کامران مرزا بولے:

"کیا ہوا ڈاکٹر۔ خیریت تو ہے۔"

"کک۔ کہیں۔ کہیں تم وہی تو نہیں ہے۔"

"وہی کون؟" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"جن کے بارے میں ابھی ابھی ریڈیو پر اعلان کیا گیا ہے۔"

"آپ کا اندازہ درست ہی ہے ڈاکٹر صاحب۔ اب آپ
سے کیا چھپانا۔"

"اُف۔ تب تو میں مصیبت میں پھنس گیا۔"

"کیوں۔ وہ کیسے؟" انسپکٹر کامران مرزا نے اُلجھن کے عالم
میں کہا، پھر اچانک ان کے چہرے پر اُلجھن کے آثار نمودار
ہو گئے۔ انھوں نے تیزی سے دروازے کی طرف دیکھا۔

پھر ڈاکٹر کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور دبے پاؤں دروازے
پر پہنچے۔ انھوں نے یک دم دروازہ کھول دیا، لیکن برامدے
میں کوئی نہیں تھا۔ اب وہ جلدی سے باہر نکلے اور اس لڑکی
کے کمرے کے دروازے تک آئے۔ وہ فون کا ریسیور اُٹھائے
جلدی جلدی ڈائل کر رہی تھی۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ
رہی تھیں۔۔۔

"نہیں مس۔ فون کا ریسیور رکھ دو۔"

یہ کہتے ہی وہ کمرے میں داخل ہو گئے اور ریسیور اس
کے ہاتھ سے چھین کر رکھ دیا۔

"تم تو ہمارے بارے میں اطلاع دینے چلی تھیں۔ ڈاکٹر
کے منہ سے نکلنے والے 'ارے' نے تمھیں ڈاکٹر کے دروازے
تک آنے پر مجبور کر دیا تھا۔ پھر تم نے ہماری بات چیت
سُن لی۔ اور معلوم کر لیا کہ ہم وہی ہیں جن کے بارے میں
ریڈیو پر اعلان ہو چکا ہے۔ دراصل میں نے تمھارے
قدموں کی ہلکی سی چاپ سُن لی تھی۔ آؤ۔ تم بھی ڈاکٹر کے
کمرے میں آجاؤ۔"

"نن نہیں۔ میں نے کچھ نہیں سُنا۔ میں تو اپنے گھر
فون کر رہی تھی۔"

"گھر فون کر رہی تھیں۔ اچھا۔ کمال ہے۔ لیکن تمھارے

چہرے کو کیا ہوا۔ اس کا رنگ بالکل کیوں بدل گیا ہے۔ گھر
فون کرتے ہوئے آدمی کے چہرے پر ایک رنگ آ اور دوسرا
جا تو نہیں رہا ہوتا۔" وہ بولے۔

"مم۔ میں سچ کہتی ہوں۔"

"خیر۔ تم ڈاکٹر کے کمرے تک تو چلو۔ ہم تفصیل سے بات
چیت ڈاکٹر کی موجودگی میں کریں گے۔"

"نہیں نہیں۔ میں اپنے گھر جاؤں گی۔ مجھے جانے دیجیے۔"

"افسوس۔ آپ نہیں جا سکتیں۔"

"کیوں نہیں جا سکتی۔ میں چیخنا چلانا شروع کر دوں گی۔
پھر دیکھتی ہوں، تم مجھے کس طرح روک سکتے ہو۔" یہ کہہ کر
اس نے چیخنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ انھوں نے آگے بڑھ
کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور دوسرے ہاتھ سے اس
کے دونوں بازو پکڑ لیے۔ پھر اسی طرح اسے کھینچتے ہوئے
ڈاکٹر کے کمرے کی طرف چلے۔ جوں ہی وہ اندر داخل ہوئے،
ڈاکٹر کی سرد آواز کانوں سے ٹکرائی:

"اسے چھوڑ دو مسٹر اور ہاتھ اوپر اٹھا دو۔"

انھوں نے بوکھلا کر ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔ اس کے ہاتھ
میں وہی نشتر تھا جو تھوڑی دیر پہلے انھوں نے اٹھایا تھا۔
اب وہ نشتر انسپکٹر جمشید کی شہ رگ پر تھا:

"اگر ذرا بھی حرکت کی تو میں اس کی شہ رگ کاٹ دوں
گا۔ اس کے قتل کے جرم میں حکومت کی طرف سے مجھے
انعام تو مل سکتا ہے، سزا نہیں مل سکتی۔"

"انعام ملنے تک تمھیں زندہ کون رہنے دے گا۔" انسپکٹر کامران
مرزا غرائے۔

"تب بھی تمھارا یہ ساتھی اپنی جان سے ہاتھ دھو چکا ہو
گا۔" ڈاکٹر نے ان کے رعب میں آئے بغیر کہا۔

"ہوں۔ اچھا یہ لو۔ میں نے اسے چھوڑ دیا۔"

"روشنگ۔ فون کرو۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"او کے ڈاکٹر۔" اس نے خوش ہو کر کہا اور فون کی طرف
مڑی۔

انسپکٹر کامران مرزا کے لیے یہ لمحات بہت خوف ناک تھے،
اگر وہ اسے فون کرنے سے روکتے تو نشتر انسپکٹر جمشید کی
گردن میں اتر جاتا اور نہ روکتے تو رونل کے آدمی یہاں
پہنچ جاتے۔ دونوں ہی صورتیں حد درجے خوف ناک تھیں۔
انھوں نے تیزی سے ذہن کو گردش دی۔ ادھر لڑکی تیزی سے
نمبر گھما رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں کپکپاہٹ تھی۔ ڈاکٹر
پوری طرح چوکس تھا۔ اسے بھی احساس تھا کہ بازی پلٹتے دیر
نہیں لگے گی۔ ذرا سی چوک دونوں فریقوں کے لیے خطرناک

ترین ثابت ہو سکتی تھی۔ انسپکٹر کامران مرزا نے انسپکٹر جمشید کی طرف دیکھا۔ وہ بے بسی کے عالم میں مسکرائے:

"کوئی بات نہیں انسپکٹر کامران مرزا۔ ایسا بھی ہوتا ہے۔ غلطی مجھ سے ہوئی۔ اس پر نظر نہیں رکھی۔ میں سمجھا ٹرے میں سے قینچی اُٹھا رہا ہے۔"

اسی وقت سلسلہ مل گیا۔ لڑکی نے تھر تھر کانپتی آواز میں کہا:

"وہ۔ وہ لوگ جن کے بارے میں ریڈیو پر اعلان کیا گیا تھا۔ یہاں ہیں۔ ڈاکٹر نونڈا کے کلینک میں گرٹ روڈ۔"

اتنا کہتے ہی اس نے ریسیور رکھ دیا، ریسیور رکھتے ہی تیزی سے ڈاکٹر کی طرف آئی اور پھر منہ کے بل گری۔ اس کے گرتے ہی ڈاکٹر نے بوکھلا کر اس کی طرف دیکھا۔ اتنا ہی لمحہ انسپکٹر کامران مرزا کے لیے کافی تھا۔ انھوں نے ہاتھ بڑھا کر ڈاکٹر کا دوسرا بازو پکڑا اور زور سے جھٹکا دیا۔

وہ دھڑام سے گرا۔ انسپکٹر کامران مرزا فوراً ہی اسے چھاپ بیٹھے۔ ساتھ ہی بولے:

"بہت خوب انسپکٹر جمشید۔ آپ نے لڑکی کو گرانے میں کمال کر دیا۔ اسے تو پتا ہی نہیں چل سکا، کب آپ کی ٹانگ اس کے راستے میں آ گئی۔"

"شکریہ انسپکٹر کامران مرزا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔" وہ مسکرائے، پھر چونک اُٹھے۔ لڑکی نکلی جا رہی تھی۔ ادھر انسپکٹر کامران مرزا ڈاکٹر کے ساتھ اُلجھے ہوئے تھے۔ انھوں نے زخم کی پروا کیے بغیر لڑکی کی طرف چھلانگ لگا دی اور اسے چھاپ بیٹھے:

"بس۔ اب ہم یہاں نہیں رُک سکتے۔ کسی بھی لمحے رونل کے آدمی یہاں پہنچا چاہتے ہیں۔" وہ بولے۔

"لیکن ان کا کیا کیا جائے۔ ہاں ٹھیک ہے۔" انسپکٹر کامران مرزا نے کہا اور ایک ہلکا سا ہاتھ ڈاکٹر کی کن پٹی پر رسید کر دیا۔ وہ فوراً ہی بے ہوش ہو گیا۔ ادھر انسپکٹر جمشید نے لڑکی کے ساتھ یہی سلوک کیا۔ پھر وہ ڈاکٹر کی میز کی دراز کی طرف بڑھے، لیکن وہاں نقدی نہیں تھی۔ انھیں فوراً لڑکی کے کمرے کا خیال آیا۔ لڑکی والی میز کی دراز میں کرنسی نوٹ کافی مقدار میں تھے۔ انھوں نے وہ جیبوں میں ٹھونس لیے۔ دونوں عمارت سے باہر نکلنے ہی لگے تھے کہ انسپکٹر کامران مرزا کو خیال آ گیا، وہ جلدی سے بولے:

"اوہو۔ زخم کا تو کچھ کیا ہی نہیں۔"

وہ ایک بار پھر ڈاکٹر کے کمرے میں داخل ہوئے۔ انسپکٹر کامران مرزا نے افراتفری کے عالم میں پٹی کی، پھر دونوں باہر نکل کر ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔

"ہم ذرا شہر کی سیر کرنا چاہتے ہیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"شہر کی سیر۔ اوہ اچھا۔" اس نے کہا اور ٹیکسی چل پڑی۔

"لیکن۔ اس جگہ سے زیادہ دور نہیں جانا ہے۔"

"کیا مطلب۔"

"ہمیں تھوڑی دیر بعد پھر یہاں آنا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس وقت میری مرہم پٹی نہیں کر سکتے۔ کچھ دیر بعد اس قابل ہو سکیں گے۔"

"اچھی بات ہے۔"

"اور ہاں۔ ہمیں کچھ ریڈی میڈ کپڑے خریدنے ہیں۔ کسی اچھی سی دکان تک لے چلو۔"

"بہت بہتر۔"

ٹیکسی ڈرائیور نے جلد ہی ٹیکسی ایک دکان کے سامنے روک دی۔

"آپ بیٹھے رہیں، میں لے آتا ہوں۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"اچھی بات ہے۔"

وہ اُتر کر دکان میں داخل ہو گئے۔ اسی وقت انسپکٹر جمشید کی نظریں ایک اشتہار پر پڑیں۔ اس پر ان کی تصاویر تھیں۔ اور گرفتار کرانے والے کو دس ہزار روپے انعام دینے

کا اعلان موٹے حروف میں کیا گیا تھا۔ اشتہار دیوار پر کافی اونچا لگا ہوا تھا۔ کچھ لوگ اس کے نیچے کھڑے سر اُٹھا اُٹھا کر پڑھ رہے تھے۔

"دس ہزار۔" ٹیکسی ڈرائیور بڑبڑایا۔

"خیر تو ہے بھئی۔" وہ بولے۔

"ریڈیو پر ابھی ابھی کچھ لوگوں کی گرفتاری کے لیے ہدایات دی گئی تھیں، یہ اشتہار بھی اسی سلسلے میں ہے۔ جو شخص انہیں گرفتار کرائے یا ان کی کسی جگہ موجودگی کی اطلاع دے۔ وہ دس ہزار روپے حاصل کر سکتا ہے۔"

"اوہ!" انسپکٹر جمشید بولے۔

"لیکن میری ایسی قسمت کہاں۔" ڈرائیور بولا۔

"قسمت بدلتے کیا دیر لگتی ہے۔" وہ مسکرائے۔

انسپکٹر کامران مرزا تیز تیز چلتے دکان سے نکلے اور ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ ان کے ہاتھوں میں کپڑوں کے ڈبے تھے۔

"چلو بھئی۔ پھر اسی ڈاکٹر کی طرف۔" انہوں نے کہا۔

"جی بہتر۔"

تھوڑی دیر بعد وہ پھر ڈاکٹر نونڈا کے کلینک کے سامنے ٹیکسی سے اُتر رہے تھے۔ وہ بے دھڑک اندر داخل ہو گئے۔ لڑکی اسی کمرے میں میز پر بیٹھی نظر آئی۔ اس کا رنگ

ابھی تک زرد تھا ۔ دونوں اس کے کمرے کے سامنے رُک کر مسکرائے ۔ پھر انسپکٹر جمشید اندر داخل ہو گئے ۔

"تت ۔ تت ۔ تم ۔ تم اور پھر یہاں ۔" وہ ہکلائی ۔

"ہاں! اس لیے کہ سُرخ کارکن اور تو سب جگہ ہمیں تلاش کریں گے ۔ یہاں نہیں آئیں گے ۔ کیا خیال ہے ۔"

لڑکی نے چیخنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ انھوں نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا ، پھر اسے بازو سے پکڑ کر اُٹھا دیا اور ڈاکٹر کے کمرے کی طرف بڑھے ۔ انھوں نے ایک جھٹکا دیا اور اشارہ کیا :

"ڈاکٹر دروازہ کھولیے ۔" لڑکی کے مُنہ سے پھنسی پھنسی آواز میں نکلا ۔

"اب کیا ہوا ۔ اور شاید تم ڈر رہی ہو ۔ خیر ۔ میرے کمرے میں ہی آ بیٹھو ۔ ویسے وُہ بدمعاش اب ادھر کا رُخ نہیں کریں گے ۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی دروازہ کُھل گیا اور پھر ڈاکٹر بوکھلا کر پیچھے ہٹا ۔

"وُہ بدمعاش پھر یہاں موجود ہیں ڈاکٹر ۔ اگر تم نے مرہم پٹی کر دی ہوتی تو ہم تمھارے ساتھ بہت اچھا سلوک کرتے ، لیکن اب نہیں ۔ اب تم پٹی بھی کرو گے اور سلوک بھی

تمھارے ساتھ بُرا ہو گا ۔ یاد رکھو ۔ تم زخم پر جو دَوا لگاؤ گے ۔ وہ پہلے ہم تمھارے جسم کے زخم پر لگا کر دیکھیں گے ۔"

انسپکٹر جمشید جلدی جلدی بولے ۔

"لل ۔ لیکن ۔ میرے جسم پر زخم کہاں ہے ؟"

"تو زخم بنانے میں کیا دیر لگتی ہے ۔ ٹرے میں ہر طرح کے نشتر موجود ہیں ۔"

"نن ۔ نہیں نہیں ۔ میں بالکل ٹھیک دَوا سے پٹی کروں گا ۔"

"نہیں بھئی ۔ چیکنگ تو کرنا ہو گی ۔" یہ کہتے ہوئے انسپکٹر کامران مرزا نے ایک نشتر اٹھا لیا ، ڈاکٹر کانپنے لگا ۔ لڑکی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی ۔ اچانک انسپکٹر کامران مرزا نے نشتر سے لڑکی کی کلائی پر ہلکی سی خراش لگا دی ، اس خراش سے خُون کے دو تین قطرے نکل پڑے ۔

"یہ ہے وُہ خراش ۔ جس پر ہم دوا لگا کر چیک کریں گے ، ڈاکٹر اب تم جلد از جلد مرہم پٹی کرو ۔"

ڈاکٹر پٹی کرنے لگا ۔ انسپکٹر کامران مرزا نے وُہ مرہم لڑکی کے زخم پر لگا کر دیکھا ۔ نہ ڈاکٹر پریشان ہوا ، نہ لڑکی گھبرائی ۔ اس سے ہی وُہ جان گئے کہ مرہم غلط نہیں ہے ۔

پٹی کرانے کے بعد انھوں نے میزوں اور الماریوں کی

تلاشی لی۔ ایک پستول اور کچھ نقدی ان کے ہاتھ لگی۔

"اب تم دونوں کو ہمارے ساتھ چلنا ہو گا۔"

"لل۔ لیکن۔ کہاں۔"

"جہاں ہم لے چلیں۔ پستول میری جیب میں ہو گا اور اس کے ٹریگر پر میری انگلی ہو گی، جوں ہی تم نے کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کی۔ ہم تم دونوں کو گولی مار دیں گے۔ پہلے بھی تم غلط حرکت کر چکے ہو۔"

"نن۔ نہیں کریں گے۔"

"ٹیکسی ڈرائیور کو ہم یہ بتائیں گے کہ ڈاکٹر صاحب کو ایک اور مریض کو دکھانے کے لیے لے جا رہے ہیں اور ہاں اپنے دفتر کے باہر بورڈ لگا دو۔ ڈاکٹر اندر نہیں ہے۔"

"اچھا۔ چلو روشنگ۔ جو یہ کہ رہے ہیں کرو۔"

"او کے ڈاکٹر۔"

روشنگ نے بورڈ لٹکا دیا اور وہ ان کو ساتھ لیے ٹیکسی تک آئے۔ ان دونوں کو پچھلی سیٹ پر بٹھایا گیا۔

"ایک اور مریض کو دکھانا ہے۔ وہیں چلو جہاں سے ہم ٹیکسی میں سوار ہوئے تھے۔"

"بہت بہتر۔ لیکن بہت دیر لگے گی۔" ڈرائیور نے کہا۔

"بہت دیر لگے گی۔ کیا مطلب۔ فاصلہ تو اتنا ہی ہے،

جتنا ہم نے یہاں تک آنے میں طے کیا ہے۔"

"بے شک۔ فاصلہ اتنا ہی ہے، لیکن اس وقت حالات اور ہیں۔ جگہ جگہ چیکنگ ہو رہی ہے۔"

"اوہو۔ لیکن ہمیں کیا۔ ہونے دو چیکنگ۔ ہمارے پاس ہمارے کاغذات موجود ہیں۔ تمہارے پاس اپنے ہیں نا۔"

"ہاں بالکل۔ ان کے بغیر تو ہم ٹیکسی چلا ہی نہیں سکتے۔"

"اور آپ کے پاس ڈاکٹر؟"

"میرے کاغذات میری جیب میں رہتے ہیں۔" اس نے منہ بنایا۔

"بہت خوب۔ چلو بھئی۔ دیکھا جائے گا۔"

وہ آگے بڑھے۔ اور پھر ایک سڑک پر انہیں گاڑیوں کی لمبی قطار کھڑی نظر آئی۔

"لیجیے۔ چیکنگ ہو رہی ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔ اپنے اپنے کاغذات نکال کر ہاتھ میں لے لیں۔" انسپکٹر جمشید نے پُرسکون انداز میں کہا۔

لائن آگے بڑھتی چلی گئی۔ دونوں بالکل پُرسکون انداز میں بیٹھے رہے۔ ہاں ڈاکٹر اور لڑکی کے چہرے پر ضرور گھبراہٹ کے آثار تھے۔

"مہربانی فرما کر چہرے سے گھبراہٹ ظاہر نہ ہونے دیں،

ورنہ یہ لوگ ہمیں شک کی بنا پر بھی گرفتار کر سکتے ہیں۔
اگر ایسا وقت آیا تو ہم تم لوگوں کو فوراً گولی مار دیں گے۔"
انسپکٹر کامران مرزا نے سرگوشی کی۔

"اوہ!" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

ڈاکٹر اور لڑکی کا حال بُرا تھا۔ ان کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ انسپکٹر جمشید یہ دیکھ کر فکر مندانہ انداز میں بولے:

"ڈاکٹر صاحب اس طرح تو کام نہیں چلے گا۔ پولیس آپ کے چہرے کی گھبراہٹ سے گڑبڑ کا اندازہ لگا لے گی۔ اور آپ بلا وجہ مارے جائیں گے۔"

"ہوں۔ لیکن۔ میں کیا کروں۔"

"نہ آپ کے پاس نقلی کاغذات ہیں، نہ ہمارے پاس۔ پھر گھبراہٹ کیسی؟" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"ہوں۔ بات ٹھیک ہے۔ اچھا خیر۔ ہم کوشش کرتے ہیں، مس روشنگ۔ اپنے آپ کو سنبھالو، ورنہ ہم جان سے جائیں گے۔"

"او کے ڈاکٹر۔" اس نے کہا۔

جلد ہی انھوں نے ان کے چہروں پر کافی حد تک تبدیلی محسوس کی، لیکن ان کے چہرے ابھی تک بالکل صاف

نہیں ہوئے تھے۔ اسی وقت ان کی باری آ گئی:

"اپنے کاغذات دکھائیے۔" انسپکٹر بولا۔

"جی بہتر!" انسپکٹر کامران مرزا نے کہا اور اپنے کاغذات ان کی طرف کر دیے۔

کاغذات دیکھ کر اس نے مطمئن انداز میں سر ہلایا، پھر بولا:

"آپ کچھ پریشان لگتے ہیں ڈاکٹر؟"

"ایک خطرناک کیس کی وجہ سے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ہوں ٹھیک ہے۔ آپ جا۔ ارے۔ آپ تو ڈاکٹر فونڈا ہیں، وہی ڈاکٹر۔ جن کے کلینک میں وہ غیر ملکی جاسوس گھس آئے تھے۔"

"ج۔ جی ہاں۔ میں وہی ہوں۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"آپ کے بارے میں ہمارے چیف کی ایک ہدایت ہے، ہم آپ سے اس وقت جاسوسوں کے حلیے پوچھنا بھول گئے تھے۔ لہٰذا آپ کو فوری طور پر چیف کے سامنے پیش ہو کر ان کے حلیے لکھوانا ہیں۔"

"لیکن میں اپنے مریض کا کیا کروں۔" ڈاکٹر نے بوکھلا کر کہا۔

"چیف یہاں سے زیادہ دور نہیں ہیں۔ آئیے میرے ساتھ۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنے ساتھیوں سے کچھ کہا اور اپنے موٹر سائیکل پر بیٹھ کر ان کے آگے آگے چلنے لگا۔ مجبوراً انھیں اس کے پیچھے چلنا پڑا۔ انسپکٹر جمشید نے ٹیکسی ڈرائیور کے چہرے پر الجھن کے آثار صاف دیکھے۔ ان کے دل تیزی سے دھڑک رہے تھے۔ آخر ایک موڑ پر بنے کیبن کے قریب موٹر سائیکل رک گئی۔

"اتر آیئے ڈاکٹر صاحب۔" انسپکٹر نے درد سے کہا۔

"اب میں کیا کروں۔" ڈاکٹر نے سرگوشی کی۔

"چلے جایئے، لیکن آپ نے ان لوگوں کو ہمارے بارے میں بتایا تو مس روشنگ کو زندہ نہیں دیکھ سکیں گے۔" انسپکٹر کامران مرزا نے سرد آواز میں کہا۔ ان الفاظ کے ساتھ ہی مس روشنگ کا چہرہ دودھ کی طرح سفید نظر آنے لگا۔ اس کے منہ سے دبے الفاظ میں نکلا:

"ڈ ڈ۔ ڈاکٹر۔"

"ہاں بے بی۔ فکر نہ کرو۔ تم مجھے بہت عزیز ہو۔"

اسی وقت انسپکٹر جمشید نے ڈرائیور کے جسم میں حرکت محسوس کی:

"خبردار مسٹر ڈرائیور۔ تمھاری پسلیوں میں چبھنے والی چیز پستول کی نالی سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔"

ان کا ہاتھ جیب میں تھا۔ اور اس ہاتھ کی شہادت والی انگلی ڈرائیور کی کمر سے جا لگی تھی۔ ڈرائیور کانپ اٹھا۔ اتنے میں ڈاکٹر اتر کر جا چکا تھا۔

"تت۔ تت تو آپ لوگ وہی ہیں جن کے بارے میں۔" وہ جملہ مکمل نہ کر سکا۔

"ہاں! زبان بند رکھو۔" انسپکٹر کامران مرزا غرائے۔

اور ان دونوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ دو منٹ بعد ڈاکٹر آتا نظر آیا۔ اس کے پیچھے انسپکٹر بھی تھا:

"شکریہ ڈاکٹر۔ آپ کو زحمت ہوئی۔"

"کوئی بات نہیں جناب۔ قانون کی مدد کرنا ہر شہری کا فرض ہے۔" اس نے کہا اور اندر آ کر بیٹھ گیا۔

"چلو بھئی۔ جلدی کرو۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

اور ٹیکسی چل پڑی۔ اس جگہ سے بہت دور آ کر انھوں نے اطمینان کا سانس لیا۔

"ہم تم تینوں کو یقین دلاتے ہیں کہ اگر۔ تم نے کوئی غلط حرکت نہ کی تو بخیریت رہو گے۔ اور ہمارے یہاں سے فرار کے بعد بھی باعزت زندگی گزار سکو گے، لیکن اگر گڑبڑ کی تو پھر خود ذمے دار ہو گے۔" انسپکٹر جمشید نے بارعب آواز میں کہا۔

ان کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکل سکا۔ آخر وہ بے آباد ساحل تک پہنچ گئے۔ وہ انھیں لانچ تک لے گئے، کیوں کہ اب ان تینوں کو ساتھ ہی لے جانا تھا۔

"ٹیکسی اس چٹان کی اوٹ میں کھڑی کر دو تاکہ کسی کو آسانی سے نظر نہ آسکے۔ اور ہمارے ساتھ ساحل تک چلو۔"

"آپ۔ آپ لوگوں کا ارادہ کیا ہے؟" ڈرائیور نے کانپتی آواز میں کہا۔

"فکر نہ کرو۔ ہم تم لوگوں کو سمندر میں دھکا نہیں دیں گے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

ٹیکسی کو چٹان کی اوٹ میں کھڑا کر کے وہ ساحل پر آئے اور لانچ میں بیٹھ گئے۔ سٹیرنگ انسپکٹر جمشید نے سنبھالا اور انسپکٹر کامران مرزا ان کی طرف پستول تان کر بیٹھ گئے، ان کی آنکھوں سے خوف جھانکنے لگا۔ لمحہ بہ لمحہ وہ جزیرے سے نزدیک ہوتے چلے گئے اور پھر انسپکٹر جمشید چونک کر بولے:

"اوہو۔ یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔"

"کیا مطلب؟" انسپکٹر کامران مرزا نے ان کی طرف سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔ وہ اناڑی تو تھے نہیں کہ اچانک ادھر دیکھنے لگ جاتے۔

"جزیرے کے ساحل پر میں ایک لانچ دیکھ رہا ہوں۔ بڑی لانچ۔ دوسری طرف ایک اور لانچ کھڑی ہے۔"

"اوہ۔ تب تو۔ جزیرے سے دور ہی رہنا مناسب ہے۔" وہ بولے۔

"ہاں بالکل۔" انھوں نے کہا اور لانچ کا رخ موڑ لیا۔

"کیا جزیرے پر رونل کے آدمی اتر چکے ہیں۔ اور ہمارے ساتھی گرفتار کر لیے گئے ہیں۔" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔

"ہو سکتا ہے، یہی بات ہو، لیکن ہمارے ساتھی آسانی سے تو ہاتھ آنے والے نہیں ہیں۔"

"رونل بھی تو عام آدمی نہیں ہے۔" انھوں نے کہا۔

دور ہوتے ہوئے وہ اس قدر فاصلے پر چلے آئے کہ جزیرے کے ساحل پر کھڑا جہاز بھی ایک دھبا نظر آنے لگا، اب اس فاصلے کو برقرار رکھ کر انھوں نے جزیرے کے گرد چکر لگانا شروع کر دیا:

"لانچ میں پٹرول کی کیا پوزیشن ہے؟"

"پٹرول ابھی بہت ہے۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔"

"آخر ہم کب تک تم لوگوں کے ساتھ رہیں گے۔" روشنگ نے چیخ کر کہا۔

"جب تک ہم اپنا کام مکمل نہیں کر لیتے۔"

"لیکن ہمارے گھر والوں کا بُرا حال ہو جائے گا رو رو کر، کیا یہ ان کے ساتھ ظلم نہیں ہوگا؟"

"ہوں - بات تو ٹھیک ہے - خیر - تم لوگ ایسا کرو کہ اپنا اپنا نام اور پتا لکھ کر دے دو، اور ایک ایک خط بھی لکھ دو - کہ ہم ایک ضروری کام کے سلسلے میں ایک جگہ مصروف ہیں، کام خفیہ نوعیت کا ہے، اس لیے وضاحت نہیں کی جا سکتی - ہم بہت جلد لوٹ آئیں گے، فکر کرنے کی ضرورت نہیں - بس اتنے الفاظ کافی ہیں، ہم تینوں کے گھروں تک یہ خطوط پہنچا دینے کی ذمے داری لیتے ہیں۔"

"ہوں! تم لوگ عجیب لوگ ہو۔" روشنگ حیران ہو کر بولی۔

"ہم انسانیت کے ہمدرد ہیں - اگر ہمیں تنگ نہ کیا جائے اور چھیڑا نہ جائے - تو پوری دنیا میں امن کا پیغام دے ڈالیں - لیکن مشکل یہ ہے کہ ہمیں سُکھ اور چین سے جینے دیا ہی نہیں جاتا - ہمیں نت نئی سازشوں کا شکار بناتے رہتے ہیں -"

"تو کیا ہم ابھی اور اسی وقت پیغام لکھنا شروع کر دیں۔"

"ہاں بالکل - ہم پہلی فرصت میں پیغام آپ لوگوں کے گھروں میں پہنچا دیں گے۔"

"شکریہ - غیر ملکی دشمن اتنے مہربان بھی ہو سکتے ہیں، ہم

سوچ بھی نہیں سکتے۔" روشنگ کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ہم غیر ملکی دشمن بعد میں ہیں، انسان پہلے۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"ہوشیار - ایک لانچ جزیرے سے ہماری طرف بڑھ رہی ہے - یا تو انھوں نے ہماری لانچ کو دیکھ لیا ہے - یا پھر وہ شہر کا رُخ کر رہی ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اوہ!" ان کے منہ سے نکلا - لیکن انھوں نے اب بھی اس سمت میں نہیں دیکھا - نظریں ان پر ہی جمائے رکھیں - انسپکٹر جمشید نے رفتار بڑھا دی - اور دائرہ بڑا کرنے لگے -

رائفلوں کے سائے

"لو بھئی۔ پھر ایک لانچ آ رہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے، رونل کا اطمینان نہیں ہو سکا۔" محمود نے منہ بنایا۔

"کوئی بات نہیں۔ اسے بھی آنے دو۔" آصف بولا۔

انھوں نے ساحل کی طرف دیکھا اور پھر فرزانہ نے چیخ کر کہا:

"اوہو۔ ایک نہیں، چار لانچیں آ رہی ہیں۔"

"ارے باپ رے۔ ان کا ارادہ تو شاید ہم پر حملہ آور ہونے کا ہے۔" فرحت گھبرا گئی۔

"تو کیا ہوا۔ ہم بھی ان سے مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہیں۔ کیوں انکل۔" فاروق نے خان رحمان کی طرف دیکھا۔

"ہاں! بالکل۔ کیوں نہیں۔" انھوں نے کہا۔

وہ جلدی جلدی ان درختوں کی طرف بڑھے۔ جن پر اس سے پہلے چھپے تھے۔

"کہیں انھوں نے یہ بات بھانپ نہ لی ہو کہ ہم درختوں پر چھپ گئے ہوں گے۔" ایسے میں شوکی نے بلند آواز میں کہا۔

"اوہ ہاں۔" خان رحمان چونک کر بولے۔

"اس صورت میں وہ درختوں پر اندھا دھند فائرنگ کر سکتے ہیں۔" منور علی خان نے فکرمندانہ انداز میں کہا۔

"تب پھر۔ ہم کیا کریں۔"

"ج ج۔ جہاز۔" شوکی ہکلایا۔

"جہاز۔ کیا مطلب۔ تم جملہ درمیان میں کیوں چھوڑ دیتے ہو۔ کیا یہ تمھاری گھٹی میں پڑا ہے۔" فاروق نے بھنا کر کہا۔

"پپ۔ پتا نہیں۔ گھٹی کے بارے میں میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" اس نے ڈرے ڈرے انداز میں کہا۔

"خیر خیر۔ شوکی۔ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔" خان رحمان نے بے تابانہ لہجے میں کہا۔

"اس بار ہم درختوں کی بجائے جہاز پر کیوں نہ چھپ جائیں۔"

"جہاز پر۔ لیکن وہ جہاز کی بھی تلاشی لیں گے۔"

"تو لیتے رہیں۔ ہم انھیں ملیں گے ہی نہیں۔" شوکی نے مسکرا کر کہا۔

"کیسے نہیں ملیں گے شوکی - تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" پروفیسر داؤد نے اسے گھورا۔

"یہ حضرت کہنا یہ چاہتے ہیں کہ ہم وہیں چھپ سکتے ہیں جہاں رونل نیلے لباس والوں کو چھپائے رہا۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"اوہ - یہ تو بالکل احمقانہ اقدام ہوگا۔" منور علی خان بولے۔

"وہ کیسے انکل؟" مکھن نے بُرا مان کر کہا۔

"اس لیے کہ پہلے آنے والے دشمنوں کو جہاز کی اس جگہ کے بارے میں معلوم نہیں تھا - لیکن اب رونل نے انھیں ہدایات دے کر بھیجا ہوگا - لہٰذا ہمارے لیے وہ جگہیں بھی خطرناک ہیں، درخت بھی محفوظ نہیں ہیں - جائیں تو جائیں کہاں۔" خان رحمان نے جلدی جلدی کہا۔

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہم گھر گئے۔" آصف بڑبڑایا۔

"اُلجھن یہ ہے کہ انسپکٹر جمشید اور انسپکٹر کامران مرزا صاحبان اس وقت یہاں نہیں ہیں - اگر ہم اکٹھے گھر جاتے تو کوئی بات نہیں تھی - صرف ہماری گرفتاری ان کے لیے اُلجھن پیدا کرے گی - اور وہ ہمیں تلاش کرتے پھریں گے - اس طرح ہم اپنے اصل مقصد سے دُور ہٹ جائیں گے۔"

"ہوں - اور ادھر لانچیں لمحہ بہ لمحہ نزدیک آ رہی ہیں - ان کے آنے سے پہلے پہلے ہمیں کوئی ترکیب سوچ لینی چاہیے۔" آصف بولا۔

"فرزانہ - اللہ کے لیے اپنی عقل کو آواز دو۔" فاروق جلدی سے بولا۔

"فرحت تم بھی۔"

"لل - لیکن - ہم تو تمہارے کہنے سے پہلے ہی عقلوں کو آواز دے چکی ہیں - لیکن افسوس - ان کی طرف سے کوئی اشارہ نہیں مل رہا۔"

"تب پھر - لے دے کے ہم درختوں پر ہی چڑھ سکتے ہیں۔" خان رحمان بولے۔

"ٹھیک ہے - چڑھ جاؤ۔"

وہ جلدی جلدی درختوں پر چڑھنے لگے - جلد ہی چار لانچیں جزیرے تک آ گئیں اور اس کے چاروں طرف کھڑی ہو گئیں - اب لاؤڈ سپیکر پر آواز اُبھری:

"ہم جانتے ہیں - تم لوگ جزیرے پر ہی موجود ہو - بہتر یہ ہوگا کہ خود کو ہمارے حوالے کر دو - ورنہ جزیرے کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے کر حملہ کیا جائے گا اور تم لوگ اس حملے سے بچ نہیں سکو گے، اس مرتبہ ہم بڑے

پیمانے پر تیاری کر کے آئے ہیں۔ چاروں لانچوں پر ہلکی توپیں بھی نصب ہیں۔ اگر ہم نے توپوں کو داغنا شروع کر دیا تو درختوں کو آن کی آن میں اڑایا جا سکتا ہے۔ اس سے پہلے کہ تم لوگوں کے جسموں کے پرخچے اڑیں۔ درختوں سے نیچے چھلانگیں لگا دو۔ تم لوگوں کے بچنے کی بس ایک ہی صورت ہے۔"

انھوں نے دم سادھ لیے۔ اس وقت ان کی باگ ڈور خان رحمان کے ہاتھ میں تھی۔ جواب میں کچھ کہنا تھا یا نہیں۔ ان کا کام تھا۔ باقی لوگ منہ سے کچھ کہہ ہی نہیں سکتے تھے۔

"تم لوگوں نے جواب نہیں دیا۔" لانچ پر سے ایک آواز پھر اُبھری۔

وہ اب بھی خاموش رہے۔

"اگر ایک منٹ کے اندر اندر تم نے چھلانگیں نہ لگائیں تو گولہ باری شروع کر دی جائے گی۔"

ان کے دل دھک دھک کر رہے تھے۔ آخر ایک منٹ بھی گزر گیا۔ اس مرتبہ لانچوں کی طرف سے بھی کوئی آواز نہیں اُبھری۔

"گولہ باری شروع نہیں ہوئی۔ شاید یہ لوگ جھوٹ بول

رہے ہیں۔" خان رحمان نے سرگوشی کی۔

"لیکن انکل۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ حملے کے لیے پروگرام ترتیب دے رہے ہوں۔" فاروق نے کہا، وہ ان کے ساتھ درخت پر موجود تھا۔

"اگر یہ گولہ باری کریں گے۔ تو بھی پہلے ہوائی فائر کریں گے۔ تاکہ ہمیں بتا دیں کہ واقعی لانچوں پر توپیں نصب ہیں۔" خان رحمان مسکرائے۔

"اوہ واقعی۔" فاروق بولا

اسی وقت انھوں نے لانچوں سے کچھ لوگ اُتر کر جزیرے کی طرف بڑھتے دیکھے۔

"دیکھا فاروق۔ ان کے پاس کوئی توپ ووپ نہیں ہے، ہم ان سے مقابلہ کریں گے۔ تیار ہو جاؤ۔" خان رحمان بولے۔

"جی بہتر۔ میں تو تیار ہو گیا۔ آپ دوسروں کو تیار کریں۔"

خان رحمان نے منہ سے ہلکی سی سیٹی کی آواز نکالی۔ ساتھ والے درخت پر سے محمود اور آصف نے ان کی طرف دیکھا۔ انھوں نے مکا فضا میں لہرا کر اشارہ دیا کہ جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔ محمود نے منہ سے سیٹی کی آواز نکالی اور ساتھ والے درخت پر چھپے آفتاب اور مکھن کو اشارہ دیا، انھوں

نے آگے شوکی اور منور علی خان کو اشارہ دیا۔ ان سے اگلے درخت پر فرزانہ اور فرحت موجود تھیں، انھیں بھی اشارہ مل گیا۔ پروفیسر داؤد، اشفاق اور اخلاق ایک درخت پر تھے۔ وہ بھی تیار ہو گئے۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ ان کے پاس واجبی سا اسلحہ تھا۔ جب کہ دشمن ان کے خیال میں اسلحے سے لیس آیا تھا۔ اور پھر انھوں نے دشمنوں کو رینگ کر آگے بڑھتے دیکھا۔ پھر ایک تیز سیٹی گونجی اور وہ جہاں تھے، وہیں رُک گئے۔ ان کے ہاتھوں میں رائفلیں اور سٹین گنیں تھیں۔ سیٹی کی آواز سن کر وہ مُڑ مُڑ کر دیکھنے لگے۔ انھوں نے بھی اسی لانچ کی طرف دیکھا۔ جس سے سیٹی کی آواز اُبھری تھی۔ انھوں نے ایک زرق برق لباس والی لڑکی کو لانچ سے چھلانگ لگاتے دیکھا۔ اپنے رینگنے والے ساتھیوں کے پاس پہنچ کر اس نے انھیں کوئی اشارہ کیا اور آگے بڑھ کر درختوں کی طرف آنے لگی۔ پھر وہ ان درختوں کے بالکل نیچے پہنچ گئی۔ جن پر وہ موجود تھے۔ وہ بغور زمین کا جائزہ لے رہی تھی۔ ایک بار جو اس نے سر اُوپر اُٹھا کر دیکھا تو وہ چونک اُٹھے۔ آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

وہ ریوٹا تھی ـــــ

○

وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اس مہم کے لیے رونل ریوٹا کو بھیج دے گا۔ اب تو وہ فکر مند ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ایسے میں خان رحمان کو نہ جانے کیا سوجھی۔ انھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ عین اسی وقت ریوٹا پر چھلانگ لگا دی۔ جب کہ وہ ان کے درخت کے نیچے سے گزر رہی تھی۔ دونوں گرے، لیکن ہوا یہ کہ ریوٹا نے ایک لحظہ پہلے اپنی جگہ سے چھلانگ لگا دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خان رحمان زمین پر گرے۔ اس سے پہلے وہ سنبھل سکتے۔ ریوٹا ان پر ٹوٹ پڑی۔ اس کا پہلا ہاتھ ان کی گردن پر لگا، وہ تڑپ کر مُڑے اور دائیں ہاتھ کا مکا اس کی ٹھوڑی پر مارا۔ یہ مکا اس کی ٹھوڑی پر کیا لگا۔ وہ لڑکھڑا گئی۔ فوراً ہی فاروق نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ اس وقت وہ لڑکھڑا رہی تھی۔ فاروق عین اس کے سر پر گرا۔ وہ دھپ سے زمین بوس ہو گئی۔ فوراً ہی خان رحمان نے اسے جکڑ لیا اور اس کا بازو مروڑتے ہوئے دبی آواز میں بولے:

" اپنے ساتھیوں کو حکم دو۔ اسلحہ پھینک دیں اور ہاتھ اوپر

اُٹھائے ادھر آ جائیں - مطلب یہ کہ اسلحہ اپنے پیچھے پڑا چھوڑ آئیں۔"

ریوٹا نے ایک لمحے کے لیے سوچا، پھر بلند آواز میں بولی:

"میں تمھیں حکم دیتی ہوں - اسلحہ نیچے گرا دو، ہاتھ اوپر اٹھا دو اور سیدھے ادھر چلے آؤ - حکم کی فوری طور پر تعمیل ہو۔"

"یہ - یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں مس ریوٹا" ایک آواز اُبھری —

"میں نے جو کہا ہے، وہی کرو - تم نہیں جانتے — صورتِ حال کیا ہے۔"

"بہت بہتر۔"

تڑا تڑ اسلحہ نیچے گرنے کی آوازیں اُبھریں اور پھر دشمن ہاتھ اوپر اُٹھائے آگے آنے لگے - اس وقت تک خان رحمان ریوٹا کے پستول پر قبضہ کر چکے تھے اور اس کی نالی اس کی کن پٹی پر جم چکی تھی —

ایک ایک قدم اُٹھاتے اس کے ساتھی نزدیک آ گئے۔ انھوں نے ریوٹا کی طرف حیرت زدہ انداز میں دیکھا —

"یہ - یہ کیا مس ریوٹا - آپ نے اپنی جان بچانے کے لیے ہم سب کو بھی پھنسوا دیا۔"

"بے وقوف - ایسا نہیں ہے۔"

"تم سب نیچے اُتر آؤ - اور ان کے پیچھے جا کر اسلحہ سمیٹ لو۔" خان رحمان بولے۔

سب لوگ نیچے آنے لگے، پھر وہ اسلحے کی طرف بڑھ گئے - انھوں نے تیزی سے ہاتھ چلائے اور سارا اسلحہ ایک درخت کے نیچے ڈھیر کر دیا:

"لیجیے انکل - اسلحہ نیلامی کے لیے تیار ہے۔" فاروق مسکرایا —

"شکریہ فاروق - ہاں مس ریوٹا - اب کیا پروگرام ہے؟"

"تم لوگ بچ نہیں سکتے - مسٹر رونل تمھارے گرد ایک ایسا جال بُن رہے ہیں کہ بالکل بے بس ہو جاؤ گے۔"

"اور وہ جال کب تک بُن لیں گے۔"

"کام شروع ہے - جلد ایسا ہو گا۔"

"پروا نہیں - دیکھا جائے گا - تم اپنی کہو - تمھارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔"

"تم میرا اور میرے ساتھیوں کا بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔"

"وہ کیوں؟" آصف نے منہ بنایا۔

"اس لیے کہ تم لوگ بالکل بے وقوف ہو اور میں بہت عقل مند ہوں۔" اس نے ہنس کر کہا۔

"یہ شان دار اندازہ کس طرح لگا لیا۔" محمود حیران ہو

کر بولا۔

"بہت آسانی سے۔ اور ابھی ثابت ہونے والا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ جب ثابت ہو جائے گا تو ہم بھی یہ بات مان لیں گے۔" آفتاب گنگنایا۔

"جب ثابت ہی ہو جائے گا تو ماننے کی کیا ضرورت رہ جائے گی۔" مکھن نے منہ بنایا۔

اچانک ایک فائر ہوا۔ گولی خان رحمان کے سر پر سے گزر گئی۔ وہ دھڑام سے گرے اور اسی وقت ریٹا کے دو ساتھیوں نے ان پر چھلانگ لگا دی۔ ریٹا نے آزاد ہوتے ہی چیخ کر کہا:

"اسلحے کے ڈھیر پر قبضہ کر لو اور انھیں بھون ڈالو۔"

اس کے ان الفاظ کے ساتھ ہی محمود اور آصف نے اسلحے کی طرف دوڑ لگا دی۔ ادھر دشمن کے آدمی اس سمت میں دوڑے۔ پھر تو سبھی ادھر دوڑ پڑے۔ خان رحمان نے اپنے سے بھڑے ہوئے دونوں دشمنوں کو ایک زبردست جھٹکا دیا اور ان کے درمیان سے نکل کر اسی طرف دوڑ پڑے، وہ سب کے سب بے ہنگم انداز میں اسلحے تک پہنچے اور ایک دوسرے سے بھڑ گئے۔ گتھم گتھا ہو گئے۔

اسلحے کی طرف سبھی دوڑ پڑے تھے۔ لیکن کم از کم

ایک فرد ایسا ضرور تھا۔ جس نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی تھی۔ اور وہ فرزانہ تھی۔ اب وہ بالکل تنہا کھڑی رہ گئی تھی۔ اس نے چند لمحے کے لیے کچھ سوچا اور پھر رُخ دوسری طرف کر کے ساحل کی طرف دوڑ لگا دی۔ لیکن اس انداز میں کہ قدموں کی چاپ نہ اُبھر سکی۔ ساحل کے نزدیک پہنچ کر اس نے لانچ کا جائزہ لیا۔ اس پر کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ جلدی سے آگے بڑھ کر لانچ پر سوار ہو گئی۔ لانچ پر چند رائفلیں موجود تھیں۔ اس نے ان میں سے دو رائفلیں اُٹھا لیں۔ اور پھر ان لوگوں کی طرف دوڑ لگا دی۔ مناسب فاصلے پر پہنچ کر اس نے ایک درخت کے پیچھے پوزیشن لے لی اور رائفل تان لی۔ پھر جوں ہی پہلا دشمن اس کی زد میں آیا، اس نے فائر کر دیا۔ فائر کی آواز نے ان سب کو چونکا دیا ادھر جسے گولی لگی۔ دہشت زدہ انداز میں چیخا، تڑپا اور ٹھنڈا ہو گیا۔ وہ سب کے سب اس کا انجام دیکھتے ہی لیٹ گئے۔ ابھی انھیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ گولی کس فریق کے آدمی نے چلائی ہے۔ فرزانہ نے فوراً ہی ایک فائر اور کیا۔ اور وہ ایک اور آدمی کو لے ڈوبی۔ اس آدمی نے سر اُٹھا کر اس کی طرف دیکھنے کی کوشش کی تھی۔

"جس نے بھی حرکت کی۔ اس کا یہی انجام ہو گا۔" فرزانہ نے بلند آواز میں کہا۔

"وہ مارا۔ یہ تو فرزانہ ہے۔" محمود چلّا اُٹھا۔

"اسلحہ اپنے ہاتھوں میں لے لو۔ اور ان کے چاروں طرف کھڑے ہو جاؤ۔ تاکہ ہم ان کو بھوننے کا کام آسانی سے کر سکیں۔ مس ڈیوٹا۔ مجھے تم سے ایسی امید نہیں تھی۔" فرزانہ نے چہکتی آواز میں کہا۔

"کیسی؟" فاروق نے حیران ہو کر کہا۔

"اس کی منصوبہ بندی بہت ناقص رہی۔ یہی وجہ ہے کہ پندرہ منٹ میں دوسری بار یہ ہماری زد پر ہیں۔" وہ بولی۔

"خیر خیر۔ اب اس بے چاری اور ان بے چاروں کی بُرائی تو نہ کرو۔" آفتاب نے منہ بنایا۔

"اگر ان سے اتنی ہی ہمدردی ہے تو ان کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ جا کر۔" مکھن نے جل کر کہا۔

"بہت اچھی تجویز ہے۔ آفتاب کو اس پر فوراً عمل کرنا چاہیے۔" فاروق چہکا۔

"حد ہو گئی۔ ارے بھئی۔ یہ اسلحے پر قبضہ کرنے کا وقت ہے یا گپیں ہانکنے کا۔" خان رحمان نے جھنجلا کر کہا۔

"اوہ واقعی انکل۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔" آصف نے چونک کر کہا۔

"اور تم میرا شکریہ کس بات کا ادا کر رہے ہو؟"

"اس بات کا کہ آپ نے انھیں حالات کی نزاکت کا احساس دلایا۔"

اب وہ اسلحہ ایک ایک کر کے اُٹھا چکے تھے۔ دشمن اس لیے نہیں اُٹھا سکتے تھے کہ فرزانہ انھیں نشانہ بنا سکتی تھی۔ آخر وہ سب دشمنوں کے گرد کھڑے ہو گئے۔

"ہاتھ اوپر اُٹھا لو۔" خان رحمان نے کہا، پھر اس درخت کی طرف منہ کر کے بولے جس کے پیچھے سے فرزانہ کی آواز آتی رہی تھی:

"اب کیا کیا جائے فرزانہ؟"

لیکن فرزانہ کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا۔

"ارے۔ تم۔ کہاں چلی گئیں فرزانہ۔ کہیں درخت کے پیچھے لیٹ کر سو تو نہیں گئیں۔" فاروق نے گھبرا کر کہا۔

"نہیں۔ وہ نیند کی اس حد تک عادی نہیں ہے۔ ہو گی یہیں کہیں۔ اس کی فکر چھوڑو۔ دشمنوں کی فکر کرو۔" آفتاب نے منہ بنا کر کہا۔

"دشمن بھی کوئی فکر کرنے کی چیز ہوتے ہیں۔" مکھن نے بوکھلا کر کہا۔

"لو۔ بی مینڈکی کو بھی ہوا زکام۔"

"شش۔ شاید اُردو گرامر کے پرچے میں آپ فیل ہوتے رہے ہیں۔" مکھن نے منہ بنا کر کہا۔

"کیا مطلب۔ تم نے یہ بالکل غلط اندازہ کس بنیاد پر لگا لیا۔"

"اس طرح کہ میں مذکر ہوں۔ مونث نہیں۔" وہ بولا۔

"دھت تیرے کی۔ رائفلوں کے سائے میں بھی انھیں اُردو گرامر کی سوجھ رہی ہے۔" محمود نے جھلّا کر اپنی ران پر ہاتھ مارا۔

"سوال یہ ہے کہ اب کیا کریں۔ ان لوگوں کا کیا کریں؟"

"انھیں باندھ لینا چاہیے۔"

"لیکن اب ہم اس جزیرے پر زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتے۔"

"کک۔ کیوں۔ کیا اس پر بھوتوں کا قبضہ ہونے والا ہے۔" آفتاب نے گھبرا کر کہا۔

"نہیں۔ جب ریوٹا اور اس کے ساتھی واپس نہیں پہنچیں گے تو رونل شاید خود جزیرے کی طرف دوڑا آئے گا۔"

خان رحمان بولے۔

"تت۔ تو ہم انھیں چھوڑ دیتے ہیں۔" شوکی نے گڑبڑا کر کہا۔

"یار شوکی۔ تمھارا دماغ تو نہیں چل گیا۔" محمود اس کی طرف پلٹا۔

"نن نہیں تو۔ میں نے تو ایسا محسوس نہیں کیا۔" شوکی نے جلدی سے کہا۔

"اگر ہم نے انھیں واپس جانے دیا تو بھی اس کا کیا فائدہ۔ یہ وہاں جا کر بھی رونل کو حالات سے آگاہ کر دیں گے۔ اور اس صورت میں بھی رونل یہاں آئے گا، جب کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ پہلے ابا جان اور انکل کامران مرزا یہاں آ جائیں۔ پھر ہم یہاں سے بے شک کوچ کر جائیں۔ لیکن اگر اس سے پہلے رونل یہاں آ گیا تو حالات نہ جانیں کس کروٹ بیٹھیں۔"

"تت۔ تب تو ٹھیک ہے۔ ہم انھیں نہیں جانے دیں گے۔"

"کیسے نہیں جانے دو گے۔ یہ دیکھو۔ میں جا رہی ہوں، ہمت ہے تو روک لو۔" ریوٹا نے چیخ کر کہا۔ اور دو تین لمبی لمبی پھلانگیں لگا کر یہ جا وہ جا۔ خان رحمان نے

اس کا نشانہ لیا ہی تھا کہ ایک فائر ہوا۔ اور گولی ریوٹا کی کمر پر لگی۔ وہ اوندھے منہ گری۔ لیکن پھر اُٹھ کر بھاگی۔

"اوہ۔ یاد آیا۔ اس نے تو بلٹ پروف لباس پہن رکھا ہے۔" ایک درخت پر سے فرزانہ کی آواز اُبھری۔ گویا اب وہ درخت پر موجود تھی۔ لیکن فرزانہ کے یہ بات کہنے سے پہلے خان رحمان ریوٹا کا نشانہ لے چکے تھے۔ اور انھوں نے ٹریگر بھی دبا ہی دیا۔ گولی ریوٹا کے سر میں لگی۔ ایک بھیانک چیخ اس کے منہ سے نکلی۔ اور اس کا جسم بُری طرح تڑپنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے۔ وہ ٹھنڈی ہو گئی۔

"ہائیں۔ یہ کیا۔ ریوٹا تو گئی کام سے۔"

"ریوٹا کے ساتھیو۔ اب تم خود کو بندھوا لو۔ ورنہ ہم تم لوگوں پر گولیاں ہی گولیاں برسا دیں گے۔" محمود نے بلند آواز میں کہا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔ لیکن ہم انھیں باندھیں گے کس طرح۔ یہاں رسیاں کہاں ہیں۔" فرحت نے منہ بنایا۔

"رسیاں جہاز سے لے آئیں گے۔" اخلاق نے فوراً کہا۔

"ٹھیک ہے۔ تم دونوں جا کر رسیاں لے آؤ۔" خان رحمان

بولے۔

"ک۔ کون دونوں؟" اخلاق نے گھبرا کر کہا۔

"تم اور فرحت۔ تم نے ہی رسیوں کا سوال پیدا کیا ہے۔" خان رحمان مسکرائے۔

"آ۔ آیئے فرحت صاحبہ۔" اخلاق نے گھبرا کر کہا۔

"بھئی یہ فرحت صاحبہ کیا ہوا۔ فرحت بہن نہیں کہہ سکتے کیا۔" فرحت نے ہنس کر کہا۔

"اوہ ہاں۔ بالکل کہہ سکتا ہوں۔ کیوں نہیں کہہ سکتا۔"

"اب کہہ سکتا کے چکر میں پڑ کر رسیاں نہ گول کر دینا۔" فاروق نے بھنا کر کہا۔

"لیکن۔ رسیاں تو پہلے ہی گول ہوتی ہیں۔" مکھن نے بوکھلا کر کہا۔

"اور تم انھیں بالکل ہی گول کرنے پر تُل گئے ہو۔" آفتاب جل گیا۔

"آیئے چلیں۔ کہیں یہ لوگ لڑ نہ پڑیں۔" اخلاق نے سہم کر کہا اور دونوں نے جہاز کی طرف دوڑ لگا دی۔

لیکن اسی وقت انھوں نے دوسری طرف کھڑی ایک لانچ کے سٹارٹ ہونے کی آواز سُنی۔ وہ سب کے سب چونک اُٹھے:

"ارے۔ یہ کیا۔ یہ لانچ کون لے بھاگا ہے؟"

"ہمارا ایک ساتھی۔ مس ریوٹا نے اپنے والی لانچ پر ایک آدمی کو چھوڑ دیا تھا۔ شاید وہ حالات دیکھ کر بھاگ نکلا۔"

"اوہ۔ یہ۔ یہ بہت بُرا ہوا۔" خان رحمان بولے۔

سب نے لانچ کی طرف دیکھا۔ وہ لمحہ بہ لمحہ دُور ہوتی جا رہی تھی۔ فرحت اور اخلاق تک اس لانچ کو جاتے دیکھ کر رُک گئے تھے۔

لامے را

"ہمیں اس لانچ سے صرف اتنے فاصلے پر رہنا چاہیے کہ فوری طور پر اسے جا لیں۔" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔

"ہاں۔ اگر یہ شہر کا رُخ کرنے کا ارادہ رکھتی ہے، تب تو ہمیں اسے روکنا ہوگا اور اگر یہ ہماری طرف آ رہی ہے تو پھر مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"مشکل یہ ہے کہ ہمارے ساتھ یہ لوگ بھی موجود ہیں۔ آپ ان پر نظر رکھیں گے یا اس لانچ سے مقابلہ کریں گے۔"

"یہ بات بھی ٹھیک ہے۔ خیر ہم ترکیب نمبر تیرہ استعمال کیے لیتے ہیں۔" انسپکٹر کامران مرزا نے کہا۔

"ترکیب نمبر تیرہ۔ کیا مطلب؟" ڈاکٹر فونڈا نے حیران ہو کر کہا۔

"بہت سیدھی اور آسان ترکیب ہے اور وہ یہ ہے کہ کر

انھوں نے اچانک پستول والا ہاتھ سر سے بلند کیا اور ڈاکٹر
کے سر پر پستول دے مارا۔ یہ دیکھتے ہی ٹیکسی ڈرائیور
نے چاہا کہ ان کا ہاتھ پکڑ لے، لیکن دوسرے ہاتھ کا
مکا اس کی ٹھوڑی پر لگا۔ پستول والا ہاتھ دوسری بار
روشنگ کے سر پر لگا۔ ٹیکسی ڈرائیور کو ایک اور ہاتھ
کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ اس کے بھی پستول رسید کر
دیا۔ فوراً ہی تینوں لمبے لیٹے نظر آئے۔ ان کی طرف سے
مطمئن ہو کر وہ لانچ کی طرف مڑے۔ اب وہ بہت نزدیک
آ گئی تھی، لیکن ڈرائیور کا منہ ان کی طرف نہیں تھا۔ گویا
وہ ان کی لانچ کی فکر میں نہیں تھا۔ اس پر تو بس ایک
ہی دھن سوار تھی۔ اور وہ یہ کہ کسی طرح شہر پہنچ جائے۔

انسپکٹر جمشید نے یہ محسوس کرتے ہی لانچ کا رخ موڑ
دیا اور اس کے راستے میں آ گئے۔ انسپکٹر کامران مرزا نے
پستول سیدھا کیا اور فائر کر دیا۔ لانچ ڈرائیور اچھل کر
سمندر میں گرا اور لانچ بھی الٹ گئی۔ سرخ ہونے والے
پانی نے انھیں بتا دیا کہ لانچ ڈرائیور کے گولی لگ چکی
ہے۔

انسپکٹر جمشید نے اب لانچ کا رخ جزیرے کی طرف کر
دیا۔ ان کی لانچ کی آواز نے جزیرے پر موجود دونوں فریقوں

کو ادھر متوجہ کر دیا۔ اور پھر فاروق اور آفتاب ایک ساتھ چلا
اٹھے:

"وہ مارا۔"

ان کے چہرے کھل اٹھے۔ اس وقت تک اخلاق اور فرحت
رسیاں لا چکے تھے اور باندھنے کا کام تیزی سے شروع تھا۔
خان رحمان انھیں جلدی جلدی حالات بتانے لگے۔

"اس کا مطلب ہے، دیوتا کی چھٹی ہو گئی۔ چلیے، تین
میں سے ایک سے تو نجات ملی۔ اب ہم زیادہ دیر یہاں
نہیں ٹھہر سکتے۔"

"کیوں نہ ہم سب لوگوں سمیت ساتھ والے جزیرے پر
چلے جائیں۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"ہاں اب یہی کرنا ہو گا اور جہاز کو بھی لے جانا ہو
گا۔"

آدھ گھنٹے بعد وہ جہاز پر سوار ہو چکے تھے اور ان
کا رخ دوسرے جزیرے کی طرف تھا۔ اب ان کے پاس
کافی اسلحہ بھی تھا اور قیدی بھی۔ دوسرا جزیرہ انھوں نے آتے
ہوئے دیکھا تھا اور اندازہ تھا کہ کس طرف ہے، لہٰذا وہ بغیر
کسی دقت کے اس تک پہنچ گئے۔

جزیرے پر پہنچ کر سب لوگ ایک جگہ بیٹھ گئے۔

قیدیوں کو قدرے فاصلے پر ڈال دیا گیا، وہ سب بندھے
ہوئے تھے۔ صرف ڈاکٹر فونڈا کو اپنے پاس رکھا گیا۔ وہ ہوش
میں آ چکا تھا۔

"مسٹر فونڈا۔ مجھے افسوس ہے آپ کو بے ہوش کرنا پڑا۔"

"کک۔ کوئی بات نہیں۔"

"ہم آپ کے ملک کے ایٹمی پلانٹ تک جانا چاہتے ہیں،
کیا آپ اس سلسلے میں ہماری مدد کر سکتے ہیں۔"

"ایٹمی پلانٹ۔ کیا مطلب؟" ڈاکٹر نے بوکھلا کر کہا۔

"ہم ایٹمی پلانٹ کی تباہی چاہتے ہیں۔"

"نن۔ نہیں۔ نہیں۔" ڈاکٹر فونڈا چلا اٹھا۔

"گھبرائیے نہیں مسٹر فونڈا۔ ہم مہم سے کامیاب لوٹیں گے
تو تم لوگوں کو اپنے ساتھ اپنے ملک لے جائیں گے۔ وہاں
تم بہت آرام وہ زندگی بسر کر سکو گے۔"

"اور میرے بیوی بچے۔ رشتے دار۔"

"خیر۔ آپ یہاں رہنا پسند کریں تو بھی ہمیں کوئی
اعتراض نہیں ہو گا۔ ہم ایسا انتظام کر جائیں گے کہ آپ
کی حکومت آپ پر ذرا سا بھی شک نہیں کر سکے گی۔"

"وہ تو خیر ٹھیک ہے۔ لیکن میں سچ کہتا ہوں۔ میں نہیں
جانتا۔ ایٹمی پلانٹ کہاں ہے۔"

"کیا آپ کسی ایسے آدمی کے بارے میں بتا سکتے ہیں۔ جو
ہمیں بتا سکے۔"

"صرف خیال ظاہر کر سکتا ہوں۔"

"چلیے۔ خیال ہی سہی۔"

"وزیر دفاع کو معلوم ہو سکتا ہے۔"

"اور وزیر دفاع تک ہم کس طرح جائیں؟"

"مم۔ میں تو صرف پتا بتا سکتا ہوں۔ جانے کا کام
آپ کا ہے۔"

"ہوں ٹھیک ہے۔ پتا بتائیے۔"

"اس کی کوٹھی۔ ۹ ارٹن روڈ پر ہے۔ نام کلاشوف
ہے۔"

"بہت بہت شکریہ۔ اب آپ سب لوگوں کو یہاں ہمارا
انتظار کرنا ہو گا۔"

"لیکن کیوں جمشید۔" پروفیسر داؤد نے برا سا منہ بنایا۔

"جی کیا مطلب؟"

"ہم ان لوگوں کو یہاں باندھ کر کیوں ڈالیں، کیوں نہ
انہیں جانے دیں۔"

انہوں نے حیران ہو کر پروفیسر داؤد کی طرف دیکھا، پھر
انسپکٹر جمشید بولے:

"بات ٹھیک ہے۔ ان لوگوں کو روک کر کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ خیر ہم انہیں آزاد چھوڑ جاتے ہیں — کوئی گزرتی ہوئی لانچ یا جہاز انہیں لے جائے گا۔ اس طرح یہ ہمارے بعد پہنچ سکیں گے۔ اس وقت تک ہم نہ جانے کہاں کے کہاں پہنچ چکے ہوں۔"

آخر یہی کیا گیا۔ وہ انہیں کھول کر وہاں سے جہاز میں روانہ ہوئے۔ جہاز کو پھر اسی جزیرے کے کنارے کھڑا کیا اور لانچ میں بیٹھ کر ویران ساحل پر اُترے۔

"اب ہمارے پاس ٹیکسی صرف ایک ہے۔ اور آدمی بہت ہیں۔" انسپکٹر جمشید نے اُلجھن کے عالم میں کہا۔

"تو پھر پیدل چلے چلتے ہیں۔ کوئی ویگن وغیرہ ہاتھ لگ گئی تو اس سے کام لیں گے۔" آصف بولا۔

"یہ ٹھیک رہے گا۔ لیکن ٹیکسی کو اس جگہ سے ہٹا کر کہیں اور کھڑے کر دینا چاہیے۔ شاید ہمیں اس کی بھی ضرورت پیش آجائے۔" محمود نے جلدی سے کہا۔

انسپکٹر جمشید نے سر ہلا کر اس کی تائید کی اور ٹیکسی ایک اور جگہ کھڑی کر دی۔ چابی وہ ٹیکسی ڈرائیور سے لے آئے تھے۔

اب انہوں نے شہر کی طرف رُخ کیا۔ ظالموں کے شہر

میں وہ سب ایک ساتھ پہلی مرتبہ داخل ہو رہے تھے اور ابھی انہیں اس مُلک کے ایٹمی پلانٹ تک پہنچنا تھا۔

تھوڑی دیر بعد آبادی کے آثار نظر آئے۔ ان کی نظریں کسی ویگن کی تلاش میں بھٹکنے لگیں۔ آخر ایک جگہ سفید رنگ کی ایک بڑی ویگن کھڑی نظر آئی۔ اس میں کوئی نہیں تھا۔ شاید کوئی خاندان ساحل کی سیر کرنے آیا ہوا تھا۔ انسپکٹر جمشید ٹہلنے کے انداز میں اس کی طرف گئے اور دروازے کا ہینڈل پکڑ کر کھینچا۔ لیکن وہ بند تھا۔ اب انہوں نے جیب سے چابیوں کا گچھا نکال کر باری باری چابیاں لگانی شروع کیں۔ پھر جوں ہی کلک کی آواز سنائی دی۔ ایک بھاری بھرکم آواز نے انہیں چونکا دیا:

"کیا کر رہے ہو مسٹر۔ کیا گاڑی چرانے کا ارادہ ہے؟"

"توبہ کیجیے جناب۔ میں چور نہیں ہوں۔" وہ جلدی سے اس کی طرف مڑے۔ وہ ایک بوڑھا آدمی تھا۔

"تو پھر گاڑی کو کیا کر رہے تھے؟"

"دیکھ رہا تھا۔ گاڑی کا مالک دروازہ کھلا تو نہیں چھوڑ گیا۔"

"ارے — تو تم چوکیدار ہو؟"

"نہ جی — جو آپ سمجھ لیں — میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" انھوں نے کندھے اچکائے۔

"کیا مطلب — میں کیا سمجھ لوں — اور مجھے ضرورت ہی کیا ہے، کچھ سمجھنے کی۔"

"خیر خیر — آپ سمجھیں یا نہ سمجھیں — میں چور نہیں ہوں — ہاں یہ ضرور دیکھ رہا تھا کہ دروازہ کھلا ہے یا بند۔"

"لیکن کیوں — تمھیں یہ دیکھنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"آپ اسے میرا شوق خیال کر لیں — بعض اوقات لوگوں کی گاڑیوں کے دروازے کھلے رہ جاتے ہیں — میرا یہ شوق ایسے لوگوں کی مدد کرتا ہے۔"

"عجیب شوق ہے — خیر مجھے کیا — مہربانی فرما کر گاڑی کے پاس سے ہٹ جائیے۔"

"بہت بہتر۔" انھوں نے کہا اور پیچھے ہٹتے چلے گئے —

"نہیں بنا کام ابا جان۔" انھوں نے فاروق کی آواز سنی —

"بس کیا بتاؤں — دروازہ تو میں نے کھول لیا تھا — اتنے میں وہ بڑے میاں آ گئے — ویگن کے مالک۔"

"چلیے پھر کوئی اور گاڑی دیکھیں۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"ہاں! یہی کرنا ہو گا — آؤ چلیں۔"

ابھی انھوں نے قدم اٹھائے ہی تھے کہ دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی — وہ جلدی سے مڑے، دیکھا کہ وہی بڑے میاں دوڑے چلے آ رہے تھے، ان کے چہرے پر حیرت کے آثار تھے:

"کیا بات ہے جناب — خیر تو ہے؟"

"وہ — وہ — آپ ٹھیک کہتے تھے — آپ کے خیال دلانے پر میں نے دروازہ کھول کر دیکھا — وہ واقعی کھلا تھا — اُف — اگر کوئی کار چور ادھر آ جاتا تو ویگن صاف تھی۔"

"تو یہ بات ثابت ہو گئی نا — کہ میرا یہ شوق ایسے لوگوں کی مدد کرتا ہے۔"

"ہاں بالکل — اسی لیے تو میں دوڑ کر آیا ہوں۔" بوڑھے نے خوش ہو کر کہا۔

"جی کیا مطلب — کس لیے دوڑ کر آئے ہیں؟"

"آپ نے میری مدد کی، اب میرا بھی یہ فرض ہے کہ میں آپ کی مدد کروں — کیا میں کوئی مدد کر سکتا ہوں؟"

"جی بس شکریہ — ہم تو ذرا شہر تک جا رہے ہیں — گھومنے پھرنے کے لیے۔"

"اور آپ کے پاس کوئی سواری نہیں ہے؟"

"نہیں ہے تو کیا ہوا، ہم آگے چل کر لے لیں گے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"تو میری ویگن میں کیوں نہیں چلتے آپ۔" اس نے شکایت بھرے لہجے میں کہا۔

"اور آپ کی فیملی کس طرح جائے گی۔"

"کون سی فیملی۔ کیسی فیملی۔ کس کی فیملی۔"

"دد۔ دیکھیے نا جناب۔ لفظ فیملی کی گردان تو نہ کریں، بُرا مان جائے گا۔" مکھن نے گھبرا کر کہا۔

"کون بُرا مان جائے گا؟"

"لفظ فیملی۔" مکھن بولا۔

"اوہو۔ آپ لوگ تو زندہ دل بھی ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں بالکل اکیلا ہوں۔ دُور پار کے کچھ عزیز ضرور ہیں۔ لیکن وُہ صرف میری دولت کے بھوکے ہیں، انھیں مجھ سے کوئی ہمدردی نہیں، اس لیے میں بھی انھیں لفٹ نہیں کراتا۔ آئیے میں آپ کو شہر پہنچا دوں۔"

"شکریہ جناب۔" فاروق نے جلدی سے کہا۔

"یہیں ٹھہریے۔ میں ویگن لاتا ہوں۔ اور ہاں۔ شہر میں آج جگہ جگہ چیکنگ ہو رہی ہے۔ آپ لوگوں کے پاس کاغذات تو پورے ہیں نا۔"

"بالکل ہیں۔ آپ فکر نہ کریں۔"

وُہ اس کی ویگن میں بیٹھ کر آگے روانہ ہوئے۔ ایسے میں محمود نے پوچھا:

"آپ کا نام کیا ہے جناب؟"

"لامے را۔" اس نے کہا۔

"مسٹر کلاشوف کو جانتے ہیں؟"

"انھیں کون نہ جانتا ہوگا۔" اس نے فوراً کہا۔

"ہمیں ان سے کچھ کام ہے۔ کیا مُلاقات کی کوئی صورت ہو سکتی ہے؟"

"سُنا ہے، وُہ بہت اکھڑ آدمی ہے۔ مُلاقات بہت مشکل سے ہو سکتی ہے اس سے، اس سلسلے میں تو مَیں کوئی مدد نہیں کر سکتا۔"

"اگر آپ ہماری مدد کریں تو ہم اس سے مل سکتے ہیں۔" فرزانہ نے سوچے سمجھے بغیر کہا۔

"وُہ۔ وُہ کیسے؟" لامے را نے حیران ہو کر کہا۔

"کیا آپ ہمیں اپنے گھر لے جا سکتے ہیں؟" فرزانہ نے اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے ایک اور سوال کیا۔

"ہاں کیوں نہیں۔ اس میں کیا حرج ہے۔ میں تو خود تنہائی

سے پریشان رہتا ہوں۔"

"تو پھر پہلے ہمیں گھر لے چلیے۔ وہیں بات ہو گی۔"

"لیکن آپ لوگ تو کہہ رہے تھے۔ شہر میں گھومنے پھرنے کے لیے جا رہے ہیں۔ یہ کام کہاں سے نکل آیا۔" اس نے الجھن کے عالم میں کہا۔

"گھومنے پھرنے کے دوران اگر کوئی کام بھی کر لیا جائے تو کیا برائی ہے۔"

"ہاں! یہ بھی ٹھیک ہے۔" اس نے کہا، پھر کچھ سوچ کر بولا:

"اگر گھر ہی جانا ہے تو پھر مین روڈ سے کیوں چلوں۔ چیکنگ میں وقت ضائع ہو گا۔"

"یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔" انسپکٹر جمشید نے خوش ہو کر کہا۔

بیس منٹ بعد وہ ایک عالی شان محل میں داخل ہوئے۔ چار ملازمین ویگن کی طرف دوڑ پڑے۔ بڑے میاں کے ساتھ وہ اندر پہنچے اور ایک بہترین طرز پر سجے ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے۔ بے تحاشا دولت ضائع کی گئی تھی۔ یہ دیکھ کر ان کے منہ بن گئے، یہ بات لامے را سے بھی چھپی نہ رہ سکی۔ شاید اس کی نظر بہت تیز تھی:

"خیر تو ہے، کیا ڈرائنگ روم پسند نہیں آیا، میں نے تو اس کو ترتیب دیتے وقت آرٹسٹ کو کئی ہزار روپے دیے ہیں۔"

"یہ بات نہیں جناب۔ خیر چھوڑیے۔ آپ برا مان جائیں گے۔" محمود نے جلدی سے کہا۔

"کس بات کا برا مان جاؤں گا۔"

"ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قسم کی فضول خرچیوں کی بالکل اجازت نہیں دی۔"

"آپ کے نبی۔ یعنی۔"

"آپ حضرت موسیٰؑ کو نبی مانتے ہیں نا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں۔"

"ہاں بالکل۔ اس میں کیا شک ہے۔"

"تب پھر آپ کو یہ بھی مان لینا چاہیے کہ دنیا میں سب سے آخر میں اللہ کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم آئے۔ ان کے آنے کی خبر ہر نبی نے دی۔ خود حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کی امت میں پیدا ہونے کی خواہش کی۔ اس امت کو دیکھنے کی خواہش کی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی خبر دی۔ کل عالم کے لیے ان پر ایمان لانا ضروری ہے۔

اس کے بغیر آخرت میں نجات ممکن نہیں۔ آپ کو بھی چاہیے، ان پر ایمان لائیں۔"

لامے را ساکت رہ گیا۔ ایک منٹ تک اس کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکل سکا۔ آخر اس نے کہا:

"آپ لوگوں کے پاس کیا ثبوت ہے کہ آپ کے نبی کی آمد کی خبر ان سے پہلے ہر نبی نے دی۔"

"اللہ کی کتاب قرآن۔ جب آپ اسے پڑھیں گے تو معلوم ہوگا کہ تمام مشہور نبیوں کے واقعات اس میں کھول کر بیان کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ تمام آسمانی کتابوں میں پیش گوئی موجود ہے۔ وقت ملا تو اس موضوع پر تفصیل سے بات چیت ہو گی۔ پہلے تو آپ یہ بتائیے۔ ہم کلاشوف سے ملاقات کے لیے کیا طریقہ اختیار کریں۔" انسپکٹر جمشید روانی کے عالم میں کہتے چلے گئے۔

"مشکل ہے۔ بہت مشکل۔ میں کیا بتاؤں۔"

"خیر۔ ان کا فون نمبر آپ کو معلوم ہے۔"

"نہیں۔ ڈائریکٹری میں دیکھنا ہو گا۔"

"مہربانی فرما کر جلدی دیکھ لیں۔ آؤ بھئی۔ اتنی دیر میں ہم نماز ادا کر لیں۔"

"کیا کر لیں؟"

"نماز پڑھ لیں۔ اپنے اللہ کی عبادت کر لیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں پانچ وقت اپنی عبادت کا حکم دیا ہے۔"

"اوہ!" اس کے منہ سے نکلا۔

وہ ڈائریکٹری میں کھو گیا اور وہ وضو کر کے نماز میں مشغول ہو گئے۔ لامے را کن اکھیوں سے ان کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس نے فون نمبر نوٹ کر کے ان کی طرف منہ کیا اور بولا:

"فون نمبر مل گیا ہے۔"

ان کی طرف سے کسی نے بھی جواب نہ دیا۔ تو اس نے حیران ہو کر کہا:

"کیا آپ نے سنا نہیں۔ میں نے کیا کہا ہے۔"

اب بھی وہ نہ بولے۔ آخر نماز سے فارغ ہو کر اس کی طرف آئے، اس وقت انسپکٹر کامران مرزا نے اس سے کہا:

"نماز کے دوران ہم نہیں بول سکتے۔"

"اوہ اچھا!" اس نے کہا اور فون نمبر ان کی طرف سرکا دیا۔

انسپکٹر جمشید نے ایک لمحے کے لیے سوچا، پھر لامے را کی طرف مڑے:

"آپ کے اس محل کا نمبر کیا ہے؟"

"جی نائن۔"

"اور آپ سے اگلی کوٹھی کا نمبر؟"

"جی سیون۔" اس نے کہا۔

"شکریہ۔" انھوں نے کہا اور پھر وہ نمبر ڈائل کرنے لگے، بیس منٹ کی مسلسل کوشش کے بعد کہیں جا کر سلسلہ ملا اور انھوں نے کہا:

"ہیلو۔ میں ان غیر ملکی جاسوسوں کے متعلق اطلاع دینا چاہتا ہوں۔"

"ضرور ضرور۔ لیکن آپ نے اس نمبر پر کیوں رنگ کیا۔ اس کے لیے تو تھری زیرو نمبر دیا گیا ہے۔"

"ان نمبروں پر اطلاع دینے سے کچھ نہیں بنے گا۔"

"کیا مطلب؟" دوسری طرف سے حیران ہو کر کہا گیا۔

"وہ لوگ ایک مکان میں چھپے ہوئے ہیں۔ اور اس مکان کی کتنی بھی تلاشی لی جائے۔ انھیں اس سے برآمد نہیں کیا جا سکتا۔"

"تو پھر مسٹر کلاشوف اس سلسلے میں کیا کر سکیں گے۔"

"آپ میری ان سے بات کرا دیں۔ یہ میں انھی کو بتاؤں گا کہ وہ کیا کر سکتے ہیں اور کیا نہیں۔"

"اچھی بات ہے۔ انتظار کریں۔" دوسری طرف سے کہا گیا، پھر دو منٹ بعد ایک کھڑکھڑاتی آواز سنائی دی:

"کلاشوف۔ کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟"

"ایک اطلاع دینا چاہتا ہوں۔ وہ غیر ملکی جاسوس جن کی تلاش اس وقت پورے شہر میں ہو رہی ہے۔ اس وقت شہر کی ایک کوٹھی میں چھپے ہوئے ہیں۔ آپ لاکھ کوشش کریں، انھیں اس کوٹھی سے برآمد نہیں کر سکیں گے، لیکن اگر میں چاہوں تو یہ بائیں ہاتھ کا کھیل ہو گا۔"

"کوٹھی کا نمبر بتائیں۔ میں اس کی بنیادیں اکھڑوا دوں گا۔"

"اس سے بھی کچھ نہیں ہو گا۔"

"تو پھر۔ ہمیں کیا کرنا ہو گا۔"

"پہلے آپ کوشش تو کر لیں۔ تاکہ میری بات پر یقین آ جائے، آپ اپنے آدمیوں کو بھیج کر انھیں تلاش کرائیں۔ ناکامی کی صورت میں میں پھر فون کروں گا۔"

"دیکھو مسٹر۔ اس طرح وقت ضائع ہو گا۔" دوسری طرف سے جھنجلا کر کہا گیا۔

"تب پھر آپ تلاش کرتے رہیے انھیں۔" وہ برا سا منہ بنا کر بولے۔

"اچھا خیر۔ بتائیے۔ میں اپنے آدمیوں کو کہاں بھیجوں؟"

"جی بیون۔"

"اور آپ کس نمبر سے بات کر رہے ہیں؟"

"سوری۔" انھوں نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

"کیا مطلب؟" لامے را کے منہ سے نکلا۔ اس کی آنکھیں اب حیرت اور خوف سے پھیل گئی تھیں۔

"مطلب یہ مسٹر لامے را۔ ہم ان جاسوسوں کے بارے میں جانتے ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ ان کی گرفتاری پر دس ہزار کا انعام ہے۔"

"ل۔ لیکن۔ وہ جی بیون میں کیسے ہو سکتے ہیں۔" اس کے لہجے میں بلا کی حیرت تھی۔

"یہ صرف ایک مذاق ہے۔"

"اور یہ مذاق ہمیں بہت مہنگا پڑے گا۔ وہ اس فون کال کا پتا چلالیں گے۔"

"فکر نہ کریں۔ اب ہم فون اس جگہ سے نہیں۔ کسی پبلک فون بوتھ سے کریں گے۔" انھوں نے کہا۔

"لیکن کیوں۔ آپ کو ایسا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ساحل کے پاس آپ نے بتایا تھا کہ شہر سیر کرنے جا رہے ہیں، لیکن پھر میرے گھر آ گئے اور اب یہ پراسرار فون کر ڈالا۔ آخر آپ لوگ کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں؟"

"ہم بہت شریف آدمی ہیں۔ اور سب کی بھلائی چاہتے ہیں۔" شوکی بڑبڑایا۔

"کیا مطلب؟"

"اب میں مطلب کس بات کا بتاؤں۔" اس نے بے چارگی کے عالم میں کہا۔

"یار چپ رہو۔ تم سے مطلب پوچھ کون رہا ہے۔" آصف نے بگڑ کر کہا۔

"ج۔ جی۔ بہت بہتر۔" شوکی ہکلایا۔

"مہربانی فرما کر وضاحت کریں۔ آپ کون ہیں۔ ورنہ میں پولیس کو فون کرتا ہوں۔"

"لیجیے۔ کہاں تو اپنے گھر لا رہے تھے اور کہاں ہمارے خلاف کیے جا رہے ہیں۔ حد ہو گئی۔" فاروق نے تلملا کر کہا۔

"میں کہتا ہوں۔ بتائیے۔ آپ کون ہیں؟"

"ہمیں نماز پڑھتے دیکھنے کے بعد۔ اور اتنی باتیں ہونے کے بعد بھی آپ ابھی تک اندازہ نہیں لگا سکے؟"

"نہیں۔ اس لیے کہ ہمارے ملک میں کچھ لوگ ہیں۔ جو آپ ہی کی طرح نماز پڑھتے ہیں۔ آپ ہی جیسی باتیں کرتے ہیں۔ لیکن سب کو معلوم ہے۔ دراصل وہ مسلمان نہیں ہیں۔ مسلمانوں کے خلاف سازش کرنے والے ہیں۔ وہ جابانی لوگ کہلاتے

ہیں۔ کیا آپ جاپانی نہیں ہیں؟

"جی نہیں۔ وہ لوگ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی ایک اور شخص کو نبی مانتے ہیں۔ جب کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ یہ اللہ کی کتاب قرآن کا بھی فیصلہ ہے اور ہمارے نبی کے الفاظ بھی یہی بات ثابت کرتے ہیں۔ یہ ٹولہ صرف سازش کے تحت وجود میں آیا ہے۔"

"اوہ۔ تو۔ تو آپ مسلمان ہیں۔"

"ہاں! اس میں کوئی شک نہیں۔"

"تب پھر۔ آپ وہی لوگ ہیں۔ جن کی اس وقت پورے شہر کی سڑکوں پر ہو رہی ہے۔"

یہ الفاظ کہتے وقت لامے را کی آنکھیں خوف کی زیادتی سے باہر کو نکل آئیں۔

بے ہودہ اجازت

"آپ کا خیال ٹھیک ہے۔ لیکن۔ آپ کو ہم سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ نے ہم پر احسان کیا ہے۔ ہم آپ کو کوئی تکلیف نہیں پہنچائیں گے۔"

"وہ۔ وہ تو خیر ٹھیک ہے، لیکن اگر مسٹر رونل کو معلوم ہو گیا کہ میں نے اپنے محل میں آپ لوگوں کو پناہ دی ہے تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا اور اس محل کو بھی گروا دے گا۔"

"لیکن اسے یہ پتا کیوں کر لگ سکتا ہے۔ ہم نے آپ کے محل کا نمبر تو لیا ہی نہیں۔"

"وہ لوگ ساتھ والی کوٹھی میں تو آئیں گے ہی۔ ادھر بھی آ سکتے ہیں۔"

"نہیں۔ وہ ایسا نہیں کر سکیں گے۔ اور اگر انھوں نے ایسا کیا تو ہمیں یہاں تلاش نہیں کر سکیں گے۔"

"آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں۔ آپ کو کیا معلوم، ان کا طریقہ کار کیا ہے۔"

"ہم مسٹر رونل، شیلاک اور ریوٹما سے ٹکرا چکے ہیں۔"

"ن۔ نہیں۔" اس کے منہ سے نکلا۔ آنکھوں میں ایک بار پھر حیرت دوڑ گئی۔

"اس میں کوئی شک نہیں۔ بلکہ ہم تو مس ریوٹما کو ٹھکانے بھی لگا چکے ہیں۔"

"یہ۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"آپ کو یقین آئے بھی کیسے۔ آپ ہم سے واقف نہیں ہیں اور رونل وغیرہ کو نہ جانے کیا خیال کرتے ہیں۔"

"تو آپ کا دعویٰ ہے کہ کلاشوف میرے محل کا رُخ نہیں کرے گا۔"

"ابھی کلاشوف تو آئے گا بھی نہیں۔ فی الحال تو اس کے ماتحت آ رہے ہیں۔" انسپکٹر کامران مرزا مسکرائے۔

"اب اگر میں پولیس کو فون کر کے آپ لوگوں کی یہاں موجودگی کی اطلاع دے دوں۔"

"ضرور ایسا کریں، لیکن اس صورت میں ہم آپ کے ساتھ کوئی نرمی کا سلوک نہیں کر سکیں گے۔" محمود نے کہا۔

"اوہ!" وہ دھک سے رہ گیا۔

"آئیے۔ ذرا محل کی چھت پر چلیں۔ دیکھیں تو سہی۔ کلاشوف کے آدمی کیا کارروائی کرتے ہیں۔"

"ہوں۔ ٹھیک ہے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں خود بھی دیکھنا پسند کروں گا۔"

وہ سب محل کی چھت پر آ گئے۔ آخر پولیس کی گاڑیوں کی آمد شروع ہوئی۔ پولیس گاڑیوں سے اُتر اُتر کر اِدھر اُدھر پھیلنے لگی۔

"اوہو۔ یہ تو بہت دُور تک پھیل رہے ہیں۔" شوکی نے پریشان ہو کر کہا۔

"میں نے پہلے ہی کہا تھا۔ ان کے کام کرنے کا اپنا ایک طریقہ ہے۔" لامے را نے تھر تھر کانپتی آواز میں کہا۔

"آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"کک۔ کیوں۔ میں تو سمجھتا ہوں۔ مصیبت نے مجھے گھیر لیا ہے۔"

"اگر انھوں نے ادھر کا رُخ کیا تو ہم پستول آپ پر تان دیں گے۔ ظاہر ہے۔ اس صورت میں آپ ان کی نظروں میں بے قصور ٹھہریں گے۔"

"معلوم تو ایسا نہیں ہوتا۔ خیر۔" اس نے مایوسانہ انداز میں کہا۔

عین اسی وقت محل کے دروازے پر دستک دی گئی۔ گھنٹی کی آواز انھیں اوپر بھی سنائی دی۔ وہ نیچے کی طرف لپکے، ادھر سے ایک ملازم اوپر آتا نظر آیا:

"ہاں! کیا بات ہے؟" لامے رانے ڈوبتی آواز میں کہا۔

"باہر پولیس والے کھڑے ہیں۔ اندر کی تلاشی لینا چاہتے ہیں۔"

"اوہ ٹھہرو۔ میں دیکھتا ہوں۔" اس نے کہا۔ پھر ان کی طرف مڑا:

"آپ۔ کیا کہتے ہیں؟"

"دروازہ کھول دیں اور ان لوگوں کو اندر آنے دیں۔ ہمیں اپنا مہمان بتائیں۔ ہم بے تکلف انداز میں ڈرائنگ روم میں بیٹھ جائیں گے اور دروازہ کھلا رکھیں گے۔ اگر ہماری طرف آئے تو ان کی باتوں کے ہم خود جواب دیں گے۔"

"اچھی بات ہے۔ اب تو مجھے آپ ہی کی ہدایات پر عمل کرنا ہوگا۔"

"خیال رہے۔ آپ ہمارے بارے میں انھیں اور کچھ نہیں بتائیں گے۔"

"اچھ۔ چھا۔"

اسی وقت فرحت نے چونک کر ملازم کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت اور خوف کے آثار تھے۔ جوں ہی وہ جانے کے لیے مڑا۔ وہ بول اٹھی:

"آپ ذرا ٹھہریے۔ ہمیں کچھ چیزیں منگوانا ہیں۔"

"جی۔ کیا کہا؟"

"ہمارے ساتھ ڈرائنگ روم میں آئیے۔"

"ج۔ جی بہتر۔" اس کے منہ سے نکلا۔

وہ اسے لیے ڈرائنگ روم میں آ گئے۔

"بس ایک طرف خاموشی سے کھڑے رہو۔ اگر ہلنے کی کوشش کی تو ہم تمھاری شکایت لامے راسے کر دیں گے اور پھر تم ملازمت میں نہیں رہ سکو گے۔"

"اوہ!" اس نے بوکھلا کر کہا۔

"کیا ہم غلطی نہیں کر رہے۔" شوکی نے بے چینی کے عالم میں کہا۔

"کیسی غلطی۔ ہمیں یہاں دور دور تک کوئی غلطی نظر نہیں آ رہی۔"

"میرا مطلب ہے۔ دروازے پر مسٹر لامے را پولیس کو کچھ بھی بتا سکتا ہے۔"

"ہوں۔ ایسی امید نہیں۔ خیر ہمیں احتیاط کا دامن نہیں

چھوڑنا چاہیے۔ تم سب لوگ یہیں موجود رہو۔ میں اور انسپکٹر جمشید سامنے والے کمرے میں چھپ جاتے ہیں۔ تاکہ وقت پر صورتِ حال کو سنبھالا جا سکے۔"

"یہ ٹھیک رہے گا۔" آصف نے مطمئن لہجے میں کہا۔

دونوں اُٹھے اور کمرے سے نکل گئے۔

"یہ۔ آخر یہ کیا ہو رہا ہے؟" ملازم ہکلایا۔

"بھئی کچھ بھی نہیں ہو رہا۔ تم تو بلاوجہ پریشان ہو رہے ہو۔" آفتاب نے ہنس کر کہا۔

اسی وقت بھاری قدموں کی آواز سنائی دی۔ اور ڈرائنگ روم کی طرف بڑھنے لگی اور پھر آٹھ دس پولیس والے بے دھڑک اندر داخل ہو گئے۔ ان کے ہاتھوں میں سٹین گنیں تھیں۔

ملازم کے بدن میں تھرتھری دوڑ گئی۔ پولیس والوں کے پیچھے لامے را اندر داخل ہوا، اس کا چہرہ بھی دودھ کی طرح سفید تھا۔

"تو یہ ہیں آپ کے مہمان۔"

"ہاں۔ آخر بات کیا ہے۔" اس نے کہا۔

"تم لوگ اپنے کاغذات دکھا سکتے ہو۔" ایک آفیسر نے کہا۔

"جی ہاں۔ کیوں نہیں۔" انسپکٹر جمشید نے کہا اور سب نے اپنے کاغذات نکال کر ان کے سامنے کر دیے۔

پولیس آفیسر نے ایک ایک کارڈ کو بغور دیکھا، پھر بولا:

"ہوں۔ ٹھیک ہے۔ محل کے باقی حصّوں کی بھی پوری طرح تلاشی لو۔" اس نے اپنے ماتحتوں کو حکم دیا۔

تلاشی شروع ہو گئی۔ آخر پولیس والے باہر نکل آئے، اب لامے را اور ملازم کے چہروں پر رونق آتی نظر آئی:

"اُف۔ ہم بال بال بچے۔"

"اب ہم پھر چھت پر جا کر نظارا کریں گے۔ یہ ملازم بھی ہمارے ساتھ اوپر جائے گا۔"

"لے جائیے۔ ضرور لے جائیے۔" اس نے فوراً کہا۔

"آپ بھی چلیے نا۔"

"ضرور ضرور۔" اس نے کہا۔

وہ چھت پر چڑھ گئے۔ اور بھی بے شمار لوگ اپنی چھتوں پر چڑھ کر پولیس کارروائی کو دیکھ رہے تھے۔ لہٰذا انھیں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ ایک گھنٹے بعد پولیس جا رہی تھی؛ چنانچہ انھوں نے بھی نیچے کا رُخ کیا:

"آخر یہ سب کیا ہے۔ اس ترکیب کا کیا فائدہ ہوا۔" لامے را نے بُرا سا منہ بنایا۔

"فائدہ اب شروع ہو گا۔" انسپکٹر کامران مرزا مسکرائے۔

بیس منٹ بعد انسپکٹر جمشید نے پھر کلاشوف کے نمبر ڈائل کیے۔ سلسلہ ملنے پر بولے :

"میں وہی بول رہا ہوں جس نے غیر ملکی جاسوسوں کی جی سیون میں موجودگی کی خبر دی تھی۔ اور یہ دعویٰ بھی کیا تھا کہ آپ لوگ انھیں اس کوٹھی سے برآمد نہیں کر سکیں گے۔"

"ہوں ۔ تمھاری یہ بات ثابت ہو گئی۔ اب تم کیا چاہتے ہو؟"

"میں انھیں اسی کوٹھی سے برآمد کرا سکتا ہوں، لیکن انعام دوگنا کر دیں اور آپ خود تشریف لائیں۔ یا مسٹر رونل کو بھیج دیں۔"

"مسٹر رونل تو خیر نہیں آ سکتے۔ اس وقت وہ بہت اہم ڈیوٹی سرانجام دے رہے ہیں، ہاں میں ضرور آ سکتا ہوں، لیکن سوال یہ ہے کہ تم مجھے کیوں بلانا چاہتے ہو۔ دوگنا انعام تو میرے بغیر بھی تمھیں دیا جا سکتا ہے۔"

"صرف انعام کی بات نہیں۔ میں آپ سے ذاتی طور پر مل کر فخر تو کر سکوں گا۔"

"اوہ اچھا۔ میں آ رہا ہوں۔ کیا تم اپنا نام بتاؤ گے؟"

"جب آپ یہاں تشریف لائیں گے تو میں خود سامنے آ

کر تعارف کراؤں گا، لیکن شرط صرف ایک ہے۔"

"اور وہ کیا؟"

"یہ کہ آپ بالکل تنہا آئیں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے، کیا آپ نہیں جانتے۔ وہ کس قدر خطرناک لوگ ہیں۔"

"آپ میرا مطلب نہیں سمجھے۔ ساتھ اپنے آدمی ضرور لائیں، لیکن ۔ وہ آپ سے کافی فاصلے پر رہیں اور جب تک آپ انھیں اشارہ نہ دیں۔ اس وقت تک جی سیون میں داخل نہ ہوں۔"

"اچھی بات ہے۔ یوں ہی سہی۔" اس نے الجھن کے عالم میں کہا اور ریسیور رکھ دیا۔ وہ بھی ریسیور رکھ کر مسکرائے۔

"اب ۔ آپ کیا کریں گے؟" شوکی نے الجھن کے عالم میں کہا۔

"اسے پکڑ کر یہاں لاؤں گا۔" وہ بولے۔

"جی ۔ کیا کہا ۔ پکڑ کر یہاں لائیں گے ۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" لامے دا نے چیخ کر کہا۔ ملازم کا چہرہ بھی سفید پڑ گیا۔

"اس کے سوا ہم کیا کر سکتے ہیں۔"

"بھئی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں خطرہ مول

لینا ہی ہو گا۔" محمود نے پُر سکون آواز میں کہا۔

"لل۔ لیکن ہمارا کیا بنے گا؟" لامے را بولا۔

"آپ لوگوں پر کوئی شک نہیں کر سکتا۔ بے فکر رہیں۔ یہ ہمارا وعدہ ہے۔"

انسپکٹر جمشید ساتھ ساتھ گھڑی پر وقت دیکھ رہے تھے، آخر وہ انھیں وہیں ٹھہرنے کا اشارہ کرتے ہوئے باہر نکل گئے اور سڑک کے موڑ پر جا کھڑے ہوئے۔ اس جگہ سے کلاشوف کی کار مڑنے والی تھی۔

اور پھر انھوں نے کار کو آتے دیکھ لیا۔ کار پر بیگال کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ اور اندر بیٹھا ہوا آدمی صاف پہچانا جا رہا تھا کہ کوئی بڑا افسر ہے۔ نزدیک آنے پر انھیں یقین ہو گیا کہ یہی کلاشوف ہے۔ انھوں نے ہاتھ کا اشارہ دے دیا۔ کار فوراً رُک گئی۔ وہ دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئے اور بولے:

"معاف کیجیے گا جناب۔ فون میں نے ہی کیا تھا۔"

"بہت خوب۔ تو تمھارا دعویٰ ہے کہ وہ لوگ جی سیون میں موجود ہیں۔"

"جی ہاں! لیکن میرا انعام بیس ہزار ہو گا۔"

"بیس نہیں پچیس۔"

"تو پھر چلیے۔ پولیس آپ سے کتنے فاصلے پر ہے؟"

"صرف دو منٹ کے فاصلے پر۔ جب ہم جی سیون میں داخل ہوں گے، وہ اس پورے علاقے کو گھیر چکے ہوں گے۔ تم فکر نہ کرو۔"

"او کے سر۔ شکریہ۔" انھوں نے خوش ہو کر کہا۔

جلد ہی جی سیون کے سامنے پہنچ گئے۔ کار سے اُتر کر کلاشوف نے جی سیون کا رُخ کیا۔ لیکن انسپکٹر جمشید نے آگے بڑھ کر اس سے کہا:

"ادھر نہیں جناب۔ ادھر۔"

"کیا مطلب۔ کیا جی سیون یہ نہیں ہے۔"

"بے شک جی سیون یہی ہے، لیکن اس کا راستا جی نائن کی طرف سے جاتا ہے۔ اگر آپ ان لوگوں تک پہنچنا چاہتے ہیں تو پھر میرے ساتھ چلنا ہو گا۔ ورنہ پولیس والے تو پہلے بھی کوشش کر چکے ہیں۔"

"اوہ۔ تت۔ تو کیا۔ اندر سے یہ دونوں عمارتیں ایک ہی ہیں اور ان میں کوئی دروازہ ہے۔"

"آپ آیئے تو سہی۔" وہ مسکرائے۔

انھوں نے لامے را کے دروازے پر دستک دی۔ چند سیکنڈ بعد دروازہ کھلا اور لامے را کی صورت نظر آئی:

"جی فرمائیے۔"

"یہ مسٹر کلاشوف ہیں ۔ سمجھے۔" انسپکٹر جمشید بارُعب آواز میں بولے۔

"جی !!!" لامے را نے بوکھلا کر کہا۔

انسپکٹر جمشید اسے دھکیلتے ہوئے اندر گھس گئے اور کلاشوف کے اندر داخل ہونے کے بعد دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

اب وُہ تیز تیز قدم اُٹھانے لگے۔ اور سیدھے ڈرائنگ روم کے دروازے پر جا کر رُکے۔ اتنے میں کلاشوف اور لامے را بھی پہنچ گئے:

"یہ رہے جناب۔ وُہ غیر مُلکی جاسوس جن کی تلاش میں سارے شہر کو کھنگالا جا رہا ہے۔"

"ن۔ نہیں۔" کلاشوف کے منہ سے نکلا۔

"اگر یقین نہیں آرہا تو ان سے پوچھ لیں۔"

"لگ۔ کیوں۔ تم۔ وہی ہو؟" ساتھ ہی اس کا ہاتھ جیب میں رینگ گیا۔

"ہاں! ہم وہی ہیں۔"

"ارے۔ مم۔ میرا ریوالور کہاں گیا۔"

"اس کی آپ فکر نہ کریں جناب۔ وُہ محفوظ ہے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"محفوظ ہے۔ کیا مطلب۔ کہاں محفوظ ہے؟" کلاشوف نے بھنا کر کہا۔

"میری جیب میں۔"

"جیب سے نکال کر مجھے دو۔ ان لوگوں کو کوّر کرنا ہے۔"

"اب یہ اتنے سیدھے بھی نہیں کہ آپ کو اس کا موقع دے دیں گے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"بالکل ٹھیک۔ ہم واقعی اتنے سیدھے نہیں ہیں۔ بلکہ کسی قدر ٹیڑھے میڑھے ہیں۔ ہاتھ اوپر اُٹھا دیجیے مسٹر کلاشوف۔" فاروق نے شوخ آواز میں کہا۔

"کیا مطلب؟" اس نے بوکھلا کر کہا۔ اب انسپکٹر کامران مرزا کے ہاتھ میں ایک پستول نظر آرہا تھا۔

"ارے۔ یہ تو میرا ریوالور ہے۔" وہ بولا۔

"میری جیب سے نکل کر ادھر چلا گیا ہے، فکر نہ کریں اور بیٹھ جائیں۔ ہم اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔"

"تم لوگوں کا انجام بہت بھیانک ہوگا۔" اس نے غرّا کر کہا۔

"اس اطلاع کے لیے ہم آپ کے شکر گزار ہیں۔" آفتاب نے فوراً کہا۔

"کیا تم بھی ان کے ساتھی ہو؟" کلاشوف نے لامے را کو کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔

"جی۔ جی نہیں ۔ میرے گھر پر یہ زبردستی قابض ہو گئے ہیں۔"

"فکر نہ کرو۔ ان کا انجام نزدیک ہے ۔ اس پورے علاقے کو گھیرے میں لیا جا چکا ہے ۔ میں یُوں ہی تو بے دھڑک نہیں گھس آیا۔"

"لیکن جناب ۔ آپ شاید یہ بھول رہے ہیں کہ ہمارے ساتھ آپ کا انجام بھی بھیانک ہو گا ۔ آپ کے آدمی ہم تک بعد میں پہنچیں گے ، ہم آپ کا کام پہلے تمام کر دیں گے ۔ اب اگر آپ کو اپنا کام تمام کرانے کا اتنا ہی شوق ہے ۔ تو دیجیے انھیں اشارہ ۔" آصف نے تیز آواز میں کہا ۔ ساتھ ہی انسپکٹر کامران مرزا کی انگلی ٹریگر پر دباؤ ڈالتی نظر آئی ۔

کلاشوف ساکت رہ گیا ۔ ایک منٹ تک سوچتا رہا ، پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولا :

"تم لوگ چاہتے کیا ہو؟"

"ہاں ! یہ کیا ہے آپ نے کام کا سوال ۔ محمود ، ہم کیا چاہتے ہیں۔" فاروق نے خوش ہو کر کہا ۔

"کیوں ۔ تم نہیں جانتے کیا۔" آفتاب نے اسے گھورا۔

"بھئی کاٹ کھانے کو نہ دوڑو ۔ اور اگر کاٹ کھانے کو دوڑنے کا اتنا ہی موڈ ہے تو اس کے لیے یہاں مسٹر کلاشوف جو موجود ہیں۔" فاروق بولا۔

"یار چپ رہو ۔" انسپکٹر جمشید جھلا اُٹھے اور فاروق سہم گیا ۔

"ہم آپ سے صرف اور صرف ایک سوال کا جواب چاہتے ہیں ۔ اگر آپ نے جواب دے دیا تو آپ زندہ سلامت یہاں سے جا سکیں گے اور اگر نہ جواب دیا تو پھر یہاں سے آپ کی لاش جائے گی۔"

"ن ۔ نہیں ۔" وُہ ہکلایا ۔

"آپ اب وُہ سوال جاننے کے لیے بہت بے چین ہوں گے ۔ کیوں ٹھیک ہے نا ۔ تو سُنیے ۔ صرف اتنا بتا دیں ۔ ایٹمی پلانٹ کہاں بنایا گیا ہے؟"

"کیا !!!" کلاشوف چلّا اُٹھا ۔ لامے را کا چہرہ بھی تن گیا ۔ اسی وقت کلاشوف نے کہا :

"ہوں ! تو وُہ اِطلاع درست ہی تھی۔"

"کون سی اِطلاع؟" خان رحمان نے پریشان ہو کر کہا ۔

"یہی کہ۔ انسپکٹر جمشید نے اپنی حکومت سے درخواست کی ہے کہ وہ اسے ہمارے ملک کا ایٹمی پلانٹ اڑانے کی اجازت دے دے۔ لیکن۔ لیکن۔ میں نے تو سنا تھا کہ حکومت نے اجازت نہیں دی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ہمارے دوست ممالک نے تمہاری سرحدوں پر فوجوں کی تعداد اور ان کا دباؤ اور بڑھا دیا تھا۔"

"ہاں! یہ ٹھیک ہے۔ حکومت کی طرف سے مجھے اجازت واقعی نہیں ملی۔ یہ اجازت تو دراصل آپ نے ہمیں دی ہے۔"

"کیا بکواس ہے۔ ہم اور اس قسم کی بے ہودہ اجازت دیں گے۔"

"ہاں جناب۔ کیوں نہیں۔ آپ لوگوں نے ہمارے ملک کا سونا اڑانے کا پروگرام بنایا۔ راستے میں ہم آ گئے۔ سونا بچانے کے لیے ہم یہاں تک آ پہنچے۔ اب جب ہم یہاں تک آ ہی گئے ہیں۔ تو پھر ہم نے سوچا۔ کیوں نہ ایٹمی پلانٹ سے بھی دو دو ہاتھ کر ہی لیے جائیں۔" وہ روانی کے عالم میں کہتے چلے گئے۔

"ہاں اور کیا۔ ایٹمی پلانٹ سے دو دو ہاتھ کرنا حد درجے آسان جو ہوا۔" فاروق بول اٹھا۔

"خام خیالی ہے۔ تم مجھ سے یہ راز معلوم نہیں کر سکو گے۔" کلاشوف نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"ارے میاں جاؤ۔ تم کیا اور تمہاری بساط کیا۔" شوکی نے اس طرح ہاتھ لہرایا جیسے مکھی اڑائی ہو۔

"بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ کیا پدی کیا پدی کا شوربا۔" آفتاب بولا۔

"اس وقت اگر ہمارے ملک کی سرزمین پر آپ ہوتے تو کبھی یہ جملہ نہ کہہ سکتے، کیوں کہ ہم آپ کو سیدھا امتحان گاہ لے جاتے۔ دراصل ہمارے ہاں کی محکمۂ سراغرسانی کی امتحان گاہ آپ نے دیکھی ہی نہیں۔ بہت پر فضا مقام ہے۔ بڑے بڑے فرفر بولنے لگتے ہیں۔"

"تم لوگوں کا دماغ چل گیا ہے۔ ہم مر تو سکتے ہیں۔ ایٹمی پلانٹ کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتے۔"

"اس صورت میں تو پھر آپ کو مرنا ہی ہو گا۔"

"کوئی بات نہیں۔ میں مرنے کے لیے تیار ہوں۔"

"اب کیا کریں بھئی۔ یہ تو بہت ضدی ہے۔"

"اور ادھر اس کے ساتھی لمحہ بہ لمحہ گھیرا تنگ کر رہے ہوں گے۔" خان رحمان نے پریشان آواز میں کہا۔

"تب پھر ہمیں حرکت میں آ جانا چاہیے۔" یہ کہتے ہی

انسپکٹر جمشید نے ایک بھرپور مکا کلاشوف کی کن پٹی پر رسید کر دیا۔ وہ تیورا کر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ انسپکٹر جمشید اسے ایک کمرے میں گھسیٹ لے گئے۔ اور برق رفتاری سے اس کا لباس اتار کر پہن لیا۔

"آؤ بھئی جلدی کرو۔ مسٹر لامے را۔ ہم مسٹر کلاشوف کو اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں۔ آپ کسی کو کچھ نہ بتایئے گا۔ اس طرح آپ محفوظ رہیں گے۔"

"اچھی بات ہے۔" لامے را نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

انسپکٹر جمشید کو اچانک کوئی خیال آیا۔ وہ جلدی سے باہر نکلے۔ باہر ایک پولیس آفیسر موجود تھا، انھوں نے یک دم کلاشوف کی آواز میں کہا:

"جہاز سے جو قیدی لائے گئے تھے۔ انھیں فوراً یہاں لے آؤ۔"

"او کے سر۔" اس نے کہا اور مڑ گیا۔

وہ اندر آ گئے اور انتظار کرنے لگے۔ بیس منٹ بعد جہاز کے سب لوگ وہاں پہنچ گئے۔ باہر موجود پولیس آفیسر کو بھی اندر بلا لیا گیا اور اسے بھی بے بس کر دیا گیا۔

اب وہ سب وہاں سے نکل کر محل کے گیٹ کے

ساتھ اندر کھڑی ویگن میں بیٹھ گئے۔ کلاشوف کو بھی ڈال لیا گیا۔ انسپکٹر جمشید نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ اور جب وہ دروازہ کھول کر باہر نکل رہے تھے تو سامنے سے پولیس کی گاڑیاں آ رہی تھیں۔ پہلی گاڑی کے ڈرائیور کی نظر ویگن کے ڈرائیور پر پڑی تو اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ وہ فوراً کلاشوف کی آواز میں بولے:

"جلدی سے پورے علاقے کو گھیرے میں لے لو۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی وہ نکلے چلے گئے اور پھر رفتار بڑھاتے گئے۔ دو تین چوراہوں پر انھیں روکنے کی کوشش کی گئی، لیکن پھر ان کی وردی پر نظر پڑتے ہی ہاتھ نیچے گر گئے۔

"ہم۔ کہاں۔ جا رہے ہیں؟" مکھن بڑبڑایا۔

"ایک نامعلوم منزل کی طرف۔ کیوں کہ نامعلوم منزلوں کی طرف جانا ہماری گھٹی میں پڑا ہے۔" فاروق نے کہا۔

"ایک تو ہر چیز ہماری گھٹی میں نکل آتی ہے۔" فرحت نے جل کر کہا۔

"گھٹی میں ہی کیا۔ اور نہ جانے کس کس چیز میں

نکل آتی ہے ۔ اور ان چیزوں میں سے محاورے بھی
اُبل پڑتے ہیں ۔"

"مارے گئے ۔ آگے پھر چیکنگ ہے ۔" انسپکٹر جمشید کی
کی آواز سنائی دی ۔

"روکو مت جمشید ۔ آگے چلتے رہو اور ہارن مسلسل دیتے
رہو ۔" خان رحمان نے گھبرا کر کہا ۔

"ہاں ! یہی کرنا ہوگا ۔" انھوں نے کہا اور رفتار
تیز کر دی ۔

ہارن مسلسل بجنے لگا ۔

بہت سے لوگوں نے اِدھر اُدھر ہو کر انھیں راستا
دے دیا ۔ وہ ایک طرف سے ویگن نکال کر بالکل
آگے لے گئے ۔ عین اس جگہ جہاں چیکنگ ہو رہی تھی ۔
ادھر مسلسل ہارن نے چیکنگ کرنے والوں کو اپنی طرف
متوجہ کر لیا تھا اور وہ بہت پریشان ہو کر رہ گئے
تھے ۔

چیکنگ کرنے والے جلدی سے ویگن کی ڈرائیونگ
سیٹ کی طرف لپکے ۔ ایسے میں انسپکٹر جمشید کلاشوف کی
آواز میں چلائے :

"بے وقوفو ۔ راستا دے دو ۔ ورنہ میں ان کا سُراغ

کبھی نہ پا سکوں گا ۔"

ان الفاظ میں نہ جانے کیا تھا ۔ وہ بانس یک دم
اُوپر اُٹھ گیا ۔ جس کے ذریعے ٹریفک کو روکا گیا
تھا ۔

اور ان کی ویگن تیر کی طرح آگے نکل گئی ۔

آگے بھی، پیچھے بھی

چند لمحے تک خاموشی طاری رہی، سڑک تیزی سے پیچھے جاتی نظر آ رہی تھی، آخر انسپکٹر جمشید کے منہ سے نکلا:

"ہم جا تو رہے ہیں، لیکن یہ معلوم نہیں کہ اس سڑک پر ہم کس طرف جائیں گے — خیر فی الحال کسی ایسی جگہ پہنچنا چاہیے جہاں ہم بیٹھ کر مشورہ کر سکیں اور کلاشوف سے دو دو باتیں کر سکیں۔"

"کیا آپ کا خیال ہے کہ اس سے ایٹمی پلانٹ کا پتا اگلوا لیں گے؟"

"ہاں کیوں نہیں — ہمیں امید تو ہر حال میں رکھنی ہو گی۔" انسپکٹر کامران مرزا مسکرائے۔

"ارے — وحت تیرے کی۔" محمود نے جھلا کر اپنی ران پر ہاتھ مارا۔ ساتھ ہی اس نے برا سا منہ بنایا۔

"یہاں وحت تیرے کی کیا ضرورت پیش آ گئی — کوئی

وجہ تو دور دور تک نظر نہیں آ رہی۔" فاروق نے حیران ہو کر کہا۔

"میری آنکھوں سے دیکھو۔" محمود نے بھنا کر کہا۔

"لاؤ نکال دو۔" فاروق نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

"کیا نکال دو۔" محمود جل کر بولا۔

"آنکھیں اور کیا — خود ہی تو کہہ رہے ہو، میری آنکھوں سے دیکھو۔" فاروق شوخ انداز میں بولا۔

"آنکھیں نکالنے کا کیا ہے — وہ تو محاورۃً بھی نکالی جا سکتی ہیں۔" آفتاب مسکرایا۔

"صرف نکالی ہی نہیں جا سکتیں — دکھائی بھی جا سکتی ہیں۔" مکھن ہنسا۔

"کہیں تم لوگ آنکھوں ہی آنکھوں میں لڑنا نہ شروع کر دینا۔" آصف گھبرا کر بولا۔

"یوں لگتا ہے جیسے اس ویگن کی دیواروں کی آنکھیں بھی ہمیں گھورنے لگی ہیں۔" شوکی نے منہ بنایا۔

"دیکھا فرحت — محمود جو کہنا چاہتا تھا — اسے یہ لوگ بالکل بھول گئے — یہ ہے ان کے ایک جگہ جمع ہونے کی برکت۔" فرزانہ نے تلملا کر کہا۔

"ہاں! دیکھ چکی ہوں اور اگر تم نے یاد نہ دلایا ہوتا

تو شاید محمود کو بھی اپنی بات کی طرف لوٹنے کا خیال نہ رہتا۔"

"محمود۔ ان کے خاموش ہونے کا انتظار نہ کرو۔ ورنہ تم وہ بات کبھی بھی نہیں بتا سکو گے۔ لہٰذا تم وہ بات صرف مجھے بتا دو۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

اسی وقت کلاشوف کے منہ سے ایک کراہ نکلی۔ اور اس نے کروٹ لی۔ دوسرے ہی لمحے اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ وہ خوف زدہ آواز میں بولا:

"م۔ میں کہاں ہوں؟"

"ویگن میں۔" اخلاق نے فوراً کہا۔

"ہم۔ ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

"پپ۔ پتا نہیں۔" اشفاق بولا۔

"یہ کیا بات ہوئی۔" کلاشوف غرّایا۔

"آپ کی طرف نہ ہوتی ہو گی کوئی بات۔ ہماری طرف تو یہ بات ہی بات ہے۔" مکھن نے مسکرا کہا۔

"دماغ تو نہیں چل گیا۔" اس نے جھلا کر کہا۔

"ہمارا نہیں۔ تمہارا۔"

"دیکھو۔ سیدھی طرح بتا دو۔ ورنہ بہت بُری طرح پیش آؤں گا۔"

"بہت بُری طرح تو پیش آ چکے آپ۔ اب تو ہماری باری ہے بُری طرح پیش آنے کی۔"

"کک۔ کیا مطلب۔" اس نے پریشان ہو کر کہا۔

"ایک نظر باہر ڈالو۔ کھڑکی میں سے۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"ہاں بس۔ صرف ایک نظر۔ اگر دوسری نظر باہر ڈالی تو بہت غلط بات ہو گی۔" فاروق بولا۔

"فاروق چپ رہو۔" خان رحمان نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔

اسی وقت کلاشوف اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور کھڑکی میں سے باہر دیکھا۔ ویگن اس وقت ایک بہت چوڑی سڑک سے گزر رہی تھی۔ دونوں طرف بڑی بڑی عمارتیں تھیں۔

"کیا کہنا چاہتے ہو۔" اس نے اُلجھن کے عالم میں کہا۔

"تم نے دیکھ ہی لیا۔ ہم کہاں سے گزر رہے ہیں۔"

"ہاں۔ یہ برجال روڈ ہے۔ جو شہر سے باہر چلی جاتی ہے اور پہاڑوں تک جا کر ختم ہوتی ہے۔ تو پھر۔ اس سے کیا۔" اس کے لہجے میں بلا کی حیرت تھی۔

"شکریہ مسٹر کلاشوف۔" انسپکٹر کامران مرزا مسکرائے۔

"شکریہ کس بات کا ادا کر رہے ہو۔"

"اس بات کا۔ کہ ہمیں یہی معلوم کرنا تھا۔ یہ سڑک کس طرف جاتی ہے۔"

"اور تم شہر سے باہر جا کر کیا کرو گے۔"

"تم سے دو دو باتیں کریں گے۔ ایٹمی پلانٹ کا پتا معلوم کریں گے۔"

"غلط فہمی ہے تمھاری۔ تمھارے فرشتے تو کیا۔ تمھاری آیندہ نسلوں کے فرشتے بھی ایٹمی پلانٹ تک نہیں پہنچ سکتے۔ ہم نے اس کی حفاظت کا عجیب و غریب انتظام کر رکھا ہے، یوں سمجھ لو۔ تمام راستے بند ہیں۔ بالکل بند۔"

"بند راستوں کو کھولنا ہمارا بہت پرانا مشغلہ ہے۔ آپ فکر نہ کریں مسٹر کلاشوف۔" محمود نے سنجیدہ انداز میں کہا۔

"تم دیکھ ہی لو گے۔" اس نے کندھے اچکائے۔ اب وہ ویگن کے فرش پر بیٹھ گیا تھا۔

"اچھی بات ہے۔ ضرور دیکھ لیں گے۔ یہاں آئے کس لیے ہیں۔ دیکھنے کے لیے۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"اوہو۔ محمود۔ وہ بات تو رہ گئی۔ جس کے یاد آنے پر تم نے دحت تیرے کی کہا تھا۔" فرزانہ چونکی۔

"ہاں واقعی۔ چلو محمود جلدی بتاؤ۔" خان رحمان بولے۔

"ابھی نہیں۔ پہلے میں مسٹر کلاشوف کے کانوں میں انگلیاں دے لوں۔ مسٹر کلاشوف کیا آپ مجھے اجازت دیں گے۔ اپنے کان میں انگلیاں ٹھونسنے کی۔" شوکی بولا۔

"کیا مطلب؟" وہ جھلا کر شوکی کی طرف مڑا۔

"ذرا ہم پرائیویٹ باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ اور نہیں چاہتے کہ آپ بھی سُن لیں۔"

"تو پھر مجھے نیچے اُتار دو۔" کلاشوف نے بُرا سا منہ بنایا۔

"ترکیب زور دار ہے۔ کیوں صاحبان۔ کیا خیال ہے۔" آفتاب بولا۔

"ہم انھیں نیچے ضرور اُتاریں گے، لیکن یہاں نہیں۔ آگے چل کر۔ جہاں ہم بھی نیچے اُتریں گے۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"بہت مناسب ترکیب ہے۔"

"محمود۔ تم نے ابھی تک بتایا نہیں۔ کیا بات یاد آئی تھی؟"

"وہ۔ وہ بات۔ ارے۔" محمود نے گھبرا کر کہا۔

"کیوں۔ کیا ہوا۔ وہ بات کاٹ تو نہیں گئی۔"

"نن - نہیں - مم - میں بھول گیا - کیا کہنا چاہتا تھا" اس نے گڑبڑا کر کہا۔

"کیا !!!" وہ ایک ساتھ بولے۔

"یہ تو بہت بُرا ہوا - کیا خبر - وہ کتنی اہم بات تھی" انسپکٹر کامران مرزا بڑبڑائے۔

"فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں - میں بتا دیتی ہوں" فرزانہ نے مسکرا کر کہا۔

"کیا مطلب - کیا وہ بات محمود کے ذہن سے پھسل کر تمھارے ذہن میں آگئی ہے" فاروق کے لہجے میں بلا کی حیرت تھی۔

"یار کہیں فرزانہ بھی نہ بھول جائے" آصف نے گھبرا کر کہا۔

"اچھی بات ہے - فرزانہ اس سے پہلے کہ تم بھی بھول جاؤ - مہربانی فرما کر بتا دو - وہ کیا بات ہے"

"محمود ہمیں اس کیڑے کے بارے میں یاد دلانا چاہتا تھا"

"کیڑا -" انسپکٹر کامران مرزا کے منہ سے نکلا۔

"کیسا کیڑا بھئی" اگلی طرف سے انسپکٹر جمشید بولے۔

"بہت ہی عجیب و غریب اور شان دار کیڑا - جو ایک جھاڑی پر رہتا ہے - اور اس جھاڑی سے جدا ہونا پسند نہیں کرتا"

"ہمیں اس سے کیا" انسپکٹر کامران مرزا نے منہ بنایا۔

"محمود - فرزانہ - فضول باتوں میں وقت ضائع نہ کیا کرو" انسپکٹر جمشید بولے۔

"لیکن ابا جان - وہ کیڑا بہت اہم تھا - انکل منور علی خان سے پوچھ لیں" آفتاب جلدی سے بولا۔

"کیا مطلب؟" وہ منور علی خان کی طرف مڑے۔

اور وہ انھیں اس کیڑے کے بارے میں بتانے لگے۔

"اوہ - اوہ" انسپکٹر کامران مرزا اور انسپکٹر جمشید کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"پہاڑی سلسلہ شروع ہو گیا ہے - میں سڑک سے اتر رہا ہوں - کیا خیال ہے؟" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ٹھیک ہے" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

سڑک سے بہت دور چٹانوں کے درمیان گھری ایک جگہ پہنچ کر انھوں نے ویگن روک دی:

"اُتریے مسٹر کلاشوف ہمارا پہلا سٹاپ آگیا ہے" فاروق نے شوخ لہجے میں کہا۔

وہ سب نیچے اُترے - کلاشوف کے چہرے پر اب خوف سوار تھا:

"بہتر تو یہی ہو گا مسٹر - کہ آپ اینٹی پلانٹ کا پتا

بتا دیں۔"

" خوش فہمی میں مبتلا ہو ، میں ہرگز نہیں بتا سکتا۔"

" ابھی ابھی ایک کیڑے کا ذکر ہم کر رہے تھے۔ اس قسم کے کیڑے یہاں کس طرف پائے جاتے ہیں؟"

" مجھے یہ بھی معلوم نہیں۔" اس نے بھنّا کر کہا۔

" معلوم نہیں یا بتانا نہیں چاہتے۔" خان رحمان نے اسے گھورا۔

" جو تم سمجھ لو۔"

" یہ حضرت ایسے نہیں بتائیں گے۔ ہم بھی زیادہ وقت ان پر صرف نہیں کر سکتے۔ بہت جلد اس کے ماتحتوں کو معلوم ہونے والا ہے کہ ان کے چیف کے ساتھ کیا گزری۔ لہٰذا خان رحمان۔ اس کے دل کا نشانہ لے لو۔ میں دس تک گنوں گا۔ میرے نو کہنے تک اگر یہ بول پڑا اور کچھ بتانے پر آمادگی ظاہر کی تو ٹھیک ہے ، ورنہ میرے دس کہتے ہی تم گولی چلا دو گے۔"

" اچھی بات ہے جمشید۔ میں یہی کروں گا۔" وہ بولے۔

" تو پھر تیار ہو جاؤ۔"

خان رحمان کلاشوف کو ایک طرف لے گئے۔ اسے کھڑا کر کے خود پیچھے ہٹ گئے۔ اور پھر پستول جیب سے نکال کر

اس کے دل کا نشانہ لے لیا:

" میں تیار ہوں۔" وہ بولے۔

" مسٹر کلاشوف۔ اپنی زندگی اور موت کا فیصلہ کر لو۔"

" موت۔ اور صرف موت۔" اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔

" شاید تم نہیں جانتے۔ موت کس قدر بھیانک چیز ہے۔"

" ہو گی۔ ایک دن آکر رہے گی۔"

" اچھی بات ہے۔ ہمیں بھی ایٹمی پلانٹ کا پتا ضرور چلانا ہے۔ تم بتاؤ تو۔ نہ بتاؤ تو بھی۔ ایک۔ دو۔ تین۔" وہ کہتے چلے گئے۔ کلاشوف کے چہرے پر زلزلے کے آثار نمودار ہو گئے۔ اس کا بدن کانپنے لگا۔

" کانپ رہے ہو مسٹر کلاشوف۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

" ہاں! موت واقعی بہت ہولناک چیز ہے ، لیکن میں پھر بھی موت ہی قبول کروں گا۔"

" تمھاری مرضی۔" انسپکٹر جمشید نے کندھے اچکائے اور بولے:

" چار پانچ چھے سات۔ آٹھ نو۔"

نو کہہ کر وہ ایک لمحے کے لیے رُکے۔ کلاشوف نے آنکھیں بند کر لیں۔ گویا وہ کچھ بتانے پر آمادہ نہیں ہوا تھا۔ آخر انھوں نے کہا:

"دس !" اور اس کے ساتھ ہی فائر ہوا۔ کلاشوف کے منہ سے ایک دل دوز چیخ نکلی۔ اس کا جسم دھڑام سے گرا اور تڑپنے لگا۔ جلد ہی اس نے دم توڑ دیا۔

چند لمحے تک وہ ساکت کھڑے اس کے مُردہ جسم کو دیکھتے رہے۔

"ہمارے پاس وقت نہیں تھا۔ ورنہ راز اگلوانے کے بے شمار طریقے ہو سکتے تھے۔" کامران مرزا بڑبڑائے۔

"چلیے خیر۔ ایک بڑا دشمن اور کم ہوا۔"

"اس کیڑے نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔

"خاص طور پر اس لیے بھی کہ جب سے ہم یہاں آئے ہیں۔ رونل کی صورت نظر نہیں آئی۔ نہ شیلاک کی۔ بس ایک ریوٹا ہمارے مقابلے پر ضرور آئی تھی اور ماری گئی۔"

"اس کا مطلب ہے۔ وہ ایک ایسی جگہ موجود ہیں۔ جہاں اس قسم کے کیڑے ہیں۔"

"ہو نہ ہو۔ اسی طرف ایٹمی پلانٹ موجود ہے۔" فرزانہ نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

"سوال یہ ہے کہ ہم اس جگہ کے بارے میں کس طرح معلوم کریں۔"

"ظاہر ہے۔ یہاں کے کسی باشندے سے ہی معلوم کیا جا سکتا ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اور اس سلسلے میں آپ کی وردی کام آئے گی۔ ہمیں سڑک کی طرف جانا ہو گا اور مسافروں کو اس ساحل پر پہنچانا ہے۔ جہاں سے ہم رُخصت کے وقت انہیں لے جا سکیں۔"

"ہاں! یہ ٹھیک ہے۔ آؤ چلیں۔"

وُہ ویگن میں بیٹھ گئے۔ پہلے مسافروں کو ساحل تک پہنچایا گیا، انھیں ہدایات دی گئیں۔ سڑک پہاڑیوں تک پہنچ کر یوں کر ختم ہو گئی تھی، اس لیے اب وُہ پھر شہر کا رُخ کرنے پر مجبور تھے۔ انسپکٹر جمشید نے ویگن آندھی اور طوفان کی رفتار پر چھوڑ دی۔ یہاں تک کہ آبادی کے آثار نظر آنے لگے، پھر جُوں ہی ایک پُرانا سا مکان نظر آیا۔ انھوں نے ویگن روک دی۔

"آپ سب لوگ ویگن میں بیٹھے رہیں۔ میں اُتر کر معلوم کروں گا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اچھی بات ہے۔" خان رحمان نے کہا۔

وُہ نیچے اُترے، دروازے پر دستک دی۔ جلد ہی ایک ادھیڑ عمر آدمی نے دروازہ کھول دیا۔ لیکن جوں ہی اس کی نظر ان پر پڑی۔ بُری طرح اُچھلا، آنکھیں باہر کو

اُبل پڑیں۔

"آ۔ آ۔ م۔ میں۔" اس کے منہ سے کوئی مکمل لفظ نہ نکل سکا۔

"ہاں! یہ میں ہوں۔ ایک مہم پر نکلا ہوا ہوں۔ بہت ہی اہم مہم پر۔ آپ سے کچھ کام ہے۔" انھوں نے نرم آواز میں کہا۔

"مم۔ مجھ سے؟"

"ہاں! آپ سے۔"

"تشریف لائیے۔" اس نے پریشان آواز میں کہا۔

انھوں نے ایک نظر ویگن پر ڈالی اور پھر گھر میں گھس گئے۔ ادھیڑ عمر آدمی اسے ڈرائنگ روم میں لے آیا۔ یہاں ریڈیو موجود تھا اور اس سے کھڑ کھڑاہٹ کی آواز اُٹھ رہی تھی۔ انھوں نے ریڈیو کی طرف دیکھا۔ تو وہ فوراً بولا:

"حکومت کے اعلان کے مطابق سب لوگ ریڈیو آن کیے بیٹھے ہیں۔ اور یہ سب ان غیر مُلکی جاسوسوں کی وجہ سے ہو رہا ہے، نہ جانے کم بخت کہاں جا چھپے ہیں۔"

"فکر نہ کریں۔ میرے سوال کا جواب دیں۔ ہمارے شہر میں ایک ایسی جگہ ہے۔ جہاں سیاہ رنگ کے کنکھجورے کی قسم کے کیڑے پائے جاتے ہیں۔ یہ کیڑے ایک قسم کی

جھاڑی سے چمٹے رہتے ہیں۔"

"جی۔ بھلا یہ بات میں کس طرح بتا سکتا ہوں۔ یہ تو کوئی ماہر حشرات الارض ہی بتا سکے گا۔"

"ہاں! یہ بات بھی ٹھیک ہے۔ آپ کسی ماہر حشرات الارض کا نام اور پتا بتا سکتے ہیں؟"

"یہ۔ یہ آپ مجھ سے پوچھ رہے ہیں؟" اس کے لہجے میں بلا کی حیرت تھی۔

انسپکٹر جمشید کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ انھوں نے فوراً کہا:

"شاید آج میرا دماغ چل گیا ہے۔ اچھا جناب شکریہ۔" یہ کہہ کر وہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"کک کوئی بات نہیں جناب۔"

وہ باہر نکل آئے۔ ادھیڑ عمر آدمی بھی دروازے تک آیا۔ جب تک ویگن چل نہ پڑی۔ وہ دروازے میں ہی کھڑا رہا۔ پھر جلدی سے مُڑا۔ دروازہ اندر سے بند کیا اور اندر پہنچ کر فون پر جُھک گیا۔ اس نے تین زیرو ڈائل کیے اور گھبراہٹ کے عالم میں بولا:

"ہیلو۔ ابھی ابھی غیر مُلکی جاسوسوں کی ویگن لونا روڈ سے شہر کی طرف گئی ہے۔ وہ لوگ کسی ماہر حشرات الارض

سے ملنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ان میں سے ایک کے جسم پر مسٹر کلاشوف کی وردی ہے۔ مسٹر کلاشوف ان کے ساتھ نظر نہیں آسکے۔" یہ کہتے ہی اس نے ریسیور رکھ دیا۔

انسپکٹر جمشید ویگن میں آکر بیٹھ گئے۔

"معلوم ہوتا ہے، کام نہیں بنا۔"

"ہاں! ہمیں کسی ماہر حشرات الارض سے ملنا پڑے گا۔ ان کیڑوں کی جگہ کے بارے میں بس وہ ہمیں بتا سکے گا، عام شہریوں کو بھلا یہ بات کیسے معلوم ہو سکتی ہے کہ یہاں کس علاقے میں اس قسم کے کیڑے مل سکتے ہیں۔" وہ بولے۔

"ہوں۔ لیکن ہمیں ماہر حشرات الارض کے بارے میں کس طرح معلوم ہو سکے گا؟"

"ٹیلی فون ڈائریکٹری کے ذریعے۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں کی فہرست میں دیکھ سکتے ہیں۔" انھوں نے جواب دیا۔

"اوہ ہاں۔ تب تو آپ کسی پبلک فون بوتھ سے ڈائریکٹری اٹھا لیں۔" شوکی نے فوراً کہا۔

"یہ کام تم کرو گے۔" محمود نے مسکرا کر کہا۔

"مم۔ میں۔ یعنی کہ میں۔ یہ کیا بات ہوئی۔"

"تو یہ کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔ کمال ہے۔" فاروق

بولا۔

اسی وقت انسپکٹر جمشید نے ویگن روک دی۔ انھوں نے ان کی آواز سنی:

"سڑک کے کنارے ایک پبلک فون بوتھ موجود ہے۔ جاؤ شوکی ڈائریکٹری اٹھا لاؤ۔"

"اگر کسی نے مجھے ایسا کرتے دیکھ لیا تو؟" اس نے گھبرا کر کہا۔

"کوئی تمھیں دیکھے ہی کیوں۔ ذرا مہارت دکھاؤ نا۔" آفتاب نے منہ بنایا۔

"اچھ۔ چھا۔" اس نے کہا اور نیچے اتر گیا۔

ایک منٹ بعد وہ لوٹا تو اس کے ہاتھ میں ڈائریکٹری تھی، اس نے کانپتی آواز میں کہا:

"میرا خیال ہے۔ ہمیں یہ ویگن چھوڑ دینی چاہیے۔"

"کیوں۔ کیا بات ہے؟" انسپکٹر کامران مرزا نے الجھن کے عالم میں کہا۔

"بوتھ کے ساتھ دو پولیس والے کھڑے ہیں۔ میں نے انھیں ویگن کو بہت تیز نظروں سے گھورتے دیکھا ہے۔ کہیں ان لوگوں کو یہ بات معلوم تو نہیں ہو گئی کہ ہم ایک ویگن میں فرار ہوئے ہیں۔"

"اوہ! ہو سکتا ہے - لامے راسے انھوں نے اگلوا لیا ہو یا خود اس نے بتا دیا ہو"

"اور مزے کی بات یہ ہے کہ ویگن کا تعاقب شروع ہو گیا ہے، سبز رنگ کی ایک جیپ برابر فاصلے سے تعاقب کر رہی ہے" انسپکٹر جمشید بولے -

"تب تو یہ ویگن ہمارے لیے اور بھی خطرناک ہو گی" انسپکٹر کامران مرزا بولے -

"فکر نہ کریں - اس جیپ سے پیچھا چھڑانا میرا کام ہے" انسپکٹر جمشید نے کہا اور ویگن کی رفتار یک لخت بڑھا دی -

آن کی آن میں جیپ غائب ہو گئی - لیکن تھوڑی دیر بعد پھر نظر آنے لگی - گویا اب جیپ کی رفتار بھی بے تحاشا بڑھ گئی تھی -

"وہ تو پھر نظر آنے لگی انکل" آفتاب بے چین ہو گیا -

"تو کیا ہوا - یہ لو"

انھوں نے کہا اور پھر پورے بریک لگا دیے -

ویگن سڑک کے بیچوں بیچ رک گئی - جیپ آندھی اور طوفان کی طرح بڑھی آ رہی تھی - اس کے ڈرائیور نے پہلے

تو پورے زور سے بریکیں لگائیں اور جب ایکسیڈنٹ ہوتا صاف نظر آیا تو جیپ کو تیزی سے بائیں طرف گھما دیا - اور یہی اس کی غلطی تھی - جیپ فوراً الٹ گئی - ادھر ویگن آگے بڑھ گئی :

"بھئی واہ - مزا آ گیا" فاروق چلا اٹھا -

پھر جوں ہی الٹی ہوئی جیپ نظروں سے اوجھل ہوئی - انھوں نے ویگن ایک دوسری سڑک پر ڈال دی - پھر سڑک سے اتار کر اسے درختوں کے درمیان آگے لیتے چلے گئے - جنگل میں کافی اندر جا کر وہ اتر پڑے -

"اب ہم جنگل ہی جنگل میں پیدل آگے بڑھیں گے" انھوں نے کہا -

وہ تیز تیز قدم اٹھانے لگے - بہت دور جا کر انھیں لکڑی کا ایک بڑا سا کیبن نظر آیا - وہ خالی پڑا تھا اور دروازہ بھی کھلا تھا - دور دور تک جب کوئی نظر نہ آیا تو وہ کیبن میں داخل ہو گئے - انسپکٹر جمشید اور انسپکٹر کامران مرزا ڈائریکٹری پر جھک گئے -

دس منٹ کی کوشش کے بعد انسپکٹر کامران مرزا بول اٹھے :

"یہ رہا ماہر حشرات الارض - پروفیسر ٹوباک - ۱۰ اگن روڈ"

سوال یہ ہے کہ ہم دس الگن روڈ تک کیسے پہنچیں — ہمارے بارے میں اب شہر کے بچے بچے کو معلوم ہو چکا ہے — سب کے سب ایک ٹیکسی میں سفر بھی نہیں کر سکتے۔"

"تو پھر میں اور آپ جا کر پروفیسر ٹوباک سے مل آتے ہیں — یہ لوگ ہمارا یہیں انتظار کریں گے۔"

"نہ جانے — الگن روڈ یہاں سے کتنی دُور ہو — آپ کو کتنی دُور تک پیدل سفر کرنا پڑے۔" فرزانہ نے بے چین ہو کر کہا۔

"اس کے سوا ہمارے پاس راستا بھی کیا ہے فرزانہ۔" انسپکٹر جمشید نے کندھے اچکائے۔

"ہوں — جیسے آپ کی مرضی۔"

"تم لوگ پوری طرح چوکس رہنا — ہم جلد از جلد واپس آنے کی کوشش کریں گے۔"

"اچھی بات ہے — آپ فکر نہ کریں۔" محمود نے کہا۔

انسپکٹر جمشید نے کلاشوت کی وردی اُتار دی — اس کے نیچے اپنے کپڑے وُہ پہنے ہوئے ہی تھے — دونوں سڑک پر پہنچے اور تیز تیز قدم اُٹھانے لگے — آدھ گھنٹے تک چلنے کے بعد انھیں ایک ٹیکسی مل سکی — اندر بیٹھتے ہوئے انھوں نے کہا:

"الگن روڈ۔"

"بہت بہتر۔" اس نے کہا اور ٹیکسی آگے بڑھ گئی۔

ٹیکسی بیس منٹ تک تیزی سے چلتی رہی — اور پھر ڈرائیور نے ان سے کہا:

"الگن روڈ پر پہنچ گئے ہیں۔ کہاں اُترنا ہے؟"

"دس الگن روڈ۔"

"اچھا —" اس نے کہا اور پھر ایک منٹ بعد ٹیکسی رُک گئی۔

وُہ نیچے اُترے — ایک شان دار عمارت کے دروازے پر پروفیسر ٹوباک موٹے حروف میں لکھا تھا — انھوں نے بل ادا کیا پھر دروازے کی طرف بڑھے — ادھر اُدھر دیکھا — دُور دُور تک کوئی خطرے والی بات نظر نہ آئی — آخر انسپکٹر جمشید نے دستک دی — جلد ہی دروازہ کھلا اور ایک مُلازم کی صورت نظر آئی:

"جی — فرمائیے۔"

"شش شاید ہم نے غلط دروازے پر دستک دے دی — یہ پندرہ الگن روڈ نہیں ہے نا۔" انسپکٹر جمشید بول اُٹھے۔

"جج — جی ہاں — آپ غلط آ گئے — یہ دس نمبر ہے۔" اس نے منہ بنا کر کہا اور دروازہ بند کر لیا۔

دونوں وہاں سے آگے چل پڑے۔ اُن کے دِل تیزی سے دھڑک رہے تھے۔ جُوں ہی وُہ مین سڑک تک پہنچے۔ دس سُرخ کارکُن سٹین گنیں لیے کھڑے نظر آئے۔ نالیاں اُن کی طرف اُٹھی ہوئی تھیں۔ اُنھوں نے مُڑ کر دیکھا۔ پیچھے بھی دس نالیاں مَوجود تھیں ـــــ

بے آواز خاتمہ

"میرا خیال ہے، اب ہم آزاد ہیں۔" فاروق نے ان کے جانے کے بعد کہا۔

"وہ کیسے؟" آفتاب نے اسے گھورا۔

"بھئی کرنے کے لیے تو کوئی کام ہے نہیں۔ لہذا اپنی محفل کیوں نہ گرم کر لیں۔"

"نہیں بھئی۔ ہم ایسا نہیں کر سکیں گے۔ ہم سے ایک عدد غلطی ہو چکی ہے۔"

"وہ کیا؟" خان رحمان نے گھبرا کر کہا۔

"ہمیں انکل اور ابا جان کو تنہا ہی نہیں روانہ کر دینا چاہیے تھا۔ کم از کم ایک اور پارٹی ان سے قدرے فاصلے پر یہاں سے روانہ ہونی چاہیے تھی۔ تاکہ مشکل وقت میں ان کی مدد کر سکے۔"

"تو اس میں کیا مشکل ہے۔ انھیں گئے ابھی دیر ہی کتنی ہوئی ہے۔ ان کی منزل کے بارے میں بھی ہمیں

معلوم ہی ہے۔ ہم نہایت آسانی سے وہاں پہنچ سکتے ہیں۔"

"ہوں! لیکن سب نہیں جا سکتے۔" خان رحمان نے کہا۔

"ہاں۔ زیادہ سے زیادہ چار آدمی جا سکتے ہیں۔"

"سب سے پہلے میں اپنا نام پیش کرتا ہوں۔" خان رحمان بولے۔

"میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گا۔" محمود بولا۔

"تو پھر مجھے بھی ساتھ لے جائیں۔" آصف بولا۔

"اور میرے بارے میں کیا خیال ہے۔" منور علی خان مسکرائے۔

"نہیں بھئی۔ میں اس کی رائے نہیں دوں گا۔ آپ کا یہاں ہمارے ساتھ رہنا ضروری ہے۔" پروفیسر داؤد جلدی سے بولے۔

"میرا بھی یہی خیال ہے۔ آپ یہیں ٹھہریں۔ ہم شوکی کو ساتھ لے جاتے ہیں۔"

"ہم۔ مجھے۔" شوکی نے گھبرا کر کہا۔

"ہاں بھئی۔ ڈرنے کی ضرورت نہیں۔" محمود نے مسکرا کر کہا۔

"ن۔ نہیں۔ میں ڈر تو نہیں رہا۔" اس نے فوراً کہا۔

"تو پھر چلو۔ ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے۔"

وہ چاروں اللہ حافظ کر کے وہاں سے رخصت ہوئے۔ انھیں بھی بہت دیر تک سڑک پر پیدل چلنا پڑا۔ تب کہیں جا کر انھیں ایک ٹیکسی ملی۔ اس میں بیٹھ کر وہ دس الگن روڈ پہنچے۔ نیچے اتر کر بل ادا کیا۔ ٹیکسی کے جانے کے بعد خان رحمان بولے:

"اب کیا کریں۔ راستے میں تو وہ دونوں ہمیں کہیں نظر نہیں آ سکے۔"

"اس کا مطلب ہے۔ انھیں ٹیکسی جلدی مل گئی تھی، گویا اب وہ اس عمارت کے اندر ہیں اور پروفیسر ڈوباک سے بات کر رہے ہیں۔" محمود نے سوچ کے انداز میں کہا۔

"تب تو انھیں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ ہم انتظار کر لیتے ہیں۔" آصف بولا۔

وہ ذرا ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔ پھر پندرہ منٹ گزر گئے۔ انھوں نے پریشان ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"کہیں اندر کوئی گڑبڑ تو نہیں ہو گئی۔" شوکی بڑبڑایا۔

"ہوں! اب میں نہیں رک سکتا انکل۔" محمود نے بے چین ہو کر کہا۔

"تو پھر چلو۔" خان رحمان بولے۔

چاروں دروازے پر آئے۔ محمود نے دستک دی۔ جلد ہی دروازہ کھلا۔ اور ایک ملازم کی صورت نظر آئی:

"ہمیں پروفیسر ٹوباک سے ملنا ہے۔"

"کارڈ دے دیں۔" اس نے کہا۔

خان رحمان نے جلدی سے اپنا کارڈ اسے دے دیا۔ کارڈ لے کر وہ اندر چلا گیا۔ دو منٹ بعد اس کی واپسی ہوئی۔

"آئیے جناب۔"

وہ انھیں ساتھ لے کر اندر کی طرف چل پڑا۔

"کیا پروفیسر صاحب مصروف ہیں۔" محمود نے بے تابانہ انداز میں کہا۔

"ن۔نہیں تو۔" وہ بولا۔

اسی وقت وہ ایک کمرے میں داخل ہو گیا۔ پھر انھیں بٹھا کر باہر نکل گیا۔ جلد ہی قدموں کی چاپ سنائی دی اور چھوٹی سی ڈاڑھی والا ایک شخص اندر داخل ہوا۔

"پروفیسر ٹوباک۔ آپ سے مخاطب ہے۔ فرمائیے کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ آپ سرخ کارکن ہیں۔ اور سرخ کارکنوں کی فوری مدد کرنا ہر شہری کا فرض ہے۔"

"شکریہ ڈاکٹر۔ پہلے تو یہ بتائیے۔ ان لوگوں کا کیا بنا؟" خان رحمان نے گول مول انداز میں کہا۔

"وہ پکڑے گئے۔"

"بھئی واہ۔ پھر تو مزا آگیا۔ ہم آپ سے ایک کیڑے کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔"

"ضرور ضرور، کیوں نہیں۔ فرمائیے۔"

"ایک کیڑا ہے۔ سیاہ رنگ کا ہوتا ہے۔ کنکھجورے جیسا ہوتا ہے۔ اس کے بارے میں آپ کچھ بتا سکتے ہیں۔"

"کیا وہ کسی خاص قسم کی جھاڑی پر رہتا ہے۔"

"جی ہاں۔ بالکل۔"

"اس قسم کے کیڑے اور جھاڑیاں ہمارے ملک کے شمال مغرب میں پہاڑوں کے درمیان پائے جاتے ہیں۔ یہ بہت خطرناک ہوتے ہیں۔ لیکن آپ کیوں پوچھ رہے ہیں۔" اس نے کہا۔

"ہمیں ایک جگہ یہ کیڑا دکھائی دیا تھا۔ چونکہ پہلے کبھی ایسا کیڑا نہیں دیکھا تھا اس لیے معلومات حاصل کرنے چلے آئے۔ کیا یہ انسان کو ختم کر سکتا ہے۔"

"کمزور انسان اس کے کاٹے سے ختم بھی ہو سکتے ہیں۔ طاقت ور انسان بھی کئی ماہ کے لیے بستر پر تو لیٹ ہی جاتا ہے۔"

"بہت بہت شکریہ جناب۔ ان لوگوں کو کہاں لے جایا

گیا ہے۔" محمود نے سرسری لہجے میں کہا۔
"مجھے کیا معلوم۔" اس نے چونک کر کہا۔
"اچھا جناب۔ اب ہم چلتے ہیں۔"
"آپ نے کیڑا کہاں دیکھا تھا۔"
"ایک۔ ایک جزیرے پر۔"
اسی وقت ریڈیو پر آواز گونجنے لگی:
"عوام کو خبردار کیا جاتا ہے کہ ان خطرناک جاسوسوں میں سے سب سے زیادہ خطرناک دو جاسوسوں کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ باقی ابھی رہتے ہیں۔ پولیس بہت جلد انھیں بھی گرفتار کر لے گی۔ عوام ان کی طرف سے ہوشیار رہیں۔ ان لوگوں کے پاس سرخ کارکنوں کے کارڈ ہیں۔ لیکن دراصل یہ کارڈ ان کے نہیں ہیں۔ انھوں نے سرخ کارکنوں کو مار کر حاصل کیے ہیں۔ اگر کوئی اس قسم کا کارڈ پیش کرے تو یہ کارڈ پر لگی تصویر اور اس شخص کے چہرے کو غور سے دیکھ لیں۔ اعلان ختم ہوا۔"
پروفیسر ٹوباک اعلان سنتے ہی زور سے چونکا۔
"آپ اب اپنا کارڈ پھر دکھایئے ذرا۔"
"اب اس کی ضرورت نہیں۔ ہم تو دکھا بھی چکے اور

آپ سے معلومات بھی حاصل کر چکے۔ لہٰذا ہمیں اجازت دیں۔" آصف نے جلدی سے کہا۔
"نہیں۔ آپ کارڈ دکھائے بغیر نہیں جا سکتے۔ اب مجھے خفیہ پولیس والوں کو فوری طور پر یہ اطلاع دینا ہو گی کہ تم لوگ دراصل سیاہ کیڑوں کی وادی کے چکمہ میں ہو۔"
یہ کہتے ہی اس نے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ خان رحمان فوراً حرکت میں آئے اور اس کی ٹھوڑی پر ایک مکا دے مارا۔
"اے۔ خبردار" دروازے کی طرف سے ایک تیز آواز آئی۔ اور وہی ملازم جھپٹ کر اندر آیا۔ محمود اور آصف فوراً اس کی طرف پلٹے۔ دونوں کے مکے اس کے منہ پر ایک ساتھ لگے۔ وہ الٹ گیا۔
"سنبھالو بھئی شوکی اسے۔"
"م۔ میں سنبھالوں۔" اس نے بوکھلا کر کہا۔
"ہاں! اتنا طاقت ور نہیں ہے۔"
"اچھا۔" یہ کہ کر شوکی اس کی طرف بڑھا۔ اور وہ اٹھ چکا تھا۔ اس نے بھنا کر ایک لات شوکی کی طرف چلائی۔ وہ گھبرا کر نیچے بیٹھ گیا۔ ٹانگ اس کے اوپر

سے گزر گئی۔ اور ملازم اپنی ہی جھونک میں گرا۔ شوکی نے
چند قدم دور ہٹ کر اس پر چھلانگ لگائی۔ لیکن وہ
کروٹ بدل گیا۔ اور شوکی دھڑام سے گرا۔ تاہم جلدی
سے اٹھا اور دایاں پاؤں اس کے سر پر دے مارا۔ ملازم
جھلا کر اس کی طرف مڑا۔ اور دونوں ہاتھوں کی انگلیاں
اس کی آنکھوں کی طرف اچھال دیں۔ شوکی بوکھلا کر پیچھے
ہٹا اور ملازم اوندھے منہ گرا۔ اس کے بعد وہ نہ اُٹھ
سکا۔ اِدھر خان رحمان پروفیسر ڈوباک کے دم خم نکال
چکے تھے۔ اور اب تابڑ توڑ مُکّے اس پر برسا رہے تھے۔
جلد ہی وہ ساکت ہو گیا۔

"اب ان کا کیا کریں۔" خان رحمان اس سے الگ
ہٹتے ہوئے بولے۔

"یہ دونوں اس راز سے واقف ہو چکے ہیں کہ ہم
سیاہ کیڑوں کی وادی کے چکر میں ہیں۔ لہٰذا ہوش میں
آنے کے بعد یہ فوری طور پر رونل کے آدمیوں کو یہ
اطلاع دیں گے۔ اور یہ اطلاع ہمارے لیے بہت خطرناک
ہو گی۔ لہٰذا مجبوری ہے۔ ان دونوں کا خاتمہ ضروری ہے۔"

"اور خاتمہ بھی بے آواز۔" شوکی بولا۔

"ہوں ٹھیک ہے۔" خان رحمان نے رومال جیب

سے نکالا اور پروفیسر ڈوباک کی گردن کے گرد کس دیا۔ یہی سلوک
انھوں نے ملازم کے ساتھ کیا۔

تین منٹ بعد وہ وہاں سے باہر نکل رہے تھے۔ ان
کے علاوہ عمارت میں انھیں کوئی اور نظر نہیں آیا تھا۔

"باہر نکل کر رکنا نہیں ہے۔ بس چلتے رہیے گا۔" محمود
بولا۔

"لیکن اب کیا کیا جائے۔ انسپکٹر جمشید اور انسپکٹر کامران
مرزا تو گرفتار کر لیے گئے ہیں۔" خان رحمان فکرمندانہ لہجے
میں بولے۔

"سوچا جائے گا انکل۔ غور کیا جائے گا۔ پریشان نہ ہوں۔"

"تو پھر کیوں نہ ہم واپس چلیں اور باقی ساتھیوں کے
ساتھ مشورہ کر لیں۔"

"اس میں وقت ضائع ہو گا۔ ہم کیوں نہ ابا جان اور
انکل کو ساتھ لے کر وہاں چلیں۔ اب تو ہمیں کیڑوں کی
وادی کی سمت بھی معلوم ہو گئی ہے۔"

"ہمیں نہیں معلوم۔ انھیں کہاں لے جایا گیا ہے۔" شوکی
بڑبڑایا۔

"تو پھر سوچیں کوئی ترکیب۔ ترکیب کے بغیر کام نہیں
چلے گا۔"

"ہک ۔ کیسے سوچیں ۔ ترکیبیں سوچنے والیاں تو کیبن میں رہ گئیں۔"

"تت ۔ تو پھر ۔ کیا ہمیں واپس ہی جانا پڑے گا۔"

"بھئی پہلے ذہن پر زور تو دے لیں۔"

"ٹھیک ہے ۔ میں تھری زیرو پر فون کرتا ہوں۔" محمود بولا۔

"اس سے کیا ہو گا ۔ تم کیا کہو گے؟"

"میں کہوں گا ۔ ان کے چار اور ساتھی دس الگن روڈ پہنچ چکے ہیں۔"

"اور پھر ۔ پھر ہم کیا کریں گے۔" خان رحمان جلدی سے بولے۔

"ان کا تعاقب۔" آصف نے مسکرا کر کہا۔

"ہاں ، بالکل ۔ تعاقب کرتے ہوئے ہم وہاں پہنچ جائیں گے، جہاں ابا جان اور انکل کو لے جایا گیا ہے۔"

"لیکن کیسے ۔ تعاقب کیسے کیا جا سکے گا ۔ ہمارے پاس کوئی گاڑی تو ہے نہیں۔"

"تو پھر گاڑی حاصل کرنے کے لیے ہمیں پھر پروفیسر ٹوباک کی کوٹھی میں جانا پڑے گا ۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ہم اس کی کار میں تعاقب کریں۔"

"اور رات میں ہونے والی چیکنگ کا کیا کریں گے۔" شوکی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"اوہ ۔" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

چند لمحے وہ سوچ میں گم رہے ۔ پھر محمود نے کہا۔

"کچھ بھی ہو ۔ ہمیں فون کرنا ہی ہو گا۔" یہ کہہ کر وہ ایک پبلک فون بوتھ کی طرف بڑھ گیا ۔ اس نے تین بار زیرو گھمایا ۔ دوسری طرف سے فوراً ہی ایک آواز سنائی دی۔

"کیا آپ کوئی اطلاع دینا چاہتے ہیں۔"

"جی ہاں ۔ کچھ دیر پہلے چار آدمی دس الگن روڈ میں داخل ہوئے ہیں ۔ اندر گڑبڑ محسوس کی گئی ہے۔"

"بہت بہت شکریہ۔" دوسری طرف سے پرجوش انداز میں کہا گیا۔

محمود بھی ریسیور رکھ کر باہر نکل آیا۔

"انکل ۔ مجھے افسوس ہے۔" وہ چونک کر بولا۔

"اب ، آپ ہمارا ساتھ نہیں دے سکیں گے ۔ صرف ہم تینوں جائیں گے۔"

"وہ کیوں؟" انھوں نے حیران ہو کر کہا۔

"اس لیے کہ ہم پولیس گاڑیوں کی سیٹوں کے نیچے دبک کر جائیں گے ۔ چیکنگ سے بچنے کا اس سے بہتر کوئی

طریقہ نہیں۔"

"اوہ!" ان کے منہ سے نکلا۔

"اور چونکہ آپ سیٹ کے نیچے نہیں سما سکیں گے، اس لیے ہم آپ کو نہیں لے جا سکتے۔"

"لل۔ لیکن پھر۔ میں کیا کروں؟" انھوں نے بوکھلا کر کہا۔

"آپ دُور کھڑے رہ کر منظر دیکھتے رہیں اور جب ہم یہاں سے چلے جائیں تو آپ باقی ساتھیوں کے پاس پہنچ جائیں۔ سب لوگ وہیں ہمارا انتظار کریں۔"

"اچھی بات ہے۔ لیکن اس دوران ہم شمال مغربی سمت میں سفر کے بارے میں معلومات کیوں نہ حاصل کرنے کی کوشش کریں۔"

"دیکھ لیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ معاملہ الٹ پلٹ ہو جائے۔"

"اچھا۔ خیر دیکھا جائے گا۔"

"اب، آپ ہم سے الگ ہو جائیں۔ ہم بھی پروفیسر ٹوباک کے گھر کے آس پاس کوئی جگہ دیکھ لیں۔"

"ٹھیک ہے، میں سڑک کی طرف جاتا ہوں۔"

وہ الگ ہو گئے۔ ٹھیک دس منٹ بعد پولیس کی دو بڑی گاڑیاں آ کر رکیں۔ ان میں سے پولیس والے جلدی جلدی

اتر کر پروفیسر ٹوباک کی عمارت کی طرف بڑھے۔ پہلے انھوں نے عمارت کو گھیرے میں لیا اور پھر وہ اندر داخل ہوئے۔ محمود، آصف اور شوکی کی نظریں گاڑیوں پر تھیں۔ ان میں صرف ڈرائیور چھوڑے گئے تھے۔ گاڑیوں کے پچھلے حصے بالکل خالی پڑے تھے، لیکن پولیس والوں کو دیکھنے والے ارد گرد جمع ہو گئے تھے۔ اور ان کی موجودگی میں گاڑیوں کے اندر پہنچ کر سیٹوں کے نیچے چھپنا قریب قریب ناممکن ہو گیا تھا۔

"اب۔ اب کیا کریں؟" آصف نے پریشان ہو کر کہا۔

"مجبوری ہے۔ کیا کر سکتے ہیں؟" شوکی نے کندھے اُچکائے۔

"یوں تو کام نہیں چلے گا، کچھ نہ کچھ تو کرنا ہو گا۔" محمود نے منہ بنایا۔

"تو پھر بتاؤ نا۔ کیا کریں؟"

"ہم نے بڑی غلطی کی۔ فرزانہ یا فرحت کو ساتھ لے کر آنا چاہیے تھا۔ یہ بتانا دراصل ان کا کام ہے کہ اب کیا کریں۔ ان حالات میں کیا کریں وغیرہ۔" محمود بولا۔

"آ۔ آپ۔ یہ کام مجھ سے نہیں لے سکتے۔" شوکی نے ڈرے ڈرے انداز میں کہا۔

"کیا مطلب؟" دونوں چونکے۔

"ہم۔ میں ایک عدد ترکیب بتا سکتا ہوں۔"

"ارے تو کھڑے منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ بتاؤ۔" آصف بھنا اُٹھا۔

"ان حالات میں چوری چھپے کام نہیں چل سکتا۔ بے دھڑک ایک گاڑی کے پچھلے حصے میں داخل ہو جائیں۔ کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ سب یہ خیال کریں گے، ہم بھی پولیس والوں کے ساتھی ہیں۔"

"ہوں۔ بات تو ٹھیک ہے، لیکن سیٹوں کے نیچے چھپتے دیکھ کر تو اعتراض کیا ہی جائے گا۔" آصف بولا۔

"ایک بار اندر داخل ہو جائیں۔ پھر ان کی نظریں بچا کر سیٹوں کے نیچے جانا ذرا بھی مشکل نہیں ہوگا۔"

"میرا خیال ہے، یہ ترکیب ٹھیک ہی رہے گی۔" محمود بڑبڑایا۔

"گویا شوکی ہمارے لیے فرزانہ یا فرحت ثابت ہوا ہے۔" آصف ہنسا۔

"یہ۔ یہ غلط ہے۔" اس نے بُرا مان کر کہا۔

"اوہ ہاں۔ واقعی۔ خیر آؤ پھر ایسا ہی کریں۔"

وہ تیز تیز قدم اٹھاتے گاڑیوں کی طرف بڑھے۔ اور پھر ایک گاڑی کے پچھلے حصے میں سوار ہو گئے۔ اتنی احتیاط انھوں نے ضرور کی تھی کہ ڈرائیور کو پتا نہ چلے۔

دوسرا لمحہ حیران کن تھا۔ شوکی کی ترکیب بالکل کارگر ثابت ہوئی تھی۔ کسی نے بھی ان کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔ دیکھا بھی تھا تو سرسری انداز سے۔

"اور اب ترکیب کا دوسرا مرحلہ۔ یعنی نیچے چھپنا ہے۔" آصف بولا۔

"ہم میں سے دو کا چھپنا بہت آسان ہے۔ صرف تیسرے کا کام مشکل ہو گا۔" محمود نے پرجوش انداز میں کہا۔

"وہ کیسے؟"

"دو تیسرے کی اوٹ لے کر چھپ سکتے ہیں۔ تیسرے کو مہارت دکھانا ہو گی۔"

"ہوں۔ پھر کیا خیال ہے۔" آصف نے اُلجھن کے عالم میں کہا۔

"تم دونوں میری اوٹ لے کر کام کر گزرو۔ موقع ملتے ہی میں بھی تمھارے پاس پہنچ جاؤں گا اور اگر موقع نہ مل سکا تو نیچے اُتر جاؤں گا۔ اس صورت میں تم دونوں کو ان کے ہیڈ کوارٹر تک سفر کرنا ہو گا۔"

"ارے باپ رے۔ ہم دونوں کو۔" شوکی نے گھبرا کر کہا۔

"اس میں ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔" آصف نے

بڑا سا منہ بنایا۔

"ڈ- ڈر- کون کم بخت رہا ہے۔" شوکی ہکلایا۔

"اچھا اچھا- وقت ضائع نہیں کیا جا سکتا- آؤ۔" آصف نے کہا اور محمود کے جسم کی اوٹ لیتے ہوئے نیچے لیٹ گیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ سیٹ کے نیچے لڑھک گیا۔ شوکی نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا۔

عین اسی وقت ایک کرخت آواز نے انہیں چونکا دیا:

"اے- تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

محمود نے بوکھلا کر گاڑی کے دروازے کی طرف دیکھا۔ اور پھر اس کی سٹی گم ہو گئی- دروازے میں ڈرائیور موجود تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول بھی تھا۔

"میں- میں- وہ- جی- میں کیا بتاؤں۔" محمود ہکلانے لگا۔

"کیا مطلب سب باہر نکلیں- کون ہو تم؟"

"میں- جی ہاں- یہ لیجیے- باہر نکل آیا۔" محمود نے دل ہی دل میں خوش ہو کر کہا۔

"اوہو- تم تو ان غیر ملکی جاسوسوں کے ساتھی ہو۔" ڈرائیور نے خوش ہو کر کہا۔

"شاید نہیں جناب- یقیناً۔" محمود بولا۔

"اور گاڑی پر کیوں سوار ہوئے تھے۔

سیر کو جی چاہ رہا تھا۔" محمود نے کہا۔

"ہوں- آگے چلے آؤ- میرے ساتھ بیٹھو۔ میں تمہیں بہت اچھی طرح سیر کراؤں گا۔"

"شش- شکریہ جناب، آپ کتنے اچھے ہیں۔" محمود نے خوش ہو کر کہا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

"ابھی کیا ہے- ابھی تو میں تمہیں اور بھی اچھا لگوں گا۔" ڈرائیور ہنسا۔ اس نے پستول کی نالی محمود کی کمر سے لگا دی۔ اور اس کے ذریعے اسے آگے کی طرف دھکا دیا۔ پھر ڈرائیونگ سیٹ کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس کے بیٹھنے کے بعد خود بھی بیٹھ گیا۔

"تمہارے باقی ساتھی کہاں ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"کچھ آپ لوگوں کی قید میں ہیں۔" محمود نے بڑا سا منہ بنا کر کہا۔

"میں ان کی بات نہیں کر رہا۔" اس نے جل بھن کر کہا۔

"تو پھر- آپ کن کی بات کر رہے ہیں۔"

"جو باقی رہ گئے ہیں۔"

"ایک میں رہ گیا ہوں۔" محمود بولا۔

"بدتمیز- تمہیں بھی میں پکڑ چکا ہوں، اس لیے تم رہ نہیں گئے۔" اس نے بھنّا کر کہا۔

"اوہ ہاں! یہ بھی ٹھیک ہے۔" اس نے فوراً کہا۔

"تو پھر بتاؤ۔ باقی ساتھی کہاں ہیں؟"

"کوئی ادھر۔ کوئی اُدھر۔ کوئی یہاں۔ کوئی وہاں۔" محمود نے جلدی سے کہا۔

"دیکھو۔ میں بہت بُری طرح پیش آؤں گا۔" وہ غرّایا۔

"کیا واقعی۔ ذرا پیش آ کر دکھائیں تو۔" محمود نے خوش ہو کر کہا۔

"شاید تم پاگل ہو۔"

"میرے بارے میں آپ کچھ بھی خیال کر سکتے ہیں جناب۔ میں برا نہیں مانوں گا۔" محمود بولا۔

"میں سمجھ گیا۔ تم یوں نہیں مانو گے۔"

"چلیے۔ یہ اور اچھی بات ہے کہ آپ خود ہی سمجھ گئے۔ مجھے کچھ سمجھانا نہیں پڑا۔"

اس وقت بھاری قدموں کی آواز سنائی دی۔ اور پھر پولیس والے دونوں گاڑیوں میں بیٹھنے لگے۔ ایک آفیسر ان کی طرف آیا اور پھر چونک کر بولا۔

"یہ۔ یہ کون ہے؟"

"ان کا ایک ساتھی۔"

"یہ کہاں تھا؟" اس نے حیران ہو کر کہا۔

"یہیں تھا۔ آس پاس گھوم رہا تھا۔ میں نے تاڑ لیا اور پکڑ کر یہاں بٹھا لیا۔" اس نے شیخی بگھاری۔

"بہت خوب۔ یہ کام کیا ہے تم نے۔" یہ کہہ کر آفیسر بھی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اب محمود ان دونوں کے درمیان میں تھا۔

"تو تم لوگوں نے ٹوباک اور اس کے ملازم کو مار ڈالا؟"

"اوہو۔ کیا وہ دونوں بالکل مر گئے؟" محمود نے بوکھلا کر کہا۔

"بھئی نہیں۔ ایکٹنگ نہیں چلے گی۔ تمھارے باقی ساتھی کہاں ہیں؟"

"اِدھر اُدھر بکھر گئے ہیں۔ ایک آدمی سب کے بارے میں کس طرح بتائے کہ کہاں کہاں ہیں؟"

"خیر۔ فکر نہ کرو۔ سب پکڑے جائیں گے، ایک بھی نہیں رہے گا۔ پورے شہر میں تم لوگوں کے لیے جال بچھا دیا گیا ہے۔ تم اس جال سے بچ کر نہیں جا سکو گے۔"

"بہت بہتر۔ نہیں جائیں گے۔" محمود نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

گاڑیاں چل پڑیں۔ ٹوباک اور اس کے ملازم کی لاشیں انھوں نے اس گاڑی کے پچھلے حصے میں لاد لی تھیں۔ آصف اور شوکی لاشوں کے بالکل نزدیک لیٹے ہوئے تھے۔

اور لاشوں کی کھلی ہوئی آنکھیں انھیں گھورتی محسوس ہو رہی تھیں جیسے کہہ رہی ہوں:

"فکر نہ کرو۔ ہم تم سے نبٹ لیں گے۔"

ادھر آفیسر محمود سے کہہ رہا تھا:

"تم میں سے تین ہمارے قابو میں آگئے۔ تم تینوں کے ذریعے باقی لوگوں کو گرفتار کرنا آسان ہو گا۔ چلے تھے ایٹمی پلانٹ تباہ کرنے۔ تم لوگ تو پلانٹ کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکے۔" اس کے لہجے میں بلا کی حقارت تھی۔

"اوہو۔ تو کیا۔ پلانٹ کی گرد بھی ہوتی ہے۔" محمود کے لہجے میں حیرت در آئی۔ اس کی آواز آصف اور شوکی کے کانوں میں بھی پہنچ گئی۔ دونوں بے ساختہ مسکرا دیے۔

آخر گاڑیاں رک گئیں۔ آفیسر نے سرد آواز میں کہا:

"آؤ چلیں۔ تمھارے دونوں ساتھی تمھیں دیکھ کر خوش ہوں گے۔"

"ہونا بھی چاہیے۔" محمود نے منہ بنا کر کہا۔

وہ ایک عمارت میں داخل ہوئے۔ کئی برآمدے مڑنے کے بعد ایک کمرے میں اسے لے جایا گیا۔ دوسرے ہی لمحے محمود دھک سے رہ گیا۔ اس کے سامنے ایک ہولناک منظر تھا۔ ابھی وہ خود کو سنبھال بھی نہیں پایا تھا، کہ اس نے

ایک آواز سنی:

"تم بھی آ پھنسے محمود۔"

آواز انسپکٹر جمشید کی تھی۔ وہ اور انسپکٹر کامران مرزا کمرے کی چھت سے بندھی زنجیروں سے الٹے لٹکے ہوئے تھے۔

"اسے بھی الٹا لٹکا دو۔ جب تک یہ اپنے باقی ساتھیوں کا پتا نہیں بتائیں گے۔ اسی طرح لٹکے رہیں گے۔" کمرے میں موجود ایک اور شخص نے کہا۔ محمود نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

وہ شیلاک تھا۔

وہ پھٹ گیا

"مسٹر شیلاک! یہ آپ ہیں۔" محمود کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ہاں کیوں۔ کیا ہوا۔ کیا میں نہیں ہو سکتا؟" اس نے بھی حیران ہو کر کہا۔

"جی۔ ہونے کو تو اس دنیا میں کیا نہیں ہو سکتا۔" محمود مسکرایا پھر جلدی سے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے بولا:

"لیکن یہ آپ کیا کر رہے ہیں، یہ سراغرسانی کا کون سا طریقہ ہے۔"

"تم لوگ باتوں کے بھوت نہیں ہو، لاتوں کے بھوت ہو۔"

"اوہو اچھا۔ یہ بات آج ہی معلوم ہوئی۔ مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ ہم بھوت بھی ہیں۔"

اتنے میں چار آدمی اسے جکڑ چکے تھے۔ دونوں پاؤں ملا کر زنجیر میں پرو دیے گئے اور پھر محمود اوپر اٹھنے لگا۔

"یہ کوئی اچھا سلوک نہیں کر رہے آپ ہم مہمانوں سے۔" محمود نے منہ بنا کر کہا۔

"اس سے بہتر سلوک اگر تم بتا سکو تو ہم اس پر عمل کریں گے۔"

"ہم سے کھلی فضا میں دو دو ہاتھ کر لو۔"

"وہ وقت بھی آ جائے گا۔ فکر نہ کرو۔"

اسی وقت ایک کھٹکا سا ہوا۔ شیلاک نے چونک کر نگرانوں کی طرف دیکھا۔

"یہ کیسی آواز تھی؟"

"ہم سمجھ نہیں سکے جناب۔"

"عمارت کے چاروں اطراف کا جائزہ لو۔ کہیں ان کے باقی ساتھی تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک تو نہیں پہنچ گئے۔"

"جج۔ جی بہتر۔"

ان میں سے چار کمرے سے نکل گئے۔ چار وہاں اب بھی موجود تھے۔ ان میں سے دو زنجیر کھینچ رہے تھے۔ اور باقی دو سٹین گنیں لیے کھڑے تھے۔ محمود کی ٹانگیں اوپر اٹھتی جا رہی تھیں۔

"مسٹر رونل نظر نہیں آئے۔" محمود بولا۔

"اپنی اپنی جگہ سبھی موجود ہیں۔ فکر نہ کرو۔"

"اوہ سمجھ گیا۔ وہ ایٹمی پلانٹ کے آس پاس موجود ہوں گے۔
بے چاری دیوتا تو دوسری دنیا پہنچ گئی۔"
شیلاک بے ساختہ مسکرا دیا۔ محمود نے حیران ہو کر
اس کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ الٹا تھا، لیکن پھر بھی وہ
اسے مسکراتے ہوئے دیکھ سکتا تھا۔
"اس مسکراہٹ کی وجہ سمجھ میں نہ آئی۔"
"اچھا ہی ہے۔ نہ سمجھو۔"
اسی وقت ایک بار پھر کھٹکا ہوا۔ اس وقت تک زنجیر
ایک ہک میں پھنسا دی گئی تھی۔
"ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔ تم دونوں فوراً چھت کی طرف
جاؤ۔" شیلاک نے ان سے کہا جو ابھی ابھی محمود کو الٹا لٹکا
کر فارغ ہوئے تھے۔
"او کے سر۔" انھوں نے کہا اور چلے گئے۔
"عمارت کے چاروں طرف پہرہ ہے۔ کوئی پرندہ بھی پر
نہیں مار سکتا، پھر تم لوگوں کا کوئی ساتھی کس طرح اندر
آ سکتا ہے۔ یا اوپر چھت پر پہنچ سکتا ہے۔" اس
نے الجھن کے عالم میں کہا۔
"یہ تو آپ اپنے نگرانوں سے پوچھیے جناب، ہمیں کیا
معلوم۔" محمود نے بُرا سا منہ بنایا۔

"ان سے تو اچھی طرح پوچھوں گا۔ فکر نہ کرو۔"
اسی وقت پہلے چار نگران اندر داخل ہوئے۔
"نہیں جناب۔ کہیں کوئی گڑبڑ نہیں ہے۔" ان میں سے
ایک نے کہا۔
"کیا کہ رہے ہو بھئی۔ کوئی گڑبڑ نہیں ہے۔ اور کھٹکا
ایک بار پھر ہو چکا ہے۔"
"جی کیا فرمایا۔ کھٹکا پھر ہو چکا ہے۔ اس کا مطلب
ہے، گڑبڑ چھت پر ہے۔ ٹھہریے جناب۔ ہم ذرا چھت
کو بھی دیکھ لیں۔" یہ کہ کر وہ جانے کے لیے مڑے۔
"میں چھت پر بھی دو آدمی بھیج چکا ہوں۔"
"اوہ اچھا۔" ان کے منہ سے نکلا۔
اسی وقت وہ دونوں بھی اندر داخل ہوئے۔
"نہیں جناب۔ چھت پر کچھ نہیں ہے۔"
"حیرت ہے۔ کہیں بھی کچھ نہیں ہے۔ اور دو مرتبہ آواز
پیدا ہو چکی ہے۔"
"ہو سکتا ہے جناب۔ ساتھ والی عمارت میں مرمت
کا کام ہو رہا ہو۔" ایک نگران نے پرخیال انداز
میں کہا۔
"اوہ ہاں۔ ضرور یہی بات ہے۔ خیر تو اب ذرا میں

ان سے دو دو باتیں کر لوں۔"

"مسٹر شیلاک۔ اب ہم تین ہو گئے ہیں۔ لہٰذا تین تین باتیں کریں۔" محمود بولا۔ اب وہ سخت تکلیف میں تھا لیکن ظاہر یہ کر رہا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

"اچھا تین ہی سہی۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ تمھارے سارے ساتھی گرفتار ہو جائیں۔ اس کے بعد کہیں جا کر ہم سکون کا سانس لے سکیں گے۔"

"ہماری طرف سے اجازت ہے جناب۔ آپ جتنے جی چاہے، سکون کے سانس لے لیں۔" محمود بولا۔

"اوٹ پٹانگ باتیں نہیں چلیں گی۔ یاد رکھو۔" وہ غرایا۔

اچانک تیسری بار پھر کھٹکا ہوا۔ اس بار شیلاک زور سے اچھلا:

"عقل کے اندھو۔ کہیں نہ کہیں گڑبڑ ضرور ہے۔ ٹھہرو۔ میں خود دیکھتا ہوں۔ آؤ میرے ساتھ۔ یہ تو اب بندھے ہوئے ہیں۔ ان کی طرف سے تو کوئی خطرہ ہے نہیں۔"

یہ کہا اور کمرے سے نکل گیا۔ اس کے ساتھی اس کے پیچھے باہر نکل گئے:

"خبردار محمود۔ یہ ایک چال ہے۔ ہمارا واسطہ رونل اور شیلاک جیسے شیطانی ذہن کے مالک لوگوں سے ہے۔"

انسپکٹر جمشید نے ان کے نکلتے ہی دبی آواز میں کہا۔

"جی۔ کیا مطلب۔ چال ہے۔" محمود حیران ہو کر بولا۔

"ہاں! اس بہانے انھوں نے ہمیں تنہا چھوڑ دیا ہے۔ تاکہ ہم اپنے ساتھیوں کے بارے میں بات چیت شروع کر دیں اور وہ کمرے میں پہلے سے نصب شدہ آلات کی مدد سے ہماری گفتگو سن لیں۔"

"اوہ۔ آپ کا شکریہ ابا جان۔" محمود کے منہ سے نکلا۔

تیس سیکنڈ بعد ہی دروازہ زوردار آواز کے ساتھ کھلا اور شیلاک کی صورت دکھائی دی۔ اس کے چہرے پر شدید جھنجلاہٹ کے آثار تھے:

"تم۔ تم میری امیدوں سے زیادہ چالاک ہو۔" اس نے بھنا کر کہا۔

"شکریہ مسٹر شیلاک۔" محمود مسکرایا۔

"خیر۔ میں نے بھی تمھارے ساتھیوں کا پتا تم سے نہ اگلوایا تو نام شیلاک نہیں۔"

"جی بہت بہتر۔ اس صورت میں آپ نے اپنا کیا نام تجویز کیا ہے۔" محمود نے شوخ لہجے میں کہا۔

"بدتمیز!" اس نے چلا کر کہا۔

"بہت خوب صورت نام ہے۔ بھئی واہ۔"

"انسپکٹر جمشید۔ اس سے کہو۔ خاموش رہے۔"

"ابھی تو صرف ایک یہاں آیا ہے۔ اگر خدانخواستہ سب یہاں آ کر بولنے لگے تو تمہارا کیا حال ہو گا۔" انسپکٹر کامران مرزا ہنسے۔

"حیرت ہے۔ اس قدر تکلیف کی حالت میں بھی تم لوگ مسکرا سکتے ہو۔"

"اس لیے کہ مسکرانا زندگی ہے۔ اپنے دین اور ملک کے لیے تکالیف برداشت کرنے میں بھی ایک لذت ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

عین اسی وقت کوئی بلند آواز میں چیخا:

"آگ۔ آگ۔ آگ۔"

وہ بوکھلا اٹھے۔ افراتفری کے عالم میں کمرے سے نکل بھاگے۔ شیلاک نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ ایک کمرے سے دھواں نکل رہا تھا۔

"ارے۔ یہ آگ کیسے لگ گئی۔" شیلاک کی آواز گونجی۔

"پپ۔ پتا نہیں جناب۔"

"چلو جلدی کرو۔ پانی ڈالو۔ اگر کنٹرول سے باہر ہونے لگے تو فائر بریگیڈ کو فون کرو۔"

"آگ صرف اسی کمرے میں لگی ہے۔ لہذا خطرے کی

کوئی بات نہیں۔" کسی نے کہا۔

ہل چل سی مچ گئی۔ پانی کی بالٹیاں بھر بھر کر لائی جانے لگیں۔ عمارت کے برآمدے میں دو آگ بجھانے والے آلے بھی موجود تھے۔ انھیں کمرے میں توڑ دیا گیا۔ چند منٹ کی کوشش کے بعد ہی آگ دبتی نظر آئی۔ شیلاک نے اطمینان کا سانس لیا اور تیزی سے قیدیوں کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ اچانک اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس پر قیامت ٹوٹ پڑی ہو۔ گرنے سے پہلے اس نے دیکھا۔ اس کی گردن پر پڑنے والا ہاتھ انسپکٹر جمشید کا تھا۔ وہ بھونچکا رہ گیا۔ اس وقت تک اس کی گردن پر دو ہاتھ اور لگ چکے تھے۔ دوسرے ہی لمحے وہ بے ہوش ہو گیا۔

عین اسی وقت بھاری قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ پھر کسی نے اندر داخل ہوتے ہوئے پُرجوش انداز میں کہا۔

"آگ بالکل بب۔ بب۔"

وہ جملہ مکمل نہ کر سکا۔ کیونکہ زنجیروں سے نکلنے والے اب فرش پر کھڑے تھے اور شیلاک فرش پر بے ہوش پڑا تھا۔ ابھی وہ سنبھلا بھی نہیں تھا کہ اس کے سات ساتھی بھی اندر آ گئے۔ اسی وقت ایک سرد آواز گونجی:

"تم سب ہاتھ اوپر اٹھا دو۔ ورنہ انجام شیلاک جیسا ہو گا۔"

انھوں نے چونک کر دیکھا۔ شیلاک کا پستول اب انسپکٹر کامران مرزا کے ہاتھ میں تھا۔ اور ان کی آنکھوں میں ایک ایسی چمک تھی کہ مارے خوف کے ان کے ہاتھ اوپر اٹھ گئے:

"بہت بہت شکریہ آصف۔ شوکی۔ لیکن تم یہاں تک کس طرح پہنچے؟" انسپکٹر جمشید بولے۔

"شکریے میں محمود کا حصہ برابر کا ہے انکل۔" آصف مسکرایا

"کیا مطلب؟"

اور آصف بتانے لگا کہ وہ کس طرح گاڑی کی سیٹوں کے نیچے چھپنے میں کامیاب ہوتے تھے، اس کے بعد اس نے بتایا:

"گاڑیاں یہ لوگ اندر تک لے آئے تھے۔ ہمیں جوں ہی موقع ملا، سیٹوں کے نیچے سے نکل کر ایک کمرے میں گھس گئے اور لگے سوچنے کہ کیا کریں۔ ہمیں اس کمرے کے بارے میں بھی معلوم نہیں تھا۔ ایسے میں شوکی نے ترکیب بتائی کہ ایک کمرے میں آگ لگا دی جائے۔ عمارت کے باقی کمرے خالی پڑے ہیں۔ چنانچہ ہم نے اس میں آگ لگا دی۔ جب سب لوگ ادھر متوجہ ہو گئے تو ہم یہاں پہنچ گئے۔"

"بہت خوب۔ جلدی کرو۔ ان سب کو باندھ دو۔ ان میں سے ہمیں صرف شیلاک کو اپنے ساتھ لے جانا ہے۔ اب وہی ہمیں ایٹمی پلانٹ تک لے جائے گا۔"

انھوں نے سب کے ہاتھ پیر باندھے۔ منہ کے اندر کپڑے ٹھونسے اور باہر نکل کر اس گاڑی میں بیٹھ گئے۔ اب انسپکٹر جمشید شیلاک کے کپڑے پہنے ہوئے تھے اور ان کی جیب میں شیلاک کے کاغذات موجود تھے۔

انھوں نے فوری طور پر اس کیبن کا رخ کیا۔ ابھی وہ کیبن کے نزدیک سڑک پر ہی پہنچے تھے کہ اپنے باقی ساتھیوں کو آتے دیکھا۔

"تم لوگ کہاں جا رہے ہو؟"

"انکل خان رحمان یہ خبر لے کر آئے تھے کہ محمود پھنس گیا ہے۔ شاید آصف اور شوکی بھی دیکھ لیے جائیں۔ اس لیے تجویز ٹھہری کہ ہم سب آپ سب کو چھڑانے چلتے ہیں۔" فاروق نے شوخ آواز میں کہا۔

"لیکن تم اس عمارت تک کس طرح پہنچ سکتے تھے جس میں ہم قید تھے؟" انسپکٹر جمشید نے منہ بنایا۔

"انکل خان رحمان پروفیسر ڈوباک کے گھر کے پاس سے ہی ادھر نہیں آئے۔ بلکہ یہ اس عمارت تک ہو کر آئے

ہیں؛ آفتاب نے بتایا۔

"وہ کیسے؟" انھوں نے پوچھا۔

"ایک ٹیکسی کے ذریعے۔ انھوں نے ٹیکسی ڈرائیور سے صرف اتنا کہا تھا کہ اس گاڑی کے پیچھے چلنا ہے۔ اس نے کوئی سوال نہیں کیا۔"

"ہوں۔ تم لوگ یہ سن کر خوش ہوں گے کہ ہم شیلاک کو پکڑ لائے ہیں۔"

"ارے۔ شیلاک شہر میں تھا۔ ہمارا تو خیال تھا کہ وہ ایٹمی پلانٹ میں ملے گا۔" فرزانہ نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

"اب ہم اس کی مدد سے ایٹمی پلانٹ تک جائیں گے۔"

انھوں نے شیلاک کو باہر نکالا۔ وہ اب ہوش میں آ چلا تھا۔ پھر جوں ہی پوری طرح ہوش میں آیا۔ چلا اٹھا:

"یہ۔ یہ تم مجھے کہاں لے آئے؟"

"یہ ہمارا عارضی ہیڈ کوارٹر ہے۔"

"یہ۔ لکڑی کا کیبن؟" اس کے لہجے میں بلا کی حیرت تھی۔

"ہاں کیوں۔ لکڑی کا کیبن کیا ہیڈ کوارٹر نہیں ہو سکتا۔" مسکرا دیا۔

"تت۔ تم کیا چاہتے ہو۔" شیلاک ہڑبڑا کر کھڑا ہو گیا۔

"یوں کام نہیں چلے گا مسٹر شیلاک۔ اطمینان سے بیٹھ جاؤ۔ ہم معلوم کر چکے ہیں کہ ایٹمی پلانٹ شمال مغربی پہاڑیوں کے درمیان کہیں ہے۔ تم ہمیں وہاں تک لے چلو گے اور بس۔"

"ناممکن۔" اس نے جھلا کر کہا۔

"کیا ناممکن ہے۔" انسپکٹر جمشید غرائے۔

"میں تمھیں وہاں تک نہیں لے جا سکتا۔ اسے لکھ لو۔"

"لکھ بعد میں لیں گے۔ پہلے تم لے چلو۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"ادھر دیکھو۔ اب ہم میں سے ہر ایک کے پاس ایک ایک پستول موجود ہے اور تم ہم سب کی زد پر ہو۔ انکار کی صورت میں جسم چھلنی ہو جائے گا۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"تم چھلنی کی بات کرتے ہو۔" شیلاک نے برا سا منہ بنایا۔

"تمھارے خیال میں کیا ہمیں جھرنے کی بات کرنی چاہیے۔" آفتاب بولا۔

"چھلنی تو پھر ایک مکمل چیز ہوتی ہے۔ تم تو میرے جسم کے ٹکڑے گن نہیں سکو گے۔" اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"کک۔ کیا مطلب؟"

ہیں: آفتاب نے بتایا۔

"وہ کیسے؟" انھوں نے پوچھا۔

"ایک ٹیکسی کے ذریعے۔ انھوں نے ٹیکسی ڈرائیور سے صرف اتنا کہا تھا کہ اس گاڑی کے پیچھے چلنا ہے۔ اس نے کوئی سوال نہیں کیا۔"

"ہوں۔ تم لوگ یہ سن کر خوش ہوں گے کہ ہم شیلاک کو پکڑ لائے ہیں۔"

"ارے۔ شیلاک شہر میں تھا۔ ہمارا تو خیال تھا کہ وہ اٹیمی پلانٹ میں ملے گا۔" فرزانہ نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

"اب ہم اس کی مدد سے اٹیمی پلانٹ تک جائیں گے۔"

انھوں نے شیلاک کو باہر نکالا۔ وہ اب ہوش میں آ چلا تھا۔ پھر جوں ہی پوری طرح ہوش میں آیا۔ چلا اٹھا:

"یہ۔ یہ تم مجھے کہاں لے آئے؟"

"یہ ہمارا عارضی ہیڈ کوارٹر ہے۔"

"یہ۔ لکڑی کا کیبن؟" اس کے لہجے میں بلا کی حیرت تھی۔

"ہاں کیوں۔ لکڑی کا کیبن کیا ہیڈ کوارٹر نہیں ہو سکتا؟" مسکرا دیا۔

"تت۔ تم کیا چاہتے ہو؟" شیلاک بھڑک کر کھڑا ہو گیا۔

"یوں کام نہیں چلے گا مسٹر شیلاک۔ اطمینان سے بیٹھ جاؤ۔ ہم معلوم کر چکے ہیں کہ اٹیمی پلانٹ شمال مغربی پہاڑیوں کے درمیان کہیں ہے۔ تم ہمیں وہاں تک لے چلو گے اور بس۔"

"ناممکن۔" اس نے بھنا کر کہا۔

"کیا ناممکن ہے۔" انسپکٹر جمشید غرائے۔

"میں تمہیں وہاں تک نہیں لے جا سکتا۔ اسے لکھ لو۔"

"لکھ بعد میں لیں گے۔ پہلے تم لے چلو۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"ادھر دیکھو۔ اب ہم میں سے ہر ایک کے پاس ایک ایک پستول موجود ہے اور تم ہم سب کی زد پر ہو۔ انکار کی صورت میں جسم چھلنی ہو جائے گا۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"تم چھلنی کی بات کرتے ہو۔" شیلاک نے برا سا منہ بنایا۔

"تمھارے خیال میں کیا ہمیں بھرنے کی بات کرنی چاہیے۔" آفتاب بولا۔

"چھلنی تو پھر ایک مکمل چیز ہوتی ہے۔ تم تو میرے جسم کے ٹکڑے گن نہیں سکو گے۔" اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"کک۔ کیا مطلب؟"

"میں پھٹنے والا ہوں۔ ابھی ایک دھماکا ہو گا۔ اور میں پھٹ جاؤں گا۔ میرا جسم ہزاروں ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے گا۔ تم انھیں ایک جگہ جمع بھی نہیں کر سکو گے۔"

"بھئی کیوں مذاق کر رہے ہو۔ تم غبارے نہیں ہو۔" شوکی نے بے یقینی کے عالم میں کہا۔

"اچھا تو پھر یہ لو۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی ایک زور دار دھماکا ہوا۔ ان کے قدم اُکھڑ گئے۔ وہ اِدھر اُدھر گر گئے۔ خون آلود ٹکڑے ان کے جسموں سے ٹکرائے اور وہ لرز کر رہ گئے۔ شیلاک اب وہاں نہیں تھا۔ جہاں وہ ابھی چند سیکنڈ پہلے کھڑا باتیں کر رہا تھا۔

"یہ۔ یہ کیا ہوا ابا جان۔" فرزانہ نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔

"اس نے کوئی کیپسول نما بم منہ میں رکھا ہوا تھا۔ اسے چبانے کی دیر تھی کہ وہ پھٹ گیا۔" انسپکٹر جمشید نے بوکھلائی آواز میں کہا۔

"افسوس۔ ہم اس سے بھی مدد نہ لے سکیں۔"

"پروا۔ نہیں۔ اب ہمارا سفر اس گاڑی میں شروع ہو گا۔ ابھی کسی کو اس عمارت میں ہونے والے واقعے کی

خبر نہیں ملی ہو گی۔ اس سے پہلے کہ خبر ہو۔ ہم شہر سے نکل چکے ہوں گے۔ بس شہر سے ہمیں ایک نقشہ حاصل کرنا ہے۔ اس کی مدد سے ہم شمال مغرب میں سفر جاری رکھیں گے۔"

"لیکن انکل۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہمیں اسی طرف سے آگے جانا ہو جہاں ہم موجود ہیں۔ اس صورت میں ہم شہر کی طرف کیوں جائیں۔"

"نقشہ ہمارے لیے بہت اہم ہے۔ خیر۔ میں اکیلا چلا جاتا ہوں۔ سب لوگ یہیں ٹھہریں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"نہیں جمشید۔ اکیلے نہیں۔ کم از کم مجھے ساتھ لے لو۔" خان رحمان نے کہا۔

"اچھی بات ہے۔ آؤ۔ اب انسپکٹر کامران مرزا ان سب کے ساتھ رہیں گے۔"

"ابا جان۔ آپ کے زخم کا کیا حال ہے۔"

"شاید وہ پھر کھل گیا ہے۔ کیونکہ اُلٹا لٹکنا پڑا ہے۔ تکلیف بہت بڑھ گئی ہے۔ خیر تم فکر نہ کرو۔ ہم کسی ڈاکٹر کو بھی ساتھ لے آئیں گے۔"

"اچھا اللہ حافظ۔" اُن سب نے ایک ساتھ کہا۔

"اللہ حافظ۔"

گاڑی تیزی سے مڑی اور اُن کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ شہر پہنچ کر نقشہ خریدنا ان کے لیے مشکل ثابت نہیں ہوا۔ ابھی تک شاید شہر میں ہیڈ کوارٹر سے ان کے فرار کی خبر نہیں پھیلی تھی۔

خان رحمان۔ اب ہمیں ایک ڈاکٹر کا بندوبست کرنا ہے۔ ہم مرہم پٹی بھی اپنے ہیڈ کوارٹر میں جا کر کرائیں گے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ہوں ٹھیک ہے۔ چلو۔" وہ بولے۔

دونوں کسی ڈاکٹر کے بورڈ کی تلاش میں نظریں دوڑاتے آگے بڑھتے چلے گئے۔ آخر ایک جگہ ایک ڈاکٹر کا کلینک نظر آ ہی گیا۔ وہ گاڑی سے اُتر کر اندر داخل ہوئے۔ ایک لیڈی سیکرٹری نے ان کا استقبال کیا۔

"کیا خدمت کر سکتے ہیں۔"

"ڈاکٹر صاحب کو ایک مریض کے لیے لے کر جانا ہے۔"

"کہیں جا کر مریض کو دیکھنے کے لیے ڈاکٹر کی فیس ایک ہزار روپے ہے۔" اس نے کہا۔

"ہم۔ ہم ادا کریں گے۔"

"فیس پہلے جمع کرانا پڑتی ہے۔"

"ضرور کیوں نہیں۔" انسپکٹر جمشید نے فوراً کہا۔ ان کے

پاس کرنسی نوٹ موجود ہی تھے۔ نکال کر گن دیے۔ جلدی لڑکی نے انھیں ڈاکٹر کے سامنے پیش کر دیا۔

"کیس کیا ہے؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"کیس عجیب و غریب سا ہے۔ وہاں چل کر ہی آپ درست اندازہ لگا سکیں گے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ہوں۔ ٹھیک ہے۔ گاڑی ہے نا۔ واپس بھی چھوڑ کر جانا ہو گا۔"

"آپ فکر نہ کریں۔" خان رحمان بولے۔

دس منٹ بعد ڈاکٹر ان کے ساتھ گاڑی میں سوار ہو چکا تھا اور وہ کیبن کی طرف اڑے جا رہے تھے۔ آخر وہ کیبن تک پہنچ گئے۔ سب لوگ انھیں دیکھ کر مطمئن ہو گئے۔

"یہ۔ یہ آپ لوگ کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ کیا آپ خانہ بدوش ہیں۔" ڈاکٹر نے پریشان ہو کر کہا۔

"اس میں کوئی شک نہیں جناب کہ ہم خانہ بدوش قسم کے آدمی ہیں۔" فاروق نے بُرا سا منہ بنایا۔

"ل۔ لیکن۔ خانہ بدوش لوگ بھی کسی ڈھنگ کی جگہ ڈیرا ڈالتے ہیں۔" ڈاکٹر بولا۔

"تو کیا جناب۔ آپ کے خیال میں یہ ڈھنگ کی جگہ

"تم کسی لمحے چپ بھی رہ سکتے ہو۔" محمود نے اسے گھورا۔

"ہاں۔ جب تھرمامیٹر منہ میں ہو۔" اس نے جواب دیا۔

ڈاکٹر نے انھیں ایسی نظروں سے گھورا جیسے وہ پاگل ہوں۔ یہ باتیں انھوں نے انگریزی میں کی تھیں۔

"ٹھہرو بھئی۔ پہلے ہمیں بات کر لینے دو۔" انسپکٹر کامران مرزا نے کہا اور پھر جیب سے پستول نکال کر ڈاکٹر سے بولے۔

ڈاکٹر صاحب۔ آپ فکر نہ کریں۔ ہم ان آدم خوروں سے نبٹنا جانتے ہیں۔ وہ ہمیں کیا بھونیں گے۔ ہم انھیں گولیوں سے بھون کر رکھ دیں گے۔ جلدی کریں اور ان کے زخم کو دیکھیں۔"

"کن کے زخم کو۔" ڈاکٹر کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ان کے زخم کو۔ جو آپ کو ساتھ لائے ہیں۔"

"ارے۔ یہ کیا بات ہوئی۔ یہ تو اپنے زخم پر پٹی وہیں کرا سکتے تھے۔ مجھے یہاں لانے کی کیا ضرورت تھی۔" اس نے الجھن کے عالم میں کہا۔

"بات دراصل یہ ہے جناب کہ ہم زیادہ دیر شہر میں نہیں ٹھہر سکتے تھے۔"

"کک۔ کیوں۔ کیا شہر میں زلزلہ آنے والا تھا۔"

نہیں ہے۔" محمود کے لہجے میں حیرت تھی۔

"بالکل نہیں جناب۔ اس طرف شہر کے لوگ ان کے بھی آنے کی جرأت نہیں کرتے۔" اس نے بتایا۔

"جی۔ وہ کیوں؟"

"اس لیے کہ یہ علاقہ حد درجے خطرناک ہے۔ کچھ خونخوار قسم کے قبیلے ان اطراف میں رہتے ہیں۔ وہ لوگوں کو پکڑ کر لے جاتے ہیں اور انھیں بھون کر کھا جاتے ہیں۔ خاص طور پر لڑکیوں کو۔"

"ارے باپ رے۔" فرحت نے گھبرا کر کہا۔

"کک۔ کیوں مذاق کر رہے ہیں جناب۔ اس دور میں اور آدم خور قبیلے۔" فرزانہ نے کانپتی آواز میں کہا۔

"یہ مذاق نہیں ہے۔ شہر میں کسی سے بھی پوچھ لو۔ تصدیق ہو جائے گی۔ میں یہاں نہیں ٹھہر سکتا۔ مریض کو یہاں سے لے چلو۔ شہر کی حدود شروع ہونے پر میں مریض کو دیکھ سکوں گا۔"

"ڈاکٹر صاحب۔ ڈرنے، گھبرانے اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" آفتاب نے فوراً کہا۔

"جی ہاں۔ ان سب کے لیے یہ اکیلا ہی کافی ہے۔" فاروق مسکرایا۔

"جی ہاں۔ بالکل یہی بات ہے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"لیکن ریڈیو اور ٹی وی پر تو کوئی اعلان نہیں ہوا۔ اخبارات میں بھی نہیں پڑھا۔"

"وہ زلزلہ ذرا خاص قسم کا زلزلہ ہے۔ اس کے بارے میں کسی کو پتا نہیں چلتا۔"

"اوہ!" اس نے پریشان ہو کر کہا۔

"ویسے ڈاکٹر۔ شمال مغرب کی طرف کون سا راستا جاتا ہے۔"

"شش۔ شمال مغرب۔ لگ۔ کیوں۔" اس نے کانپ کر کہا۔

"ہم اب شمال مغرب کی طرف سفر کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔"

"تت۔ تب۔ تب تم لوگوں کا دماغ ضرور خراب ہے۔" اس نے پُریقین لہجے میں کہا۔

"دد۔ دیکھیں جناب۔ سراسر الزام تو نہ لگائیں۔" شوکی بُرا مان گیا۔

"میں ٹھیک کہ رہا ہوں۔ شمال مغرب میں ہی تو وہ آدم خور رہتے ہیں۔ ان کی ایک پوری آبادی ہے۔"

"لیکن کیوں۔ اگر یہ باتیں آپ کو معلوم ہیں تو کیا حکام کو

معلوم نہیں ہوں گی۔ پولیس انھیں کیوں گرفتار نہیں کرتی۔"

"پولیس نے اکثر انہیں گرفتار کرنے کے لیے ان اطراف میں چھاپے مارے۔ لیکن ایک بار بھی کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ پورا کا پورا علاقہ چھان مارا۔ لیکن ایک کو بھی گرفتار نہیں کر سکی۔"

"آخر کیوں۔ کیا پولیس نے اس پر غور کیا۔"

"وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ وہ اِدھر اُدھر نکل جاتے ہیں۔ اور پولیس کے چلے جانے کے بعد پھر آ جاتے ہیں۔"

"تو گھیرا ڈالا جا سکتا ہے۔ وہ کسی طرف سے نکل کیوں جائیں۔"

"شمال مغرب کے ایک طرف پہاڑ ہیں۔ دوسری طرف سمندر ہے۔ آگے جا کر مکمل طور پر تاریک علاقہ ہے۔ پولیس کس طرح اتنے بڑے علاقے کو گھیرے میں لے سکتی ہے۔"

"تاریک علاقے سے آپ کی کیا مراد۔" فرزانہ نے چونک کر کہا۔

"دوسری طرف بہت گہری گہری کھائیاں ہیں۔ نوکیلی چٹانیں ہیں۔ چٹانوں پر کانٹوں دار درخت ہیں۔ کھائیوں میں عجیب و غریب گھاس اور دوسرے پودے اُگے ہیں۔ اس

جگہ کے نزدیک جانے کی تو کوئی ہمت کرتا ہی نہیں۔ دوسرا وہ سارا کا سارا علاقہ تاریکی میں ڈوبا نظر آتا ہے۔ شاید دھند اور کہُر کی وجہ سے یا پھر کوئی اور وجہ ہو گی۔ اور پولیس کا خیال ہے کہ آدم خور ان ہی کھائیوں میں کہیں جا چھپتے ہیں۔"

"ہُوں۔ اس تاریک وادی سے آگے کیا ہے؟"

"کوئی وہاں تک گیا ہو تو معلوم بھی ہو کہ آگے کیا ہے۔ لوگ باگ تو تاریک وادی سے بھی میلوں ادھر ہی رہ جاتے ہیں اور جب سے ادھر آدم خوروں کا عمل دخل شروع ہوا ہے، اس وقت سے تو کوئی ان اطراف کا رخ کرتا ہی نہیں۔ جس جگہ آپ لوگ موجود ہیں۔ یہاں تک بھی کوئی نہیں آتا۔"

"اوہ۔" ان کے منہ سے نکلا۔

"ارے۔ مگر۔ میں یہ سب باتیں آپ کو کیوں بتانے بیٹھ گیا۔ آپ تو مجھے یہاں پٹی کرانے لائے تھے۔ خیر لائیے میں پٹی کر دوں۔ زیادہ دیر تک یہاں رکنا مناسب نہیں۔"

"بہت بہت شکریہ ڈاکٹر صاحب۔" انسپکٹر جمشید نے خوش ہو کر کہا۔

ڈاکٹر ان کی پٹی کھولنے لگا اور پھر زور سے چونکا:

"یہ۔ یہ کیا۔ پٹی کے نیچے آپ کی جلد اور رنگ کی ہے اور۔" وہ جملہ مکمل نہ کر سکا۔

"یہ کوئی ایسی خاص بات نہیں۔ پہلے جس ڈاکٹر سے پٹی کرائی۔ اس نے بھی اس پر حیرت ظاہر کی تھی۔"

"اور کیا۔ وہ۔ ڈاکٹر کونڈا تھے۔" ڈاکٹر نے کانپتی آواز میں کہا۔

"آپ نے یہ اندازہ کس طرح لگا لیا۔"

اُف خدا۔ آپ۔ آپ لوگ تو وہ غیر ملکی جاسوس ہیں۔ جن کے بارے میں۔" اس نے پھر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ چہرے کا رنگ سفید پڑتا نظر آیا۔

"آپ نے درست اندازہ لگا لیا ڈاکٹر صاحب۔ اور آپ کو ایسا کرنا نہیں چاہیے تھا۔" فاروق نے منہ بنا کر کہا۔

"کک۔ کیسا؟" ڈاکٹر ہکلایا۔

"یہی۔ درست اندازہ لگانا۔"

"ڈاکٹر صاحب۔ فوراً اپنا کام شروع کریں۔ اب آپ میرے پستول کی زد پر ہیں۔" انسپکٹر کامران مرزا نے گویا اسے خبردار کیا۔

ڈاکٹر تھر تھر کانپتے ہاتھوں سے پٹی کرنے لگا۔ آخر اس نے اپنا کام مکمل کر لیا۔

"اب۔ اب مجھے اجازت دیں۔" اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ارے۔ کیا پیدل ہی جائیں گے ڈاکٹر۔"

"ہاں۔ مم۔ میں چلا جاؤں گا۔"

"نہیں بھئی۔ ہم آپ کو آپ کے کلینک پہنچا کر آئیں گے۔" خان رحمان بولے۔

"نن۔ نہیں۔ میں خود جاؤں گا۔"

"اب یہ مشکل ہے ڈاکٹر۔ آپ ہمارے بارے میں جان چکے ہیں۔ شہر پہنچتے ہی آپ پہلا کام یہ کام کریں گے کہ پولیس کو ہمارے بارے میں اطلاع دیں گے۔ کیوں۔ ٹھیک ہے نا۔"

"نن۔ نہیں۔ مم ایسا نہیں کروں گا۔ آپ یقین کریں۔"

"شکریہ۔ بہت مشکل۔ آپ اطلاع دیے بغیر نہیں رہیں گے۔" انسپکٹر جمشید نے بےچارگی کے عالم میں کہا۔

"تت۔ تو پھر۔ آپ لوگ کیا چاہتے ہیں۔"

"دنیا سے ایک روز سبھی کو جانا ہے۔ لہٰذا آپ آج ہی کیوں نہ چلے جائیں۔" انسپکٹر کامران مرزا نے کہا۔

"نہیں۔ نہیں۔ مجھ پر رحم کرو۔"

"تو پھر اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ۔ آپ ہمارے بارے میں کسی کو نہیں بتائیں گے۔"

"یہی تو مشکل ہے۔ میں کیا گارنٹی پیش کروں۔" اس نے کندھے اچکائے۔

"فرزانہ۔ فرحت۔ تم کوئی ترکیب بتا سکتی ہو۔" انسپکٹر جمشید ان کی طرف مڑے۔

"سب سے بہتر ترکیب تو یہی ہے کہ انھیں ختم کر دیا جائے۔ کیونکہ اس طرح نہ رہے گا بانس، نہ بجے گی بانسری۔" فرزانہ نے کہا۔

"اور دوسری ترکیب یہ ہے کہ انھیں باندھ کر یہیں ڈال دیا جائے۔" فرحت بولی۔

"اور واپسی پر ہم انھیں کھول دیں گے۔" فرزانہ نے کہا۔

"لیکن ہم نہ جانے کب واپس آئیں۔ کتنے دن بعد واپس آئیں۔ آئیں بھی کہ نہیں۔ اس صورت میں تو یہ بے چارے ہمارا انتظار ہی کرتے رہ جائیں گے۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"تمھارا دماغ تو ٹھیک ہے۔" آفتاب نے بھنا کر کہا۔

"کیوں۔ کیوں۔ خیر تو ہے۔" فاروق نے اسے گھورا۔

"اگر ہمیں واپسی میں دیر ہو گئی تو یہ زندہ کس طرح رہیں گے۔ بھوک پیاس سے مر جائیں گے۔"

"ہوں! وہ مارا۔" فرزانہ نے چٹکی بجائی۔

"پرانی بات ہے۔" محمود نے منہ بنایا۔

"ہم انھیں کچھ دُور تک اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ جب کافی آگے پہنچ جائیں گے، تو انھیں آزاد کر دیں گے اور یہ تیر کی طرح اپنے گھر کا رخ کریں گے۔"

"لیکن جا کر رپورٹ ضرور درج کرائیں گے اور پولیس ہمارا اس جگہ انتظار کرے گی، جب ہم واپس پہنچیں گے تو وہ نہایت آسانی سے ہمیں گرفتار کر لے گی۔" شوکی نے جل کر کہا۔

"تب پھر تم ہی بتاؤ۔ ان کا کیا کریں۔"

"ایک ترکیب یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ہم انہیں اپنے ساتھ ساتھ ہی رکھیں۔" اخلاق بول پڑا۔

"یہ کیا معقول ترکیب ہوئی۔" آصف نے جھلا کر کہا۔

"میں نے آج تک اتنی بے کار ترکیب کبھی کسی کے منہ سے نہیں سنی۔" فاروق نے بھی فوراً کہا۔

"مم۔ مجھے حیرت ہے۔ یہ کیا ہوا۔" فرزانہ نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

"اور میں بھی حیران ہوں۔ کہیں مارے حیرت کے مر نہ جاؤں۔"

"اور مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ تم دونوں کس بات پر حیران ہو رہی ہو۔" فاروق نے جل بھن کر کہا۔

"اس پر کہ میں اور فرحت تو ترکیب بتا نہیں سکیں اور اخلاق بھائی ایک نہایت معقول ترکیب بتا گئے۔"

"کک۔ کیا مطلب۔ معقول ترکیب۔" محمود ہکلایا۔

"ہاں! ان حالات میں یہ معقول ترین ترکیب ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ہم پر احسان کیا ہے۔ نیکی کی ہے۔ ہم انھیں مارنے کے حق میں نہیں ہیں۔ لیکن انھیں جانے کی اجازت دینے سے بھی مجبور ہیں۔ لہٰذا ان حالات میں اس کے سوا کیا کیا جا سکتا ہے کہ ہم انھیں بھی اپنے ساتھ لے چلیں۔"

"اوہ۔ تو۔ تو اخلاق تم دونوں کو مات دے گیا۔" فاروق نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

"ہمارے پاس کوئی مات وات نہیں ہے۔" آفتاب نے گھبرا کر کہا۔

"یہ طے ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب ہمارے ساتھ رہیں گے۔" انسپکٹر جمشید نے گویا فیصلہ سنایا۔

"نن۔ نہیں۔ میں آپ لوگوں کے ساتھ کس طرح جا سکتا ہوں۔ آپ۔ آپ تو آدم خوروں کی آبادی کا رخ کرنے

والے ہیں۔ اور وہ انسانوں کو آگ پر بھون کر کھا جاتے ہیں۔" ڈاکٹر نے چیخ کر کہا۔

"تو پھر۔ ہمیں گولی کا نشانہ بننا منظور کر لیں۔"

"یہ۔ یہ کک۔ کیسے ہو سکتا ہے۔" ڈاکٹر بولا۔

"اس میں کوئی مشکل نہیں۔ صرف ٹریگر دبانا ہوگا۔" خان رحمان بولے۔

"دیکھیں جناب۔ ہم بھی تو آخر جا رہے ہیں۔ آپ سے یہ وعدہ رہا کہ آدم خور پہلے ہمیں پکڑیں گے بعد میں آپ کو۔ یہ نہیں ہو گا۔ وہ آپ کو پکڑ لیں اور ہم ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہیں۔ ہم پر اعتماد کریں۔ آپ نے آج تک اپنی قوم کے ساتھ زندگی گزاری ہے۔ چند دن ہم مسلمانوں کے ساتھ گزاریں۔"

"یا موسیٰ۔ میں کیا کروں۔ میری مدد کر۔" اس نے آسمان کی طرف منہ اٹھا کر کہا۔

"آسمان کی طرف دیکھ رہے ہیں اور پکارتے ہیں موسیٰ علیہ السلام کو۔ ارے یہاں موسیٰ کے پروردگار کو پکارو۔ اللہ سے مدد مانگو۔ اس کے سوا کون مدد کر سکتا ہے۔"

"اللہ کو پکاروں۔" اس نے حیران ہو کر کہا۔

"ہاں! اس اللہ کو جس نے حضرت موسیٰ کو فرعون سے

بچایا تھا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"میں۔ میں نہیں سمجھ سکتا۔ مجھے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں۔ بہرحال میں۔ میں آپ لوگوں کے ساتھ چلوں گا۔"

"ویری گڈ۔ یہ ہوئی نا بات۔ آپ کا نام کیا ہے ڈاکٹر۔"

"ڈومی رو۔" اس نے کہا۔

"اور آپ اپنا بیگ بھی ساتھ رکھیں گے۔ تاکہ مرہم پٹی ہوتی رہے۔"

"ٹھیک ہے۔"

"اب ہمیں سب سے پہلے اس گاڑی کو ایسی جگہ کھڑا کرنا ہے کہ یہ آسانی سے نظر نہ آ سکے۔" انسپکٹر کامران مرزا نے کہا۔

"اور گاڑی میں جو کھانے پینے کا سامان ہم ساتھ لائے ہیں۔ وہ ہمیں ساتھ لے کر چلنا ہے۔" خان رحمان نے کہا۔

تھوڑی دیر بعد یہ چھوٹا سا قافلہ شمال مغرب کی طرف سفر شروع کر چکا تھا۔ انسپکٹر جمشید اور انسپکٹر کامران مرزا نقشے کو دیکھ کر بھی اطمینان کر چکے تھے کہ انھوں نے غلط سمت اختیار نہیں کی تھی۔ اور اب انھیں دھڑکا لگا تھا آدم خوروں کا۔ جن سے کسی آن بھی ملاقات ہو سکتی تھی۔

راستا حد درجے دشوار گزار تھا۔ دائیں بائیں سیکڑوں فٹ
گہری کھائیاں تھیں۔ راستا بھی ناہموار تھا۔ اور اس پر جگہ جگہ
خود رو پودے، جھاڑیاں اور خاردار درخت لگے تھے۔ لہٰذا
انھیں ایک ایک قدم پھونک پھونک کر رکھنا پڑ رہا
تھا۔ ایسے میں انھیں باتیں کرنے کا موقع مل گیا۔

"میرا خیال ہے۔ اب تو راوی ہمارے لیے باتیں ہی
باتیں لکھتا ہے۔" فاروق نے شوخ آواز میں کہا۔

"تو یوں کہو نا۔ باتوں کے میدان میں کود پڑنے کے
لیے تیار ہو۔" آفتاب بولا۔

"کوئی بات نہیں۔ ہم سب پیچھے نہیں رہیں گے۔" اس
نے فوراً کہا۔

"اس سے پہلے کہ تم لوگ کودنے کا کام شروع کرو۔ پہلے
میری ایک بات سن لو۔" انسپکٹر کامران مرزا ہنسے۔

"اور۔ وہ کیا انکل۔" محمود بولا۔

"ہم نے اب تک ظہر کی نماز ادا نہیں کی۔ وقت نکلا
جا رہا ہے۔"

"اوہ۔ ہاں۔ یہ تو خیال ہی نہیں رہا۔ شکریہ انکل۔ پہلے
نماز ہی ادا کر لیتے ہیں۔" فرزانہ بولی۔

"لیکن۔ ڈاکٹر ڈومی کا کیا کریں۔ یہ تو نماز پڑھیں گے نہیں۔"

"ہوں۔ انھیں تھوڑی دیر کے لیے باندھ دیتے ہیں۔ رسی
ہمارے پاس ہے ہی۔"

"تو پھر جلدی سے باندھیے۔ یہاں وضو کے لیے پانی
بھی نہیں مل سکتا۔ لہٰذا تیمّم کرنا ہو گا۔"

ڈاکٹر ڈومی کو باندھ کر انھوں نے تیمّم کیا اور نماز ادا
کی۔ فارغ ہو کر ڈاکٹر کو کھولا تو اس نے حیران ہو کر کہا۔

"یہ۔ یہ آپ لوگ کیا کر رہے تھے۔"

"اپنے اللّٰہ کی عبادت۔ اللّٰہ سے مدد مانگ رہے
تھے۔" منوّر علی خاں بولے۔

"کیا مانگ رہے تھے؟" اس نے حیران ہو کر کہا۔

"دُعا۔ مدد۔ ہر چیز۔ کیونکہ وہ ہر چیز کا مالک ہے۔ اسی
کے قبضے میں ہر چیز ہے۔ وہی اپنی ساری مخلوق کو عطا
فرماتا ہے۔" پروفیسر داؤد نے کہا۔

"آپ لوگ اس طرف سفر کیوں کر رہے ہیں۔ مقصد کیا
ہے؟" ڈاکٹر ڈومی نے اُلجھن کے عالم میں کہا۔

"مقصد تو شاید آپ کو معلوم ہی ہو گا۔"

"نن نہیں۔ ٹی وی اور ریڈیو پر آپ لوگوں کے بارے
میں خبردار ضرور کیا گیا ہے۔ یہ کسی کو نہیں بتایا گیا کہ آپ
لوگ ہمارے ملک کی طرف کیوں آئے ہیں۔"

"فکر نہ کریں۔ بہت جلد معلوم ہو جائے گا۔"

عین اسی وقت ایک تیر سنسناتا ہوا ان کے سروں پر سے گزر گیا۔

"آ۔ آ۔ آدم۔ خور۔" ڈاکٹر ڈومی رو نے کانپ کر کہا اور دھپ سے نیچے گر گیا۔

پھر کیڑا

وہ بھی نیچے لیٹ گئے۔ پھر سر اٹھا کر اس سمت میں دیکھا جس طرف سے تیر آیا تھا۔ لیکن نزدیک یا دُور کوئی دشمن کھڑا نظر نہیں آیا۔ سامنے خار دار جھاڑیاں بھی تھیں اور دو تین گھنے درخت بھی۔

"دشمن یا تو ان جھاڑیوں کے پیچھے ہے یا کسی درخت کی اوٹ میں۔" خان رحمان بڑبڑائے۔

"اور ان کے دوسری طرف جانے کا کوئی اور راستا نہیں ہے۔" انسپکٹر کامران مرزا بڑبڑائے۔

"خیر۔ دیکھتے ہیں۔ دشمن کیا قدم اٹھاتا ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"کیوں ابا جان۔ اس سے پہلے کہ دشمن کوئی قدم اُٹھائے کیوں نہ ہم اسے نشانہ بنا دیں۔" فرزانہ نے جلدی سے کہا۔

"کیسے۔ ہم نہیں جانتے۔ وہ کہاں ہے؟" وہ بولے۔

"وہ درمیان والے درخت کے اُوپر ہے۔ اس نے سبز کپڑے پہن رکھے ہیں، میں اس کی ایک جھلک دیکھ چکی ہوں۔"

"اوہو اچھا۔" انسپکٹر کامران مرزا کے منہ سے نکلا۔ ساتھ ہی ان کی نظریں درخت پر جم گئیں۔ پھر انسپکٹر کامران مرزا نے سوچ سمجھ کر ایک فائر کیا۔ دوسرے ہی لمحے ایک چیخ گونجی۔ درخت کے پتے کھڑکھڑائے اور ایک انسانی جسم دھڑام سے نیچے گرا۔

انھوں نے اب بھی اپنی جگہ سے حرکت نہ کی۔ پہلے درخت کا جائزہ لیا۔ اس پر ایک سے زیادہ آدمی بھی تو ہو سکتے تھے۔ پھر نیچے گرنے والے دشمن کا جائزہ لیا۔ وہ قبائلی باشندہ تھا۔ جسم پر ریڈ انڈینوں جیسا لباس تھا جو پرندوں کے پروں سے بنایا گیا تھا۔ بہت سے تیر اور کمان اس کے ارد گرد بکھر گئے تھے۔ اس کی کمر کے گرد ایک چمڑے کی پیٹی بھی تھی۔ اس میں ایک پستول اڑسا ہوا تھا۔ پیٹی میں گولیاں بھی لگی تھیں۔

انسپکٹر کامران مرزا نے درخت پر ایک اور فائر کیا، لیکن جواب میں کچھ بھی نہ ہوا۔ آخر وہ آگے بڑھے، تیر کمان اور پستول پر قبضہ کر لیا گیا۔

"اس کے پاس پستول اور چمڑے کی اس پیٹی کی موجودگی

سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ لوگ تو عام طور پر تیر کمان ہی اپنے پاس رکھتے ہیں اور سنا ہے، اس میں بہت ماہر ہوتے ہیں۔" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔

"ہوں! کہیں یہ شخص میک اپ میں تو نہیں ہے۔" فرزانہ نے خیال ظاہر کیا۔

"کیا مطلب۔ بھلا ایک ریڈ انڈین کو میک اپ کرنے کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"بھئی فاروق۔ اتنا بُرا منہ نہ بناؤ۔ ضرورت ہو سکتی ہے۔ کسی شخص کو ریڈ انڈین بننے کی ضرورت تو ہو سکتی ہے نا۔" سنور علی خان نے مسکرا کر کہا۔

"ہاں واقعی۔ بہت زور دار خیال ہے۔" یہ کہتے ہوئے انسپکٹر جمشید اس پر جھک گئے۔ اور پھر جلد ہی انھوں نے اس کے چہرے پر سے ایک سیاہ رنگ کی جھلی اتار پھینکی۔ اب اس کا رنگ بالکل صاف نکل آیا تھا۔

"ارے۔ یہ تو بنگالی ہے۔" کئی آوازیں اُبھریں۔

"اب میں یہ کہوں گا کہ ایک بنگالی کو ریڈ انڈین کا روپ دھارنے کی کیا ضرورت تھی۔" فاروق بولا۔

"ریڈ انڈین کا نہیں۔ آدم خور کا۔" ڈاکٹر ڈومی کی آواز نے ان سب کو چونکا دیا۔

سب اس کی طرف مڑے۔ انسپکٹر جمشید نے حیران ہو کر کہا۔

"آدم خور اس روپ میں ہوتے ہیں؟"

"جی ہاں؛ ان کا حلیہ شہر میں یہی مشہور ہے۔"

"لیکن یہ آدم خور نہیں۔ بیگالی ہے۔" انسپکٹر کامران مرزا نے الجھن کے عالم میں کہا۔

"تو کیا ہوا ابا جان۔ یہ بیگالی آدم خور تو ہو سکتا ہے۔" آفتاب نے فوراً کہا۔

"اوہ۔ بیگالی آدم خور۔" وہ بڑبڑائے۔

"خیر۔ ہمارا سفر نہیں رکے گا۔ ہم آگے بڑھیں گے۔ حیرت اس بات پر ہے کہ صرف ایک آدم خور یہاں کیا کر رہا تھا۔ اس کے پاس کوئی اور کیوں نظر نہیں آیا۔"

"ہو سکتا ہے یہ گھومتا پھرتا ادھر نکل آیا ہو۔ دور سے اس نے ہمیں آتے دیکھ لیا ہو اور درخت پر چڑھ گیا ہو۔" منور علی خان بولے۔

"ہاں! یہ بھی ممکن ہے اور اس صورت میں ان کا کوئی گروپ نزدیک ہی موجود ہو گا۔ گویا ہمیں خبردار ہو جانا چاہیے۔"

"ابا جان۔ خبردار ہونے کے ساتھ ساتھ اگر ہم ذرا

کھل کر ایک دوسرے سے بات چیت کر لیں تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں۔ کیونکہ جب سے ہماری ملاقات ہوئی ہے۔ ابھی تک باقاعدہ باتوں کا ڈنگل نہیں ہو سکا۔"

"کر لو بھئی۔ تم بھی اپنا کام کر لو۔ لیکن اتنا خیال رہے باتوں میں اس حد تک مگن نہ ہو جانا کہ ہم چاروں طرف سے گھر جائیں۔"

"جی بہتر۔ اس کا خیال ہم پہلے رکھیں گے اور باتیں بعد میں کریں گے۔" آفتاب نے فوراً کہا۔

"دوسری بات یہ انکل۔ کہ آپ لوگ تو ان باتوں میں شریک ہوں گے نہیں۔ لہٰذا اس کا خیال آپ لوگ کیوں نہ رکھیں۔" مکھن نے مشورہ دیا۔

"وہ تو خیر ہم کریں گے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"بھئی کم از کم ہیں، پروفیسر صاحب اور منور علی خان تو باتوں میں شرکت کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ہاں دونوں انسپکٹر صاحبان شاید حصہ نہ لیں۔" خان رحمان بولے۔

"چلیے انکل۔ ہماری طرف سے آپ کو پوری اجازت ہے۔"

"شکریہ۔ بہت بہت شکریہ۔" منور علی خان نے خوش

ہو کر کہا۔

"ہائیں۔ منور علی خان۔ تم تو بالکل بچوں کی طرح خوش ہو رہے ہو۔"

"صرف میں ہی نہیں۔ پروفیسر صاحب بھی۔" منور علی خان ہنس دیے۔ انھوں نے پروفیسر داؤد کی طرف دیکھا، وہ واقعی کھلے پڑ رہے تھے۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ان کے من میں تو لڈو پھوٹ رہے ہیں۔" فاروق مسکرایا۔

"بس۔ لڈو۔ بھئی کس چیز کا نام لے دیا۔ اب ہم یہاں لڈو کہاں سے لائیں۔" منور علی خان جلدی سے بولے۔

"تو ابا جان۔ یہاں لڈو کی کیا ضرورت پڑ گئی۔" فرحت کے لہجے میں بھلا کی حیرت تھی۔

"بھئی۔ نہ جانے کتنا عرصہ ہو گیا۔ جنگلوں میں بھٹکتے ہوئے۔ مٹھائی نام کی کوئی چیز کہاں ملی ہے کھانے کو۔" وہ بولے۔

"پھر تو آپ کی اللہ نے سن لی منور علی خان۔" انسپکٹر جمشید بول اٹھے۔

"لیجیے۔ کر چکے ہم تو باتیں۔ اب تو سبھی بڑے زور شور سے بات چیت میں شریک ہو گئے ہیں، اس قدر

کہ خود ہمیں باتیں کرنے کی مہلت نہیں مل رہی۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"انسپکٹر جمشید آپ نے کیا کہا۔ اللہ نے میری سن لی۔ لیکن مجھے تو یہاں لڈو یا مٹھائی دور دور تک نظر نہیں آ رہی۔" انھوں نے حیران ہو کر کہا۔

"وہ نظر آ بھی کیسے سکتی ہے۔ جب کہ کھانے پینے کی چیزوں والے تھیلوں میں ہے۔"

"کیا!!!" منور علی خان کے ساتھ دوسرے بھی شریک ہو گئے۔

"اُف۔ کس قدر غیر جاسوسی ہے۔" آفتاب نے فوراً کہا۔

"کیا چیز غیر جاسوسی ہے۔" شوکی نے حیران ہو کر کہا۔

"یہ کیا۔ جو ان سب کے منہ سے نکلا ہے۔ عام طور پر جب بھی ہمارے منہ سے "کیا" نکلتا ہے۔ وہ خالص جاسوسی قسم کا ہوتا ہے۔"

"چلو خیر۔ ایک مٹھائی قسم کا بھی سہی۔" مکھن ہنس کر بولا۔

"تب تو ہم پہلے مٹھائی کھائیں گے۔ پھر آگے بڑھیں گے۔" منور علی خان یک دم دھرنا مار کر بیٹھ گئے۔

"بھئی منور علی۔ تم تو بالکل بچے بن گئے ہو۔"

"جی کیا کروں۔ یہاں اور کچھ بن بھی تو نہیں سکتا۔"

"ثابت ہو گیا۔ آج بڑوں کی باتوں کا دنگل ہے۔ بچوں کی باتوں کا نہیں۔" فاروق نے گویا اعلان کیا۔

"بھئی وہ مٹھائی والا تھیلا کون سا ہے؟" منور علی خان نے کہا۔

"یہ رہا۔" انسپکٹر جمشید نے ہنس کر کہا اور تھیلا ان کے سامنے رکھ دیا۔ سامان انھوں نے مل جل کر اٹھا رکھا تھا۔ ہر کسی کے پاس کوئی نہ کوئی چیز تھی۔ صرف ڈاکٹر ڈومی خالی ہاتھ تھا۔

سب مٹھائی کے گرد جمع ہو گئے۔ البتہ مسٹر ڈومی الگ تھلگ کھڑا رہا۔

"مسٹر ڈومی۔ آپ مٹھائی نہیں کھائیں گے۔" انسپکٹر جمشید اس سے بولے۔

"آپ۔ آپ مجھے بھی اپنے ساتھ شریک کریں گے؟" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہاں کیوں۔ اس میں کیا برائی ہے۔ چلیے آپ بھی شریک ہو جائیے۔"

چہرے پر عجیب سے تاثرات لیے ڈاکٹر ڈومی رو

بھی ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ابھی ان کے ہاتھ مٹھائی کی طرف بڑھے ہی تھے کہ انسپکٹر جمشید بول اٹھے:

"ایک منٹ۔ آپ میں سے کسی نے یہ پوچھا کہ یہ مٹھائی آخر کہاں سے۔ کیا بیگالی کی بنی ہوئی ہے۔ اور کیا بیگالی کے ہاتھ کی بنی ہوئی مٹھائی ہم کھا سکتے ہیں۔ کیونکہ ہمیں نہیں معلوم کہ انھوں نے اس میں کیا کیا چیزیں ملا رکھی ہوں گی۔"

"اوہ۔ واقعی۔ یہ تو بہت اہم سوال ہے۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"لیکن انکل۔ یہ سوال تو خریدنے سے پہلے آپ کے ذہن میں بھی پیدا ہوا ہو گا۔ چنانچہ آپ نے اطمینان کر لینے کے بعد ہی خریدی ہو گی۔" شوکی نے کہا۔

"ہاں! یہی جواب ہے اس بات کا۔ دراصل یہ ڈبوں میں بند مٹھائی تھی۔ جو دوسرے ملکوں سے منگوائی جاتی ہے۔ میں نے ڈبوں میں سے نکال کر اس پیکٹ میں رکھ دی تھی۔ اب سب لوگ شوق فرما سکتے ہیں، بے سرو سامانی کے عالم میں مٹھائی کی دعوت۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"بھئی واہ۔ مزا آ گیا۔" فاروق نے خوش ہو کر کہا۔

اور وہ سب مٹھائی میں مصروف ہو گئے۔ ڈاکٹر

ڈومی روستک نے کوئی تکلف نہ کیا۔

مٹھائی ختم ہونے کے قریب تھی کہ انسپکٹر جمشید بولے۔

"آخر چوک ہو ہی گئی۔"

"جی۔ کیسی چوک۔ ہمیں تو یہاں آس پاس کہیں کوئی چوک ووک نظر نہیں آ رہی۔" محمود نے حیران ہو کر کہا۔

"مٹھائی کھانے کے چکر میں ہم یہ بھول گئے کہ آدم خور نہایت خاموشی سے ہمارے گرد گھیرا بھی ڈال سکتے ہیں۔"

"جی۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"ہاں! میں نے بھی ابھی ابھی محسوس کیا ہے۔ وہ ہمارے گرد گھیرا ڈال چکے ہیں۔"

اب تو وہ سب مٹھائی کو بھول گئے۔ بھڑک کر کھڑے ہو گئے۔ چاروں طرف دیکھا، لیکن کہیں کوئی آدم خور نظر نہ آیا۔

"ابا جان! کیا آپ مذاق کے موڈ میں ہیں۔"

"ارے نہیں بھئی۔ مذاق کیسا؟"

"تب پھر۔ آدم خور کہاں ہیں؟"

"لمحہ بہ لمحہ ان کا گھیرا تنگ ہو رہا ہے۔"

"آخر آپ نے کس طرح اندازہ لگا لیا۔ جب کہ وہ

نظر نہیں آ رہے۔" فرحت نے حیران ہو کر کہا۔

"میں نے ایک عجیب سی آواز سنی تھی۔ بالکل ہلکی سی آواز جو کسی جانور کی ہو سکتی تھی۔ لیکن جب سے ہم اس علاقے میں داخل ہوئے ہیں، اس وقت سے اب تک ویسی آواز نہیں سنائی دی۔ اس کا مطلب ہے آدم خور اس آواز کو اشارے کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔ اور گھیرا اس اشارے کے مطابق تنگ ہو رہا ہے۔"

"یہ بھی ہو سکتا ہے جمشید۔ تمہارا اندازہ غلط ہو۔" خان رحمان بولے۔

"ہاں! بالکل ہو سکتا ہے۔" وہ بولے۔

"پھر بھی ہمیں ہر طرح تیار ہو جانا چاہیے۔ سوال یہ ہے کہ مقابلہ کیا جائے گا، یا مقابلے کے بغیر ہی ہار مان لی جائے گی۔" منور علی خان نے کہا۔

"یہ تو ان کی تعداد دیکھ کر ہی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے پاس ناکافی اسلحہ ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ہم اس اسلحے سے کب تک ان کا مقابلہ کر سکیں گے۔ دوسرے یہ کہ اگر وہ ہماری زد پر ہوئے تو پھر مقابلہ زیادہ مشکل نہیں ہو گا۔" خان رحمان نے جلدی جلدی کہا۔

"تب خان رحمان - تم اپنی فوج کو تیار تو کر لو۔"

"ہاں! کیوں نہیں۔ دشمن ایک دائرے کی صورت میں آ رہے ہیں۔ ہمیں بھی ایک دائرہ بنانا ہو گا۔ ہمارے منہ دشمن کی طرف ہوں گے، اور یہ دائرہ ہٹتا ہوا ہو گا۔"

"جی کیا فرمایا۔ ہٹتا ہوا دائرہ۔" فاروق کے لہجے میں بلا کی حیرت تھی۔

"یار۔ یہ بھی کوئی مذاق کا وقت ہے۔" آفتاب نے بھنا کر کہا۔

"اوہو۔ وہ باتوں کا دنگل پھر رہ گیا۔" شوکی بولا۔

"شاید اس بار منعقد ہو ہی نہیں سکے گا۔" مکھن نے مایوسانہ انداز میں کہا۔

"تمھیں دنگل کی پڑی ہے اور ادھر آدم خور ہماری طرف بڑھ رہے ہیں۔" انسپکٹر جمشید نے جھنجلا کر کہا۔

"تو کیا ہوا انکل۔ ہم انکل کا رخ ان کی طرف پھیر دیں گے۔"

"دھت تیرے کی۔" محمود نے جھلا کر اپنی ران پر ہاتھ مارا۔

عین اسی لمحے ایک تیز چیخ فضا میں گونجی۔ چیخ کافی دیر تک گونجتی رہی۔ یوں محسوس ہوا جیسے ختم ہو گی ہی نہیں۔

انھوں نے بوکھلا کر چاروں طرف دیکھا۔ اور پھر دھک سے رہ گئے۔ ان کے چاروں طرف ریڈ انڈینوں کی وضع قطع والے لوگ کھڑے تھے۔ ان کی تعداد کسی طرح بھی سو سے کم نہیں تھی۔ ان میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں ایک کمان تھی۔ اور ہر کمان میں تیر چڑھا ہوا تھا۔ ان کی کمروں پر ترکش تھے۔ ان ترکشوں میں تیر بھرے ہوئے تھے۔ گویا وہ ایک ہی وقت میں سو تیر ان کی طرف چل سکتے تھے۔ ان میں سے ایک سب سے اونچا تھا۔ اس کے سر پر سینگوں کا بنایا ہوا ایک تاج تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھی کمان تھی۔ اور اس میں ایک سنہری رنگ کا تیر موجود تھا۔ شاید وہ ان کا سردار تھا۔ اچانک نقارہ بجنے لگا۔ پھر ان آدم خوروں کے پیچھے شور گونجا۔ انھوں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ آدم خور بھی شور کی طرف مڑ گئے۔ انھوں نے دیکھا، چند آدم خور ایک سفید نسل کے آدمی کو دھکیلتے ہوئے آگے لا رہے تھے۔ اس کے ہاتھ کمر پر بندھے تھے۔ اس کے منہ میں جانوروں کی طرح لگام ڈالی گئی تھی۔ اور لگام کا سرا ایک آدم خور کے ہاتھ میں تھا۔ جو اسے جھٹکے پہ جھٹکا دے رہا تھا۔ سفید رنگ کا آدمی بری طرح بلبلا رہا تھا۔ گڑگڑا رہا تھا، ہاتھ جوڑ رہا تھا۔ آخر اس سردار

کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا گیا۔ سردار نے چیخ کر اپنی زبان
میں اس سے کچھ کہا۔ اب وہ چونک کر ان سب کی
طرف مڑا۔ انھیں اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔ اس کی
آنکھوں میں دلچسپی اور حیرت کے آثار نظر آئے۔ پھر اس
نے انگریزی زبان میں کہا۔

"اے لوگو! آدم خوروں کا سردار تم سے یہ کہتا ہے کہ
ہتھیار پھینک دو۔ ورنہ ان کے تیر تم لوگوں کو چھلنی کر
دیں گے۔ جب کہ ہتھیار پھینکنے کی صورت میں تم لوگوں
کی زندگیاں کئی دنوں کے لیے بڑھ جائیں گی۔ کیونکہ یہ
ایک یا دو آدمی روزانہ کھاتے ہیں۔ اس طرح دو آدمیوں
کی باری ایک دن میں آیا کرے گی۔ ہو سکتا ہے۔ تم
لوگوں میں سے کچھ بچ جائیں۔ ورنہ تیروں سے تو ایک
بھی نہیں بچ سکے گا۔ یہ تو تھا پیغام سردار کا جو میں
نے دے دیا۔ اب میں تم سے کہتا ہوں۔ خود کو ان
کے حوالے ہرگز نہ کرنا۔ ورنہ لرزہ خیز انجام ہو گا۔ یہ
لوگ انسانوں کو آگ کے الاؤ پر بھون کر کھاتے ہیں۔
جس طرح انسان ہرن کو الاؤ پر بھون کر کھا جاتا ہے،
مارو اور مر جاؤ۔ یہ آگ پر بھُننے سے کہیں زیادہ
بہتر ہے اور آسان ہے۔" یہاں تک کہہ کر وہ خاموش

ہو گیا۔

"لیکن تم کون ہو؟" انسپکٹر کامران مرزا نے اس کے
خاموش ہوتے ہی کہا۔

"میں ان کا قیدی ہوں۔ مجھے انھوں نے نہیں
کھایا۔ کیونکہ میں تو ان کا کام کرتا ہوں۔

"ہوں۔ تو پھر سردار سے کہہ دو۔ ہم ان کا مقابلہ
کریں گے۔ اگر ہمت ہے تو ہم پر تیر چلا کر دیکھے۔ اس
سے پہلے کہ ان کی طرف سے کوئی تیر چلے گا۔ ہم ان
کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"شاباش۔ مجھے اسی جواب کی اُمید تھی۔ میرا بھی
خیال رکھنا۔ اگر تم لوگ انھیں شکست دے دو۔ تو مجھے
اپنے ساتھ لے جانا نہ بھُولنا۔"

"اچھی بات ہے۔ فکر نہ کرو۔ اب انھیں بتا دو کہ ہمارا
فیصلہ کیا ہے۔" وہ بولے۔

سفید آدمی ان کی طرف مڑا اور ان کی زبان میں
ان سے باتیں کرنے لگا۔ اِدھر خان رحمان دبی آواز
میں ان سے کہہ رہے تھے:

"ہمیں لڑنا ہی ہو گا۔ اور جیت اس میں ہے کہ ان
کی طرف سے کوئی تیر چلنے سے پہلے ہی ہم وار کر

جائیں۔ لہٰذا ہم صلح کی اس بات کے پابند نہیں ہیں۔ حملے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

"لیکن انکل۔ ہم پہل کس طرح کر سکتے ہیں۔ مسلمان تو جنگ میں پہل نہیں کرتا۔" محمود نے اعتراض کیا۔

"ہوں یہ بھی ٹھیک ہے۔ خیر۔ ہم انتظار کر لیتے ہیں۔ لیکن ان میں سے چلنے لوگوں کو بھی نشانے میں لیا جا سکتا ہے۔ اچھی طرح لیے رہو۔"

"آپ فکر نہ کریں انکل۔" آصف بولا۔

انسپکٹر جمشید اور انسپکٹر کامران مرزا کے ہاتھوں میں بڑے بڑے پتھر تھے۔ منور علی خان نے نقلی آدم خور کی تیر کمان سنبھال لی تھی۔ خان رحمان اور محمود کے پاس پستول تھے۔ باقی لوگوں نے بھی پتھر سنبھال لیے تھے۔ پتھروں کا ایک بڑا ڈھیر ان کے گھیرے کے درمیان میں جمع تھا۔ یہ اس جنگ کے لیے ان کا اسلحہ تھا۔

اسی وقت سفید آدمی ان کی طرف مڑا اور بولا:

"سردار کہہ رہا ہے کہ مقابلہ فضول ثابت ہو گا۔ تم سب مارے جاؤ گے، لہٰذا اس کا کیا فائدہ۔ لہٰذا خود کو ان لوگوں کے حوالے کر دو۔ اب تم لوگ جو کہو۔ میں کہہ دوں۔"

"کہہ دیں۔ ہم ہتھیار نہیں ڈالیں گے۔ جب تک جان میں جان ہے۔ لڑیں گے۔"

"بہت اچھا۔" سفید آدمی مڑا۔ جوں ہی اس نے سردار کو ان کا پیغام دیا۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ سفید آدمی کو دھکیل کر دور ہٹا دیا گیا۔ اب سردار ان کی طرف مڑا، اس نے چیخ کر اپنے ساتھیوں سے کچھ کہا۔

ان کی کمانوں کی ڈوریاں کھینچ لی گئیں:

"ہوشیار۔ ہم پر تیروں کی بارش ہونے والی ہے۔ میں فائر کر رہا ہوں۔ ان کی طرف سے یہ پہل ہی ہے۔"

خان رحمان اور محمود کے پستولوں نے گولیاں اگلنا شروع کر دیں۔ ادھر منور علی خان نے تیر چلا دیا۔ باقی لوگوں نے پتھر تاک کر مارے۔ اتنے میں ادھر سے تیر چھوڑ دیے گئے۔

"زمین سے چپک جائیں۔" خان رحمان بولے۔

بہت سے تیر ان کے سروں پر سے گزر گئے۔ کچھ ان کے آس پاس زمین پر لگے۔ ایک آدھ چیخ بھی ابھری۔ آدم خوروں کا نشانہ اس لیے خطا گیا تھا کہ ان کے حملے نے ان کے دائرے میں ابتری مچا دی تھی۔ زخمی ہونے والوں اور مرنے والوں نے دوسروں کو

لڑکھڑانے پر مجبور کر دیا تھا۔

"دوسری باڑھ ماری جائے۔" خان رحمان چلّائے۔

ادھر سے اب بے ترتیبی کے عالم میں تیر چلائے جا رہے تھے۔ دوسرے یہ کہ وہ اور نزدیک آ گئے تھے۔ ایسے میں فرزانہ چلّائی۔

"پتھر ختم ہو رہے ہیں۔ ان کے تیر اٹھا اٹھا کر ہاتھوں سے پھینکنا شروع کر دیں۔"

"ہاں! یہ ٹھیک رہے گا۔" خان رحمان بولے۔

اب ادھر سے تیر بھی پھینکے جا رہے تھے۔ گولی بھی چلائی جا رہی تھی۔ اور پتھر بھی مارے جا رہے تھے۔ آدم خوروں کا دائرہ درہم برہم ہو چکا تھا۔ ایسے میں کسی نے سردار کے کندھے پر پیچھے سے ہاتھ رکھا۔ وہ بھنّا کر مڑا۔ اور اپنے سامنے ایک مقابل کو دیکھ کر چکرا گیا۔ اس کا تو خیال تھا کہ یہ حرکت اس کے کسی ساتھی نے کی ہے، لیکن خیال غلط نکلا۔ دراصل موقع پا کر منور علی خان اس کے پیچھے پہنچ گئے تھے۔ ان کے پاس تیر ختم ہو چکے تھے۔ چہرہ اپنی طرف ہوتے دیکھ کر انھوں نے کمان زور سے اس کے سر پہ ماری۔ اس نے بھی کمان اٹھائی اور کمان سے کمان ٹکرانے لگی۔ اچانک منور علی

خان جھکے اور سردار کو دونوں ہاتھوں سے اچھال دیا۔ اس کا سر ایک پتھر سے لگا۔ اس کی چیخ نے اس کے سارے ساتھیوں کو لرزا دیا۔ ان میں بھگدڑ مچ گئی۔ ایسے میں ان سب نے اور بھی تاک تاک کر پتھر مارے اور تیر چلائے پستول البتہ خالی ہو چکے تھے۔

تھوڑی دیر بعد میدان صاف تھا۔ وہ لاشیں جمع کرنے لگے۔ ان کے تیروں، کمانوں پر قبضہ کرنے لگے۔

"اب پتھر کس لیے جمع ہو رہے ہیں۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"ابھی وہ ایک بار پھر حملہ کریں گے اور شاید پہلے کی نسبت زیادہ بڑی تعداد میں آئیں گے۔" خان رحمان بولے۔

"اوہ!" ان کے منہ سے نکلا۔

"پتھر بھی جمع کر لو۔ ان کے زخمیوں اور مُردوں کو اپنے سامنے اوٹ بنا لو۔ تاکہ جو تیر بھی آئے۔ ان کے جسموں میں لگے۔

سب تیزی سے ہاتھ چلانے لگے۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر ڈومی رو نے بھی پتھر جمع کرنے میں ان کی مدد کی:

"ڈاکٹر۔ آپ بھی ہمارا ساتھ دے رہے ہیں۔"

"میں نے مٹھائی کھانے میں بھی تو ساتھ دیا تھا۔ یوں

بھی آپ لوگوں کے سلوک نے مجھے شرمندہ کر کے رکھ دیا ہے۔"

"شرمندہ کر دیا ہے۔ وہ کیوں؟"

"میری قوم مسلمانوں کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ کسی بھی اسلامی ملک کو چین سے نہ چلنے دینا اس کا سب سے بڑا مقصد ہے۔ اور اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے منصوبوں پر منصوبے بنائے جاتے ہیں۔ لیکن آپ اس ملک کے ایک باشندے کو اپنے ساتھ لیے پھر رہے ہیں۔ اس کی جان بچانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ میں شرمندہ نہ ہوں تو کیا کروں۔"

"خیر کوئی بات نہیں۔ ہو جایئے شرمندہ۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔" فاروق نے مسمسی صورت بنائی۔

اس وقت ایک شور گونجا۔ بے شمار آدم خور چیختے چلاتے آتے نظر آئے۔ ان کے ہاتھوں میں تیر کمان تھے۔

"اس سے پہلے کہ یہ ہمیں اپنی زد میں لیں حملہ شروع کر دیا جائے۔" خان رحمان چلائے۔

اس بار دشمن صرف ایک طرف سے آیا تھا۔ ان کے رخ بھی اسی سمت میں ہو گئے۔ ایسے میں خان رحمان بولے۔

"ہم میں سے ایک اپنے پیچھے نظر رکھے گا۔ اور

پروفیسر صاحب۔ یہ کام آپ کریں گے۔"

"اچھی بات ہے۔" وہ بولے اور اپنا رخ تبدیل کر لیا۔

اسی وقت انھوں نے حملہ شروع کر دیا۔ اس مرتبہ حملے میں پہلے کی نسبت کہیں زیادہ تیزی تھی۔ کیونکہ ان کے پاس سامانِ جنگ پہلے سے زیادہ تھا اور پھر دشمنوں کی لاشیں مورچوں کا کام دے رہی تھیں۔ خان رحمان نے اسی پر بس نہیں کی۔ انسپکٹر جمشید کو کوئی اشارہ کیا۔ دونوں رینگتے ہوئے باہر نکل آئے اور ایک چکر کاٹ کر دشمن کے عقب میں پہنچ گئے۔ اب جو انھوں نے عقب سے حملہ شروع کیا تو دشمن بوکھلا کر مڑے۔ لیکن اپنے مقابلے میں صرف دو آدمیوں کو دیکھ کر شیر ہو گئے۔ اور ان پر حملہ آور ہوئے۔ یہ اور بات ہے کہ اب وہ درمیان میں آ گئے تو جس طرف بھی منہ کرتے، کمر کی طرف وار ہونا لازمی تھا۔ چنانچہ جوں ہی انھوں نے اپنے منہ انسپکٹر جمشید اور خان رحمان کی طرف کیے، تیروں کی بوچھاڑ ان کی کمروں کی طرف آئی۔ وہ بوکھلا کر پھر اسی طرف مڑے تو ان دونوں نے تابڑ توڑ حملہ شروع کر دیا۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر منور علی خان اور ڈاکٹر ڈومی رو بھی ان کے ساتھ آ ملے۔ اس طرح ان کے حملے میں بھی شدت آ گئی۔ اب آدم خور

بُری طرح چکرا رہے تھے اور یہ محسوس کر رہے تھے، اس بار انھوں نے ایک خاص جنگجو قوم کے ساتھ ٹکر لے لی ہے۔"

اچانک وہ دائیں اور بائیں سے نکل بھاگے۔ ان سب نے مل کر تعاقب شروع کیا۔ وہ تعاقب کر رہے تھے اور ساتھ میں تیر بھی چلا رہے تھے۔ دوڑتے ہوئے آدم خور تیر کھا کر ایک دوسرے پر گر رہے تھے۔ انھوں نے اس حد تک تعاقب کیا کہ سامنے دوڑنے والا کوئی آدم خور باقی نہ رہا، پھر واپس لوٹے۔ اور جو آدم خور زندہ نظر آیا، اسے ختم کرتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ اسی جگہ پہنچ گئے جہاں جنگ شروع ہوئی تھی۔

"آدم خوروں کا جھنجٹ تو ختم ہوا۔" محمود نے سکون کا سانس لیتے ہوئے کہا

"ابھی اور کتنے ہی جھنجٹ باقی ہیں۔ فکر نہ کرو۔" فاروق مسکرایا۔

"یہاں سے ہمیں پھر نقشہ دیکھنا ہو گا۔" انسپکٹر کامران مرزا نے کہا۔

"یہ کام آپ کریں۔ ہم ذرا دیر کے لیے آرام کر لیں۔" پروفیسر داؤد مسکرائے۔

"ضرور کیوں نہیں۔ اس جنگ نے سبھی کو تھکا دیا ہے۔" خان رحمان نے کہا۔

آدھ گھنٹے کے آرام کے بعد انھوں نے پھر اپنا سفر شروع کیا۔ نماز کے وقت نماز ادا کی جاتی رہی اور اس طرح ان کا سفر ایک دن اور ایک رات جاری رہا۔ دوسری صبح جب سورج نکلا تو ان کی آنکھیں مارے حیرت کے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ان کی آنکھوں کے سامنے عجیب و غریب قسم کے ٹیڑھے ٹیڑھے درخت تھے۔ چند لمحے تک وہ ان درختوں کو دیکھتے رہے۔ پھر فاروق کے منہ سے نکلا:

"حیرت ہے۔ ان درختوں کی شاخیں دو رنگ کی ہیں۔ ایک ہی شاخ کہیں سے سبز ہے اور کہیں سے بالکل سیاہ۔"

"بالکل غلط۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا۔" آفتاب نے بلند آواز میں کہا۔

"یہ نہیں ہو سکتا۔ آنکھوں سے دیکھ رہے ہو اور پھر بھی کہہ رہے ہو، ہو نہیں سکتا۔ ہے کوئی بات۔" آصف نے جھلا کر کہا۔

"تب پھر میں یہ کہوں گا کہ تمھارا دماغ چل گیا ہے۔"

آفتاب نے اسے گھورا۔

"کیا مطلب۔ کیا تم اپنے خیال میں یہ کہہ چکے ہو کہ میرا دماغ چل گیا ہے۔" فاروق نے بھنا کر کہا۔

"تم میری بات کا کچھ بھی مطلب نکال سکتے ہو، میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" آفتاب بولا۔

"آصف۔ تم اس سے نبٹو گے یا میں دو دو ہاتھ کروں۔" فاروق بولا۔

"فی الحال اس نے میرے دماغ پر کیچڑ اچھالا ہے۔ میں اسے معاف کرتا ہوں۔" آصف نے بھنا کر کہا۔

"ہا ہا۔ ڈر گئے۔" آفتاب ہنسا۔

"اچھا! یہ بات ہے۔ تو پھر آؤ۔" آصف نے کہا اور اچھل کر اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

"ارے ارے۔ ابھی تو آدم خوروں سے لڑ کر فارغ ہوئے ہیں۔ پیٹ نہیں بھرا تھا تو ان سے آہستہ انداز میں جنگ جاری رکھی ہوتی۔" شوکی نے گھبرا کر کہا۔

اتنے میں آصف ایک مکا آفتاب کی ٹھوڑی پر مار چکا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ یک دم نیچے جھک گیا، اس کے بالکل پیچھے اشفاق تھا۔ مکا اس کی گردن پر لگا۔ کیونکہ وہ آفتاب سے بھی قدرے لمبا تھا

وہ بری طرح لڑکھڑایا اور تلملا کر بولا:

"یہ کیا۔ لڑائی آپ کی آفتاب بھائی سے ہے اور مکے مجھے مار رہے ہیں۔"

"اوہ۔ معاف کرنا بھئی۔ یہ سب شرارت آفتاب ہی کی ہے۔ نہ یہ نیچے بیٹھتا۔ نہ مکا تمہیں لگتا۔"

"خیر۔ ذرا دیکھ بھال کر لڑیے۔ کوئی اور مکا میری طرف نہ آئے۔"

"ٹھیک ہے۔" آصف نے کہا اور آفتاب کی طرف متوجہ ہوا، لیکن اس وقت تک وہ کنی کترا کر اس کے پیچھے پہنچ چکا تھا۔ آصف بلا کی تیزی سے پلٹا، لیکن اس سے پہلے کہ وہ پھر مکا چلاتا، منور علی خان درمیان میں آ گئے۔

"نہیں بھئی۔ ہمیں اپنی طاقت دشمنوں پر استعمال کرنا ہے۔"

"چلیے خیر۔ آپ کہتے ہیں تو رک جاتا ہوں۔ ورنہ میں نے تو آج سوچ لیا تھا کہ اس کی چٹنی بنا کر چھوڑوں گا۔"

"ارے میاں جاؤ۔ بڑے آئے چٹنی بنانے والے۔ میری تو خیر کیا چٹنی بناتے۔ ہاں میرے چکر میں دوسرے بے چاروں کی چٹنی ضرور بن جاتی۔"

"معلوم ہوتا ہے، تم لوگوں پر چٹنی بنانے کا بھوت سوار ہو گیا ہے۔" فرزانہ نے منہ بنایا۔

"لیجیے۔ چٹنی بنانے کا بھوت بھی نکل آیا۔"

"بھوت تو آپ پرانی بات ہو گئی ہیں۔ آج کل تو زولوٹ جیسی چیزوں کا زمانہ ہے۔" فرحت ہنسی۔

"کاش۔ ان کے دو دو ہاتھ ہو ہی جاتے۔ لطف آ رہا تھا۔" شوکی نے سرد آہ بھری۔

"اگر اتنا ہی شوق ہے تو تم خود سامنے آ جاؤ۔" آصف جل کر بولا۔

"اشفاق آ تو چکا ہے۔" مکھن بولا۔

"وہ شاخ والی بات درمیان میں رہ گئی۔" منور علی خان بڑبڑائے۔

"ہاں انکل۔ آپ کو تو جنگلات کا بہت تجربہ ہے۔ آپ بتائیے۔ دو رنگوں کی شاخ بھی ہو سکتی ہے؟"

"بھئی بات دراصل یہ ہے کہ اس دنیا میں کیا نہیں ہو سکتا۔" وہ مسکرائے۔

"واقعی انکل۔ یہ بات تو آپ نے ہمارے دلوں کی کہی۔" محمود نے خوش ہو کر کہا۔

"لیکن اس کے باوجود۔ یہ شاخیں دو رنگ کی نہیں ہیں۔"

"یہ کیا بات ہوئی ابا جان۔" فرحت کے لہجے میں حیرت تھی۔

"یہ شاخیں دراصل ایک ہی رنگ کی ہیں۔"

"تت۔ تو کیا۔ ہم سب کی آنکھیں خراب ہو گئی ہیں۔" فاروق نے بوکھلا کر کہا اور جلدی جلدی پلکیں جھپکانے لگا۔

"پلکیں تو اس طرح جھپکا رہے ہو جیسے خراب آنکھیں پلکیں جھپکانے سے ہی تو ٹھیک ہوتی ہیں۔" آفتاب نے جل کر کہا۔

"تم سے کون کہہ رہا ہے جھپکانے کے لیے۔ میری طرف سے تو تم زندگی میں کبھی بھی پلکیں نہ جھپکانا۔" فاروق نے بھی منہ بنایا۔

"کیوں نہ آپ دونوں پلکیں جھپکانے کا مقابلہ کر لیں۔" مکھن بول اٹھا۔

"لیکن بھئی۔ اتنا وقت کہاں سے لائیں۔" محمود نے فوراً کہا۔

"بالکل۔ آخر ہمیں آگے بھی بڑھنا ہے۔" خان رحمان مسکرائے۔

"مجھے سب سے زیادہ فکر ڈومی رو کی ہے۔ بے چارے ہمارے ساتھ مصیبت میں مبتلا ہو گئے۔" پروفیسر داؤد نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

"نن نہیں جناب - یہ بات نہیں ہے۔" ڈاکٹر ڈومی رو
نے عجیب سے لہجے میں کہا۔
"کیا مطلب - کیا بات نہیں ہے؟"
"یہ کہ میں خود کو مصیبت میں محسوس نہیں کر رہا۔"
اس نے کہا۔
"تت - تو پھر - کس میں محسوس کر رہے ہیں۔" فاروق
نے گھبرا کر پوچھا۔
"خدا نخواستہ - آپ خود کو ہماری قید میں تو محسوس نہیں
کر رہے۔" محمود بولا۔
"یا پھر - کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ اپنے آپ کو مردہ
خیال کر رہے ہوں۔" آصف جلدی سے بولا۔
"نہیں - بلکہ میرے خیال میں یہ خود کو زندہ سلامت
کر رہے ہیں۔ بس انھوں نے یہ خیال کر لیا ہے کہ
آب و ہوا کی تبدیلی کے لیے گھر سے نکلے ہیں۔ ڈاکٹر
لوگ آب و ہوا کی تبدیلی پر بہت زور دیتے ہیں نا۔
ضرور خود پر بھی زور دیتے ہوں گے۔" آفتاب بولا۔
"ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے سب کے سب بولنے پر
تُل گئے ہوں۔ اس طرح بھلا ڈاکٹر صاحب کیسے اپنا خیال
ظاہر کر سکیں گے۔" فرزانہ نے جل کر کہا۔

"میں بھی فرزانہ کی ہم خیال ہوں۔ مہربانی فرما کر باتوں
کے اس بھوت سے جلد از جلد پیچھا چھڑایا جائے تاکہ
ڈاکٹر صاحب ہمیں بتا سکیں کہ یہ کیا محسوس کر رہے ہیں۔"
"اُف توبہ - بولے بغیر رہ بھی کوئی نہیں رہا۔ اور
دوسروں کو خاموش رہنے کی تلقین بھی کی جا رہی ہے۔
آخر یہ سب کیا ہے؟" شوکی تلملا اُٹھا۔
"اسے کہتے ہیں - پتا نہیں اسے کیا کہتے ہیں - میں بھول
گیا۔ ویسے میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ ہم سب کچھ دیر
کے لیے خاموش ہو جائیں۔ کم از کم اتنی سی دیر کے لیے
کہ ڈاکٹر صاحب اپنی بات کہہ سکیں۔" مکھن جلدی جلدی بولا۔
"تجویز معقول ہے۔ لہٰذا کم از کم میں نے اس گفتگو
میں حصہ نہیں لیا اور نہ لوں گا۔" اشفاق نے کہا۔
"اسے کہتے ہیں بھاٹ گوئی۔ حصہ لے بھی لیا اور کہہ
رہے ہیں حصہ نہیں لوں گا۔" اخلاق نے فوراً کہا۔
"اُف توبہ - ابھی شاخ والی بات پوری ہو نہیں پائی
تھی کہ ڈاکٹر صاحب کی بات کو انھوں نے درمیان میں اُلجھا
دیا۔ میں تم سب کو حکم دیتا ہوں کہ بالکل خاموش ہو جاؤ۔
جب تک ڈاکٹر صاحب اپنی بات کی وضاحت نہ کر دیں۔
کوئی نہ بولے۔ بلکہ جب تک منوّر علی خان شاخ کے بارے میں

نہ بتا دیں، کوئی منہ سے ایک لفظ نہ نکالے۔" انسپکٹر جمشید نے سرد آواز میں کہا۔

"بب۔ بہت بہتر ابا جان۔" فاروق نے کانپ کر کہا۔

"تم پھر بولے۔" انسپکٹر جمشید غرائے۔

"غغ۔ غلطی ہو گئی۔" فاروق پھر بھی بولے بغیر نہ رہ سکا۔

"خان رحمان، پروفیسر صاحب۔ آپ لوگ دیکھ رہے ہیں۔" انسپکٹر جمشید بے چارگی کے عالم میں بولے۔

"صرف دیکھ ہی نہیں رہے، سن بھی رہے ہیں۔" پروفیسر داؤد مسکرائے۔

"آپ۔ آپ بھی۔" انسپکٹر جمشید نے بوکھلا کر کہا۔

"کیا کریں۔ مزا آ رہا ہے۔" خان رحمان ہنسے۔

"ایک تو ان کی بات بات میں اور بات بے بات آپ کو مزا آنے لگ جاتا ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔ پھر ڈاکٹر ڈومی رو کی طرف مڑے۔

"آپ کیا کہہ رہے تھے ڈاکٹر؟"

"اب تو یاد بھی نہیں رہا۔ کیا کہنا چاہتا تھا۔ ان کی باتوں نے سب کچھ بھلا دیا۔" ڈاکٹر ڈومی رو نے شوخ آواز سے کہا۔

"یہ ایک ہی رہی۔ پروفیسر صاحب نے آپ کے لیے ہمدردانہ الفاظ کہے تھے۔" خان رحمان بولے۔

"اوہ ہاں یاد آیا۔ تو پھر سنیے۔ میں خود کو مصیبت میں نہیں محسوس کر رہا، نہ یہ محسوس کر رہا ہوں کہ آپ لوگوں کے درمیان ایک قیدی ہوں۔ بلکہ مجھے تو یوں محسوس ہو رہا ہے۔ جیسے میں بالکل اپنوں میں ہوں۔ جو میری خاطر جان تو دے سکتے ہیں، مجھ پر کوئی مصیبت نہیں آنے دے سکتے۔ کبھی کبھی یوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ جیسے میں اپنے خاندان کے ساتھ پکنک کے لیے گھر سے نکلا ہوا ہوں۔ اور زیادہ کیا کہوں۔ اگر اس وقت کوئی شخص ہیلی کاپٹر لے کر یہاں آ جائے اور آپ لوگ مجھے اس کے ساتھ اپنے گھر جانے کی اجازت دے دیں۔ تو بھی میں جانا پسند نہیں کروں گا۔ آپ لوگوں کے ساتھ سفر جاری رکھنا پسند کروں گا۔"

"اوہ!" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔ یہ "اوہ" حیرت لیے ہوئے تو تھا ہی۔ اس میں خوشی بھی شامل تھی اور اطمینان بھی۔

"اور منور علی خان۔ تم کیا کہنا چاہتے ہو، اس شاخ کے بارے میں۔ ذرا جلدی سے کہہ گزرو۔ ایسا نہ ہو کہ یہ لوگ پھر شروع ہو جائیں اور تمہارے الفاظ دھرے کے

دھرے رہ جائیں۔ اگر اس مرتبہ ایسا ہوا تو پھر اس بات کا
بہت زیادہ امکان ہو گا کہ وہ بات ہی تمھارے ذہن
سے نکل جائے اور اگر ایسا ہوا تو ہم سب کو بہت افسوس
ہو گا۔" انسپکٹر کامران مرزا کہتے چلے گئے۔

"خیر۔ ایسا تو نہیں ہو سکتا۔" منور علی خان مسکرائے۔

"جی۔ ہو کیوں نہیں سکتا۔ ابھی آپ نے دیکھا نہیں
تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے ذہن سے بات نکل گئی تھی۔" محمود
نے جلدی سے کہا۔

"وہ دوسری بات تھی۔"

"تو آپ کے سلسلے میں پہلی بات ہے یا تیسری۔" فاروق
نے فوراً کہا۔

"منور علی خان ہوشیار۔ تم ان کے جال میں آ رہے ہو۔"
انسپکٹر جمشید نے چلا کر انھیں گویا خبردار کیا۔

"آپ فکر نہ کریں۔ ایسا نہیں ہو گا۔" منور علی خان بولے۔

"کک۔ کیسا نہیں ہو گا انکل۔" آفتاب ہکلایا۔

"تم لوگ مجھے جال میں نہیں پھانس سکو گے، کیونکہ میں تو
خود چالاک ترین درندوں کو جال میں پھانس لیتا ہوں، بہرحال۔
بات ان درختوں کی شاخوں کی ہو رہی تھی۔ دراصل یہ دو
رنگ کی نہیں ہیں۔ ان کا رنگ سبز ہی ہے۔ ہر شاخ کہیں

سے سیاہ اور کہیں سے سبز اس لیے نظر آ رہی ہے کہ۔"
ان کے الفاظ درمیان میں رہ گئے۔ اسی وقت فرزانہ کے
منہ سے ایک زور دار چیخ بلند ہوئی تھی۔ وہ بوکھلا کر کئی
قدم پیچھے بھی ہٹی تھی۔ اس کی نظریں زمین پر گڑی تھیں۔
اور ان میں بے پناہ خوف امڈ آیا تھا۔

سب نے گھبرا کر اس کی نظروں کے تعاقب میں زمین
کی طرف دیکھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ اچھل پڑے۔ ایک
بالکل ویسا ہی کیڑا ان کی طرف چلا آ رہا تھا۔ جیسا انھوں
نے جزیرے پر دیکھا تھا۔ بالکل سیاہ رنگ کا کیڑا۔ جو
کھنکھجورے جیسا تھا۔ ساتھ ہی انھیں پانی کی لہروں کا شور
سنائی دیا۔

ٹیلوں کے پیچھے

"یہ - یہ کیڑا - تو وہی ہے" محمود ہکلایا۔

"ہاں - یہ بیمار ہے یا زخمی - اس لیے شاخ سے گر پڑا۔ عام حالات میں یہ شاخوں سے الگ نہیں ہوتے - جہاں جہاں سے شاخیں سیاہ نظر آ رہی ہیں۔ وہاں وہاں یہ کیڑے چمٹے ہوئے ہیں۔ شاخیں دو رنگ کی نہیں ہیں"

"ارے!" ان کے منہ سے پھر ایک ساتھ نکلا۔

"اس کا مطلب ہے - ہم اس جگہ پہنچ گئے - جہاں سے روزل نے جزیرے پر اپنے آدمی روانہ کیے تھے" فاروق نے بڑبڑانے کے انداز میں کہا۔

"یہ ضروری نہیں - ہو سکتا ہے، کوئی لانچ روزل وغیرہ کو یہاں تک لائی ہے۔ پھر اس کو واپس کر دیا گیا ہو۔ پھر اس لانچ پر اپنے آدمی سوار کر کے جزیرے کی طرف بھیجے گئے ہوں اور اس طرح وہ کیڑا جزیرے پر پہنچا ہو" فرزانہ نے خیال ظاہر کیا۔

"ہوں - بہر حال - ہمیں آگے بڑھنا ہے - لہروں کا شور بھی ہم سن چکے ہیں - ہو سکتا ہے، یہاں کوئی جھیل ہو - یا پھر کوئی آبنائے بھی ہو سکتی ہے - جس کا تعلق سمندر سے جا ملتا ہو گا اور اسی آبنائے کے ذریعے وہ لانچ یہاں تک آئی ہو گی" انسپکٹر جمشید نے جلدی جلدی کہا۔

"لیکن - سوال یہ ہے کہ ان کیڑوں کے جنگل کو کیسے عبور کریں - کیا ہمیں ان سے خطرہ نہیں"

"یہ کیڑے جان لیوا تو نہیں ہیں - ہاں پریشان ضرور کر سکتے ہیں - ہم میں سے ہر ایک کو اگر ایک ایک کیڑا بھی چمٹ جائے تو بیگمنی کا ناچ تو نچا ہی سکتا ہے اور یہ ناچ اس وقت تک جاری رہے گا - جب تک کہ اسے جھٹک نہ دیا جائے - یا یہ خود ہمارا پیچھا نہ چھوڑ دے - اب رہا یہ سوال کہ اسے جھٹکا کیسے جا سکتا ہے - یہ بہت مشکل کام ہے - اپنے پنجے یہ گوشت میں گاڑ دیتا ہے - اور ہم جتنا جی چاہے ہاتھوں پیروں کو جھٹکے دیں - یہ نہیں گرے گا - ہاں - ذرا اسے حرارت پہنچائی نہیں - اور یہ گھبرایا نہیں - ان درختوں پر اس کے رہنے کی وجہ بھی یہی ہے - ان کی شاخیں بہت ٹھنڈی ہوتی ہیں - یہ گرمی سے بہت گھبراتا ہے" منور علی خان کہتے چلے گئے۔

"سوال یہ ہے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔"

"یہ سوچنا ہو گا۔ سوچے سمجھے بغیر کوئی اقدام اٹھانا خطرناک ہو گا۔"

"گویا۔ پہلے سوچنے کا پروگرام شروع کرنا ہو گا۔" شوکی بولا۔

"سوچنے کا پروگرام۔" ڈاکٹر ڈومی رو کے لہجے میں حیرت تھی۔

"جی ہاں۔ ہمارے ہاں کسی بھی چیز کا پروگرام ہو سکتا ہے۔ یہ حیرت کی بات نہیں۔" محمود مسکرایا۔

"تو پھر سوچیے۔" ڈاکٹر نے کندھے اچکائے۔

"انکل۔ یہ اور کس چیز سے گھبراتا ہے۔" فرحت نے سوال کیا۔

"آگ کے علاوہ دھوئیں سے بھی اس کی جان جاتی ہے۔"

"اگر ہم ان درختوں کے نیچے دھواں پیدا کر دیں۔"

"تو یہ پٹ پٹ نیچے گرنے لگیں گے اور پھر ہماری طرف ہی بڑھیں گے۔"

"ارے باپ رے۔ فرحت۔ اپنی اس ترکیب سے توبہ کرو۔" فاروق ہنسا۔

"کوئی ترکیب پیش کرنا گناہ کا کام نہیں ہے۔ کہ میں توبہ کروں۔" فرحت بھنا اٹھی۔

"میرے ذہن میں ایک اور ترکیب آئی ہے۔" فرزانہ نے

ایسے انداز میں کہا جیسے ان کی باتیں سنی ہی نہ ہوں۔

"لیجیے۔ مسئلہ حل ہو گیا۔" فاروق اچھلا۔

"ہاں فرزانہ۔ وقت ضائع نہ کرو۔"

"اس جنگل کو آگ لگا دی جائے۔" فرزانہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"کیا کہا۔ آگ لگا دی جائے۔ لل۔ لیکن اس صورت میں ہم کس طرح آگے بڑھ سکیں گے۔ اگر آگ کئی روز تک نہ بجھ سکی تو کیا ہم اس جگہ کئی روز پڑے رہیں گے۔"

"ہوں۔ فرزانہ کی تجویز قابل غور ہے۔ اس طرح ان کیڑوں سے ضرور نجات مل سکتی ہے۔ لیکن ہمارا سفر کھوٹا ہو گا۔" منور علی خان بڑبڑائے۔

"تب پھر ہم ان درختوں کے اوپر سے سفر کریں۔" فرحت بولی۔

"درختوں کے اوپر سے سفر۔ کیا کہہ رہی ہو فرحت۔" منور علی خان حیران ہو کر بولے۔

"مطلب یہ کہ ان درختوں سے اوپر ہی اوپر سفر کیا جائے۔" فرحت مسکرائی۔

سب نے اسے تیز نظروں سے گھورا:

"کیا تم مذاق کے موڈ میں ہو۔" محمود نے الجھن کے عالم

میں کہا۔

"ن۔ نہیں تو۔ تم نے یہ اندازہ کس طرح لگایا؟"

"اس طرح کہ درختوں کے اوپر ہی اوپر سے سفر کرنے کے لیے ہمارے پاس نہ تو کوئی ہیلی کاپٹر ہے، نہ جہاز۔"

"ان کے علاوہ بھی کوئی چیز ہو سکتی ہے۔" فرحت بولی۔

"تم کیا کہنا چاہتی ہو فرحت۔" انسپکٹر کامران مرزا بے چین ہو گئے۔

"شاید یہ کہ ہم خود ہوا میں اڑنا شروع کر دیں، اور اس جنگل کو اڑ کر عبور کر لیں۔" فاروق نے جل بھن کر کہا۔

"نہیں۔ دور بہت دور ایک بہت اونچا درخت نظر آ رہا ہے۔ اتنا اونچا کہ جنگل کے تمام درخت اس کے مقابلے میں بچے نظر آ رہے ہیں۔ اگر ہم ایک رسا اس درخت میں پھنسا دیں اور رسے کا دوسرا سرا یہاں زمین میں گاڑ دیں تو اس رسے کے ذریعے ہم ان درختوں کے اوپر ہی اوپر سفر کر سکتے ہیں۔" فرحت نے پُر سکون آواز میں کہا۔

"اور اتنا لمبا رسا کہاں سے لائیں گے۔" آصف نے بھنا کر کہا۔

"ابا جان کے تھیلے میں ہے۔" فرحت ہنسی۔

"نہیں۔ تم نے غلط اندازہ لگایا۔ میرے تھیلے میں رسا

ضرور ہے۔ لیکن وہ اتنا لمبا نہیں ہو سکتا۔"

"اوہ!" فرحت نے مایوسانہ انداز میں کہا۔

"ختم کریں۔ ہمیں صرف آگ اور دھوئیں سے کام لینا ہو گا۔" شوکی بول اٹھا۔

"میرا بھی شروع سے یہی خیال ہے۔" منور علی خان مسکرائے۔

"تو پھر آپ نے بتایا کیوں نہیں تھا۔" اخلاق کے لہجے میں حیرت تھی۔

"میں پہلے دوسروں کو سننے کا عادی ہوں۔" وہ مسکرائے۔

"خیر۔ منور علی خان اپنی ترکیب کی وضاحت کر دو۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"مشکل یہ ہے کہ ہمارے پاس سازو سامان نہیں ہے۔" منور علی خان بولے۔

"تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"آگ کا ایک بہت بڑا الاؤ روشن کرنا ہو گا۔ اس میں لکڑیاں ڈالی جائیں گی۔ اور پھر ہوا کا رخ بھی دیکھنا ہو گا۔ دھواں اور آگ کی حرارت جب جنگل کا رخ کرے گی تو جنگل کے ان کیڑوں میں ایک قیامت مچ جائے گی۔"

"اوہ۔ اوہ۔" ان کے منہ سے نکلا۔

"لیکن اس ترکیب کے لیے ساز و سامان کی کیا ضرورت ہے۔"

"ہم واپس پلٹ جاتے ہیں۔ اور دوسرے درختوں سے لکڑیاں توڑ توڑ کر یہاں ڈھیر کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے۔ کلہاڑے وغیرہ نہ ہونے کی وجہ سے یہ کام بہت وقت لے گا، لیکن ہم اس کے سوا کر بھی کیا سکتے ہیں۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔ یہی کرنا ہو گا۔ شروع ہو جائیں۔"

وہ الاؤ کے لیے لکڑیاں جمع کرنے پر جُت گئے۔ ان کے ہاتھ اور پیر تیزی سے چلنے لگے۔ کوئی بھی پیچھے رہنے پر تیار نہیں تھا۔ کئی گھنٹے کی مسلسل کوشش کے بعد آخر ایک بہت بڑا ڈھیر جمع ہو گیا۔ اس ڈھیر میں خشک لکڑیاں بھی تھیں اور بالکل گیلی بھی۔ پھر ہوا کا رخ دیکھا گیا۔ قدرت ان پر مہربان تھی۔ ہوا درختوں کی طرف جا رہی تھی۔ لائٹر کی مدد سے لکڑیوں کو آگ دکھا دی گئی۔ جنگل کی ہوا نے آگ پکڑنے میں مدد دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے الاؤ دہک اٹھا۔ چڑ چڑ کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ دھوئیں نے جنگل کا رخ کیا۔ دھواں اپنے ساتھ تیز گرم ہوا بھی جنگل میں لے جانے لگا۔ اب انھوں نے ایک ہولناک منظر دیکھا۔ کیڑے شاخوں پر کلبلاتے ہوئے نیچے گر رہے تھے۔ انھیں یوں لگا

جیسے کیڑوں کی بارش ہو رہی ہو۔ الاؤ کی تپش بڑھتی گئی دھوئیں میں تیزی آتی گئی۔ ادھر ہوا بھی بہت تیز چل رہی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سارا جنگل دھوئیں اور گرم ہوا کی لپیٹ میں آ گیا۔

"یہ معرکہ جلد ختم ہونے والا نہیں۔ آیئے ہم اس الاؤ سے دُور ہٹ کر بیٹھ جائیں۔" منور علی خان بولے۔

"اور زور شور سے باتیں کریں۔" آفتاب بولا۔

"تمھیں تو بس ہر وقت باتیں کرنے کی سوجھتی رہتی ہے۔" فرحت نے منہ بنایا۔

"ہمیں ان کیڑوں کے تہس نہس ہو جانے کا انتظار کرنا پڑے گا۔ انتظار کے لمحات میں اگر باتیں نہیں کریں گے تو تم بتا دو۔ کیا کریں گے؟"

"ہوں۔ ٹھیک ہے۔ یوں ہی سہی۔"

وہ الاؤ سے دور ہٹتے چلے گئے۔

"ہمیں ابھی ایک کام اور کرنا ہے۔" منور علی خان بولے۔

"فرمایئے۔ ہم ہر کام کر گزریں گے۔"

"شاخیں توڑ توڑ کر ان کے جھاڑو بنانے ہیں۔ کیونکہ جنگل مرنے والے کیڑوں سے پٹ جائے گا۔ اپنا راستا

صاف کرنے کے لیے ہمیں ان جھاڑوؤں کی ضرورت پڑے گی،
کسے معلوم تھا۔ ایک دن ہم جھاڑو بھی دیں گے۔"
فاروق بڑبڑایا۔

"ابھی تو نہ جانے کیا کیا کام کرو گے۔" آفتاب مسکرایا۔

"پروا نہیں۔ تم بھی تو ساتھ ہو گے۔"

"پہلے جھاڑو۔ پھر باتیں۔" انسپکٹر کامران مرزا نے
جلدی سے کہا۔

"کیا یہ کوئی کلیہ ہے انکل؟" محمود کے لہجے میں حیرت
تھی۔

"ہاں! ابھی ابھی بنا ہے۔" وہ مسکرائے۔

جھاڑو بنانے میں کافی وقت لگ گیا۔ آگ کئی گھنٹے
تک سلگتی رہی۔ جنگل میں داخل ہونا ابھی آسان کام نہیں
تھا۔ کیونکہ جنگل تپ رہا تھا۔ آخر رات گزار کر جنگل میں
داخل ہونے کا فیصلہ کیا گیا۔ انھوں نے اپنے گرد بھی
لکڑیوں کا ایک دائرہ جلایا اور سو گئے۔ صبح اٹھے تو
ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ آگ بالکل بجھ چکی تھی۔

کیکڑوں والے درختوں کے پاس پہنچے تو شاخیں اب
سبز ہی سبز نظر آئیں۔ نیچے کیکڑوں کے انبار لگے نظر آئے۔
انھوں نے جھاڑو سنبھال لیے اور راستا صاف کرتے ہوئے

گزرتے چلے گئے۔ کیکڑوں والے درختوں کا سلسلہ زیادہ لمبا چوڑا
ثابت نہیں ہوا۔ ایک گھنٹے بعد ہی وہ اس سے نکل چکے
تھے۔ اب انھوں نے اپنے سامنے ایک چٹیل میدان دیکھا۔
اس میدان کے دائیں طرف ایک دریا سا بہ رہا تھا۔ پانی
کی روانی بہت تیز تھی۔ میدان میں جا بجا چھوٹے بڑے
ٹیلے موجود تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ ٹیلوں کا میدان
ہو، لیکن اس چٹیل میدان کے درمیان میں ایک بلند ٹیلا
موجود تھا اور اس ٹیلے پر کوئی شخص کھڑا تھا۔ انھیں
وہاں کسی شخص کو دیکھ کر بہت حیرت ہوئی۔

○

"یہ۔ یہ کون ہے؟"

"کوئی دشمن ہی ہو سکتا ہے۔"

"تب تو بہت دلیر دشمن ہے۔ ہم سب کے مقابلے
میں تنہا کھڑا ہے۔" منور علی خان نے کہا۔

"ہو سکتا ہے۔ ٹیلے کے پیچھے اس نے پوری فوج
کو چھپا رکھا ہو۔" خان رحمان بولے۔

"ہوں۔ دیکھا جائے گا۔ ہم آگے تو جائے بغیر نہیں

رہ سکتے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

اس دوران ڈاکٹر ڈومی رو ان کی برابر پٹی کرتا رہا تھا اور زخمی کی حالت پہلے کی نسبت بہت بہتر تھی۔ ڈاکٹر ڈومی کا کہنا تھا، زخم اب برائے نام رہ گیا ہے۔

"اس دشمن کے نزدیک پہنچنے سے پہلے نماز ادا کر لی جائے۔ نہ جانے آگے کیا صورتِ حال پیش آئے۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"ٹھیک ہے۔"

نماز ادا کرنے کے بعد وہ چلنے کے لیے فارغ ہوئے ہی تھے کہ فرزانہ نے چونک کر کہا۔

"ارے۔ ڈاکٹر ڈومی کہاں گئے؟"

"انھیں نماز سے پہلے تو میں نے یہیں بیٹھے دیکھا تھا۔" فرحت نے ایک ننھے سے ٹیلے کی طرف اشارہ کیا۔

"مسٹر ڈومی آپ کہاں ہیں؟" انسپکٹر کامران مرزا مسکرائے۔

انھوں نے چاروں طرف دیکھا۔ ڈاکٹر کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا تھا۔

"حیرت ہے۔ وہ فرار تو نہیں ہو سکتے۔ اتنا لمبا سفر اکیلے کیسے کر سکیں گے۔"

"ادھر اُدھر پھیل جاؤ۔ ضرور کسی ٹیلے کی اوٹ میں

چھپ گئے ہیں۔" انسپکٹر جمشید بلند آواز میں بولے۔

انھوں نے ایسا ہی کیا۔ ادھر اُدھر دوڑ لگا دی۔ ٹیلوں کے گرد گھوم گھوم کر دیکھنے لگے۔ ایسے میں کبھی کبھی ان کی نظر سب سے اونچے ٹیلے پر کھڑے شخص پر بھی پڑ جاتی۔ وہ جوں کا توں کھڑا تھا۔ اچانک انھوں نے شوکی کی آواز سنی:

"ارے۔ مسٹر ڈومی۔ یہ رہے۔"

اس کی آواز سن کر وہ سب اس طرف دوڑ پڑے۔ نزدیک پہنچ کر انھوں نے ایک حیرت انگیز منظر دیکھا۔ ڈاکٹر ڈومی رکوع کے انداز میں جھکا کھڑا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ سیدھا ہو گیا اور پھر سجدے میں گر گیا۔ وہ حیران رہ گئے۔ آخر بالکل انھی کے انداز میں ڈاکٹر نے سلام پھیرا۔ پھر ان کی طرف دیکھا۔

"ی۔ یہ آپ کیا کر رہے تھے ڈاکٹر صاحب۔"

"وہی۔ جو آپ کرتے ہیں۔" اس نے شرما کر کہا۔

"اوہ۔ تو آپ ہماری طرح نماز پڑھ رہے تھے۔"

"ہاں! میں دیکھنا چاہتا تھا۔ اس طرح کرنے سے کیا ہوتا ہے۔"

"اور آپ پڑھتے کیا رہے۔"

"کچھ بھی نہیں۔ میں نہیں جانتا۔ آپ لوگ کیا پڑھتے ہیں۔"

"اگر آپ کی دلچسپی ہے۔ تو ہم آپ کو سکھا سکتے ہیں۔ آپ کو اپنے دین کے بارے میں بتا سکتے ہیں۔"

"ہم۔ میں ضرور جاننا چاہتا ہوں۔"

"چلیے۔ ہم اپنا سفر جاری رکھیں گے اور ہم آپ کو اسلام کے بارے میں بھی بتاتے جائیں گے۔"

انسپکٹر جمشید نے یہ ذمے داری اپنے سر لے لی اور انھیں اسلام کی موٹی موٹی باتیں بتانے لگے۔ ادھر وہ لمحہ بہ لمحہ اس اونچے ٹیلے کے نزدیک ہوتے جا رہے تھے۔ اور پھر ٹیلے پر کھڑا ہوا شخص انھیں قدرے صاف نظر آنے لگا۔ وہ ایک لمبے قد کا آدمی تھا۔ اس کے جسم پر نیلا لباس تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک رائفل تھی۔ سیاہ رنگ کی جدید قسم کی رائفل۔ جسے اس نے سر سے اونچا اٹھایا ہوا تھا۔ اس کی کمر کی طرف نیلے آسمان کے نیچے بلند و بالا پہاڑ تھے۔ قرمزی رنگ کے پہاڑ۔

"یہ۔ یہ کون ہے؟" منور علی خان بولے۔

"ابھی تک ہم اس کے نقوش نہیں دیکھ سکے۔ کچھ اور نزدیک پہنچ کر معلوم ہو گا۔" خان رحمان بڑبڑائے۔

"لیکن کہیں ہم اتنے نزدیک نہ پہنچ جائیں کہ وہ ہمیں

گولیوں کا نشانہ بنا دے۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"اس کے کھڑے ہونے کا انداز بتا رہا ہے۔ للکارے بغیر گولی نہیں چلائے گا۔ کیونکہ اگر وہ چاہتا تو ہمیں اس کے بارے کانوں کان خبر نہ ہوتی۔ وہ اس ٹیلے کی اوٹ میں چھپا رہتا اور اچانک ہم پر فائرنگ شروع کر سکتا تھا۔" انسپکٹر کامران مرزا نے کہا۔

"ہوں۔ بات ٹھیک ہے۔"

وہ آگے بڑھتے رہے۔ چھوٹی پارٹی بار بار اس نیلے لباس والے کو دیکھ رہی تھی۔ وہ باتیں کرنا بھول گئے تھے۔ جلد از جلد یہ جان لینا چاہتے تھے کہ ٹیلے پر کون کھڑا ہے۔ آخر وہ اس حد تک نزدیک پہنچ گئی کہ اس کے نقش و نگار نظر آنے لگے۔ اس کا رنگ سرخ و سفید تھا۔ آنکھیں گہری سیاہ تھیں۔ سر کے بال گھنگھریالے تھے۔ چہرے سے بالکل جوان معلوم ہو رہا تھا۔ اسے دیکھ کر فاروق پکار اُٹھا:

"ارے۔ یہ تو مسٹر رونل ہیں۔"

"رونل!" ان سب کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

ان کے ساتھ بول اُٹھنے والوں میں ڈاکٹر ڈومی رو بھی تھا۔ آخر رونل اس کے ملک کی ایک بہت اہم شخصیت تھی۔

پہلا فائر

"مسٹر رونل۔ کیا یہ آپ ہیں!" محمود نے حیران ہو کر کہا۔

"ہاں! اس میں کیا شک ہے۔" اس نے ہنس کر کہا۔ دھوپ کی روشنی میں اس کے دانت چمک اُٹھے۔ رائفل کا رخ اب ان کی طرف تھا۔

"لیکن آپ یہاں کھڑے ہو کر کیا کر رہے ہیں؟"

"تم لوگوں کا انتظار۔ جنگل سے اُٹھنے والے دھوئیں نے ہمیں اطلاع دے دی تھی کہ تم لوگ آ پہنچے ہو۔"

"اوہ۔ تو آپ تنہا کیوں نظر آ رہے ہیں؟"

"ارے نہیں بھئی۔ اس خوش فہمی میں نہ رہنا۔ تمھاری آنکھوں کے سامنے اب جس قدر ٹیلے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک ٹیلے کے پیچھے میرا ایک مسلح آدمی موجود ہے۔"

"اوہ۔ اس کا مطلب ہے۔ پوری طرح تیاری کر کے آئے ہیں؟"

"تیاری بہت پہلے مکمل کی جا چکی ہے۔ تم لوگوں

کو ہر قدم پر روکنے کا پروگرام ہم نے پہلے ہی بنا لیا تھا۔ لیکن افسوس۔ تم لوگ یہاں تک آ ہی پہنچے۔ تاہم مجھے سو فیصد اُمید ہے کہ تم یہیں سے لوٹ جانا پسند کرو گے۔ تمھارے قدم آگے بڑھنے سے انکار کر دیں گے۔"

"کیا آپ کا اشارہ اس طرف ہے کہ چونکہ ہر ٹیلے کے پیچھے آپ کا ایک مسلح آدمی موجود ہے۔ لہٰذا ہم قدم آگے نہیں بڑھائیں گے؟" فرزانہ نے جلدی سے پوچھا۔

"نہیں۔ میں جانتا ہوں۔ تم بڑی سے بڑی فوج سے بھی ٹکرا جانے کا حوصلہ رکھتے ہو۔"

"تب پھر۔ آپ نے یہ کیوں کہا کہ ہم قدم آگے نہیں بڑھائیں گے؟"

"بعض اوقات انسان مجبور ہوتا ہے۔" اس کا لہجہ عجیب ہو گیا۔

"کک۔ کیسے؟" شوکی کانپ اُٹھا۔

"اس وقت تین عورتیں ہماری قید میں ہیں۔ ان میں سے ایک کا نام بیگم جمشید۔ دوسری کا نام بیگم کامران مرزا اور تیسری والدہ شوکی برادرز کہلاتی ہیں۔"

"نہیں!!" ان کے منہ سے خوف زدہ آواز میں نکلا۔

"اگر یقین نہیں تو میں ان کی آوازیں تم لوگوں کو

سنا سکتا ہوں۔"

ان کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکل سکا۔ الجھن کے عالم میں کھڑے رہے۔ آخر رونل نے پھر کہا:

"میری جیب میں ایک ننھا سا ٹیپ ریکارڈر ہے اس میں ایک کیسٹ موجود ہے۔ لو میں یہ آن کیے دیتا ہوں۔ اپنے کانوں سے ان کی آوازیں سن لو۔ بلکہ وہ تو تم سے بھی پہلے یہاں پہنچ چکی ہیں۔ کیونکہ انھیں ہم لائے ہیں اور تم خود آئے ہو۔"

یہ کہتے ہی اس نے جیب میں رکھے ایک ٹیپ ریکارڈر کا بٹن دبا دیا۔ پہلے تو اس میں سے کوئی آواز نہ ابھری پھر شوکی کی والدہ کی آواز سنائی دی۔

"ارے۔ یہ میں کہاں ہوں۔ ہائیں بہنو۔ تم کون ہو؟"

"پپ۔ پہلے آپ بتائیں۔ آپ کون ہیں:" بیگم کامران مرزا کی آواز ابھری۔

"یہ کیا بات ہوئی:" شوکی کی والدہ بولیں۔

"ہاں واقعی۔ میرے خیال میں بھی یہ کوئی بات ہوتی نظر نہیں آتی۔ خیر میں پہل کرتی ہوں۔ مجھے شکیلہ بیگم کہتے ہیں:" بیگم جمشید نے کہا۔

"اور میں شہناز بیگم ہوں:" بیگم کامران مرزا بولیں۔

"تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ میں رضوانہ مشتاق ہوں:" شوکی کی والدہ نے کہا۔

"سوال یہ ہے کہ ہم یہاں کس طرح پہنچ گئیں۔ ہمیں ایک ساتھ کیوں جمع کیا گیا ہے؟ ہم دو تو خیر ایک دوسرے کو پہلے سے جانتے ہیں:" بیگم جمشید بولیں۔

"کم از کم میں آپ دونوں کو یہاں نہیں لائی۔" شوکی کی والدہ نے جلدی سے کہا۔

"خیر۔ وہ تو ہم بھی دیکھ رہی ہیں۔ آپ اکیلی ہم دونوں کو یہاں لا بھی نہیں سکتی تھیں:" بیگم کامران مرزا کی آواز سنائی دی۔

"اور اس کمرے کے دروازے بالکل بند ہیں۔ کھڑکیاں بھی بند ہیں۔ گویا ہمیں ان کے اندر قید کر دیا گیا ہے:" بیگم جمشید بولیں۔

"اوہو۔ کک۔ کہیں۔ یہ سارا کیا دھرا شوکی وغیرہ کی وجہ سے تو نہیں ہے:" شوکی کی والدہ نے چونک کر کہا۔

"شوکی!" ان دونوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"ہاں۔ شوکی۔ آپ کو یہ نام سن کر حیرت کیوں ہوئی؟"

"آپ۔ آپ کا۔ شوکی برادرز سے کیا تعلق ہے۔ کیا آپ ان سے کوئی کیس حل کرا رہی ہیں؟"

"کیس اور۔ میں حل کراؤں گی ان سے:" وہ بھنا کر بولیں۔

"کیوں کیوں۔ کیا بات ہے۔ آپ کیس کیوں حل نہیں کرا سکتیں۔"

"اس لیے کہ میں ان کی ماں ہوں۔"

"ارے!" دونوں کی چلاتی آواز سنائی دی۔

"اس میں اس طرح اچھل پڑنے کی کون سی بات ہے۔" شوکی کی والدہ کی آواز سنائی دی۔ شاید انھوں نے یہ جملہ بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

"اس لیے کہ میں بیگم جمشید ہوں اور یہ بیگم کامران مرزا ہیں۔"

"کیا!!!" اس مرتبہ چیخنے کی باری شوکی کی والدہ کی تھی۔

"جی ہاں!" دونوں ایک ساتھ بولیں۔

"اوہو۔ تب تو۔ تب تو ہمیں ایک دوسرے سے گلے مل لینا چاہیے۔ چاہے ہم کہیں بھی کیوں نہ ہوں۔ بہرحال زندگی میں پہلی بار ایک ساتھ جمع ہو رہی ہیں۔"

چند سیکنڈ تک کپڑوں کے سرسرانے کی آواز سنائی دیتی رہی۔ شاید وہ ایک دوسرے سے گلے مل رہی تھیں۔ آخر بیگم جمشید کی آواز اُبھری:

"شش۔ شاید کوئی ادھر آ رہا ہے۔"

پھر دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔

"تت۔ تم۔ تم کون ہو مسٹر۔ اور اس طرح باپردہ عورتوں کے کمرے میں کیوں آ گئے ہو۔" شوکی کی والدہ نے بھنائے ہوئے انداز میں کہا۔

"مجھے رونل کہتے ہیں۔" رونل کی آواز اُبھری۔

"رو۔ رو۔ رونل۔" بیگم جمشید نے بوکھلا کر کہا۔

اور اس کے ساتھ ہی رونل نے ٹیپ ریکارڈر بند کر دیا:

"آ گیا یقین۔" اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"ہاں! آ گیا۔ پھر۔ آپ کیا کہتے ہیں۔" آفتاب نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔

"خیر تو ہے۔ تمھارا منہ بن گیا۔" رونل ہنسا۔

"یہ ایک بہت گھٹیا حرکت کی ہے تم نے۔ آخر انھیں پکڑ لانے کی کیا ضرورت تھی۔"

"تم لوگوں کو ہر طرف سے قابو کرنے کے لیے میں نے ہر طرف جال بچھائے تھے۔ میری پہلی کوشش تو یہ تھی کہ تم ادھر کا رخ کرنے کے قابل ہی نہ رہ سکو۔ اس سلسلے میں میں نے حکومت کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر تمھاری سرحدوں پر فوجیں جمع کر دے۔ اور تمھاری حکومت کو دھمکی دے کر اگر تمھارے

سراغرسانوں نے ہمارے ایٹمی پلانٹ کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا تو ہم تمھارے ملک کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔ ایسا کیا گیا۔ لیکن میں تمھاری طرف سے پھر بھی مطمئن نہیں ہو سکا تھا۔ میں اس فکر میں تھا کہ کہیں تم خفیہ طور پر اس مہم پر نہ نکل پڑو۔ اپنے ملک کی اجازت نہ ملنے کے باوجود بھی۔ اور یہ ہوا۔"

"اگر تم لوگوں نے ہمارے ملک کا سونا ایک جہاز کے ذریعے اڑانے کا پروگرام نہ بنایا ہوتا تو شاید ہم واقعی یہاں تک نہ آ سکتے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"سونا اڑانے کے پروگرام کا ہمارے پروگرام سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ تعلق بعد میں پیدا ہوا۔ جب شیلاک اور ریوٹا کو تمھارے ملک سے فرار ہونے کے لیے جہاز پر سوار ہونا پڑا۔ وہ سیدھے ان خفیہ جاسوسوں کے پاس گئے تھے جو بیگال کے لیے کام کر رہے ہیں۔ انھوں نے ہی انھیں بحری جہاز تک پہنچایا۔ پھر جب ہمیں اطلاع ملی کہ جہاز پر تم لوگ بھی سوار ہو چکے ہو تو ہم نے یہاں تم لوگوں کو روکنے کے انتظامات شروع کر دیے۔ مجھے حیرت ہے۔ تمام تر انتظامات کے باوجود تم یہاں پہنچ گئے۔ یہاں تک کہ کیڑوں والا جنگل بھی عبور کر لیا۔"

"اور آپ یہ فاصلہ لانچوں کے ذریعے طے کرتے ہوئے اس آبنائے سے ہو کر سمندر میں پہنچ جاتے ہیں۔"

"ہاں! یہ ٹھیک ہے۔" اس نے کہا۔

"خیر۔ اب آپ کا کیا پروگرام ہے۔ آپ کے دو بڑے ساتھی ریوٹا اور شیلاک تو ہم نے دوسری دنیا میں پہنچا دیے۔"

"ہاں! مجھے اطلاع مل چکی ہے۔ میں چاہتا ہوں، اب تم خود کو ہمارے حوالے کر دو۔ بغیر کسی لڑائی بھڑائی کے۔ اس کی دو وجوہات ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہر ٹیلے کے پیچھے میرا ایک آدمی موجود ہے۔ اور تم سب ان کی زد میں ہو۔ دوسری یہ کہ تینوں بیگمات ہماری قید میں ہیں۔ اگر تم لوگوں نے کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کی تو انھیں زندہ نہیں دیکھ سکو گے۔" یہاں تک کہہ کر رونل خاموش ہو گیا۔

انھوں نے الجھن کے عالم میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ جیسے کہہ رہے ہوں۔ اب کیا کریں۔

"تم لوگ شوق سے مشورہ کر سکتے ہو۔ میں تم لوگوں کو مہلت دیتا ہوں۔ پندرہ منٹ کی مہلت۔" اس نے ڈرامائی انداز میں کہا۔

"پندرہ منٹ بہت ہوتے ہیں۔ اتنا وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم تو ایک دو منٹ میں مشورہ کر لیں گے۔"

انسپکٹر جمشید بولے۔

"چلو ٹھیک ہے۔" اس نے ہنس کر کہا۔

"آؤ بھئی۔ ذرا مشورہ کر لیں۔" انھوں نے کہا۔

اور اس اونچے ٹیلے سے دور ہٹنے لگے۔ کافی دور آکر انسپکٹر کامران مرزا بولے:

"ہم خود کو ان کے حوالے تو کسی صورت بھی نہیں کر سکتے۔ اس طرح تو نہ ہم بچتے ہیں، نہ بیگمات۔ نہ سونے کا جہاز ہی ہمارے ملک پہنچ سکے گا۔"

"تو پھر ان سے جنگ کر لی جائے۔" محمود بولا۔

"ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ یہ ہمیں سونے کے جہاز اور عورتوں سمیت واپس جانے کی اجازت دے دیں۔ اس صورت میں ہم یہ سودا منظور کر سکتے ہیں۔" خان رحمان نے مشورہ دیا۔

"ٹھیک ہے۔ اس سے کم شرط پر صلح کرنا ناممکن ہے۔" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

عین اسی وقت فاروق نے آفتاب کے منہ پر طمانچہ دے مارا، سب نے بوکھلا کر ان کی طرف دیکھا۔

"یہ کیا بدتمیزی کی ہے؟" آفتاب نے چیخ کر کہا اور فاروق پر جھپٹ پڑا۔

فاروق بھڑک کر بھاگا اور کچھ اس تیزی سے بھاگا کہ دیکھتے دیکھتے بہت دور نکل گیا، آفتاب بھی بھلا کب رکنے والا تھا:

"تم دونوں کا دماغ تو نہیں چل گیا۔" انسپکٹر کامران مرزا چلائے۔

انھوں نے جیسے سنا ہی نہیں۔ دوڑ جاری رکھی۔ چند لمحے تک وہ بے بسی کے عالم میں ان کی طرف دیکھتے رہے۔ ادھر رونل بھی حیرت زدہ انداز میں ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ آخر انسپکٹر جمشید نے گرج دار آواز میں کہا:

"میں تم دونوں کو حکم دیتا ہوں کہ فوراً واپس آ جاؤ اور ایک دوسرے پر جھپٹنے کا کام ختم کر دو۔"

دونوں یک لخت رک گئے:

"اب حکم مل چکا ہے۔ اس لیے میں مجبور ہوں۔" فاروق نے کہا۔

"اور میں بھی۔ خیر۔ میں تمھیں دیکھ لوں گا۔ تم سے اس طمانچے کا بدلہ ضرور لوں گا۔" آفتاب بولا۔

"اور جب آپ بدلہ لے چکیں۔ اور فاروق بھائی کو دیکھ چکے تو ہمیں بھی اطلاع دے دیجیے گا۔" مکھن نے چہک کر کہا۔

"بہت بہتر۔ میں پہلا کام یہی کروں گا۔" آفتاب نے کہا۔

"لیکن مشکل یہ ہے کہ وہ دن کبھی آئے گا ہی نہیں۔" فاروق ہنسا۔

"اگر انکل کا حکم نہ مل گیا ہوتا تو وہ دن آج کا ہی دن ہوتا۔" آفتاب بولا۔

"خام خیالی ہے۔"

"تو پھر لے دو اجازت۔" آفتاب نے تلملا کر کہا۔

"نہیں آفتاب۔ فوراً واپس آ جاؤ۔ دیکھ نہیں رہے۔ ہم کن حالات کا شکار ہیں۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

آخر دونوں ان کے قریب آ گئے۔ فاروق نے دبی آواز میں کہا:

"رونل کا بیان غلط نہیں ہے۔ ہر ٹیلے کے پیچھے اس کا ایک آدمی موجود ہے۔"

"اوہ۔ تو تم نے یہی دیکھنے کے لیے طمانچہ مارا تھا۔" آصف کے لہجے میں حیرت تھی۔

"تو تمھارا کیا خیال ہے۔ میرا دماغ چل گیا تھا۔" فاروق نے منہ بنا کر کہا۔

"تب۔ تب تو۔ فاروق۔ تمھارا شکریہ۔" آفتاب نے جلدی سے کہا۔

"وعلیکم شکریہ۔ مم۔ مجھے معاف کر دینا۔ طمانچہ ذرا زور سے مارنا پڑا۔ دراصل آواز رونل کے کانوں تک پہنچانا تھی۔"

"خیر خیر۔ کوئی بات نہیں۔" آفتاب بولا۔

"اس کا مطلب ہے۔ مقابلہ بہت سخت ہے۔" خان رحمان نے کہا۔

"لیکن ہم خود کو ان کے حوالے نہیں کر سکتے۔ اس طرح تو ہم کسی قابل بھی نہیں رہیں گے۔"

"تو پھر آئیے۔ اس سے بات کریں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"نہیں جمشید۔ مشورے کی مہلت کے بہانے اچھا موقع ہاتھ آیا ہے۔ رہی سہی کسر فاروق نے پوری کر دی ہے۔ اب ہم یہ بے وقوفی نہیں کریں گے۔" خان رحمان نے جلدی سے کہا۔

"کیا مطلب؟" انسپکٹر جمشید حیران ہو کر بولے۔

"فوراً زمین پر لیٹ جاؤ اور ٹیلوں کی اوٹ لے لو۔ اب اس سے جو بات بھی ہوگی۔ ٹیلوں کے پیچھے سے ہوگی۔"

"ہوں۔ خان رحمان۔ تمھارا شکریہ۔ بہت وقت پر ہمیں روکا۔ آخر فوجی ہو نا۔ ہم یہی کریں گے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔ اور پھر اوٹ لگا گئے۔ ان کے ساتھ دوسروں نے بھی یہی کیا۔ جب تک رونل اصل معاملے کو بھانپتا۔ وہ ٹیلوں کی اوٹ

ے چکے تھے۔ اس کی بوکھلائی ہوئی آواز سنائی دی۔

"مسٹر جمشید۔ یہ کیا۔ تم لوگ تو مشورہ کر رہے تھے۔"

"ہاں۔ ہم مشورہ کر رہے تھے۔ اور مشورہ کرنے کے بعد ہی ٹیلوں کی اوٹ میں آ گئے ہیں۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"ہم نے مشورہ کر لیا ہے۔ اگر تم ہماری خواتین کو ہمارے حوالے کر دو۔ اور سونے کے جہاز سمیت ہمیں واپس اپنے ملک چلے جانے دو۔ تو ہم ایٹمی پلانٹ کا خیال ترک کر سکتے ہیں۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔" رونل نے جھلا کر کہا۔

"کیوں جناب۔ بات کیوں نہیں ہوئی۔" انسپکٹر کامران مرزا کی آواز ابھری۔

"میں نے تو یہ مشورہ کرنے کی مہلت نہ دی تھی کہ خود کو ہمارے حوالے کر دو۔"

"ہم نے مشورہ کیا ہے۔ اور جس نتیجے پر پہنچے ہیں۔ وہ آپ کو بتا دیا ہے۔ اور ہم خود کو آپ کے حوالے نہیں کریں گے۔"

"اس صورت میں تینوں عورتیں زندہ نہیں ملیں گی۔" رونل نے غرا کر کہا۔

"موت ایک دن آ کر رہے گی۔ کوئی یہاں ہمیشہ تو رہ نہیں سکتا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ہوں! تو پھر آؤ۔ جنگ کر لو۔"

"ہاں کیوں نہیں۔ ہم تیار ہیں۔"

"میں پہلا فائر کر رہا ہوں۔ یہ میری طرف سے اعلانِ جنگ ہو گا۔ اس کے بعد تم لوگ کسی بھی رعایت کے حق دار نہیں ہو گے۔"

"شکریہ مسٹر رونل۔ ہمیں آپ سے یہی امید تھی۔" فاروق نے بلند آواز میں کہا۔

اسی وقت رائفل کی آواز نے پوری وادی میں تھرتھراہٹ پیدا کر دی۔ وہ اپنے تیر کمان اور پستول پہلے ہی سنبھال چکے تھے۔ لیکن فائر کس پر کرتے۔ دشمن ٹیلوں کے پیچھے تھے۔ اب انھوں نے بھی ٹیلوں کے پیچھے سے فائرنگ شروع کر دی تھی۔ لیکن یہ اندھا دھند فائرنگ تھی۔ اس کا فائدہ تھا تو صرف یہ کہ وہ آسانی سے آگے نہیں بڑھ سکتے تھے۔ رونل بھی اب نظر نہیں آ رہا تھا۔

"خان رحمان۔ یہ جنگ پہلی جنگ سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں تمھاری مہارت کیا کہتی ہے؟"

"ہمیں اس انداز سے پیچھے ہٹنا چاہیے کہ یہ لوگ محسوس

ہ کر سکیں۔" وہ بولے۔

"لیکن انکل پیچھے ہٹ کر کیا ہو گا۔ اور پھر کیا یہ لوگ آگے نہیں بڑھ آئیں گے۔" محمود نے اعتراض کیا۔

"ہم سب پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ انسپکٹر کامران مرزا، منور علی خان اور پروفیسر داؤد اسی جگہ جمے رہیں گے اور ہم سب فائرنگ کرتے رہیں گے۔ باقی لوگ غیر محسوس طور پر ٹیلوں کی اوٹ لیتے پیچھے ہٹتے رہیں گے۔ پھر دائیں اور بائیں چکر کاٹ کر ان ٹیلوں کے دوسری طرف پہنچنے کی کوشش کریں گے جن کے پیچھے یہ لوگ موجود ہیں۔ اس طرح وہ لوگ ہماری زد پر آ جائیں گے اور ان کا شکار آسان ہو جائے گا۔" انھوں نے جلدی جلدی کہا۔

"بہت ہی شاندار ترکیب ہے۔" منور علی خان چہکے۔

"تو پھر عمل شروع کیا جاتا ہے۔ آپ تینوں یہیں رہیں گے۔" خان رحمان بولے۔

"ٹھیک ہے۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

انھوں نے پروگرام کے مطابق پیچھے ہٹنا شروع کیا۔ جب فائرنگ کے مقام سے کافی دور ہٹ آئے تو خان رحمان بولے:

"یہاں سے ہم دو پارٹیوں میں روانہ ہوں گے۔ ایک پارٹی

دائیں طرف جائے گی۔ دوسری بائیں طرف۔"

"تو پھر مہربانی فرما کر پارٹیاں بھی آپ ہی بنا دیں۔" آصف نے کہا۔

"ایک پارٹی کو انسپکٹر جمشید لے کر آگے بڑھیں گے، دوسری کو میں۔ ان کی پارٹی میں ڈاکٹر ڈومی رو، آصف، محمود، اخلاق اور اشفاق شامل ہوں گے، میرے ساتھ آفتاب، فاروق، شوکی، مکھن، فرزانہ اور فرحت ہوں گے۔"

"بہت بہتر۔ ہم اس تقسیم پر راضی ہیں۔" محمود بولا۔

"تو پھر کارروائی شروع کر دی جائے اور یہ خیال رکھا جائے کہ ہمارے پاس اسلحہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ شدید ضرورت کے بغیر کام میں نہ لایا جائے۔"

"فکر نہ کریں انکل۔ ہم اپنی گولیاں اور تیر بہت بچا بچا کر استعمال کریں گے۔" محمود نے مسکرا کر کہا۔

دونوں پارٹیاں دائیں اور بائیں رینگنے لگیں۔ وہ اب بھی ٹیلوں کی اوٹ لے کر آگے بڑھ رہی تھیں۔ آخر کافی دیر کی محنت کے بعد وہ اتنا لمبا چکر کاٹنے کے قابل ہوئے کہ دشمن کے عقب میں پہنچ سکے۔ اب دشمن ان کی زد پر تھا۔

"میری تجویز یہ ہے کہ فائر نہ کیا جائے۔ صرف تیروں سے

کام لیا جائے۔ اس طرح ہم خاموشی سے ان کا خاتمہ جاری رکھیں
گے۔" انسپکٹر جمشید نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

"ترکیب اچھی ہے۔" محمود بولا۔

تیر اور کمانیں ان کے پاس اتنی کم بھی نہیں تھیں۔ آدم
خوروں کے بھاگنے کے بعد انھوں نے سمیٹ لی تھیں۔ اور
اب ان سے ہی وہ مقابلہ شروع کر رہے تھے۔ سب نے
ایک ایک ٹیلے کے پیچھے پناہ لی اور دشمنوں پر تیر برسانے
لگے۔ ادھر بھی چیخ و پکار شروع ہو گئی۔ دشمن کے اندر بوکھلاہٹ
مچ گئی۔ وہ گھبرا کر پلٹا۔ لیکن پلٹنے سے کیا بنتا تھا۔ عقل سے
کام لے کر ٹیلوں کے دوسری طرف چلے گئے۔ لیکن ایسا
کرنا بھی کام نہ آیا۔ کیونکہ اب وہ انسپکٹر کامران مرزا وغیرہ
کی رائفلوں کی زد میں تھے۔ فوراً رائفلیں داغ دی گئیں اور
ان کے لاشے تڑپنے لگے۔ ادھر خان رحمان اپنے ساتھیوں
کے ساتھ حملہ آور ہو چکے تھے اور انھوں نے بھی کھلبلی
مچا دی تھی۔

دشمن کے اندر ابتری پیدا ہو گئی۔ ٹیلے ان کے لیے
غیر محفوظ ہو گئے۔ صرف چند منٹ بعد وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔
ایسے میں انسپکٹر جمشید نے رونل کو بھاگتے دیکھ لیا۔ انھوں
نے بے تحاشا انداز میں اس کی طرف دوڑ لگا دی۔ اور آن کی

آن میں اسے جا لیا۔ اس کے نزدیک پہنچتے ہی انھوں نے اپنی
ٹانگ اڑا دی۔ وہ دھڑام سے گرا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھل
سکتا۔ انھوں نے رائفل کا بٹ اس کے سر پر دے مارا۔ یہ
وار کچھ اس قدر کاری تھا کہ وہ حرکت بھی نہ کر سکا، اور
اس کی روح نکل گئی۔

"ارے۔ یہ کیا ہوا؟" ان کے منہ سے حیرت زدہ آواز میں
نکلا۔

"کیا ہوا انکل؟" انھوں نے اپنے پیچھے آصف کی آواز سنی۔

"یہ۔ یہ دیکھیں۔ رونل۔"

"مردہ رونل کیسے انکل؟" وہ بولا۔

"ہاں۔ اتنا بڑا مجرم اور چوہوں کی طرح مارا گیا۔"

"زیادہ بڑے سورما اسی طرح مرا کرتے ہیں۔" اشفاق کی
آواز سنائی دی۔

"یہاں باتیں بگھارنے سے یہ کہیں بہتر ہے کہ بھاگتے
دشمنوں کا تعاقب کیا جائے۔ اس طرح رائفلیں بھی ہاتھ لگیں
گی اور دشمنوں سے بھی نجات ملے گی۔" محمود نے منہ بناتے
ہوئے کہا۔

"اوہ ہاں۔ ٹھیک ہے۔"

وہ سب دشمنوں کے پیچھے بھاگ کھڑے ہوئے۔ ادھر

خان رحمان کی پارٹی بھی تعاقب کر رہی تھی۔ انسپکٹر کامران مرزا وغیرہ نے بھی جب ان لوگوں کو بھاگتے دیکھا تو وہ بھی دوڑ پڑے۔ اب اکا دکا فائر ہو رہے تھے۔ تیر چل رہے تھے اور چیخیں گونج رہی تھیں۔ آخر آدھ گھنٹے بعد میدان صاف ہوگیا۔ وہ ایک جگہ جمع ہو گئے۔ روئل کی لاش ان کے سامنے پڑی تھی۔ اس کا سر پھٹ گیا تھا۔ انسپکٹر جمشید کے چہرے پر اب تک حیرت کے آثار تھے۔

"یہ کیا ہوا انکل؟" فرحت نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"کیوں۔ کیا تمھارے خیال میں برا ہوا؟" فاروق نے تنک کر کہا۔

"نن نہیں۔ ایک بڑا دشمن مارا گیا۔ بھلا برا کس طرح ہوا۔ ہوا تو بے شک اچھا ہے۔ میں تو یہ کہ رہی ہوں کہ تینوں بڑے مجرم مارے جا چکے ہیں۔ اور ہم ابھی ایٹمی پلانٹ تک نہیں پہنچے۔" فرحت نے جلدی جلدی کہا۔

"شاید اب ہم ایٹمی پلانٹ سے دور نہیں ہیں۔ روئل کے یہاں ملنے کا اس کے سوا اور کوئی مقصد نہیں ہو سکتا۔"

"تو پھر۔ کیا اب ہم آگے بڑھیں؟"

"ہاں! اس لیے کہ آگے بڑھنا ہی زندگی ہے۔" محمود گنگنایا۔

"رائفلیں اور گولیاں سمیٹ لو۔ اس کے بعد ہم آگے چلیں گے۔" خان رحمان نے کہا۔

"تت۔ تو آپ ایٹمی پلانٹ تک جانا چاہتے ہیں۔" انھوں نے ڈاکٹر ڈومی رو کی کانپتی آواز سنی۔

"ہاں ڈاکٹر۔ یہ بات اب آپ جان ہی چکے ہیں۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"اور۔ اور وہاں کیا کریں گے؟"

"ہم دراصل۔ ایٹمی پلانٹ کو تباہ کرنا چاہتے ہیں۔"

"نن۔ ناممکن۔ آپ لوگ یہ کام نہیں کر سکیں گے۔" اس نے پرزور انداز میں سر ہلا کر کہا۔

"کیوں نہیں کر سکیں گے؟"

"آپ لوگوں کے پاس اسے تباہ کرنے کا کوئی سامان نہیں ہے۔ پھر اصل مسئلہ تو وہاں تک پہنچنے کا ہے۔" اس نے کہا۔

"جب ہم یہاں تک پہنچ گئے ہیں تو وہاں تک کیوں نہیں پہنچ سکتے۔"

"ایٹمی پلانٹ کے گرد۔ جیسا کہ میری معلومات ہیں۔ اس قدر زبردست انتظامات ہیں کہ بیان نہیں کیے جا سکتے۔ اس کے چاروں طرف طیارہ شکن توپیں نصب ہیں۔ بہت ہی جدید قسم کی توپیں۔ ان پر مقرر عملہ چوبیس گھنٹے تیار رہتا ہے۔ وہ

عمارت یوں بھی بم پروف ہے۔ اس کے چاروں طرف بم پروف
شیشے کا خول ہے۔ تم لوگ اس خول کو کس طرح توڑو گے۔
اندر کس طرح داخل ہو گے۔" یہاں تک کہہ کر ڈاکٹر ڈومی رو
خاموش ہو گیا۔

"بس ڈاکٹر صاحب۔ آپ یہی کچھ کہنا چاہتے تھے۔" انسپکٹر
جمشید بولے۔

"کیا مطلب؟ میں اور کیا کہوں؟"

"حفاظتی اقدامات کے بارے میں آپ اور کیا کچھ جانتے
ہیں؟"

"میں زیادہ نہیں جانتا۔ عوام میں جو باتیں مشہور ہیں، صرف
وہی میں بھی جانتا ہوں۔"

"عمارت میں جو لوگ کام کرتے ہیں۔ آخر وہ بھی تو کسی
طرح داخل ہوتے ہی ہوں گے۔"

"ہاں کیوں نہیں۔ لیکن کون جانے۔ اندر داخل ہونے کا
طریقہ کیا ہے۔" ڈاکٹر ڈومی رو نے کہا۔

"آپ فکر نہ کریں۔ ہم ایسی باتوں کو خاطر میں نہیں لایا
کرتے۔ واقعے پر پہنچ کر دیکھیں گے کہ ہم کیا کر سکتے ہیں۔"

"ہوں۔ جیسے آپ کی مرضی۔ میں دیکھ چکا ہوں۔ آپ لوگ
حیرت انگیز صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ اس وقت اچھی بھلی

تعداد والی دو پارٹیوں کو کوئی نقصان اٹھائے بغیر درہم برہم کر
چکے ہیں۔"

"شکریہ ڈاکٹر۔ ہم ذرا نقشہ دیکھ لیں۔ اسی دوران آپ لوگ
کچھ آرام کر لیں۔ کیونکہ جہاں تک میرا خیال ہے۔ ہمارا اصل سفر
اب شروع ہو گا۔"

"آپ کہہ رہے ہیں، اصل سفر اب شروع ہو گا۔ جب کہ میرا
خیال ہے، یہ سفر نقلی سفر ہو گا۔" فاروق نے برا سا منہ بنا
کر کہا۔

"نقلی سفر۔ کیا مطلب؟" انسپکٹر کامران مرزا نے حیران ہو
کر کہا۔

"مطلب یہ کہ ہمارے مقابلے کے تینوں بڑے مجرم تو مارے
جا چکے ہیں۔ اب ہماری جنگ تو عام لوگوں سے ہو سکے گی۔
کیا خاک مزا آئے گا۔"

"ہوں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم یہاں تک آ
کر واپس لوٹ جائیں۔ اور پھر اب تو واپس لوٹنے کا یوں بھی
امکان ختم ہو گیا کہ یہ لوگ ہمارے گھر کی خواتین تک کو
یہاں لے آئے ہیں۔"

اسلحہ جمع کیا گیا۔ انسپکٹر کامران مرزا اور انسپکٹر جمشید نقشے
میں گم رہے۔ آخر اسے لپیٹتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"ہم ایٹمی پلانٹ سے بہت نزدیک ہیں۔ آیئے چلیں۔"
سفر پھر شروع ہوا۔ ایسے میں ڈاکٹر ڈومی رو نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"میں۔ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ ذرا ٹھہر جائیں۔"

سب رک گئے۔ اس کی طرف مڑے تو اس کے چہرے پر عجیب سے اثرات نظر آئے۔ ہونٹوں پر کپکپی سی تھی۔ اور آنکھوں میں شدید قسم کی بے چینی۔

بکرے کی ماں

"خیر تو ہے ڈاکٹر۔ کیا کہنے چاہتے ہیں؟"

"ہم۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ۔ ہو سکتا ہے۔ ہم آئندہ مہم میں زندہ نہ بچ سکیں۔ یا شاید کچھ مارے جائیں اور کچھ زندہ بچ جانے میں کامیاب ہو جائیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سب کے سب بچ جائیں۔" ڈاکٹر یہاں تک کہہ کر رک گیا۔

"تو پھر۔ آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"ہم۔ میں چاہتا ہوں۔ مرنے سے پہلے مسلمان ہو جاؤں۔" اس نے جلدی سے کہا۔

"ار۔۔رے!" وہ ایک ساتھ بولے۔ اس ارے میں بے پناہ خوشی ا شامل ہوئی تھی۔

"اس سے اچھی کیا بات ہو سکتی ہے ڈاکٹر صاحب۔" انسپکٹر جمشید بلند آواز میں بولے۔

"تو پھر مجھے مسلمان کر لیجیے۔ مجھے کیا کرنا ہو گا۔"

"صرف اتنا کہ وضو کر لیں پھر ہم آپ کو کلمہ پڑھا دیں گے۔ لیکن وضو کے لیے ہمیں آبنائے تک جانا ہو گا۔ آبنائے یہاں سے ایک کلومیٹر سے کم فاصلے پر ہے۔ اس لیے تیمم نہیں کر سکتے۔ وضو ہی کرنا ہو گا۔ کیا خیال ہے دوستو۔ خوش گوار فریضہ پہلے ادا کر لیں۔"

"بالکل!" انھوں نے ایک ساتھ کہا۔

"تو پھر آیئے چلیں۔"

وہ آبنائے کی طرف چل پڑے۔ وہاں پہنچ کر ڈاکٹر کو وضو کرایا گیا۔ پھر انسپکٹر جمشید نے انھیں کلمہ پڑھوایا۔ جوں ہی انھوں نے کلمہ پڑھا۔ سب نے انھیں مبارک باد دی۔ ہاتھ ملائے۔ گلے ملے۔ پھر انسپکٹر کامران مرزا بولے:

"اب آپ کا نام بھی اسلامی رکھنا ہو گا۔ میں آپ کا نیا نام محمد عبداللہ تجویز کرتا ہوں۔"

"شکریہ! میں اب اپنے لیے اسی نام کو پسند کروں گا۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"تو اسی وقت سے آپ ڈاکٹر محمد عبداللہ ہیں۔" خان رحمان مسکرائے۔

سب نے انھیں پھر مبارک باد دی۔ عین اسی وقت فرزانہ نے چیخ کر کہا:

"اُف اللہ۔ یہ کیا؟"

وہ جلدی سے فرزانہ کی طرف مڑے۔ اس کی نظریں آبنائے کے پانی پر تھیں۔ انھوں نے بھی پانی کی طرف دیکھا۔ دوسرے ہی لمحے ان کی آنکھیں بھی حیرت سے پھیل گئیں۔

آبنائے کے بیچوں بیچ بالکل سیاہ رنگ کی ایک دھار چلی آ رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ دھار ان کے سامنے سے گزر گئی۔ انھوں نے دور تک دیکھا۔ لیکن دھار کا دوسرا سرا نظر نہ آیا۔

"یہ۔ یہ کیا چیز ہے۔" خان رحمان بڑبڑائے۔

"کسی چیز میں اس دھار کے کچھ حصہ کو لے کر دیکھنا ہو گا۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"ٹھہریے۔ میں کرتا ہوں یہ انتظام۔" انسپکٹر جمشید نے کہا اور کندھے کے ساتھ لٹکے ہوئے تھیلے میں سے ایک برتن نکالا۔ دھار کنارے سے دور تھی۔ ہاتھ بڑھا کر برتن کو نہیں بھرا جا سکتا تھا۔

"کیا آپ چھلانگ لگائیں گے؟" فرزانہ نے بے چین ہو کر کہا۔

"ہاں! اس کے سوا کیا کیا جا سکتا ہے۔"

"نہیں جمشید۔ میں اس کا مشورہ نہیں دوں گا۔ ہمیں ہاتھ لگائے بغیر اور پانی میں اترے بغیر اس چیز کا برتن بھرنا ہو گا۔" پروفیسر داؤد جلدی سے بولے۔

"جی بہتر۔ یہ کر لیتے ہیں۔"

وہ آبنائے کے کنارے پر بیٹھ گئے۔ ایک کمان کے دھاگے کو اتار ڈالا۔ اس کے ساتھ دوسری کمان کو جوڑا۔ پھر اس برتن کو ان دونوں کمانوں کے ایک سرے پر باندھا۔ اب جو انھوں نے کمانوں کا دوسرا سرا پکڑ کر برتن اس دھار کی طرف بڑھایا تو دھار تک پہنچ گیا۔ انھوں نے برتن کو غوطہ دیا اور کمانوں کو اوپر اٹھایا۔ ایک لمحے کے لیے انھوں نے برتن میں سیاہ مائع بھری دیکھی۔ دوسرے ہی لمحے مائع غائب ہو گیا۔

"ارے۔ یہ کیا ہوا؟" کئی آوازیں ابھریں۔

"شاید مائع پانی میں سے نکلتے ہی بھاپ بن کر اڑ گئی۔" آصف جلدی سے بولا۔

"لیکن۔ ہم نے بھاپ کی صورت میں کوئی چیز اوپر جاتے نہیں دیکھی۔" فرزانہ نے اسے گھورا۔

"تو اس میں گھورنے کی کیا بات ہے۔ میں نے ایک خیال ہی پیش کیا ہے نا۔"

اتنے میں انسپکٹر جمشید برتن کو واپس کھینچ چکے تھے۔

دوسرا لمحہ حیران کن تھا۔ برتن کا نچلا حصہ غائب تھا۔ گویا برتن کی دھات اس مائع میں حل ہو گئی تھی۔

"اچھا ہی ہوا جمشید۔ تم نے پانی میں چھلانگ نہ لگائی۔" پروفیسر داؤد کانپ اٹھے۔

"تت۔ تو کیا آپ کے خیال میں میں بھی اس مائع میں حل ہو جاتا۔"

"ہاں! اس کا امکان ہے۔"

"لیکن پروفیسر صاحب۔ یہ ہے کیا۔" انسپکٹر کامران مرزا نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

"ایٹمی پلانٹ سے نکلنے والا فاصل مادہ۔" وہ بولے۔

"اوہ۔ ایٹمی تجربات سے پیدا ہونے والا مائع۔" فرزانہ بولی۔

"ہاں۔"

"یہ۔ یہ تو بہت خطرناک چیز ہے۔" شوکی نے جلدی سے کہا۔

"ایٹمی پلانٹ بھی تو کچھ کم خطرناک نہیں ہے۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"تو پھر۔ کیوں نہ ہم اس آبنائے کے ساتھ ساتھ چلیں۔" خان رحمان نے تجویز پیش کی۔

"ہاں! اس طرح ہم خود بخود ہی پلانٹ تک پہنچ جائیں

گے۔"

"ارے۔ وہ دھار ختم ہو گئی۔" فرزانہ چلائی۔

سب نے پھر پانی کی طرف دیکھا۔ اب دھار کا دوسرا سرا نظر آ رہا تھا۔ جلد ہی وہ ان کے سامنے سے گزر گیا۔

"لیجیے۔ پانی صاف ہو گیا۔ اب آپ بے شک اس میں غوطہ لگا لیں۔" فاروق نے خوش ہو کر کہا۔

"تم احمق تو نہیں ہو۔" فرحت بھنا کر بولی۔

"نہیں تو۔ تم سے کس نے کہہ دیا۔" اس نے آنکھیں نکالیں۔

"انکل اس سیاہ مائع کو برتن میں بھرنے کے لیے غوطہ لگانے والے تھے۔ اب غوطہ کس لیے لگائیں گے۔"

"غوطے کا کیا ہے۔ کسی بھی وجہ سے لگایا جا سکتا ہے۔" اخلاق مسکرایا۔

"آؤ چلیں۔" انسپکٹر جمشید برا سا منہ بنا کر بولے۔

"حیرت ہے جمشید۔ تم برے برے منہ بنا رہے ہو۔ جب کہ ہمیں ان کی باتیں بہت مزا دیتی ہیں۔"

"اس بات پر تو مجھے بھی حیرت ہے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

ابھی انھوں نے سفر شروع کیا ہی تھا کہ فرزانہ تیسری بار چلا اٹھی:

"دھار پھر آئی۔"

انھوں نے آبنائے میں دیکھا۔ ایک اور سیاہ دھار چلی آ رہی تھی۔

"میں سمجھ گیا۔ وقفے وقفے سے یہ مائع پلانٹ سے آبنائے میں گرتی ہے۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"بہت مہربانی۔" آفتاب نے فوراً کہا۔

"کس کی مہربانی۔" شوکی نے حیران ہو کر کہا۔

"اس سیاہ دھار کی۔ ہمیں پلانٹ کی طرف تو لے جا ہی رہی ہے نا۔"

"ہاں واقعی۔" شوکی نے سر ہلایا۔

ٹھیک ایک گھنٹے کے سفر کے بعد انھیں چٹانوں کی وجہ سے آبنائے سے دور ہٹنا پڑا۔ آبنائے اب دو طرفہ چٹانوں کے درمیان سے گزر رہی تھی۔

"لیجیے ابا جان۔ آبنائے تو ہم سے جدا ہو رہی ہے۔" آفتاب نے معصومانہ انداز میں کہا۔

"ہاں۔ کیا کیا جائے۔" وہ بولے۔

"اور ان چٹانوں کا سلسلہ جلد ختم ہوتا نظر نہیں آ رہا۔"

شوکی بڑبڑایا۔

"اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ ہم ہر لمحے آبنائے سے دور ہی ہوتے چلے جائیں گے۔ جب کہ ہم نے سوچا تھا کہ اس کے ساتھ ساتھ چلتے پلانٹ تک پہنچ جائیں گے۔" مکھن نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔

"خیر کوئی بات نہیں۔ تجربہ گاہ بچ کر کہاں جائے گی۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"ہاں اور کیا۔ بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔" مکھن نے مسکرا کر کہا۔

"بکرے کی ماں۔ ہائیں۔ تم ابھی تجربہ گاہ کو بکرے کی ماں کہہ رہے ہو۔ دماغ تو نہیں چل گیا۔" آفتاب نے آنکھیں نکالیں۔

"اس میں دماغ چلنے کی کیا بات ہے جناب۔ میں تو بکرے کی ماں کسی بھی چیز کو کہہ سکتا ہوں۔" مکھن برا مان گیا۔

"دیکھو۔ میرے منہ نہ لگنا۔" آفتاب غرایا۔

"شکریہ۔ میں آپ کے منہ لگ کر کروں گا بھی کیا۔" مکھن نے بھی فوراً کہا۔

"ہائیں ہائیں۔ آفتاب۔ یہ تو تمھیں آڑے ہاتھوں لیتا

نظر آتا ہے۔" فاروق نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔

"صرف نظر آتا ہے نا۔ کہہ نہیں سکتا۔" آفتاب بولا۔

"تم یہ دعویٰ کس طرح کر سکتے ہو بھئی۔" آصف ہنسا۔

"اس لیے کہ میں جانتا ہوں۔ مکھن کتنے پانی میں ہے۔"

"ارے باپ رے۔" مکھن نے بوکھلا کر نیچے دیکھا۔ اور پھر اپنے نیچے پتھریلی زمین دیکھ کر مطمئن ہو گیا۔ وہ بولا۔

"مم۔ میں پانی میں تو نہیں ہوں۔"

"میرا خیال ہے۔ مکھن تم سے کمزور ہرگز نہیں ہے۔" فاروق مسکرایا۔

"بھئی واہ۔ خود تو میرے ساتھ لڑ نہیں سکے۔ چلے ہیں مکھن کو میرے ساتھ لڑانے۔" آفتاب نے منہ بنا کر کہا۔

"خیال ہے تمھارا۔ تم تو خود اس بے چارے سے لڑ رہے ہو۔"

"لو۔ اب اسے بے چارہ بنا دیا۔"

"میں نے نہیں بنایا۔ کیوں بھئی مکھن۔ تم بے چارے ہو نا۔"

"ہاں جی۔ اس میں کیا شک ہے۔" اس نے کہا اور وہ ہنس پڑے۔

"آپ کس بات پر ہنس رہے ہیں۔" مکھن نے بوکھلا

کر کہا اور وہ اس کے اس انداز پر پھر ہنسے بغیر نہ رہ سکے۔

"بچو آفتاب۔ مکھن کم چالاک نہیں ہے۔" محمود بولا۔

"اس میں کیا شک ہے۔ لیکن طاقت میں مجھ سے زیادہ نہیں۔" آفتاب بولا۔

"خیر۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا۔" فرحت نے شریر انداز میں کہا۔

"سب کے سب ہمیں لڑانے پر تُل گئے ہیں۔ مکھن۔ اس بات کو سمجھ رہے ہو نا۔"

"آپ سمجھ لیں۔ میرے لیے یہی کافی ہے۔"

"اور کیا۔ یہ تو سکول میں بھی کچھ سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا۔ دوسروں کا سمجھنا ہی ان کے لیے کافی ہو جاتا ہے۔"

"کیا آپ ہم پر نقل کرنے کا الزام لگا رہے ہیں۔" اشفاق نے تلملا کر کہا۔

"نہیں تو۔ میرے الفاظ میں تو یہ الزام شامل نہیں ہے۔" اس نے فوراً کہا۔

"مجھے ڈر ہے۔ تم لوگ لڑ ہی نہ پڑو۔" انسپکٹر جمشید فکرمندانہ انداز میں بولے۔

"گھبرائیے نہیں انکل۔ لڑائی تو ہم دشمنوں سے کریں گے۔ اپنوں سے زیادہ سے زیادہ کشتی لڑی جا سکتی ہے۔"

آصف نے پُرسکون آواز میں کہا۔

"ہاں! یہی بہتر ہے۔ کشتی تم لوگ شوق سے لڑ لینا، لیکن وہ بھی ابھی نہیں۔ پہلے ایٹمی پلانٹ۔ پھر کوئی اور پروگرام۔" انسپکٹر جمشید جلدی جلدی بولے۔

"او کے انکل۔ اب ہم لڑائی سے دُور ہی دُور رہیں گے۔" آفتاب نے فوراً کہا۔

"لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ دشمن تمھارے سروں پر آ جائے اور تم لڑائی سے دُور ہی دُور رہو۔" خان رحمان بولے۔

"ارے۔ یہ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا سا کیوں چھا رہا ہے۔" اشفاق نے پریشان ہو کر کہا۔

"لمبے قد کے ہو نا۔ اس لیے۔" آفتاب بولا۔

"ہاں! آپ کا خیال ٹھیک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے پہلے اندھیرا نظر آنے لگا ہے۔" اشفاق بولا۔

"بک۔ کیا مطلب؟"

"اندھیرا آنکھوں کے نقص کی وجہ سے نہیں۔ بلکہ کسی اور وجہ سے نظر آ رہا ہے۔ آپ لوگ بھی سامنے دیکھیے۔"

ان سب نے سامنے دیکھا۔ انھیں یوں لگا جیسے۔ ان کی آنکھوں کے سامنے بھی اندھیرا چھا گیا ہو۔ اندھیرا ان

سے تھوڑے فاصلے پر موجود تھا اور اس سے آگے کی کوئی چیز انھیں نظر نہیں آ رہی تھی۔

"یا الٰہی۔ یہ کیا معاملہ ہے۔"

"اب تو ہمیں دُور دُور تک تاریکی نظر آ رہی ہے۔ کیا اس حصے میں رات شروع ہو چکی ہے۔" اخلاق بولا۔

"یہ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہاں ابھی دن ہے۔ اور سامنے رات۔ دماغ تو نہیں چل گیا۔" شوکی نے چلّا کر کہا۔

"بھئی چیخو نہیں۔ ہمت سے کام لو۔ کیا تم لوگوں نے کبھی نہیں دیکھا۔ کہ ایک طرف بارش ہو رہی ہوتی ہے۔ اور اس کے اودھر دھوپ نکلی ہوتی ہے۔"

"ہاں! ایسا تو دیکھنے میں آیا ہے۔"

"تو پھر یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے جو ہم دیکھ رہے ہیں۔"

"اس میں عجیب بات یہ ہے کہ دھوپ اور بارش کا ملاپ تو ہم نے اکثر دیکھا ہے۔ رات اور دن کا ایسا ملاپ زندگی میں کبھی نہیں دیکھا۔"

"ہو سکتا ہے۔ اس علاقے کے رہنے والوں نے کبھی دھوپ اور بارش کا ملاپ نہ دیکھا ہو۔ وہ ہمیشہ رات اور دن کا ملاپ دیکھتے رہے ہوں۔"

"یہ سب باتیں تو خیر درست ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اب

ہم اس تاریکی میں آگے کیسے بڑھ سکیں گے۔" خان رحمان نے تنگ آ کر کہا۔

"ہاں واقعی۔ ہمارے پاس تو ایک آدھ ٹارچ ہو گی۔ وہ کیا کام دے سکے گی اتنے لوگوں میں۔" محمود بولا۔

"ہو سکتا ہے۔ ہمیں اس جگہ سے اندھیرا نظر آ رہا ہو۔ اس جگہ پہنچ کر ہم اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہوں۔"

"تب پھر جلدی جلدی آگے بڑھیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

انھوں نے تیز تیز قدم اٹھا دیے۔ یہاں تک کہ کنارے تک پہنچ گئے۔

"لیجیے۔ اندھیرے کی سرحد شروع ہو گئی۔" آفتاب نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

"ان۔ اندھیرے کی سرحد۔" فاروق بڑبڑایا۔

"ہاں ہاں۔ کہہ دو۔ یہ تو کسی ناول کا نام ہو سکتا ہے۔" فرزانہ نے اسے گھورا۔

"نہیں کہتا۔ بس۔ آ گیا چین۔" فاروق نے کاٹ کھانے والے انداز میں کہا۔

"میرا خیال ہے۔ اب ہمیں اس اندھیرے کے ساتھ ساتھ چلنا ہو گا۔" پروفیسر داؤد نے کہا۔

"اور اندھیرے کے ساتھ ساتھ چلنے کا یہ ہماری زندگی

یں پہلا اور انوکھا اتفاق ہو گا۔"

"انوکھا اتفاق ہو یا عجیب و غریب۔ ہمیں سفر تو کرنا ہی پڑے گا۔" فاروق بولا۔

"ہوں۔ تو پھر بسم اللہ کریں۔" خان رحمان نے کہا۔

وہ اندھیرے کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ یہ انھیں بہت عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ دریا کے کنارے تو اکثر چلے تھے۔ سمندر کے ساحل پر بھی چلے تھے۔ دھوپ اور ابر کا ملاپ بھی انھوں نے دیکھا، لیکن روشنی اور اندھیرے کا ملاپ پہلی بار دیکھ رہے تھے۔ بالکل یوں لگ رہا تھا جیسے روشنی اور اندھیرے کی سرحدیں آپس میں مل گئی ہوں۔

"مم۔ میں یہ سوچ رہا ہوں۔" شوکی نے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن آفتاب نے فوراً بات کاٹ دی:

"حیرت ہے۔ کمال ہے۔ تم ان حالات میں بھی کچھ سوچنے کے قابل ہو۔"

"جی ہاں! اللہ کی مہربانی سے۔ کیا آپ کی سوچنے کی صلاحیت ختم ہو گئی ہے؟" شوکی کے لہجے میں حیرت تھی۔

"بالکل نہیں۔ میرا تمھارے بارے میں یہی خیال تھا۔" آفتاب مسکرا دیا۔

"بھئی اس غریب کو بات تو پوری کر لینے دو۔" خان رحمان

نے منہ بنایا۔

"چلیے جناب۔ بات پوری کریں۔" آفتاب جلدی سے بولا۔

"میں یہ سوچ رہا ہوں کہ جب سورج غروب ہو جائے گا تو کیا ہو گا۔ اس وقت تو سوائے اندھیرے کے یہاں کچھ بھی نہیں رہ جائے گا۔"

"ہاں! اس وقت ہم خود کو اندھیرے کے سمندر میں محسوس کریں گے۔"

"اندھیرے کا سمندر۔ بھئی واہ۔ یہ بھی خوب صورت نام ہے کسی ناول کے لیے۔" فاروق نے خوش ہو کر کہا۔

"دھت تیرے کی۔ تمھیں تو بس ناولوں کے ناموں کی پڑی رہتی ہے۔ تم ناول لکھنا کیوں شروع نہیں کر دیتے؟" محمود نے جھلا کر اپنی ران پر ہاتھ مارا۔

"سوچ تو رہا ہوں۔ اب یہی دھندا شروع کر دوں۔ کم از کم ایک چیز کی میرے پاس کمی نہیں ہو گی۔" فاروق نے سوچ میں گم لہجے میں کہا۔

"کس چیز کی؟" فرحت جلدی سے بولی۔

"ناولوں کے ناموں کی۔" فاروق بولا۔

"حد ہو گئی۔" آصف تلملا اٹھا۔

"ارے۔ اسے تو میں بھول ہی گیا۔" شوکی کے منہ سے نکلا۔

"ابھی ابھی یہ حضرت سوچ رہے تھے۔ اب یہ بھول رہے ہیں۔ ہے نا کمال۔" فاروق نے کہا۔

"ہاں! مجبوری ہے۔ انسان بہت مجبور ہے۔" شوکی نے کندھے اچکائے۔

"شوکی۔ تم کیا بھول گئے ہو؟"

"عینک۔" اس نے جلدی سے کہا۔

"لیجیے۔ بھولے بھی تو کیا چیز۔ عینک۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"ہاں! کم از کم توپ وغیرہ تو بھولتے۔" آفتاب نے فوراً کہا۔

"ایک تو تم میں یہ بڑا نقص ہے۔ دوسرے کو بات مکمل نہیں کرنے دیتے۔ اس کے پیچھے پڑ جاتے ہو۔" خان رحمان نے جھنجلا کر کہا۔

"میں بھی یہی کہتا ہوں۔" پروفیسر داؤد نے ان کی تائید کی۔

"حیرت ہے پروفیسر انکل۔ آپ بھی یہی کہتے ہیں۔" فاروق نے واقعی حیران ہو کر کہا۔

"ہاں! اس کی ایک وجہ ہے۔" وہ مسکرائے۔

"ہم وہ وجہ ضرور سنیں گے۔" منور علی خان نے مسکرا کر کہا۔

"جب کوئی بات مکمل نہیں کر پاتا۔ مطلب یہ کہ ہم

اسے بات مکمل نہیں کرنے دیتے تو سسپنس بہت بڑھ جاتا ہے۔ جی چاہتا ہے۔ یہ خاموش ہو جائیں اور اس کی بات پوری ہو جائے۔ دوسری طرف ان کی باتوں میں بھی ایک لذت ہے۔ یہ بھی جی چاہتا ہے کہ ان کی باتیں کبھی ختم نہ ہوں۔ لہٰذا آدمی خود کو چکی کے دو پاٹوں میں پھنسا محسوس کرنے لگتا ہے۔" پروفیسر داؤد نے وضاحت کی۔

"مطلب یہ انکل کہ آپ کے دو دل ہو جاتے ہیں۔" فرزانہ بولی۔

"میں نہیں سمجھا۔ کسی شخص کے دو دل بھی ہو سکتے ہیں۔"

"محاورۃً ہو سکتے ہیں، انکل۔" فرحت نے چہک کر کہا۔

"خیر ہو سکتے ہوں گے۔ مجھے کیا۔ ہاں تو شوکی۔ تم عینک کے بارے میں کہہ رہے تھے۔"

"جی ہاں! میں اسے بھول گیا تھا۔ تلاش کر رہا ہوں اپنے بیگ میں۔"

"لیکن یہاں تمہیں عینک کی کب ضرورت پیش آ گئی۔ کہیں اچانک نظر تو کمزور نہیں ہو گئی۔" آصف نے جل کر کہا۔

"نن نہیں۔ اللہ نہ کرے۔" شوکی نے گھبرا کر کہا۔

"تو کیا وہ دھوپ کی عینک ہے۔ اس وقت تو اتنی دھوپ بھی نہیں ہے۔ سورج غروب ہونے والا ہے۔"

"یہ بات بھی نہیں۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ مجھے اچانک اپنی عینک کا خیال آگیا تھا۔ اب میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ میں عینک ساتھ لایا ہوں یا نہیں۔"

"لیکن بھائی جان۔ آپ عینک لگاتے ہی کب ہیں؟" مکھن کے لہجے میں بھلا کی حیرت تھی۔

"ارے!!!" ان سب کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"یہ کیا شوکی۔ تم تو عینک لگاتے ہی نہیں۔ پھر کیوں اس کے لیے پریشان ہو رہے ہو؟" خان رحمان نے برا سا منہ بنایا۔

"شکر ہے انکل۔ آپ نے بھی منہ بنایا۔" فاروق نے خوش ہو کر کہا۔

"میرے خیال میں تو اس میں خوش ہونے کی کوئی بات نہیں۔" اشفاق بول اٹھا۔

"لیکن بھئی۔ یہاں غمگین ہونے کی بھی تو کوئی بات نہیں ہے۔" آفتاب نے کہا۔

"اس کے لیے تو یہی کافی ہے کہ ہماری خواتین ان کی قید میں ہیں۔" اخلاق نے مردہ آواز میں کہا۔

"اوہ ہاں۔ بات ٹھیک ہے۔"

"اوہ ہو۔ یہ رہی۔ مل گئی۔" شوکی کی آواز ابھری۔

وہ اپنے بیگ میں ہاتھ ڈالے اس وقت سے ہی عینک تلاش کر رہا تھا۔

"چلو۔ مشکل آسان ہوئی۔ اب اسے سنبھال کر رکھنا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"جی۔ جی ہاں۔ بالکل۔ ضرور سنبھال کر رکھوں گا۔" اس نے خوش ہو کر کہا۔

اتنی دیر میں وہ عینک نکال چکا تھا۔ اسے دیکھ کر سب ہنسنے لگے۔ اس کے فریم میں ایک ایک کے بجائے۔ تین تین شیشے لگے ہوئے تھے۔

"ارے! یہ تو بالکل بچوں کی عینک ہے۔" اخلاق کے منہ سے نکلا۔

"ہم بھی بچے ہی تو ہیں۔" مکھن نے کہا۔

"ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔"

اسی وقت شوکی نے عینک آنکھوں سے لگا لی۔ ساتھ ہی ایک زبردست گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ یوں لگا جیسے بادل زور سے ٹکرائے ہوں۔ لیکن آسمان پر ابر نہیں تھا۔ اور نہ بجلی چمکی تھی۔ پھر یہ گڑگڑاہٹ کیسی تھی۔ ہولناک اتنی تھی کہ ان کے دل زور زور سے دھڑکنے لگے۔ رنگ اڑ گئے۔ پھر یوں لگا کہ جیسے چٹانوں میں زلزلہ آگیا ہو۔ وہ ڈگمگا گئے۔ چند ایک تو

گر ہی پڑے۔ گرنے والوں میں شوکی بھی تھا۔ گرنے کے ساتھ
ہی اس کے منہ سے نکلا:

"ارے۔ مم۔ میری عینک۔"

"حد ہو گئی۔ تمھیں ایسے میں بھی عینک کی پڑی ہے۔"
انسپکٹر کامران مرزا نے جھنا کر کہا۔

شوکی کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکلا۔ وہ گھٹنوں کے بل
جھکا۔ ادھر اُدھر عینک کو دیکھ رہا تھا۔ اسی وقت زلزلہ رُک
گیا۔ ساتھ ہی شوکی کے منہ سے نکلا:

"مم۔ مل گئی۔"

"چلو شکر کرو۔" محمود بولا۔

"یا اللہ تیرا شکر ہے۔" یہ کہہ کر اس نے پھر عینک
لگا لی۔

"ارے۔ اف۔ اوہ۔" اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

آنکڑا

"ہمارے ہاں جب کوئی بیمار ہوتا ہے۔ یا کسی جگر کا آپریشن
کرایا جاتا ہے تو مریض کے منہ سے اسی قسم کے الفاظ
نکلا کرتے ہیں، شوکی۔ کیا تمھیں کوئی تکلیف ہے۔ ہمارے
ساتھ ڈاکٹر ڈومی صاحب بھی موجود ہیں۔" آصف نے ہمدردانہ
لہجے میں کہا۔

"ڈومی رو نہیں۔ محمد عبد اللہ۔" ڈاکٹر صاحب نے فوراً
کہا۔

"اوہ ہاں! معاف کیجیے گا ڈاکٹر صاحب۔ میں تو بھول
ہی گیا تھا۔ آپ تو اللہ کی مہربانی سے مسلمان ہو چکے
ہیں۔"

"ہاں! اس رحیم اور کریم کا شکر ہے۔" وہ بولے، پھر
شوکی کی طرف مُڑے۔

"ہاں مسٹر شوکی۔ میں کچھ خدمت کر سکتا ہوں۔"

"نن نہیں۔ آپ میری مدد نہیں کر سکتے۔" شوکی نے

کہا۔

بات کیا ہے؟"

"مم۔نیں۔" وہ ہکلا کر رہ گیا۔

"ایک تو یہ بڑی الجھن ہے۔تم ہکلائے بغیر بات نہیں کہہ سکتے۔" خان رحمان نے جھلّا کر کہا۔

"جی ہاں۔واقعی۔پتا نہیں۔آپ لوگوں کے سامنے میں کیوں ہکلانے لگتا ہوں۔"

"لیکن بھائی جان۔آپ تو دوسروں کے سامنے بھی ہکلاتے ہیں۔" مکھن رہ نہ سکا۔

"چپ رہو۔موقع محل دیکھ کر بات کرتے ہیں۔" شوکی نے اسے گھورا۔

"جی ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔دراصل میں نے سوچا تھا۔ یہاں موقع محل کہاں ہو گا۔" مکھن نے گھبرا کر کہا۔

"تم نے یہ کیوں کہا شوکی۔کہ ڈاکٹر صاحب تمھاری مدد نہیں کر سکتے۔"

"جی ہاں! اس لیے کہ مجھے کوئی بیماری نہیں ہے۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ابھی جو الفاظ میرے منہ سے نکلے۔ وہ حیرت کے باعث نکلے تھے۔" اس نے کہا۔ عینک اب اس کی آنکھوں پر تھی۔

"کس بات پر حیرت ہوئی تھی۔" انسپکٹر جمشید نے اُسے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر چونک اُٹھے اور ہاتھ بڑھا کر وہ عینک اس کے چہرے سے اُچکا لی۔ اب عینک ان کی آنکھوں پر جا لگی۔

"ابّا جان۔آپ بھی شوق فرمائیں گے۔" فاروق کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ہاں بھئی۔کبھی کبھی بچہ بننے کو جی چاہتا ہے۔دراصل آدمی کتنا بھی بوڑھا ہو جائے۔اس کا بچپن جُوں کا توں موجود رہتا ہے۔وہ اپنے بچپن کو اپنے اندر سے کھرچ کر باہر نہیں پھینک سکتا۔" انھوں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔یہ کہتے ہوئے انھوں نے عینک انسپکٹر کامران مرزا کی طرف بڑھا دی۔

"آپ بھی شوق فرمائیں انسپکٹر کامران مرزا۔"

یہ کہتے ہوئے انھوں نے خود ہی عینک انسپکٹر کامران مرزا کے کانوں پر رکھ دی۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے۔ہم سب پر اس عینک کا بھوت سوار ہو گیا ہے۔" محمود نے حیران ہو کر کہا۔

"ہاں محمود۔تم ٹھیک کہتے ہو۔یہ لو منوّر علی خان۔تم بھی دیکھ لو۔" یہ کہہ کر انسپکٹر کامران مرزا نے عینک ان

کی طرف بڑھا دی۔ جوں ہی انھوں نے عینک میں سے دیکھا۔
ان کے منہ سے زوردار آواز میں نکلا:

"ہائیں یہ کیا؟"

"اوہو۔ کیا ہو گیا ہے آخر؟" خان رحمان نے کہا اور
عینک منور علی خان کے چہرے سے جھپٹ لی۔ جوں ہی
انھوں نے عینک آنکھوں پر لگائی۔ ان کے منہ سے بھی
بے ساختہ انداز میں نکلا:

"نہیں۔"

اب تو باقی لوگوں کا مارے حیرت کے برا حال ہو گیا۔
پروفیسر داؤد نے عینک جھپٹ لی۔ پھر انھوں نے محمود
کو دی۔ محمود نے عینک میں سے دیکھتے ہی فاروق کی
طرف بڑھا دی۔ اسی طرح عینک آفتاب، آصف، فرزانہ اور
فرحت تک پہنچی۔ آخر میں بے چارے ڈاکٹر محمد عبداللہ
کی آنکھوں سے جا لگی:

"یہ۔ یہ۔ یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ اندھیرا تو غائب ہو
گیا ہے۔" ان کے منہ سے بوکھلائے ہوئے انداز میں نکلا۔

○

عینک لگاتے ہی صاف دکھائی دینے لگا تھا۔ جوں ہی عینک
اتاری جاتی۔ پھر آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا جاتا۔ وہ سب کے
سب دھک سے رہ گئے۔ ان کی نظریں شوکی پر جم گئیں۔

"یہ عینک کیا بلا ہے شوکی؟"

"یہ اس اندھیرے کا توڑ ہے۔ یہ اندھیرا کچھ عرصہ پہلے
ہمارے شہر میں بھی آ گیا تھا۔" اس نے کہا۔

"کیا مطلب؟"

اور شوکی نے اندھیرے کی داستان دُہرا دی۔ اس کے
خاموش ہونے پر انسپکٹر جمشید بولے:

"تب یہ اندھیرا اس اصول پر طاری کیا گیا ہے۔ اور
اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ ایٹمی پلانٹ کسی کو نظر نہ
آ سکے۔" یہ کہہ کر انھوں نے عینک لے کر ایک بار
پھر آنکھوں سے لگا لی۔ انھوں نے اپنے سامنے شیشے
کا ایک بہت بڑا خول دیکھا۔ جو کہ گیند کی طرح پہاڑیوں
پر ٹکا ہوا تھا۔ گویا اس خول کے اندر پلانٹ بنایا گیا تھا۔
اس عظیم الشان خول کے چاروں طرف طیارہ شکن توپوں کے
دہانے نظر آ رہے تھے۔ لیکن ان توپوں پر توپیں چلانے
والے موجود نہیں تھے۔ شاید یہ توپیں ریموٹ کنٹرول تھیں۔
خول میں یہاں تک نظر جا سکتی تھی۔ کوئی دروازہ نہیں تھا۔

گویا اس کے اندر داخل ہونے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس گیند نما
خول کے عین اوپر۔ یعنی درمیان میں۔ ایک مینارہ سا بنا ہوا
تھا۔ وہ سنہری رنگ کا تھا اور رخصت ہوتے سورج کی
کرنوں میں چمک رہا تھا۔ چمک اس حد تک تیز تھی کہ
نظر اس پر ٹھہر نہیں رہی تھی۔

"گویا ہمیں اس خول میں داخل ہونا ہے" انسپکٹر جمشید
بڑبڑائے اور عینک انسپکٹر کامران مرزا کو دے دی۔

"خول کے بجائے ہم اسے اوکھلی کیوں نہ کہیں۔"
فاروق بولا۔

"کہہ سکتے ہو۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں" آصف بولا۔

"اور اس خول کے اندر داخل ہونے کا کوئی راستہ نہیں۔
ہمیں ان توپوں سے کوئی خطرہ نہیں۔ کیونکہ ان کے گولے
صرف آسمان کی طرف جا سکتے ہیں۔ ہمیں نشانہ نہیں بنا سکتے۔
لیکن سوال تو یہ ہے کہ جب یہ سارا خول بم پروف ہو
تو توپیں نصب کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اول تو یہ اندھیرے
میں کھڑا ہے۔ پھر بم پروف ہے۔ ان حالات میں تو
یہ ہر خطرے سے محفوظ ہے۔ توپیں لگانے کی کیا تک
تھی۔" انسپکٹر کامران مرزا نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

"اس کا جواب میں دوں گا" پروفیسر داؤد بولے۔ سب

ان کی طرف مڑے۔

"ایسے بم بھی تو ایجاد کیے جا سکتے ہیں جو ایسے بم پروف
خول کو بھی اڑا دیں"

"اوہ! یہ تو بہت ہی سیدھا سادا جواب ہے" خان
رحمان مسکرائے۔

"خیر۔ اب سوال صرف یہ ہے کہ ہم اندر کس طرح
داخل ہوں"

"جس طرح اس عمارت میں کام کرنے والے داخل ہوتے
ہوں گے۔ ہمیں بس یہی معلوم کرنا ہوگا"

"منور علی خان۔ آپ کے پاس رسی کتنی لمبی ہو گی"
انسپکٹر جمشید سوچ میں گم لہجے میں بولے۔

"کک۔ کیوں" وہ ہکلائے۔

"میں چاہتا ہوں۔ آپ رسی کے ایک سرے پر اپنا
آنکڑا باندھ کر اس مینارے پر پھینکیں۔ اس کے لیے ضروری
ہے کہ رسی اس مینارے تک جا سکے"

"ہوں۔ میرا خیال ہے۔ میرے پاس رسی اس سے بھی
زیادہ لمبی موجود ہے، مزے کی بات یہ کہ اس میں
گانٹھیں بھی لگی ہوئی ہیں"

"تو پھر آپ آنکڑا اس میں پھنسائیں"

"ضرور کیوں نہیں؟" انھوں نے کہا اور اپنے شکاری تھیلے
میں سے رسی اور آنکڑا نکال کر اسے باندھنے بیٹھ گئے۔
رسی انڈے کی سفیدی کے رنگ کی تھی اور نہ جانے کس
چیز کی بنی ہوئی تھی۔

"آنکڑا تیار ہے۔ رسی مضبوط اس قدر ہے کہ ایک طاقت
ور گینڈا بھی اسے نہیں توڑ سکتا۔"

"تب اسے آپ ہی پھینکیں گے۔ یہ لیجیے عینک۔"

"شکریہ!" انھوں نے کہا اور اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اس
کا گولا انھوں نے کھول کر اپنے پاؤں کے پاس ڈھیر
کرنا شروع کیا۔ جب پورا گولا کھل گیا۔ تو وہ بولے:

"آپ لوگ ایک طرف ہٹ جائیں۔ آنکڑا اگر کسی کے
لگ گیا تو نئی مصیبت نازل ہو گی۔"

وہ ایک طرف ہٹ گئے۔ منور علی خان نے رسی کو
پکڑ کر آنکڑے کو گھمانا شروع کیا۔ آنکڑا تیزی سے گھومنے
لگا۔ ان کی نظر مینارے پر جمی تھی اور ہاتھ آنکڑے کو
گردش دے رہا تھا۔ دوسرے ان کی طرف دیکھ رہے
تھے۔ انھیں مینارا نظر نہیں آ رہا تھا۔ اب آنکڑے کی
گردش میں بلا کی تیزی آ گئی۔ وہ انھیں نظر بھی نہیں
آ رہا تھا اور پھر منور علی خان نے رسی چھوڑ دی۔

آنکڑا تیر کی طرح مینارے کی طرح گیا۔ لوہے کے لوہے
سے ٹکرانے جیسی آواز گونجی۔ اور منور علی خان کے چہرے
پر مایوسی پھیل گئی۔

"ہم۔ میرا نشانہ خطا گیا ہے۔ آنکڑا مینارے سے کچھ دور
ادھر ہی گر گیا۔" انھوں نے رسی کھینچتے ہوئے کہا۔

"ہوں! خیر کوئی بات نہیں۔ ہم باری باری کوشش کریں
گے۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

جوں ہی آنکڑا ان تک پہنچا۔ انھوں نے رسی منور علی
خان سے لے لی۔ اب وہ وہی عمل کر رہے تھے، جو
منور علی خان نے کیا تھا۔ آخر انھوں نے بھی رسی چھوڑ
دی۔ ایک بار پھر لوہے سے لوہا ٹکرانے کی آواز اُبھری۔
اور انسپکٹر کامران مرزا نے فوراً کہا۔

"آنکڑا مینارے کی نوک پر گرا ہے۔ نیچے نہیں اُترا۔
میں ہلکا سا جھٹکا لگا کر دیکھتا ہوں۔ شاید نیچے گر جائے۔"
ساتھ ہی انھوں نے جھٹکا دیا اور پھر ان کے چہرے
پر بھی مایوسی پھیل گئی۔

"ارے۔ آنکڑا نکل گیا۔"

"کوئی بات نہیں۔ اب میں کوشش کر دیکھتا ہوں۔" انسپکٹر
جمشید بولے۔

اُنھوں نے رسی گھمانا شروع کی۔ آخر آنکڑا چھوڑ دیا۔
آنکڑا مینارے پر گرا، لیکن اوپر ہی اٹک کر رہ گیا۔

"افسوس۔ میرا وار بھی قریب قریب خالی گیا۔ آنکڑا وہیں گرا ہے۔ نیچے نہیں اُترا۔" یہ کہہ کر انھوں نے آہستہ سے جھٹکا دیا۔ اور آنکڑا نیچے گرنے کی بجائے باہر نکل گیا۔

"میں کوشش کرتا ہوں۔ فوج میں ایسے کام کرتے رہے ہیں۔" خان رحمان نے کہا۔

انھوں نے بھی کوشش کی، لیکن ناکام رہے۔

"میرا خیال ہے۔ ہمارے نشانے خطا نہیں جا رہے۔ وجہ کچھ اور ہے۔" انسپکٹر جمشید نے بڑبڑانے کے انداز میں کہا۔

"کیا مطلب؟" وہ چونکے۔

"اس بار ہم اور انداز میں کوشش کریں گے۔ میں آنکڑا پھینکوں گا۔ انسپکٹر کامران مرزا آپ عینک آنکھوں سے لگائے رہیں گے اور بغور مینارے کی طرف دیکھتے رہیں گے۔"

"اس سے کیا ہو گا؟" پروفیسر داؤد نے منہ بنایا۔

"بس دیکھتے جائیے۔" وہ بولے۔

"دیکھیں کیسے۔ ہمیں تو اندھیرا ہی اندھیرا نظر آ رہا ہے۔" انھوں نے بے چارگی کے عالم میں کہا۔

"فکر نہ کریں۔ جلد کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔" وہ بولے۔
اور پھر انھوں نے آنکڑا پھینک دیا۔ اس بار انھوں نے صرف اندازے سے آنکڑا پھینکا تھا۔ عینک تو انسپکٹر کامران مرزا کی آنکھوں پر لگی ہوئی تھی۔ اچانک وہ بولے۔

"آپ کا خیال ٹھیک نکلا۔"

"کیا مطلب؟" ان سب نے چونک کر کہا۔

"آنکڑا بالکل ٹھیک مینارے پر گرا تھا۔ لیکن خول میں سے ایک ہاتھ نکل کر اسے مینارے سے نیچے گرا دیا۔"

"کیا!!!" ان سب کے منہ سے ایک ساتھ چلانے کے انداز میں نکلا۔

"میرا بھی یہی اندازہ تھا۔ ہم اتنے کمزور نشانے والے نہیں ہیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اس طرح تو ہم کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔"

"تب پھر۔" کئی آوازیں اُبھریں۔

"فاروق۔ تم اس خول پر چڑھ سکتے ہو؟" انسپکٹر جمشید نے سوالیہ انداز میں کہا۔

"کک۔ کیا کہہ رہے ہیں ابا جان۔ میرا خیال ہے۔ کوئی شخص بھی رسی وغیرہ کی مدد کے بغیر نہیں چڑھ سکتا۔"

"ہوں۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔ اس عمارت میں اترنے کا

بس وہی ایک راستا ہے۔ یعنی جہاں سے ہاتھ باہر نکلتا نظر آیا ہے۔ لیکن اصل مسئلہ اس جگہ تک پہنچنے کا ہے۔"

"فرزانہ۔ کچھ تم ہی اپنی عقل کو آواز دو۔" فاروق اس کی طرف مڑا۔

"ایٹمی پلانٹ کی عمارت تک پہنچنے کے بعد سب راستے بند ہیں اور میری عقل کے بھی سبھی دروازے بند ہو گئے ہیں۔ کچھ سجھائی نہیں دے رہا۔" اس نے بے چارگی کے عالم میں کہا۔

"ہائیں ہائیں۔ فرزانہ یہ تم کہہ رہی ہو۔"

"فرحت۔ تم ہی آواز دو اپنی عقل کو۔" آصف بولا۔

"مم۔ میں حیران ہوں۔ کیا کہوں۔ کیا نہ کہوں۔" فرحت بڑبڑائی۔

"مم۔ اپنی ایک رائے پیش کر سکتا ہوں ابا جان۔" فاروق نے شریر آواز میں کہا۔

"فرزانہ اور فرحت کو ترکیب سوجھ نہیں رہی۔ تم بتاؤ گے۔ بھئی واہ۔ کیا پدی۔ کیا پدی کا شوربا۔" آفتاب نے برا سا منہ بنایا۔

"سنا فاروق۔ تمھیں پدی کہا گیا۔" آصف مسکرایا۔

"اس وقت یہ کچھ بھی کہہ لے۔ ہم بہت ہی نازک

صورتِ حال سے دوچار ہیں۔ بعد میں دیکھوں گا۔" فاروق نے جل بھن کر بولا۔

"شکریہ۔ میں تمھارے دیکھنے کا انتظار کروں گا۔"

"اوہو بھئی۔ چپ رہو۔" انسپکٹر کامران مرزا نے پاؤں پٹخے۔

"ہاں فاروق۔ کیا کہنا چاہتے ہو۔"

"ادھر آنکڑا پھینکا جائے۔ ادھر رائفل سے اس ہاتھ کو نشانہ بنایا جائے۔" فاروق بولا۔

"ویری گڈ فاروق۔ آج تو تم فرزانہ اور فرحت کو پیچھے چھوڑ گئے۔" خان رحمان چلا اٹھے۔

"واقعی۔ یہ بات ماننا ہو گی۔" فرزانہ بڑبڑایا۔

"فاروق۔ مبارک ہو۔" فرحت نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"شش۔ شکریہ فرحت۔"

اس ترکیب پر عمل کیا گیا۔ آنکڑا انسپکٹر کامران مرزا نے پھینکا۔ گولی انسپکٹر جمشید نے چلائی۔ دونوں اپنے وقت کے بہترین نشانے باز تھے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے انسپکٹر جمشید کا رنگ اڑ گیا۔ ان کے منہ سے نکلا:

"اوہو۔ یہ کیا۔ گولی تو خول کے قریب جاتے ہی پگھل کر نیچے گر گئی۔"

"اوہ۔ اس کا مطلب ہے۔ اس خول کے گرد ایک حصار

قائم کیا گیا ہے۔ گولی بھی اس حصار میں داخل ہوتے ہی پگھل جاتی ہے۔" پروفیسر داؤد نے کہا۔

"ارے باپ رے، پھر تو اچھا ہی ہوا۔ آنکڑا نہیں پھنسا۔" فاروق نے تھرتھر کانپتی آواز میں کہا۔

"کیوں کیوں؟" منور علی خان مسکرائے۔

"ہم۔ ظاہر ہے۔ اسی کے ذریعے مجھے ہی مینارے کی طرف روانہ کیا جاتا۔ اور۔ اور میں پگھل جاتا۔" اس نے ڈرے ڈرے انداز میں کہا۔ پروفیسر داؤد بے ساختہ ہنس پڑے۔ اور بولے۔

"نہیں بھئی۔ تم لوہے کے بنے ہوئے نہیں ہو۔"

"آپ کا مطلب ہے۔ انسانی جسم نہیں پگھلے گا۔"

"بالکل نہیں۔ اس صورت میں تو وہ ہاتھ پہلے پگھلتا۔" انھوں نے جواب دیا۔

"اوہ ہاں! آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔"

"اس کا مطلب فاروق کی تدبیر سے بھی ہم کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکے۔" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔

"اس میں میرا کیا قصور۔ میرا کام تو صرف ترکیب بتانا تھا۔" فاروق نے مسمسی صورت بنائی۔

"اب۔ اب کیا کیا جائے۔"

عین اسی وقت انھوں نے ایک مدھم سی آواز سنی۔ آواز فضا سے آ رہی تھی۔ وہ چونک اُٹھے۔ انھوں نے اوپر دیکھا۔ آخر دور سے ایک ہیلی کاپٹر آتا نظر آیا۔ پھر وہ اندھیرے میں داخل ہوا اور ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ عینک اس وقت انسپکٹر جمشید کی آنکھوں پر تھی۔ انھوں نے فوراً کہا۔

"میں اب بھی ہیلی کاپٹر دیکھ رہا ہوں۔ اس کا رخ مینارے کی طرف ہے۔ اور اب وہ مینارے کے عین اوپر کافی فاصلے پر رُک گیا ہے۔ مطلب یہ کہ زیادہ نیچے نہیں آیا۔ اب اس پر سے سیڑھی لٹکائی گئی ہے۔ اور میں ایک آدمی کو نیچے اُترتے دیکھ رہا ہوں۔ وہ مینارے کے پاس اتر گیا ہے۔ ارے۔ وہ تو خول میں اُتر رہا ہے۔ اوہو۔ شاید یہی وقت ہے۔ آنکڑا پھینکنے کا۔ وہاں موجود شخص ضرور آنے والے کی طرف متوجہ ہو گا۔" یہ کہتے ہی انھوں نے رسی اٹھائی۔ تیزی سے گردش دیتے ہوئے مینارے کی طرف پھینک ماری۔ کھٹکے کی آواز گونجی۔ دوسرے ہی لمحے انسپکٹر جمشید نے چلّا کر کہا۔

"آنکڑا مینارے میں پھنس گیا ہے۔"

فاروق فاروق

"وہ مارا۔" محمود نے چلا کر کہا۔

"اب آئے گا مزا۔" آصف بولا۔

"بھئی اس قدر خوش ہونے کی ضرورت نہیں۔ ابھی بہت مشکل مرحلہ باقی ہے۔" فاروق نے پریشان آواز میں کہا۔

"فاروق بھائی ٹھیک کہ رہے ہیں۔" شوکی بولا۔

"تو کیا ابا جان۔ اس بار وہ ہاتھ نظر نہیں آیا۔"

"نہیں۔" وہ بولے۔

"لیکن انکل۔ آنے والے شخص سے فارغ ہو کر بھی تو وہ شخص آنکڑا نکال کر پھینک سکتا ہے۔"

"اب اسے نکالنا اتنا آسان کام نہیں ہو گا۔" منور علی خان نے فوراً کہا۔

"جی۔ وہ کیسے؟" اخلاق پُر جوش انداز میں بولا۔

"اس طرح کہ آنکڑا کوئی عام آنکڑا نہیں ہے۔ میں نے اسے خاص ترکیب سے بنایا ہے۔ دوسرے یہ کہ ادھر سے ہم

رسی کو پوری طرح کھینچ کر ایک چٹان سے باندھ دیتے ہیں۔ اس کی کھچاوٹ کی وجہ سے بھی آنکڑا مینارے میں سے نہیں نکل سکے گا۔" منور علی خان بولے۔

"اوہو۔ ہوشیار۔ وہ اسے نکالنے کی کوشش کر رہا ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔ عینک ان کی آنکھوں پر تھی۔

منور علی خان نے فوراً رسی کو کھینچ لیا۔ انسپکٹر کامران مرزا اور خان رحمان بھی ان کے ساتھ مل کر رسی کھینچنے لگے۔ پھر منور علی خان نے رسی کو ایک چٹان کے گرد باندھ دیا۔

اسی وقت انھوں نے ہیلی کاپٹر کو اونچا ہوتے دیکھا۔ وہ واپس جا رہا تھا۔ گویا ہیلی کاپٹر اس شخص کو یہاں تک لایا تھا۔ اور اس کا مطلب یہ تھا کہ سائنس دان وغیرہ اس طرح اس عمارت تک آتے تھے۔

"ہم نے ایک میدان مار لیا ہے۔ اب دوسرا میدان رہ گیا۔ یعنی اس جگہ تک پہنچنا۔ اور صاف ظاہر ہے۔ اس کام میں پہل فاروق کرے گا۔"

"ایک تو میں اس 'صاف ظاہر ہے' سے تنگ آ گیا ہوں۔" فاروق نے تنگ کر کہا اور سب مسکرانے لگے۔

"فاروق بسم اللہ کرو۔ وقت کم ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"آپ نے یہ بھی سوچ لیا ہے کہ یہ رسی کس قدر باریک

ہے۔ میرے ہاتھ کٹ گئے تو میں سیکڑوں فٹ گہری کسی کھائی میں جا گروں گا۔ دوسرے یہ کہ جو ہاتھ آنکڑا ہٹاتا رہا ہے۔

"وہ ہاتھ کیا مجھے نہیں روکے گا؟" فاروق نے پریشان ہو کر کہا۔

"سبھی کچھ ممکن ہے فاروق۔ اس کے باوجود ہمیں وہاں تک پہنچنا ہے، تاہم اگر مینارے کے پاس تمہیں روکا جائے تو تم واپس آ سکتے ہو۔" وہ بولے۔

"اور واپس آنا ذرا بھی مشکل نہیں ہو گا۔ بس تمہیں صرف پھسلنا ہو گا۔" آفتاب مسکرایا۔

"اور رسی کے ذریعے اوپر چڑھنا؟" فاروق جل کر بولا۔

"اس کے بارے میں میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ انکل منور علی خان شاید کچھ بتا سکیں۔ کیوں انکل؟" آفتاب نے شوخ آواز میں کہا۔

"جہاں تک میرا خیال ہے۔ یہ ایک انتہائی مشکل کام ثابت ہو گا۔" وہ بولے۔

"شکریہ انکل۔ کم از کم آپ نے تو میرا خیال کیا۔" فاروق خوش ہو کر بولا۔

"یہ بات نہیں فاروق۔ خیال ہم سبھی کو ہے۔ لیکن ہم مجبور ہیں۔ اپنے دینِ اسلام، ملک اور قوم کے لیے ہمیں جان

بھی دینا پڑی تو دیں گے۔" انسپکٹر جمشید نے جذباتی آواز میں کہا۔

"اگر یہ بات ہے تو میں چلا۔" فاروق نے پُرعزم لہجے میں کہا۔

"ٹھہرو بھئی۔ اس طرح کیسے جا سکتے ہیں۔ ایک پستول اور یہ عینک ساتھ لے کر جاؤ۔" خان رحمان نے بے چین ہو کر کہا۔

"لیکن انکل۔ پستول وہاں کیا کام دے گا؟"

"اوہ ہاں۔ خیر کوئی خنجر ونجر ہونا چاہیے۔"

"یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ آنکڑا خول کے حصار میں جا کر کیوں نہیں پگھلا؟" ایسے میں شوکی نے پوچھا۔

"گولی آگ کی طرح گرم ہوتی ہے۔ آنکڑا ذرا بھی گرم نہیں ہوتا۔ شاید اس لیے۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"شکریہ انکل۔ کم از کم مجھے ایک اطمینان ضرور ہے۔ اور وہ یہ کہ میں پگھلوں گا نہیں۔" فاروق نے شوخ آواز میں کہا۔

"شاباش فاروق۔ تم ان حالات میں بھی چہک سکتے ہو۔ یہی زندگی ہے۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"اب سوال یہ ہے کہ ہم فاروق کو ہتھیار کے طور

پر کیا دیں۔ ہمارے پاس تو اسے دینے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ محمود کا چاقو ہم گنوا چکے ہیں۔ وہ تو اب واپس جانا نصیب ہوا تو نیا بنوائیں گے۔ پستول اس کے کام نہیں آ سکے گا۔ تیر کمان بھی کیا کام دیں گے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ابا جان۔ آپ ایک پستول ہی دے دیں۔ خالی پستول۔ کم از کم میں اس کی نالی تو دشمن کے منہ پر رسید کر سکوں گا۔"

"اسے کہتے ہیں بھاگتے چور کی لنگوٹی ہی سہی۔" آفتاب بولا۔

"جہاں تک میرا خیال ہے۔ اسے بھاگتے چور کی لنگوٹی ہی سہی نہیں کہتے۔ بلکہ" آصف نے کہنا چاہا، لیکن انسپکٹر کامران مرزا نے جھلا کر اس کی بات کاٹ دی۔

"اوہو۔ کہتے ہوں گے کچھ۔"

فاروق نے پستول جیب میں رکھا، ان سب پر ایک نظر ڈالی اور بولا:

"اللہ حافظ۔"

"اللہ حافظ۔" ان سب کے منہ سے نکلا۔

وہ مڑا اور رسی کو پکڑ کر لٹک گیا۔ اس قسم کے

کام وہ پہلے بھی بہت کر چکا تھا۔ ہمت ہارنا انھوں نے نہیں سیکھا تھا۔ وہ ایک ایک ہاتھ کر کے آگے کھسکتا رہا۔ رسی اسے گوشت میں اترتی محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن ظاہر ہے، صرف محسوس ہو رہی تھی۔ گوشت میں اتر نہیں رہی تھی۔

ادھر وہ سب باری باری اسے دیکھ رہے تھے۔ ان کے دل زور زور سے دھڑک رہے تھے، ایسے میں اگر فاروق نیچے گر جاتا تو اس کی ہڈیاں سرمہ بن جاتیں۔ کیونکہ نیچے گہری کھائیاں تھیں۔ نوکیلی چٹانیں تھیں۔ خار دار جھاڑیاں تھیں۔

فاروق کے بازو شل ہوتے جا رہے تھے۔ حواس جواب دیتے جا رہے تھے کہ اچانک اس کے پاؤں خول سے جا لگے۔ اب تک اس کے پاؤں فضا میں لٹکتے رہے تھے۔ جوں ہی اس کے پاؤں ٹکے۔ اس کی جان میں جان آ گئی۔ اس نے چیخ کر کہا۔

"میں۔ خول تک پہنچ گیا ہوں ابا جان۔"

"شاباش فاروق۔ ہمت سے کام لو۔"

"اب فکر کی کوئی بات نہیں ہے ابا جان ــــ باقی فاصلہ طے کرنا میرے لیے مشکل نہیں ہو گا۔ اور ہاں۔

یہاں مجھے عینک کی ضرورت نہیں - اس کے بغیر بھی نظر آ رہا ہے۔"

"تب تم عینک رسی میں پرو کر سرکا دو - یہ ہم تک پہنچ جائے گی - اس طرح ہم تمہیں اوپر جاتے دیکھ تو سکیں گے۔"

"بہت بہتر - سنبھالیے اسے - آ رہی ہے۔" فاروق نے کہا - ایک ہاتھ سے رسی کو سنبھالا اور دوسرے سے عینک رسی میں پرو دی - عینک تیر کی طرح نیچے کی طرف چلی - ایک منٹ بعد انسپکٹر جمشید کی آواز سنائی دی:

"یہ ہم تک پہنچ گئی ہے فاروق۔"

"چلیے - یہ بھی ٹھیک رہا۔" فاروق نے کہا اور آگے بڑھنے لگا۔

اب ان سب نے قدرے سکون کا سانس لیا - کیونکہ اب فاروق کے پاؤں اس گنبد پر تھے - اور رسی کے سہارے وہ اوپر چڑھ رہا تھا - ان کے دل بری طرح دھڑک رہے تھے - سانس سینوں میں اٹک اٹک رہے تھے - آخر ایک ایک قدم کر کے - فاروق مینارے کے نزدیک پہنچ گیا - اس نے ابھی تک نیچے دیکھنے کی

کوشش نہیں کی تھی - یہاں پہنچ کر اتفاقیہ طور پر اس کی نظر نیچے جا پڑی - اسے گنبد اپنے پاؤں کے نیچے سے نکلتا محسوس ہوا - وہ سیکڑوں فٹ کی اونچائی پر تھا - اس نے اوپر دیکھا - اور دھک سے رہ گیا - نیلے لباس میں ایک شخص مینارے کے ساتھ کھڑا تھا - اس کے دانت نکلے پڑ رہے تھے - چہرے پر ایک شیطانی مسکراہٹ تھی - فاروق ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا رہا - ایسے میں اس نے شوخ آواز میں کہا،

"میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔

○

جواب میں فاروق سنجیدہ انداز میں مسکرا دیا اور بولا:

"اور میں آ گیا ہوں۔"

"مجھے اس پر بھی بہت حیرت ہے کہ تم یہاں تک آ گئے ہو۔" وہ بولا۔

"تو تمہیں اور کس بات پر حیرت ہے۔" یہ کہتے ہوئے فاروق نے ایک ہاتھ رسی پر سے اٹھا لیا، اور غیر محسوس طور پر جیب کی طرف لے گیا۔

"میرا خیال تھا۔ تم یہاں تک آنے کی حماقت نہیں کرو گے۔ لیکن جب تم چل پڑے تو میں نے تم لوگوں کو بہت بڑے احمق خیال کیا۔ مجھے یقین تھا کہ تم یہاں تک ہرگز نہیں پہنچ پاؤ گے۔ درمیان میں ہی کہیں گر جاؤ گے۔"

"خیر۔ اب کیا پروگرام ہے؟"

"میں اس دروازے کا نگران ہوں۔ مجھے یہ حکم ہے کہ کسی اجنبی کو اندر داخل نہ ہونے دوں۔ صرف وہ لوگ یہاں آسکتے ہیں جو آنے کا حق رکھتے ہیں اور ایسے لوگ ہیلی کاپٹر کے ذریعے آتے ہیں۔"

"لیکن ہیلی کاپٹر کے ذریعے آنے والے بھی تو غلط لوگ ہو سکتے ہیں۔"

"ہو سکتے ہیں، لیکن اندر داخل نہیں ہو سکتے۔ میں مینار کے نیچے بنے زینے پر ہوتا ہوں۔ اندر بیٹھا آنے والے سے بات چیت کر سکتا ہوں۔ جب تک پورا اطمینان نہیں ہو جاتا، اس وقت تک دروازہ نہیں کھولتا۔ اطمینان کے لیے چند خاص مخصوص جملے دُہرانا پڑتے ہیں۔"

"اور وہ جملے کیا ہیں؟"

"سوال۔ یہ بات کسی کو نہیں بتائی جا سکتی۔"

"ابھی ابھی ہیلی کاپٹر سے کون آیا تھا؟"

"ہمارے ایک بہت بڑے سائنس دان۔"

"شکریہ۔ میں اب آگے بڑھنے لگا ہوں۔ اگر تم میں ہمت اور صلاحیت ہے تو مجھے روک لو۔"

"ہاں کیوں نہیں۔ میں ایسا ضرور کروں گا۔"

فاروق اس وقت تک پستول نکال چکا تھا۔ اس نے بھی اس کے ہاتھ میں پستول دیکھ لیا۔

"اوہو۔ تم اس پستول کے ذریعے میرا مقابلہ کرو گے۔" وہ ہنسا۔

"خیال تو یہی ہے۔"

"یہ جانتے ہوئے بھی کہ پستول کی گولی یہاں پگھل کر گر جاتی ہے۔"

"میں گولی چلاؤں گا ہی کیوں۔" فاروق بولا۔

"تب پھر کیا اسے میرے سر پر مارو گے۔ وہ بھی ایک ہاتھ سے۔ کیونکہ دوسرا ہاتھ تو تمہارا رسی پر ہو گا۔"

"یہ ٹھیک ہے۔ لیکن ان باتوں کا آخر مقصد کیا ہے۔ کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ میں واپس ہو جاؤں۔"

"ارے نہیں۔ یہاں آنے کے بعد یا تو تم نیچے جا گرو گے یا پھر میرے ہاتھوں مارے جاؤ گے۔ اس کے علاوہ

تیسری کوئی صورت نہیں۔"

"اللہ مالک ہے۔"

"تم لوگ بات بات میں اللہ مالک ہے بہت کہتے ہو۔" اس نے منہ بنایا۔

"اور ہمارے پاس ہے ہی کیا۔" فاروق مسکرایا۔

"اچھا آؤ۔ تم بھی کیا یاد کرو گے۔" اس نے دونوں ہاتھ پھیلا دیے۔ وہ خود سیڑھیوں میں کھڑا تھا۔ مینارے کے نیچے سیڑھیاں بنی تھیں اور ایک آدمی کے برابر اندر جانے کے لیے راستا بنایا گیا تھا۔ اس حصہ کا شیشے کا خول صندوق کے ڈھکنے کی طرح اوپر اٹھا ہوا تھا۔ گویا اس پورے گنبد میں بس یہی ایک دروازہ تھا۔

"شاید تم نہیں جانتے۔ ہم کون ہیں۔ ہم وہ ہیں جو ریوٹا، شیلاک اور رونل کو اب تک موت کے گھاٹ اتار اتار چکے ہیں۔" فاروق نے اس پر رعب جمانے کے لیے کہا۔

"کیا کہا۔ موت کے گھاٹ اتار چکے ہو۔" اس کے لہجے میں بلا کی حیرت در آئی۔

"ہاں! کیا تمہیں نہیں معلوم۔" فاروق بولا۔

"نہیں! مجھے نہیں معلوم۔ شاید تم لوگ خوابوں کی دنیا میں

رہتے ہو۔" اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"یہ شان دار اندازہ کس طرح لگا لیا۔" فاروق بولا۔

"اس لیے کہ مسٹر رونل تم جیسے لوگوں کے ہاتھوں سے نہیں مر سکتے۔"

"تو پھر کس قسم کے لوگوں کے ہاتھوں سے مر سکتے ہیں۔" فاروق نے بُرا سا منہ بنایا۔

"وہ دوسروں کے ہاتھوں مرنے کے لیے پیدا ہی نہیں ہوئے تھے۔" اس نے ہنس کر کہا۔

"اب میں یہ کہوں گا کہ تم شدید قسم کی غلط فہمی میں مبتلا ہو۔ دراصل ریوٹا، شیلاک اور رونل مر چکے ہیں اور اب تمہاری باری ہے۔ میں آ رہا ہوں۔ مجھے روک سکتے ہو تو روک لو۔"

"آؤ۔ میں تمہارے استقبال کے لیے بالکل تیار ہوں۔" اس نے کہا۔

فاروق نے ایک نظر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ وہ اگرچہ اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ لیکن ظاہر ہے، ان میں سے صرف ایک اسے دیکھنے کے قابل تھا۔ اس نے اللہ کو یاد کیا اور آگے بڑھا۔ ساتھ ہی اس نے دشمن کے ہاتھ میں خنجر کی چمک محسوس کی۔ ایک لمحے کے لیے اس نے خوف

محسوس کیا۔ پھر سر کو جھٹکا دیا۔ اس کے پاس لے دے
کے ایک پستول تھا جس کی نال سے وہ دشمن پر وار کر سکتا
تھا اور یہ نال دشمن کو کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا سکتی تھی۔
اور پھر اس کا دوسرا ہاتھ آزاد نہیں تھا۔ اس نے اس
سے رسی پکڑی ہوئی تھی۔ گویا اسے صرف ایک ہاتھ سے
مقابلہ کرنا تھا۔ جب کہ وہ پیروں سے ادھر اُدھر بھی
نہیں ہو سکتا تھا۔ دوسری طرف دشمن اس سے لمبا چوڑا
اور طاقت ور تھا۔ اور اس کے ہاتھ میں خنجر بھی تھا۔
وہ اپنے پیروں پر بھی کھڑا تھا۔ اس کا دوسرا ہاتھ بھی
آزاد تھا۔ اس کے باوجود فاروق آگے بڑھ رہا تھا۔

"شاید تمہارا دماغ چل گیا ہے۔" دشمن نے عجیب سے
انداز میں کہا۔

"وہ کیوں؟" فاروق بولا۔

"اس لیے کہ تم جان بوجھ کر موت کی طرف قدم بڑھا
رہے ہو۔"

"تب پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

"واپس چلے جاؤ۔"

"میں اپنے ساتھیوں کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ اور ساتھیوں
کی بات تو بعد کی ہے۔ اپنے اللہ اور اس کے رسولؐ

کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ نہیں نہیں۔ یہ مجھ سے نہیں ہو گا۔ میں
واپس نہیں جاؤں گا۔"

"تو پھر آؤ۔ موت کا فرشتہ تمہاری روح قبض کرنے
کے لیے تیار ہے۔"

"شکریہ۔ کس کو معلوم ہے۔ موت کس کی آئی ہے۔"
فاروق نے گنگنانے کے انداز میں کہا۔

اب وہ اس سے اتنا نزدیک پہنچ گیا تھا کہ دونوں
ایک دوسرے پر وار کر سکتے تھے۔ دشمن نے اسے
مہلت نہ دیتے ہوئے پہلا وار کیا۔ خنجر والا ہاتھ فاروق کی
طرف بجلی کی طرح آیا، نشانہ گردن کا لیا گیا تھا۔ فاروق
نے فوراً رسی والا ہاتھ پیچھے سرکا لیا اور جہاں تک ممکن
تھا۔ نیچے جھک گیا۔ خنجر اس کی گردن سے ایک انچ
کے فاصلے سے گزر گیا۔

"ذرا سوچو۔ اگر میں خنجر سے یہ رسی کاٹ دوں تو کیا
ہو گا؟"

"اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہو گا کہ میں مر جاؤں
گا۔" فاروق نے کہا۔

"تو پھر آؤ۔ پیچھے کیوں ہٹ گئے ہو۔" وہ بولا۔

"آ رہا ہوں۔ فکر نہ کرو۔" اس نے کہا اور آگے بڑھا۔

اس کی نظریں دشمن پر جمی تھیں۔ خنجر اس وقت پستول
سے زیادہ خطرناک تھا۔ پستول ایک ننھی سی سلاخ سے
زیادہ کام نہیں دے سکتا تھا۔ لیکن فاروق کر ہی کیا
سکتا تھا۔ جوں ہی وہ آگے بڑھا، دشمن نے پھر اسی رخ
سے وار کیا۔ دوسری طرف اس کے سب ساتھی بے قراری
کے عالم میں بار بار عینک اِدھر سے اُدھر کر رہے تھے۔
انسپکٹر جمشید نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا:

"ہم۔ مجھ سے بہت بڑی غلطی ہو گئی۔ فاروق کی
بجائے مجھے جانا چاہیے تھا۔ میں نے فاروق سے اس
کی طاقت سے کہیں بڑھ کر کام لے لیا ہے۔"

"ہمت نہ ہارو جمشید۔ فاروق ڈٹا ہوا ہے۔" پروفیسر داؤد
نے عینک آنکھوں سے لگاتے ہوئے کہا۔ ساتھ ہی انسپکٹر
کامران مرزا نے بے چینی کی حالت میں عینک کی طرف
ہاتھ بڑھا دیا۔

اس مرتبہ فاروق نے نیا کام کیا۔ اِدھر اُدھر جھکنے کی
بجائے پستول کی نال خنجر کی دھار کے سامنے کر دی۔ خنجر
پستول سے ٹکرایا۔ فاروق نے فوراً ہاتھ پیچھے ہٹا لیا۔ یہ
اقدام بہت بروقت تھا۔ دشمن لڑکھڑا گیا۔ فاروق نے
آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ پستول کا بھرپور وار خنجر والے ہاتھ پر

کر دیا۔ پستول کی نال پوری طاقت سے اس کے ہاتھ پر لگی۔ اس
کے منہ سے ہلکی سی ایک چیخ نکل گئی۔ خنجر ہاتھ سے چھوٹ
کر گنبد سے ٹکرایا اور نیچے کی طرف چلا۔ دشمن نے خوف زدہ
انداز میں نیچے جاتے خنجر کو دیکھا اور تیزی سے نیچے بیٹھ
گیا۔ فاروق آگے ہو گیا۔ وہ دروازہ بند کرنے کی فکر میں
ہے۔ تیزی سے آگے بڑھا۔ ادھر دروازہ صندوق کے
ڈھکنے کی طرح گر رہا تھا۔ اس نے فوراً اپنا پاؤں آگے
کر دیا۔ اور اسی کو چھوڑ کر مینارے کو پکڑ لیا۔ ساتھ ہی
دوسرا پیر بھی دروازے میں اڑا دیا۔ دشمن نے ٹکّے اس
کی ٹانگوں پر برسا دیے۔ لیکن فاروق نے تکلیف کو پی گیا
اور پیر نہ کھسکائے۔ پھر توازن برقرار رکھتے ہوئے اس
نے مینارے کو بھی چھوڑ دیا اور یک لخت نیچے بیٹھ گیا۔
اب وہ دشمن کے ساتھ اندر تھا۔ اس نے پستول والا
ہاتھ اٹھایا اور اس کے منہ پر دے مارا۔ وہ ترچھا ہو
گیا۔ پستول سیڑھی پر لگا۔ اس نے مکّا فاروق کی ٹھوڑی
پر مارا۔ جگہ بہت کم تھی۔ اِدھر اُدھر ہونا اتنا آسان نہیں
تھا۔ لہٰذا یہ مکّا فاروق کو ٹھوڑی پر وصول کرنا پڑ گیا۔
اس کا سر زور سے چکرایا۔ اور دشمن نے دونوں ہاتھ
اس کے پستول والے ہاتھ پر جما دیے۔ وہ اس سے

پستول چھیننا چاہتا تھا۔ یہی اس نے غلطی کی۔ ایسا کرتے
وقت وہ یہ بھول گیا کہ فاروق کا ایک ہاتھ اور بھی ہے۔
دوسرے ہی لمحے بائیں ہاتھ کا مُکّا اس کی ناک پر
پورے زور سے لگا۔ اس کے دونوں ہاتھ اس کے ہاتھ
سے ہٹ گئے اور ناک پر جا لگے۔ بس پھر کیا تھا۔ فاروق
نے پستول کئی بار اس کے سر پر بجا دیا۔ اور اس وقت
تک بجاتا چلا گیا جب تک کہ وہ بے ہوش نہ ہو گیا۔ اسے
بے ہوش ہوتے دیکھ کر فاروق نے اطمینان کا سانس لیا
اور اوپر اٹھا۔ دروازے سے نکل کر اس نے فاتحانہ انداز
میں ہاتھ ہلایا اور انھیں آنے کا اشارہ کیا۔ اس نے اپنے
ساتھیوں کو بھی ہاتھ ہلاتے دیکھا۔ اور پھر اپنے والد
کو آتے دیکھا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے سیڑھیوں پر
بھاری قدموں کی آواز سنی۔ وہ چونک اٹھا۔ گھبرا کر نیچے
دیکھا۔ دو گوریلا نما انسان چلے آ رہے تھے۔ ان کے رنگ
بالکل سیاہ تھے۔ موٹی موٹی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک
رہی تھیں۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں خنجر تھے۔ یہی نہیں۔
دو اور گوریلے ان کے پیچھے تھے۔

تنگ سی جگہ اور مقابلے میں چار خنجر۔ فاروق چکرا گیا۔
اس نے پستول والا ہاتھ تول لیا:

"نہیں بچو۔ اب تم ہاتھ نہیں چلا سکو گے۔ باس نیچے
اس جنگ کو بخوبی دیکھ چکا ہے اور اب پوری فوج اس
طرف آ رہی ہے۔ تم لوگوں کی ہڈیاں سُرمہ بن جائیں گی۔"
فاروق دھک سے رہ گیا۔ اچانک اس نے چیخ کر کہا۔
"رک جائیے ابا جان۔ رک جائیے۔ اس طرف نہ آئیے۔
میں خطرے میں گھر گیا ہوں۔ ان لوگوں کو ہماری یہاں تک
آمد کی اطلاع ہو گئی ہے اور ان کے باس نے بہت سے
آدمی یہاں بھیج دیے ہیں۔"

فاروق کی آواز فضا میں مرتی چلی گئی۔ پہلے انسپکٹر جمشید
کے کانوں سے ٹکرائی اور پھر دوسروں کے کانوں سے۔
انسپکٹر جمشید نے بلند آواز میں کہا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے فاروق۔ تم موت کے منہ میں
ہو اور میں ادھر کھڑا دیکھتا رہوں۔ نہیں فاروق۔ کوئی
باپ ایسا نہیں کر سکتا۔ میں آؤں گا۔ مجھے آنا ہو گا۔"

"ابا جان۔ یہاں بہت خطرہ ہے۔ فی الحال صرف میں
پھنسا ہوں۔ پھر سب پھنس جائیں گے۔"

"پروا نہیں۔ میں نہیں رک سکتا۔ ہاں میں دوسروں کو
روکے دیتا ہوں۔" انھوں نے کہا اور پھر منہ باقی ساتھیوں
کی طرف کرتے ہوئے بولے:

"آپ لوگ اس طرف سے آنے کا خیال ترک کر دیں۔ کوئی اور راستا تلاش کریں۔ میں فاروق کو موت کے منہ میں نہیں دیکھ سکتا۔ اس لیے مجھے جانا ہو گا۔"

ان کے سنسنی خیز الفاظ سُن کر وہ سکتے میں آ گئے۔ آخر محمود چلّایا:

"یہ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے ابّا جان۔ میں نہیں رک سکتا۔"

"محمود۔ تم اب وہی کرو گے۔ جو تمھارے انکل تم سے کہیں۔" انسپکٹر جمشید جھلّا کر بولے۔

"انکل۔ مجھے اجازت دیں۔"

"تمھارا انکل اتنا سنگ دل نہیں کہ تمھیں تو اجازت دے دے اور خود یہاں مزے سے کھڑا رہے۔ پہلے میں جاؤں گا۔ میرے بعد یہاں کے انچارج خان رحمان ہوں گے۔ وہ جیسا کہیں کرنا۔" یہ کہہ کر وہ منور علی خان کی طرف مُڑے:

"یہ رسی دو آدمیوں کا وزن برداشت کرے گی نا؟"

"ہاں! کیوں نہیں۔ دو سے بھی زیادہ۔ ویسے کامران مرزا۔ کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ تمھاری بجائے میں جاؤں۔" منوّر علی خان بھرّائی ہوئی آواز میں بولے۔

"نہیں۔ پہلے میں جاؤں گا۔" انھوں نے کہا اور رسی

سے لٹک گئے۔ اب وہ دونوں قدرے فاصلے سے آگے بڑھ رہے تھے۔ ادھر دشمن برابر اوپر پہنچ رہے تھے۔

"کیوں نہ ہم رسی کاٹ دیں۔" ایک دشمن نے کہا۔

"باس نے منع کیا ہے۔ ان کا حکم ہے۔ جو آتا جائے۔ ہلاک کرتے جاؤ۔"

"تب پھر اسے یہاں کس لیے رکھا ہے۔ دروازے پر کھڑا کر کے نیچے دھکا دے دو۔" ایک بولا۔

"اوہ ہاں ٹھیک ہے۔ چلو اٹھو۔ کہاں مزے سے بیٹھے ہو۔" ایک نے غرّا کر کہا۔

"ضرور ضرور۔ کیوں نہیں۔" فاروق نے مسکرا کر کہا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ پستول ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ کسی نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ لمبے تڑنگے دو دشمنوں نے اسے دائیں اور بائیں ہاتھ سے پکڑا۔ ان کے ایک ایک ہاتھ میں ایک ایک خنجر بھی تھا۔ وہ اسے گھسیٹتے ہوئے دروازے تک لے آئے۔ اور دھکا دینے کے لیے تیار ہو گئے۔

"تمھارے اس لڑکے کو ہم نیچے پھینک رہے ہیں۔ اطلاعاً عرض ہے۔" ایک دشمن چلّا کر بولا۔

"اس سے بڑھ کر بزدلی کیا ہو گی۔" انسپکٹر جمشید

نے بلند آواز میں کہا۔

"یہ بزدلی نہیں۔ حکمتِ عملی ہے۔" ایک نے ہنس کر کہا۔

"اگر تم لوگوں نے اسے نیچے پھینکا تو میں تم میں سے ایک کو بھی نیچے پھینکے بغیر نہیں رہوں گا۔ یہ سن لو۔" انسپکٹر جمشید غرائے۔

"تم اس قابل کب رہو گے۔ ادھر تم نزدیک پہنچے، اُدھر ہمارے خنجر کا نشانہ بنے۔ پھینک دو اسے نیچے۔" اس نے چلا کر کہا۔

دونوں گوریلے۔ جو فاروق کو کھینچ کر دروازے تک لائے تھے۔ ابھی تک اس کے ہاتھ پکڑے کھڑے تھے۔ جوں ہی اس نے محسوس کیا۔ وہ اسے دھکا دینے لگے ہیں۔ اس نے فوراً اپنے دونوں ہاتھ چھڑائے اور ان کی گردنوں میں ڈال دیے۔ بس پھر کیا تھا۔ اس کے ساتھ وہ بھی لڑکھڑائے اور نیچے کی طرف چلے۔ تینوں کے منہ سے ہولناک چیخیں نکلیں۔ دوسرے ہی لمحے وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

انسپکٹر جمشید ساکت رہ گئے۔ ادھر عینک محمود کے ہاتھ میں تھی۔ وہ پوری قوت سے چیخا:

"فاروق۔ میرے بھائی۔"

"وہ۔ وہ۔ نیچے جا پڑا ہے۔"

"ن۔ نہیں۔" وہ سب ایک ساتھ چلائے۔

"یہ۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ نہیں۔" پروفیسر داؤد نے رو کر کہا۔

"فاروق نہیں مر سکتا۔ نہیں مر سکتا۔" خان رحمان نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

"یا الٰہی رحم۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"ہمت نہ ہارنا ساتھیو۔ ہم اس دنیا میں ہمیشہ رہنے کے لیے نہیں آئے۔ ایک فاروق ہم سے جدا ہو گیا تو کیا۔ ابھی ہم میں کئی فاروق موجود ہیں۔" انسپکٹر جمشید نے بلند آواز میں کہا اور تیزی سے آگے بڑھنے لگے۔

"میں بھی آپ کے پیچھے ہی ہوں۔ فکر نہ کریں۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

چٹان پر کھڑے ساتھی آہستہ انداز میں آنسو بہا رہے تھے۔ آنسو خود بخود ان کی آنکھوں سے بہ رہے تھے۔ ان آنسوؤں میں فاروق کا چہرہ تیر رہا تھا۔ ہنستا مسکراتا چہرہ۔ جملے پر جملہ کستا ہوا چہرہ۔ ادھر انسپکٹر جمشید کے چہرے پر ایک عجیب سا ٹھہراؤ تھا۔ ان کی آنکھوں میں ابھی تک کوئی آنسو نہیں آیا تھا۔ وہ برابر آگے بڑھ رہے تھے:

"انسپکٹر جمشید۔ کیا آپ فاروق کی موت پر روئیں

گے نہیں۔ دو آنسو بھی نہیں بہائیں گے۔" انسپکٹر کامران مرزا
نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"نن۔ نہیں۔ ابھی رونے کا موقع نہیں انسپکٹر کامران مرزا
فرصت ملے گی تو رو لوں گا۔ پہلے تو مجھے ان لوگوں سے
حساب چکانا ہے۔"

"اور حساب چکانے میں میں آپ کا برابر کا ساتھی ہوں
گا۔ ہم جئیں گے تو ساتھ اور مریں گے تو ساتھ۔" انسپکٹر
کامران مرزا بولے۔

"شکریہ۔" ان کے منہ سے نکلا۔

اب وہ مینارے کے پاس پہنچ چکے تھے۔ جگہ چونکہ
زیادہ نہیں تھی۔ اس لیے ان کے مقابلے کے لیے صرف
دو دشمن تیار کھڑے تھے۔ باقی نیچے سیڑھیوں میں اپنی
باری کے انتظار میں تھے۔ یوں ہی وہ ان کی زد
پر آئے۔ دونوں نے ایک ساتھ خنجر ان کی طرف دے
مارے۔ وہ پہلے ہی تیار تھے اور مقابلے کے لیے زاویہ
سوچ چکے تھے۔ دونوں ہاتھوں میں رسی پکڑی اور دونوں
پاؤں ان کی رانوں کی طرف اچھال مارے۔ دونوں کے خنجر
والے ہاتھ ان کے پیٹ کا رخ کر چکے تھے جب کہ
ایک ایک پیر ان کی رانوں پر لگا۔ وہ زور سے لڑکھڑائے۔

انسپکٹر جمشید نے موقع دینا مناسب خیال نہ کیا۔ فوراً ہی دونوں پیر
پھر دے مارے۔ اس بار پیر ان کے منہ پر لگے۔ وہ چکرا گئے۔
ادھر انسپکٹر جمشید نے بجلی کی سی تیزی کا مظاہرہ کرتے
ہوئے مینارے کو پکڑ لیا۔ اب انھوں نے ایک ہاتھ اور
دونوں ٹانگوں سے کام لینا شروع کیا۔ دونوں دشمن ابھی
پہلے وار سے سنبھلے نہیں تھے کہ دو ٹانگیں بجلی کی سی
تیزی سے ان کے سینوں پر لگیں۔ ان کے پاؤں اکھڑ
گئے۔ وہ گنبد پر گرے اور پھسلتے ہوئے نیچے چلے گئے۔

"میں بھی آ گیا ہوں انسپکٹر جمشید۔" انھوں نے
انسپکٹر کامران مرزا کی آواز سنی۔

"شکریہ۔" وہ بولے اور دشمنوں کی طرف مڑے۔ وہ
سہمے ہوئے انداز میں ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"آؤ بھئی۔ رک کیوں گئے۔ میں تم میں سے ایک
ایک کو وہاں پہنچا کر رہوں گا۔ جہاں تم نے میرے
فاروق کو پہنچایا ہے۔"

ان میں سے کسی میں جرأت نہ ہوئی کہ سیڑھیوں سے
اوپر آتا۔

"اگر تم نہیں آؤ گے تو پھر میں آ رہا ہوں۔" وہ
بولے، اور سیڑھی پر قدم رکھ دیا۔

ان میں سے ایک نے خنجر کا وار ان کے پیر پر کیا۔ وہ اچھل کر ایک طرف ہو گئے۔ خنجر سیڑھی سے ٹکرایا اور کئی چنگاریاں پیدا کر گیا۔ ساتھ ہی دوسرے دشمن نے خنجر کا وار کیا۔ اس نے ان کی کمر پر وار کیا تھا۔ وہ فوراً گھوم گئے، ان کا مُکا اس کی ٹھوڑی پر گیا۔ وہ اپنے ساتھی پر گرا۔ اور اگر ابھی اس کے خنجر والے ہاتھ پر۔ اس کے منہ سے ایک دل دوز چیخ نکلی۔ اور وہ تڑپنے لگا۔ اس تڑپتے ہوئے دشمن کے ہاتھ سے انھوں نے خنجر نکال لیا اور پھر اس کی کمر میں گھسنے والا خنجر نکال کر انھوں نے انسپکٹر کامران مرزا کی طرف بڑھا دیا۔

اب جو وہ آگے بڑھے تو گوریلے ڈر کر پیچھے ہٹے۔ دونوں کا رعب ان پر سوار ہو چکا تھا۔

"بھاگو نہیں بھئی۔ ابھی تو تم لوگوں کو نیچے پھینکنا ہے۔ انسپکٹر کامران مرزا راستا صاف کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم ان دونوں کو اٹھا کر پھینک دیں۔"

"آپ ان کی طرف متوجہ رہیں۔ ان دونوں کو اٹھا کر میں پھینک دیتا ہوں۔" یہ کہ کر وہ جھکے اور ان میں سے ایک کو اٹھا لیا۔ خون اس کی کمر سے تیزی سے نکل رہا تھا۔ ان کے بھی کپڑے خون میں لت پت ہو گئے۔

انسپکٹر جمشید خنجر پکڑے ہوئے باقی لوگوں کی طرف بڑھے۔ وہ گھبرا کر نیچے کی طرف دوڑے۔ لیکن انسپکٹر جمشید بھلا انھیں بھاگنے کی مہلت کب دینے والے تھے۔ ایک کی کمر میں خنجر پھینک کر مارا۔ وہ دھڑام سے گرا اور دوسرے کو بھی لے بیٹھا۔ دوسرا خنجر اس کی کمر میں لگا۔ آگے بڑھ کر انھوں نے خنجر پھر ان کی کمروں میں سے نکال لیے۔

اتنے میں انسپکٹر کامران مرزا بھی آ گئے۔ اب ان دونوں کے خنجروں والے ہاتھ بجلی کی سی تیزی سے چلنے لگے۔ انھوں نے کشتوں کے پشتے لگا دیے۔ یہاں تک کہ ایک بھی دشمن اپنے پاؤں پر کھڑا نہ رہ سکا۔

"آیئے۔ اب ان لوگوں کا کچھ کریں۔ ڈاکٹر محمد عبداللہ پروفیسر داؤد اور شوکی برادرز تو اس رسی کے ذریعے نہیں آ سکیں گے۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"کوئی بات نہیں۔ ہم تو انھیں کھینچ ہی سکتے ہیں۔ وہ رسی سے چمٹ جائیں۔ ہم انھیں کھینچ لیں گے۔"

"شاید یہی کرنا پڑے گا۔"

دونوں سیڑھیوں پر آئے۔ دیکھا کہ خان رحمان اور منور علی خان آگے پیچھے چلے آ رہے تھے۔

"باقی لوگوں کا کیا ہو گا؟" خان رحمان "

"منور علی خان انھیں ترکیب بتا چکے ہیں۔ رسی چٹان سے کھول کر وہ اس میں گرہیں لگا لیں گے اور اس کے ساتھ لٹک جائیں گے۔ ہم سب مل کر انھیں اوپر کھینچ لیں گے۔"

"لیکن یہ ترکیب پُرخطر ہے۔ ضروری نہیں کہ سب اوپر آ جائیں۔ کچھ نیچے بھی گر سکتے ہیں۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"لیکن۔ اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں۔"

"ہاں! یہ بھی ٹھیک ہے۔ خیر۔ دیکھا"

ان کے الفاظ درمیان میں رہ گئے۔ آنکھوں میں خوف تیر گیا۔ کیونکہ اسی وقت انھیں اپنا سانس رکتا محسوس ہوا تھا۔

"یہ۔ یہ۔ یہ کیا۔" انسپکٹر جمشید بھی گلا پکڑتے ہوئے بولے۔

اسی وقت انھوں نے ایک ہولناک منظر دیکھا۔

خان رحمان اور منور علی خان رسی چھوڑ چکے تھے اور تیر کی طرح نیچے گرتے جا رہے تھے۔

ل... لیکن

فاروق کی گنگناتی آواز ان کے کانوں سے ٹکرا رہی تھی:

"اللہ۔ اللہ۔ اللہ۔"

بہت دیر سے وہ اللہ کا ورد کر رہا تھا۔ جب کسی طرح نہ رکا تو آفتاب نے جل بھن کر کہا:

"مرنے کے بعد بھی چین نہیں آیا۔"

"مر کر ہی تو مزا آیا ہے۔ اب سوائے اللہ کے ذکر کے اور کوئی کام نہیں۔" فاروق بولا۔

"لیکن مرنے کے بعد بھی تم ہمارے ساتھ کیونکر ہو۔" مکھن نے حیران ہو کر پوچھا۔

"احمق ہو اچھے بھلے۔ جو خود کو زندہ خیال کر رہے ہو۔ تم لوگ بھی مر چکے ہو اور اس وقت ہم اللہ میاں کی جنت میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہمارے کاموں سے خوش ہو کر ہمیں جنت عطا کر دی ہے۔ اس کا لاکھ لاکھ احسان ہے۔"

"ہاں واقعی۔ ہے تو یہ جنت ہی۔ لیکن مرے تو صرف تم تھے۔ یا پھر ہم نے انکل خان رحمان اور منوّر علی خان کو بھی گرتے دیکھا تھا۔ ہم کس طرح مر گئے" شوکی نے اعتراض کیا۔

"مارنے والا جانے۔ مجھے کیا پتا۔"

"حیرت ہے۔ ہم تو سب اس سبزہ زار میں موجود ہیں۔ اوہو۔ یہاں کے پھول اور درخت کس قدر عجیب ہیں۔ ہم نے اپنی زندگی میں ایسے پھول کبھی نہیں دیکھے" محمود نے کانپتی آواز میں کہا۔

"دیکھ بھی کیسے سکتے تھے۔ جنت کے پھول دنیا میں کہاں" فاروق نے کہا۔

"مل۔ لیکن" منور علی خان کی حیرت زدہ آواز سنائی دی۔

"آپ کا یہ دو ٹکڑوں میں بٹا ہوا لیکن سمجھ میں نہیں آیا۔ جنت میں لیکن کہاں سے نکل آیا۔" فاروق حیران رہ گیا۔

"اسی لیے تو میں نے مل۔ لیکن کہا ہے" منور علی خان مسکرائے۔

"جی کیا مطلب۔"

"مطلب یہ کہ میں نے اس قسم کے پھول اور درخت

دنیا میں دیکھے ہیں۔ ہاں ہمارے ملک میں البتہ نہیں ہیں۔"

"حیرت ہے۔ حضرت انسان جنت کے پھل، پھول اور درخت دنیا میں کس طرح لے گیا۔" فاروق کے لہجے میں حیرت تھی۔

"بھئی تم سمجھے نہیں۔ ہم اس وقت جنت میں نہیں۔ دنیا میں ہیں" منور علی خان نے برا سا منہ بنایا۔

"یہ۔ یہ آپ کیا کہ رہے ہیں انکل۔ کیا آپ بھول گئے۔ میں اس گنبد سے نیچے گر گیا تھا۔ بھلا اتنی اونچائی سے پتھروں پر گر کر کوئی زندہ بچ سکتا ہے۔"

"میں اور خان رحمان بھی گر گئے تھے۔ ہم بھی تو نہیں مرے۔" وہ مسکرائے۔

"یہ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" فاروق ہکلایا۔

"اس طرح کہ گنبد کے نچلے حصّے میں چاروں طرف انھوں نے ایک جال تان رکھا ہے۔ اندھیرے کی وجہ سے ہم میں سے کسی کو بھی جال دکھائی نہیں دیا۔ یوں بھی جال اس قدر نیچے تھا کہ اندھیرا نہ ہوتا، تب بھی نظر نہیں آ سکتا تھا۔"

"ارے تو کیا ہم سب زندہ ہیں" آصف اچھل پڑا۔

"بالکل۔ ہم میں سے کوئی بھی فوت نہیں ہوا۔ اب سوال

یہ ہے کہ باقی لوگ یہاں کس طرح پہنچ گئے۔" خان رحمان بولے۔

"ہم اچانک بے ہوش ہو گئے تھے۔" شوکی نے کہا۔

"ہاں بالکل ٹھیک ہے۔ میں نے اور انسپکٹر کامران مرزا نے بھی گیس کی بو محسوس کی تھی۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"یا اللہ تیرا شکر ہے۔ ہم سب کے سب زندہ سلامت ہیں۔"

"حد ہو گئی۔ بلکہ حد ہونا تو بہت ہی معمولی بات ہے۔ غضب ہو گیا۔" انھوں نے ایک نئی آواز سنی۔ محمود، فاروق اور فرزانہ اچھل پڑے۔

"ارے! یہ تو امی جان کی آواز ہے۔"

"اور ان کے ساتھ میں بھی موجود ہوں۔" بیگم کامران مرزا کی آواز لہرائی۔

"ارے۔ امی جان۔ آپ بھی۔" آفتاب چلا اٹھا۔

"مم۔ میں۔ اور میں بھی تو۔" شوکی کی والدہ کی پھنسی پھنسی آواز سنائی دی۔

"وہ مارا۔ گویا ہم سب ایک ساتھ جمع ہو گئے۔" آفتاب چلا اٹھا۔

جمع ہو نہیں گئے۔ کر دیے گئے ہو۔"

"انھوں نے ایک اور آواز سنی۔ اس آواز میں نہ جانے

کیا تھا۔ وہ سب کے سب ساکت رہ گئے۔ آنکھیں مارے حیرت کے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

وہ سب اس وقت ایک سبزہ زار پر لیٹے ہوئے تھے۔ سبزہ زار بہت بڑا تھا۔ اور یہ لوگ دور دور لیٹے ہوئے تھے۔ انھوں نے گردنیں گھما گھما کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر سب کے سب کھسک کر ایک دوسرے کے قریب ہونے لگے۔

"یہ۔ یہ آواز کس کی تھی۔" فرحت نے کانپتی آواز میں کہا۔

"جہاں تک میرا خیال ہے۔ ریوٹا کی تھی۔"

"لیکن ریوٹا تو ہمارے ہاتھوں مر چکی ہے۔" محمود نے منہ بنایا۔

"تب پھر اس کی آواز میں کوئی اور بولا ہو گا۔" آفتاب نے جلدی سے کہا۔

"ہاں! ریوٹا تمھارے ہاتھوں مر چکی ہے۔"

ایک اور آواز ابھری۔ اس بار تو ان پر گویا حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

"ہائیں۔ یہ آواز مسٹر شیلاک کی تو نہیں۔" فرحت گھبرا گئی۔

"بالکل وہی آواز ہے۔" فرزانہ نے کہا۔

"لیکن شیلاک بھی تو ہمارے ہاتھوں مارا گیا تھا۔"

"بھئی۔ سمجھنے کی کوشش کریں۔ اس وقت ان دونوں کی روحیں ہمارے ساتھ باتیں کر رہی ہیں۔"

"اوہ۔ تو انھوں نے مرنے کے بعد بھی ہمارا پیچھا نہیں چھوڑا۔" منور علی خان نے بوکھلا کر کہا۔

"کیا کریں۔ تم لوگوں کا اور ہمارا چولی دامن کا ساتھ جو ہوا۔" ایک تیسری آواز اُبھری۔

"جج۔ چولی۔ دامن کا ساتھ۔ ہائیں۔ یہ الفاظ مسٹر رونل کی آوازیں ہمارے کانوں سے ٹکرائی ہیں۔ کمال ہے۔ تو کیا مسٹر رونل کی روح بھی۔" فاروق جملہ مکمل نہ کر سکا۔

"ہاں، میری روح بھی یہاں موجود ہے۔ تم نے کبھی روحوں کے انتقام کے بارے میں سُنا ہے۔" رونل کی آواز لہرائی۔

"اس نام کی فلموں کے اشتہارات ضرور پڑھے ہیں اخبارات میں۔"

"تو پھر اب سن لو۔ روحوں کا انتقام بہت بھیانک ہوتا ہے۔ اور ہم تم سے انتقام ضرور لیں گے۔ اسی لیے تم لوگوں کو اٹھا کر یہاں لے آئے ہیں۔" رونل کی آواز سرسراتی

محسوس ہوئی۔

"ارے باپ رے۔ پھر تو مارے گئے ہم۔ ہم نے تو سوچا تھا۔ چلو چھٹی ہوئی تینوں بڑے مجرموں سے۔ لیکن۔ اب ہم سے ان کی روحیں انتقام لیں گی۔ یہ کیا انصاف ہے۔" فاروق نے بھناتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اس وقت بات روحوں کے انتقام کی ہو رہی ہے۔ روحوں کے انصاف کی نہیں۔" آفتاب جل کر بولا۔

"روحوں کا انصاف۔" فاروق کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔

"خبردار۔ یہ نام کسی ناول کا نہیں ہو سکتا۔" مکھن نے چلا کر کہا۔

"بھئی یہ کیا بدتمیزی ہے۔ ان بڑی بڑی روحوں سے بات چیت کرنے کی بجائے تم لوگ آپس کی باتوں میں اُلجھ گئے۔ پہلے ان غریب روحوں سے تو بات کر لو۔" محمود نے جھلا کر کہا۔

"لیجیے۔ اب روحیں بھی غریب ہونے لگیں۔" آصف نے منہ بنایا۔

"بھئی۔ آصف۔ تمھیں اچھی طرح معلوم تو ہے۔ اس دنیا میں کیا نہیں ہو سکتا۔" فرزانہ نے اسے گھورا۔

"ہاں! یہ ٹھیک ہے۔ خیر۔ میں معافی چاہتا ہوں۔"

"ہاں تو اے پیاری روحو۔ اب تم ہم سے کیا چاہتی ہو؟" شوکی نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"انتقام۔ اور ہمارا انتقام ذرا انوکھے قسم کا ہوگا۔"

"پہلے یہ روحوں کا انتقام تھا۔ اب اس میں انوکھا پن بھی شامل ہو گیا۔ آخر آج کیا کیا ہو کر رہے گا۔"

"تمہارے لیے صرف دو راستے ہیں۔ یا تو ہم روحوں سے دو دو ہاتھ کر لو۔ یا پھر ایک دوسرے کو خنجر مار لو۔" روزل کی آواز سنائی دی۔

"یہ کیا بات ہوئی۔" انسپکٹر جمشید نے منہ بنایا۔

"یہ بات اس طرح ہوئی کہ اس ایٹمی پلانٹ میں آج تک کوئی غیر ملکی داخل نہیں ہو سکا۔ تم پہلے انسان ہو۔ لہٰذا یہاں سے زندہ واپس تو نہیں جا سکو گے، اس لیے یا تو ایک دوسرے کے ہاتھوں مرتے جاؤ۔ یا ہم روحوں سے مقابلہ کر لو۔"

"اس سے تو یہی بہتر ہے کہ ہم روحوں سے ٹکر لے لیں۔" شوکی بولا۔

"اور یہ حسرت لیے مر جاؤ کہ بیگال کا ایٹمی پلانٹ اڑانے آئے تھے۔ اڑا نہ سکے۔ پلانٹ کے اندر بیرونی حصے تک پہنچ گئے۔ لیکن اس کا کچھ بگاڑ نہ سکے۔"

"تم میں سلاٹر والی ایک بات بھی نہیں۔ اس بات کا احساس ہمیں شاید مرنے کے بعد بھی رہے۔" انسپکٹر جمشید نے جل بھن کر کہا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ۔ اس وقت اس پلانٹ کا انچارج وہ ہوتا تو یہ ضرور کہتا۔ جاؤ میری طرف سے اجازت ہے۔ پلانٹ کو نقصان پہنچا کر دکھاؤ۔"

"تم۔ تم پلانٹ کو نقصان پہنچاؤ گے۔" شیلاک کے ہنسنے کی آواز سنائی دی۔

"تم تو۔ اس کی اصل حدود میں داخل بھی نہیں ہو سکو گے۔ واضح رہے، ابھی تم صرف بیرونی حدود میں ہو۔" ریوٹا کی آواز کانوں سے ٹکرائی۔

"تو پھر زندگی اور موت کا مقابلہ بعد میں کر لیا جائے۔ پہلے ہمیں حدود میں داخل ہونے کی کوشش کر لینے کی اجازت دی جائے۔" انسپکٹر کامران مرزا جلدی سے بولے۔

"ضرور ضرور۔ تمہارے دلوں میں یہ حسرت بھی نہ رہ جائے کہ تمہیں اندر داخل ہونے کی کوشش تک نہیں کرنے دی گئی۔ یوں تو تم لوگ بیرونی حدود تک بھی نہیں پہنچ سکے تھے۔ ہم خود یہاں تک لائے ہیں۔" شیلاک کی آواز سنائی دی۔

"یہ تو خیر غلط ہے۔ ہم گنبد والی سیڑھیوں تک پہنچ چکے تھے۔ باقی ساتھی بھی آ رہے تھے۔ کہ تم لوگوں نے ڈر کر گیس چھوڑ دی۔"

"اور اگر جال نہ تنا ہوتا۔" رونل کی ہنسی سنائی دی۔

"تو بھی ہم سب نہ مارے جاتے۔ چند ایک تو بیرونی حدود میں داخل ہو ہی چکے تھے۔"

"خیر خیر۔ دیکھ لیتے ہیں۔ تم لوگ کتنے پانی میں ہو۔ ہم تمھاری اور تمھارے سامان کی اچھی طرح تلاشی لے چکے ہیں۔ سامان میں کسی بھی قسم کے بم موجود نہیں ہیں۔ اس لیے سامان تمھارے پاس ہی چھوڑ دیا گیا ہے۔ تم لوگوں کو چوبیس گھنٹے کی مہلت دی جاتی ہے۔ اگر تم چوبیس گھنٹے کے اندر اندر پلانٹ کی اندرونی حدود میں داخل ہو گئے۔ تو زندگی بطورِ انعام تم لوگوں کو بخش دی جائے گی. اور تم اپنے گھروں کو جا سکو گے۔ شرط صرف ایک ہے۔"

"یہ شرط کہاں سے آ کودی۔" فاروق کے لہجے میں حیرت تھی۔

"اگر یہ معاملہ نہ ہوتا تو اب تک ہم تم لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار چکے ہوتے۔"

"بات سمجھ میں نہیں آئی۔" انسپکٹر کامران مرزا نے منہ

بنا کر کہا۔

"سنو۔ تم لوگ اپنے گھروں کو جا سکتے ہو۔ کیونکہ تم زندہ رہ کر بھی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ صرف اتنا بتا دو۔ کہ تم نے خزانہ اور سونا کہاں چھپایا ہے۔ ہم پورے جزیرے اور سارے جہاز کو اچھی طرح دیکھ چکے ہیں۔"

"ہا ہا ہا۔" فاروق کے منہ سے قہقہہ اُبل پڑا۔

"یہ تمھاری کتنی بڑی شکست ہے۔" محمود بولا۔

"ہاں! ہم تسلیم کرتے ہیں۔ تم سونے کا پتا بتا دو۔ ہم تمھیں یہاں آزادانہ گھومنے کی اجازت دے دیتے ہیں۔"

"اور کوئی بات۔"

"دوسری بات یہ کہ تم لوگ اپنے بارے میں بتا دو۔" فاروق جلدی سے بولا۔

"اپنے بارے میں کیا بتا دیں۔" ریوٹا کی آواز سنائی دی۔

"آپ لوگ۔ مرنے کے باوجود کس طرح بول رہے ہیں۔" شوکی نے فوراً کہا اور فاروق نے اسے گھور کر دیکھا۔

"خیر خیر۔ آپ پوچھ لیں۔ کیا پوچھنا ہے۔" شوکی گھبرا گیا۔

"اپنے بارے میں جو کچھ بتا سکتے ہیں بتا دیں۔"

"اچھی بات ہے۔ لو سُن لو۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی قدموں کی آواز سنائی دی۔ ان کی نظریں اٹھ گئیں۔ سفید لبادے میں تین آدمی ایک ایک قدم اٹھاتے چلے آ رہے تھے۔ ان کے چہرے تک کپڑوں میں چھپے ہوئے تھے۔

"ارے۔ بب باپ رے۔ یہ تو بالکل مردے ہیں۔" فاروق کانپ اٹھا۔

"تو کیا۔ آدھے پونے بھی مردے ہوتے ہیں۔" آصف حیران ہو کر بولا۔

"پپ۔ پتا نہیں۔ ہوتے ہیں یا نہیں۔" شوکی کانپ کر بولا۔

وہ چاروں تھر تھر کانپ رہے تھے۔ تین صاف سنہری مردے ان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وہ کانپتے نہ تو کیا کرتے۔ ڈاکٹر محمد عبداللہ کی حالت بھی ردی تھی۔ باقی لوگ بھی ڈرے ڈرے انداز میں کھڑے رہ گئے تھے۔ ان میں سے صرف اور صرف انسپکٹر جمشید اور انسپکٹر کامران مرزا پرسکون انداز میں کھڑے تھے۔

"انکل! کیا آپ کو ڈر نہیں لگ رہا۔" مکھن نے حیران ہو کر پوچھا۔

"دنیا میں موت سے زیادہ خوف ناک چیز کوئی نہیں۔ ہمیں

تو اس سے خوف محسوس نہیں ہوتا۔ ان سے کیا ڈریں گے۔"

"اس۔ اس کا مطلب ہے۔ اب اس ایٹمی پلانٹ کا چارج ان روحوں کے ہاتھ میں ہے۔" فرحت بوکھلا کر بولی۔

"پہلے بھی ہمارے ہی ہاتھ میں تھا۔" رونل کا مردہ بولا۔

"خیر۔ پہلے تو آپ اچھے بھلے انسان تھے۔ مردے تو نہیں تھے نا۔" اخلاق نے کہا۔

"تمھارے لیے ایک ہی بات ہے۔ ہم زندہ حالت میں بھی اتنے ہی خطرناک تھے۔ جتنے تمھارے لیے اب ہیں۔"

"آپ کو آخر ہم سے ہی کیا دشمنی ہے؟" فرزانہ نے منہ بنایا۔

"تم لوگوں سے دشمنی نہیں ہو گی تو اور کس سے ہو گی۔"

اب وہ بالکل نزدیک آ چکے تھے۔ انھوں نے پیچھے ہٹنا چاہا، لیکن حرکت نہ کر سکے۔ ان کے تو پورے جسم بے کار ہو چکے تھے۔ ہاتھ پیر تک ہلانے کے قابل نہیں رہے تھے۔ اور یہ احساس انھیں پہلی بار ہوا، اس سے پہلے تو وہ صرف باتیں کرتے رہے تھے۔

ہلنے جلنے کی انھوں نے کوشش نہیں کی تھی۔

"ارے۔ یہ کیا۔ ہم اِدھر اُدھر کیوں نہیں ہو سکتے۔" فاروق نے گھبرا کر کہا۔

"یہ اس گیس کا اثر ہے۔ کچھ دیر بعد ختم ہو جائے گا۔" رونل کا مردہ بولا۔

اب وہ تینوں ان کے بالکل نزدیک آ کر کھڑے ہو گئے۔

"تم لوگوں نے اپنی زندگی میں بہت حیران کن مناظر دیکھے ہوں گے۔ ایسے ایسے مناظر، کہ آدمی پر سکتہ طاری ہو جائے۔ لیکن آج شاید تم سکتے کی حالت سے بھی آگے بڑھ جاؤ۔"

"معاف کیجیے گا مردے صاحب۔ سکتے کی حالت سے آگے تو موت کی حالت ہوتی ہے اور تم پر طاری ہے۔" فاروق نے کانپ کر کہا۔

"دیکھ لو۔ ہم تو چل پھر سکتے ہیں۔ تم لوگ چل پھر بھی نہیں سکو گے۔"

"وہ تو ہم یوں بھی چلنے پھرنے کے قابل نہیں ہیں۔" آصف نے منہ بنایا۔

"مطلب یہ کہ چلنے پھرنے کے قابل ہونے کی صورت میں تم مجسمہ بن کر رہ جاتے۔"

"تب تو اللہ کا شکر ہے کہ۔ ہم چل پھر نہیں سکتے۔ کم از کم مجسمہ تو بننے سے بچ گئے۔" شوکی نے خوش ہو کر کہا۔

"بات سے بات نکالنا تو تم لوگوں پر ختم ہے۔" رونل کی بھنّائی ہوئی آواز سنائی دی۔

"اوہو اچھا۔ تو اس کا مطلب ہے۔ اس فن کا کوئی آدمی تمھارے ملک میں بھی نہیں ہے۔"

"لو ایک اور بات نکل آئی۔"

"کیا آپ حضرات مجھے ایک بات نوٹ کرنے کی اجازت دیں گے۔" انسپکٹر جمشید نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"ہاں ضرور کیوں نہیں۔"

انسپکٹر جمشید نے جلدی سے قلم کاغذ نکالا۔ کچھ لکھا اور دونوں چیزیں جیب میں رکھ لیں۔

"لو۔ اب تیار ہو جاؤ۔" رونل کی آواز اُبھری۔

پھر ان تینوں کے ہاتھ اپنے سفید لبادے کی

طرف گئے۔ دوسرے ہی لمحے انھوں نے اپنا اپنا لبادہ
اتار پھینکا۔ واقعی منظر حیران کن تھا۔

جیتے جاگتے ریوٹا، شیلاک اور رونل ان کے
سامنے کھڑے تھے۔ ان میں مردوں والی کوئی بات
بھی نہیں تھی۔

ڈمیاں

دھک دھک۔ ان کے دلوں سے صرف یہی
آواز اٹھ رہی تھی۔ آنکھیں ایک جگہ ٹھہر گئی تھیں۔ سانس سینوں
میں اٹک کر رہ گئے تھے۔ کانوں میں سائیں سائیں سی ہو رہی
تھی۔ ریوٹا، شیلاک اور رونل تینوں زندہ سلامت تھے جب کہ
وہ انھیں مردہ خیال کر چکے تھے۔ نہ صرف یہ کہ خیال کر
چکے تھے بلکہ وہ مارے بھی انھی کی ہاتھوں گئے تھے۔ اس
میں شک اور شبہے والی کوئی بات نہیں تھی۔ تینوں کے
چہروں پر گہری طنز بھری مسکراہٹیں تھیں۔ یہ مسکراہٹیں ان
سے کچھ کہہ رہی تھیں۔ پھر اچانک ان تینوں کے حلق
سے قہقہہ اُبل پڑا۔ ایک بہت بلند آواز والا قہقہہ۔ گویا وہ
پوری طاقت سے قہقہہ لگا رہے تھے۔ ان کا یہ قہقہہ لمبا
بھی ہوتا چلا گیا۔ کسی طرح رکنے میں نہیں آ رہا تھا۔ آخر
جب وہ بُری طرح تھک گئے۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔
تب کہیں جا کر اس قہقہے کا خاتمہ ہوا۔

"شش شاید یہ ہماری زندگی کا طویل ترین قہقہہ تھا" آصف نے اطمینان کا سانس لے کر کہا۔

"اور میں یہ خیال کر رہا تھا، ہماری زندگیاں ختم ہو جائیں گی۔ لیکن یہ قہقہہ ختم نہیں ہو گا۔" فاروق نے کہا۔

"اور میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ ہم اس وقت کوئی خواب دیکھ رہے ہیں۔" محمود بولا۔

"لیکن یہ ہو نہیں سکتا کہ ہم سب کے سب ایک خواب دیکھنے لگ جائیں۔ ہاں یہ ضرور ہو سکتا ہے کہ ہم میں سے کوئی ایک یہ خواب دیکھ رہا ہو۔" آصف نے جلدی سے کہا۔

"اور میں یہ خیال کرتی ہوں کہ یہ خواب واب نہیں ہے۔ کیوں ابا جان۔" فرزانہ نے انسپکٹر جمشید کی طرف دیکھا۔

"ہاں، بالکل۔ یہ خواب نہیں ہے۔" وہ مسکرائے۔

"تت۔ تو یہ۔ یہ تینوں واقعی زندہ ہیں۔"

"ہاں، زندہ اس لیے ہیں کہ یہ ابھی مرے ہی نہیں تھے۔ ہم نے جن تین بڑے مجرموں کو ہلاک کیا، وہ دراصل ان کی کاربن کاپیاں تھیں۔ ان کی ڈمیاں تھیں۔ یا یوں کہ لیں کہ انھوں نے ہو بہو اپنے جیسے تین تیار کیے تھے۔ اور ہمارا راستا روکنے کے لیے بھیج دیے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ ہمارا راستا

نہ روک سکے۔ اور ہم اصلی تین تک پہنچ گئے۔" انسپکٹر کامران مرزا نے مسکرا کر کہا۔

"تو کیا آپ کو پہلے ہی یہ بات معلوم تھی۔" آفتاب کے لہجے میں بلا کی حیرت تھی۔

"شاید تم لوگ اس کاغذ اور قلم کو بھول گئے۔ تھوڑی دیر پہلے میں نے کاغذ پر کچھ نوٹ کیا تھا۔"

"اوہ۔ اوہ۔" ان کے منہ سے نکلا۔

انسپکٹر جمشید نے کاغذ نکال کر ان کے سامنے کر دیا۔ اس پر لکھا تھا۔

"جن تین بڑے مجرموں کو ہم نے ختم کیا، وہ اصلی نہیں تھے۔ تینوں تو ابھی زندہ ہیں اور ہمارے سامنے کھڑے ہیں۔"

"تو کیا ابا جان۔ آپ نے یہ بات پہلے ہی بھانپ لی تھی۔" فرزانہ نے بے چین ہو کر کہا۔

"ہاں، ریوٹا بہت آسانی سے مر گیا۔ یہی حال شیلاک کا ہوا۔ اس وقت ہمیں پوری طرح یقین نہیں تھا کہ ہم نے نقلی مجرموں کا مقابلہ کیا ہے۔ لیکن جب رونل کا ہم شکل بھی مارا گیا تو اس وقت مجھے حیرت ہوئی اور میں نے جان لیا کہ دراصل یہ تینوں نقلی تھے۔ اور اس وقت یہ

بات ثابت ہو گئی۔ انسپکٹر کامران مرزا بھی یہ اندازہ لگا چکے تھے، کیونکہ میں نے ان کی آنکھوں میں بھی حیرت دیکھی تھی۔

"دھت تیرے کی۔ یہ کیا ہوا، ہم تو خیال کر بیٹھے تھے کہ آدھا میدان مار چکے ہیں، لیکن ابھی تو شاید ہمیں پورا میدان ہی مارنا ہو گا۔" محمود نے جھلا کر کہا۔

"میدان بعد میں مارتے رہنا۔ پہلے یہ بتا دو کہ وہ خزانہ کہاں ہے۔ اور وہ سونا بھی۔"

"اس سوال کو جانے دیں۔ اور ہمیں اپنا کام کرنے دیں۔"

"اپنا کام کرنے کے لیے تم یہاں پوری طرح آزاد ہو۔" رونل ہنسا۔

"کیا خاک آزاد ہیں۔ ہاتھ پیر تو ہلا نہیں سکتے۔"

"آدھ گھنٹے کے بعد تم ہاتھ پیر ہلا سکو گے۔ بلکہ چل پھر بھی سکو گے۔"

"گویا ہم ایٹمی پلانٹ کے اندرونی راستے کو تلاش کرنے کے لیے آزاد ہوں گے۔"

"ہاں، لیکن شرط یہی ہے کہ پہلے خزانے کے بارے میں بتا دو، اگر تم نے یہ بات منظور نہ کی تو پھر ہم تم لوگوں کو کوئی رعایت نہیں دے سکیں گے۔ اور تمہیں اس وقت ہم سے مقابلہ کرنا ہو گا۔" رونل نے ٹھہرے ہوئے انداز

میں کہا۔

انسپکٹر جمشید نے انسپکٹر کامران مرزا کی طرف دیکھا۔ دوسروں پر بھی ایک نظر ڈالی۔ آخر بولے۔

"افسوس! ہم یہ شرط نہیں مان سکتے۔"

"کیا مطلب؟" ریٹا نے جھلا کر کہا۔

"مطلب یہ ہم لوگ اب تک اس لیے زندہ چھوڑے گئے ہیں کہ تم لوگوں کو سونا اور خزانہ نہیں ملا۔ اگر خزانہ اور سونا مل گیا ہوتا تو ہمیں کبھی کا ختم کر دیا گیا ہوتا۔ ظاہر ہے، ہماری زندگیوں سے تم لوگوں کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے اس لیے ہم خزانے اور سونے کا پتا نہیں بتا سکتے۔"

"سوچ لو۔ اس کا انجام بھیانک ہو گا۔" شیلاک غرایا۔

"پروا نہیں۔ سونا اگر ہمارے ملک کے کام نہیں آسکا تو ہم اسے تمہارے ملک کے کام کسی صورت نہیں آنے دیں گے۔"

"مجھے پہلے ہی خیال تھا کہ تم نہیں بتاؤ گے۔" ریٹا نے منہ بنا کر کہا۔

"تو پھر۔ وقت کیوں ضائع کر رہے ہیں۔"

"سنو! تم اس پلانٹ کو تباہ نہیں کر سکتے۔ تم لوگوں کے پاس تباہ کرنے کا کوئی سامان ہے ہی نہیں۔ لہٰذا زندہ سلامت

اپنے وطن لوٹ جاؤ، زندگی سے پیاری چیز کوئی نہیں، بس ہمیں
اس دولت کا پتا بتا دو۔" شیلاک نے بھناتے ہوئے لہجے میں کہا۔
"مسٹر شیلاک۔ تمھارا یہ خیال غلط ہے کہ زندگی سے پیاری
چیز کوئی نہیں۔ ہمارے نزدیک ہمارا دین زندگی سے زیادہ
پیارا ہے۔ ہم اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اپنی جانوں
سے بڑھ کر پیار کرتے ہیں۔ ہم دولت کا پتا نہیں بتائیں
گے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں۔ پتا معلوم کرنے کے فوراً بعد تم ہم
سب کو موت کے گھاٹ اتار دو گے۔" انسپکٹر کامران مرزا نے
مضبوط لہجے میں کہا۔

"تم نے ہمارے کمرۂ امتحان اب تک نہیں دیکھے۔ وہاں
اس قدر عجیب طریقے اختیار کیے جاتے ہیں کہ بڑے سے بڑا
سورما بھی فرفر بولنے لگتا ہے۔"

"تم یہ تجربہ بھی کر کے دیکھ لو۔" خان رحمان چلائے۔

"ارے! یہ تمھارے ساتھ کون کھڑا ہے۔ یہ تو ہمارے
ملک کا جان پڑتا ہے۔ تم کون ہو مسٹر؟"

"میرا سابقہ نام ڈاکٹر ڈومی رو ہے۔" ڈاکٹر نے بے خوف
ہو کر کہا۔

"سابقہ نام کیا مطلب؟" رونل کے منہ سے نکلا۔

"اب میرا نام ڈاکٹر محمد عبداللہ ہے۔ میں نے اسلام

قبول کر لیا ہے۔"

"پاگل آدمی۔ یہ تم نے کیا کیا؟"

"میرے دل نے مجھے ایسا کرنے پر مجبور کر دیا۔" اس
نے کہا۔

"تب پھر تمھارا انجام بھی ان لوگوں کے ساتھ ہوگا۔" ریٹا
غرایا۔

"میری خواہش بھی یہی ہے۔"

"فکر نہ کرو۔ بہت جلد خواہش پوری ہو جائے گی۔"

"ہمیں کوئی فکر کرنے کی ضرورت بھی نہیں۔ تم اپنا ہنر
آزماؤ۔" فاروق گنگنایا۔

ریٹا، شیلاک اور رونل نے ایک دوسرے کی طرف
دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں الجھن کے آثار نظر آ رہے تھے۔
آخر وہ ان کے پاس سے ہٹ کر دور چلے گئے اور دبی
آواز میں ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگے۔

"ہماری مضبوطی نے انھیں چکرا دیا ہے۔ اب یہ مشورہ
کر کے ہماری طرف آئیں گے۔ یہ بات طے ہے کہ اگر
ہم نے انھیں یہ بتا دیا کہ دولت ہم نے کہاں چھپائی ہے
تو پھر۔ ایک لمحے کے لیے بھی ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں
گے۔ یہ بین الاقوامی جاسوس ہیں، لیکن ان میں جیرال والی ایک

بات بھی نہیں۔"

"ہوں۔ آپ فکر نہ کریں۔ ہم میں سے کسی کے منہ سے دولت کے بارے میں ایک لفظ نہیں نکلے گا۔" آصف نے پرعزم لہجے میں کہا۔

"مجھے شوکی وغیرہ کی طرف سے خطرہ ہے۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"نہیں انکل۔ ہم اپنے ملک کی خاطر جان دینا جانتے ہیں۔ بزدل ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ آدمی جان بھی نہیں دے سکتا۔" شوکی بولا۔

"شکریہ شوکی۔ مجھے تم سے یہی اُمید تھی۔" وہ بولے۔

اسی وقت انھوں نے ان تینوں کو لوٹتے دیکھا۔ اب ان کے چہروں پر مسکراہٹیں تھیں۔ نزدیک آتے ہی رونل نے کہا:

"ٹھیک ہے۔ تم لوگ پلانٹ کے اندر داخل ہونے کی کوشش کر سکتے ہو۔ کوئی روکنے کی کوشش نہیں کرے گا۔"

"اس قدر مہربانی کیوں۔" انسپکٹر کامران مرزا اُلجھن کے عالم میں بولے۔

"ہم تجربہ کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارا پلانٹ کس حد تک محفوظ ہے۔" رونل نے کہا۔

"بہت اچھا۔ ہم اس کے اندر پہنچ کر دکھا دیں گے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"بس تو پھر۔ ہمارا اور تمھارا مقابلہ اس کے بعد ہی ہو گا۔ اگر تم نے ہمیں شکست دے دی تو یہاں سے زندہ جا سکو گے۔ ورنہ نہیں۔"

"اور دولت۔" محمود نے جلدی سے کہا۔

"ہم نے دولت کا خیال دل سے نکال دیا ہے۔ ہمارے پاس دولت کی کیا کمی ہے۔"

"میں ایک سوال اور کرنا چاہتا ہوں۔ اُمید ہے جواب دیں گے۔" انسپکٹر جمشید کچھ سوچ کر بولے۔

"ضرور۔ کیوں نہیں۔"

"ہمارے ملک میں کچھ مرتد لوگ رہتے ہیں، ہم انھیں جاپانی کہتے ہیں۔ انھوں نے ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد ایک جھوٹے شخص کو نبی مان لیا ہے۔ اب وہ اس کے پیروکار ہیں۔ ہم نے سنا ہے کہ جاپانی لوگ آپ کے ملک میں بھی موجود ہیں۔ جب ہم ان سے یہ سوال کرتے ہیں کہ تم لوگوں کا بیگال میں کیا کام۔ بیگال تو کسی دوسرے مذاہب والوں کو اپنے ملک میں داخل ہونے کی اجازت ہی نہیں دیتا۔ پھر تم لوگوں کو کس طرح اجازت ملی ہوئی ہے، تو

وہ جواب دیتے ہیں کہ ہم وہاں تبلیغ کرتے ہیں۔ جب کہ ہم نے یہ تک سُنا ہے کہ جاپانی لوگ بیگال کی فوج میں بھی شامل ہیں، اور مسلمانوں کے خلاف جنگوں میں بیگالیوں کا ساتھ دیتے ہیں۔ کیا آپ وضاحت کریں گے۔" انسپکٹر جمشید یہاں تک کہہ کر رک گئے۔ دوسروں کو ان کے سوال نے پوری طرح رونل وغیرہ کی طرف متوجہ کر دیا۔ کیونکہ اس سوال کا جواب وہ بھی جاننا چاہتے تھے۔

"تم نے ایک بہت نازک سوال کیا ہے انسپکٹر جمشید۔" رونل نے ناخوش گوار لہجے میں کہا۔

"جی کیا مطلب۔ اس میں نازک پن کہاں سے آ گیا۔ مجھے تو یہ بہت کھردرا سوال لگا ہے۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"ہم عیسائیوں تک کو تبلیغ کے لیے اپنے ملک میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتے۔ کیونکہ وہ اپنے ملک کے وفادار ہیں۔" ریوٹا نے روانی کے عالم میں کہا۔

"کیا مطلب۔ کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جاپانی ہمارے ملک کے وفادار نہیں ہیں۔ بلکہ آپ کے وفادار ہیں۔ اور ہمارے ملک کی خبریں آپ لوگوں تک پہنچاتے رہتے ہیں۔"

"ہم۔ میں نے یہ نہیں کہا۔" ریوٹا نے جلدی سے کہا۔ کیونکہ رونل نے اسے تیز نظروں سے دیکھا تھا۔

"ہم سمجھ گئے۔ ضرور یہی بات ہے۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"ہاں ٹھیک ہے۔ یہی بات ہے۔ بس۔ اب تو مطمئن ہو گئے ہو۔ میں نے اس لیے اقرار کر لیا کہ تم واپس اپنے ملک تو اب جا ہی نہیں سکو گے۔ اگر اس بات کا امکان ہوتا تو یہ راز ہرگز نہیں بتایا جا سکتا تھا۔"

"شکریہ۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ جاپانی لوگ دراصل ہمارے ملک کی جاسوسی کرتے ہیں اور خبریں تم لوگوں تک پہنچاتے ہیں۔ اُف اللہ۔" انسپکٹر کامران مرزا نے کانپ کر کہا۔

"میرا خیال ہے۔ ہم یہاں یہ باتیں کرنے کے لیے جمع نہیں ہوئے۔"

"ہوں ٹھیک ہے۔ تو یہ طے رہا۔ ہم اندرونی دروازے تلاش کریں گے اور اس کے بعد تم لوگوں سے مقابلہ کریں گے۔ اگر ہم جیت گئے تو تم لوگ ہمیں یہاں سے جانے کی اجازت دو گے۔"

"ہاں بالکل۔" رونل نے کہا۔ پھر وہ جلدی سے بولا۔

"اب تم لوگوں کے ہلنے جلنے کا وقت ہو گیا ہے۔ اس لیے ہم چلتے ہیں۔"

تینوں مڑے اور تیز تیز قدم اٹھاتے چلے گئے۔ جلد ہی

وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

"کاش۔ ہم میں ہلنے جلنے کی طاقت ہوتی۔ ہم ان کا پیچھا کر کے اندرونی راستا دیکھ لیتے۔" شوکی نے سرد آہ بھری۔

"ٹھہرے کام چور۔ ہاتھ پیر ہلا کر کیوں دروازہ تلاش کرنے لگے۔" آصف نے منہ بنایا۔

"شکریہ۔ یہاں سوال کام چوری کا نہیں۔ وقت بچانے کا ہے۔" شوکی نے اس سے بھی برا منہ بنایا۔

ٹھیک آدھ گھنٹے بعد انھوں نے اپنے جسموں میں طاقت محسوس کی اور اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"سوال ہے کہ امی جان اور آنٹی صاحبان کا کیا کریں۔ یہ کس طرح اس مہم میں ہمارا ساتھ دے سکیں گی۔" محمود نے اُلجھن کے عالم میں کہا۔

"ہماری فکر نہ کریں۔ ہم حالات سے سمجھوتا کرنا جانتے ہیں۔" بیگم کامران مرزا بولیں۔

"جی بہتر! اب فکر نہیں کریں گے۔" آصف نے خوش ہو کر کہا۔

"اب ہم مختلف پارٹیوں کی صورت میں راستا تلاش کریں گے۔ تاکہ زیادہ وقت نہ صرف ہو۔"

"پارٹیوں کی تقسیم کا کام مجھ پر چھوڑ دیں ابا جان۔" فاروق جلدی سے بولا۔

"چلو۔ تم ہی بنا دو۔" وہ مسکرائے۔

"بالکل سیدھی سادی تین پارٹیاں بنتی ہیں۔ ایک پارٹی بڑوں کی، ایک بچوں کی اور تیسری عورتوں کی۔"

"بھلا ہم تنہا اس قسم کا کام کس طرح کر سکیں گی۔" شوکی کی والدہ نے گھبرا کر کہا۔

"فکر نہ کریں۔ کر لیں گے۔" بیگم جمشید مسکرا کر بولیں۔

"تو پھر یہی طے رہا۔" انسپکٹر کامران مرزا ہنس کر بولے۔

"مزا نہیں آئے گا۔" خان رحمان نے منہ بنایا۔

"کیا مطلب۔ مزا نہیں آئے گا۔"

"ہاں! بڑی دونوں پارٹیاں تم لوگوں کی باتوں سے تو بالکل محروم ہو جائیں گی۔"

"اوہ۔ لیکن انکل۔ یہ تھوڑی دیر کے لیے ہو گا۔ جوں ہی ہم آپس میں ملیں گے۔ کام چالو ہو جائے گا۔"

"ٹھیک ہے خان رحمان۔ اس وقت تو یوں بھی ہم باتیں کرنے اور سننے کے موڈ میں نہیں ہیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"خیر ابا جان۔ یہ بات آپ ہمارے بارے میں تو نہیں کہہ سکتے۔" فاروق نے فوراً کہا۔

"اچھا اب کام شروع کر دو۔" انھوں نے منہ بنایا۔

انھیں اپنے سامنے اس وقت تک ایک سبزہ زار نظر آتا رہا تھا۔ اب وہ اٹھ کر تین مختلف سمتوں میں چل پڑے۔ سب سے پہلے چھوٹی پارٹی کو ایک اونچی دیوار نظر آئی۔ یہ سرخ اینٹوں کی بنی ہوئی تھی۔ اس میں کوئی دروازہ نہیں تھا۔ نہ کوئی روشن دان تھا۔ نہ کھڑکی۔ بس بالکل سیدھی ایک دیوار تھی۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک موڑ مڑ گئے۔ دوسری طرف سے عورتوں والی پارٹی چلی آ رہی تھی۔

"اوہو۔ اتنی جلدی ملاقات ہو گئی۔" آصف کے منہ سے نکلا۔

"ہاں آصف۔ ادھر ایک بالکل سیدھی اور اونچی دیوار کے سوا کچھ نہیں۔"

"اور ادھر بھی۔ لہٰذا ہم تیسری دیوار کی طرف چلتے ہیں۔"

وہ چلتے رہے۔ آخر تیسری دیوار کی طرف مڑے۔ ادھر سے مردانہ پارٹی آ رہی تھی۔

"اس کا مطلب ہے۔ پورا پلانٹ ان چار دیواروں کے اندر ہے۔ ان چاروں دیواروں میں کوئی دروازہ نہیں ہے۔ نہ کوئی کھڑکی اور روشن دان ہے۔ لیکن۔ صاف ظاہر ہے۔ اندر داخل ہونے کا کوئی نہ کوئی راستہ ضرور ہے۔ کیا خیال ہے۔" شوکی نے جلدی جلدی کہا۔

"ہاں! بالکل ٹھیک۔ ہمیں وہی راستہ تلاش کرنا ہے۔"

"دیوار کے اوپر چڑھنے کا بھی کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ ورنہ ہم چھت پر پہنچ کر بھی امکانات کا جائزہ لے سکتے تھے۔" منور علی خان بڑبڑائے۔

"کیوں انکل۔ آپ کا آنکڑا کہاں گیا۔" فاروق مسکرایا۔

"آنکڑا اور رسی تو وہیں رہ گئے تھے۔"

"جہاں تک میرا خیال ہے۔ ان میں سے کوئی اینٹ کل کا کام دیتی ہے۔ اسے دبانے سے دروازہ نمودار ہوتا ہو گا۔ کیونکہ ان چاروں دیواروں میں اینٹوں کے سوا کوئی چیز نہیں ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"میرا بھی یہی خیال ہے۔"

"لیکن انکل۔ ان چاروں دیواروں میں تو ہزار ہا اینٹیں لگی ہیں۔ ہم کب تک ان اینٹوں کو دبا دبا کر دیکھتے رہیں گے۔" آفتاب نے منہ بنایا۔

"عقل سے کام لیا جائے تو سارے کام ہو سکتے ہیں۔" فاروق فوراً بولا۔

"تو پھر لیتے کیوں نہیں کام۔" اس نے بھنا کر کہا۔

"اس لیے کہ اب کام فرزانہ اور فرحت کا شروع ہو چکا ہے۔ یہ وہ بتائیں گی کہ ہم دروازہ کس طرح تلاش کریں۔"

"یہ ذرا بھی مشکل نہیں۔" فرزانہ نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

"ایک منٹ۔ اس سے پہلے کہ فرزانہ ہمیں ترکیب بتائے اور ہم اس پر عمل پیرا ہوں۔ میں ایک بات سب سے کہہ دینا چاہتا ہوں۔ یا یوں کہہ لیں کہ انسپکٹر کامران مرزا کے علاوہ سب کو ایک ہدایت دینا چاہتا ہوں۔" انسپکٹر جمشید نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"فرمائیے۔" مکھن بولا۔

"سب ساتھی کان ادھر لے آئیں۔"

وہ سب جلدی جلدی کان آگے لائے تو ایک دوسرے سے ٹکرا گئے۔

"بھئی یہ کیا۔ کان اس طرح آگے لائے جاتے ہیں۔" انسپکٹر کامران مرزا نے بھنا کر کہا۔

"واقعی۔ کان آگے لانے کا تو ایک خاص طریقہ ہے۔" فاروق خوش ہو کر بولا۔

آخر وہ ایک دوسرے سے بچ بچا کر کان آگے لے آئے اور انسپکٹر جمشید نے بالکل آہستہ آواز میں انھیں ایک ہدایت دی۔ پھر بولے:

"ہاں فرزانہ۔ وہ اینٹ تلاش کرنے کا کیا طریقہ ہے۔"

"جم۔شید۔ میں ذرا پائپ پی سکتا ہوں۔" ایسے میں پروفیسر

داؤد نے کہا اور وہ حیران رہ گئے۔

"ضرور پروفیسر صاحب۔ کیوں نہیں۔" انسپکٹر جمشید نے جلدی سے کہا۔

اور وہ اپنے تھیلے میں سے پائپ نکالنے لگے۔

"اس اینٹ پر انگلیوں کے نشانات ہوں گے۔ اور وہ دوسری اینٹوں کی نسبت میلی بھی ہو گی۔"

"بالکل ٹھیک۔ لہٰذا ان چار دیواروں میں دوسری اینٹوں کی نسبت قدرے میلی اینٹ تلاش کرنا اتنا مشکل کام ثابت نہیں ہو گا۔"

وہ سب اینٹوں پر نظریں جمائے آگے بڑھتے گئے۔ جہاں جو اینٹ قدرے میلی نظر آتی۔ اسے دبا کر ضرور دیکھا گیا۔ ایسے میں آفتاب نے ایک اینٹ پر ہاتھ رکھ کر دباؤ ڈالا۔ فوراً اینٹ اندر چلی گئی۔ وہ گھبرا گیا۔ جلدی سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اسی وقت فرحت چلا اُٹھی:

"دروازہ کھل چکا ہے۔"

وہ چونک کر فرحت کی طرف مڑے۔ دائیں طرف ایک لمبا چوڑا دروازہ نمودار ہو چکا تھا۔

"حیرت ہے۔ یہ کام تو بہت آسان ثابت ہوا۔" خان رحمان بڑبڑائے۔

"اس لیے کہ اصل حفاظتی انتظام اس گنبد کی صورت میں کیا گیا ہے۔ گنبد میں داخل ہونا اصل مشکل کام ہے۔" انسپکٹر جمشید نے پرسکون آواز میں کہا۔

"تب پھر۔ ہمیں اندر داخل ہو جانا چاہیے یا ہم ان لوگوں کا انتظار کریں۔" منور علی خان بولے۔

"انتظار کس بات کا۔ یہ لیجیے۔ میں تو اندر چلا، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔"

پروفیسر داؤد نے کہا اور اس دروازہ میں قدم رکھ دیا۔ سب نے ان کا ساتھ دیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ دھک سے رہ گئے۔ اندر شیشے کی بنی ایک بہت شان دار اور بڑی عمارت موجود تھی۔ اس کے اندر سیکڑوں آدمی کام میں مصروف تھے۔ اس عمارت میں مختلف دروازے تھے۔ ان دروازوں سے کام کرنے والے کئی آدمیوں نے ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔

اب وہ اس عمارت کے نزدیک پہنچ گئے۔ کام کرنے والے کئی آدمیوں نے ان پر ایک اچٹتی نظر ڈالی۔ لیکن کہا کچھ نہیں۔ ایسے میں پروفیسر داؤد بھنا کر بولے:

"اوہو۔ جمشید۔ تم نے میرا پاؤں کچل دیا۔"

یہ کہتے ہوئے پروفیسر داؤد یک دم نیچے بیٹھ گئے۔

ان کے دونوں ہاتھ ایک ساتھ پاؤں کی طرف بڑھے۔ پائپ ان کے ہاتھ سے نیچے گر گیا۔

"م۔ معاف کیجیے گا۔ شاید پیر زیادہ کچلا گیا۔"

"ہاں!" وہ بولے۔

انسپکٹر جمشید بھی ان کے پاس بیٹھ گئے اور پاؤں سہلانے لگے۔ عین اسی وقت انھوں نے بھاری قدموں کی آواز سنی۔ نظریں اٹھا کر دیکھا تو ریوٹا، شیلاک اور رونل چلے آ رہے تھے۔

میدانِ کارزار

"ہم تم لوگوں کو مان گئے ہیں بھئی۔" رونل نے دوستانہ انداز میں کہا۔

"جی۔ وہ کس سلسلے میں۔" فاروق گھبرا گیا۔

"اس قدر جلد دروازہ تلاش کر لیا۔ کمال ہے۔"

"لیکن آپ اتنی جلدی ہمارے پاس کیوں آ گئے۔ ابھی ہمیں عمارت کی سیر تو کر لینے دیں۔"

"نہیں۔ اتنا ہی کافی ہے۔"

"لیکن۔ کیوں۔ کیا آپ کو ہم سے کوئی خطرہ ہے۔ کیا آپ دیکھ نہیں چکے۔ کیا ہمارے پاس کوئی ایسی چیز ہے۔ جس سے ہم اس مضبوط ترین عمارت کو اڑا سکیں۔"

"ٹھیک ہے۔ نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود۔ آپ لوگ اندر نہیں جا سکتے۔"

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ معاہدہ تو یہی ہوا تھا کہ آپ ہمیں اندر کی سیر کرنے دیں گے۔"

"جب میں نے یہ وعدہ کیا تھا، اس وقت میرا خیال تھا کہ تم لوگ تو عمارت کا دروازہ ہی نہیں کھول سکو گے۔"

"اگر ہم نے دروازہ کھول لیا ہے تو اب عمارت کو دیکھنے کی اجازت دے دیں۔"

"نہیں۔ اسی وقت باہر نکل آؤ۔ ہم تم لوگوں کو زیادہ دیر اندر نہیں رکھ سکتے۔"

"آخر کیوں؟" انسپکٹر کامران مرزا چلا اٹھے۔

"اس لیے کہ تم لوگوں کے ساتھ میں بھی موجود ہوں۔" پروفیسر داؤد شوخ انداز میں بولے۔

"جی۔ کیا مطلب۔"

"یہ لوگ میری وجہ سے خطرہ محسوس کر رہے ہیں۔"

"ہاں! پروفیسر داؤد کا اندر جانا غلط ہے۔ آخر یہ ایک سائنس دان ہیں۔"

"تو میں باہر ٹھہر جاتا ہوں۔ ان لوگوں کو اندر جانے دیں۔"

"نہیں۔ اب اس کی بھی ضرورت نہیں۔ بس آپ لوگ باہر چلیں۔"

"اور اگر ہم لوگ باہر جانے سے انکار کر دیں۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"کیا مطلب؟" رونل زور سے چونکا۔

"اگر ہم باہر نہ جائیں تو آپ کیا کریں گے؟"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ باہر نہ جائیں۔" شیلاک نے جھنّا کر کہا۔

"کچھ کام ایسے بھی ہوتے ہیں جو ہم اپنی مرضی کے مطابق کرتے ہیں۔" خان رحمان نے گویا اعلان کیا۔

"اگر یہ بات ہے تو میں تم لوگوں کو یہیں ختم کیے دیتا ہوں۔"

"اس صورت میں تم اس خزانے اور سونے کے بارے میں نہیں جان سکو گے۔"

"پروا نہیں۔ ہم سونا ضائع کر سکتے ہیں، اپنے پلانٹ کو کوئی نقصان پہنچتا نہیں دیکھ سکتے۔" رونل نے کہا، اور ساتھ ہی اس نے جیب میں ہاتھ ڈال دیا۔

انسپکٹر جمشید نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ بجلی کی سی سرعت سے اس پر چھلانگ لگا دی اور سیدھے اس پر جا گرے۔ رونل جیب سے کچھ نکالنے کے چکر میں مار کھا گیا۔ دونوں دھڑام سے گرے۔ ادھر انسپکٹر کامران مرزا نے شیلاک پر چھلانگ لگا دی۔ کیونکہ وہ بھی اس وقت تک جیب میں ہاتھ ڈال چکا تھا۔ وہ اس سے پورے زور میں ٹکرائے۔

محمود کی نظریں ریوٹا پر پڑیں۔ اس کا ہاتھ بھی پتلون کی جیب میں جا رہا تھا۔

"خبردار۔" اس نے چیخ کر کہا اور اس کی طرف دوڑ لگا دی۔

ریوٹا نے اسے اپنی طرف آتے دیکھا تو تیزی سے ایک طرف ہو گئی۔ مگر ادھر آصف پہنچ چکا تھا۔ اس نے اپنا رخ ایک بار پھر بدلا تو ادھر فرزانہ کھڑی تھی۔ اسی وقت اس کا ہاتھ جیب سے نکل آیا۔ اس میں ایک عجیب وضع کا پستول تھا، اس سے پہلے کہ وہ ٹریگر دباتی۔ فرزانہ تڑپی اور اس کے سینے سے ٹکرا گئی۔ ریوٹا لڑکھڑائی۔ ایسے میں آصف کا مکا اس کی ٹھوڑی پر لگا۔ وہ گری، لیکن گرتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔ تاہم گرنے کے چکر میں اس کا پستول ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ اس نے پستول کی تلاش میں نظریں اِدھر اُدھر دوڑائیں۔ لیکن پستول غائب تھا۔ آنکھوں میں الجھن لیے وہ ان تینوں پر ٹوٹ پڑی۔

ادھر انسپکٹر جمشید اور رونل ایک دوسرے کے ساتھ گتھم گتھا تھے۔ انسپکٹر جمشید کی کوشش یہ تھی کہ اسے جیب سے نہ نکالنے دے۔ اور وہ اس کوشش میں تھا کہ کسی طرح پستول نکال لے۔ اس لیے انسپکٹر جمشید نے رونل کے ہاتھ انتہائی مضبوطی سے پکڑ رکھے تھے۔ رونل اپنے

ہاتھوں کو چھڑانے کے لیے پورا زور لگا رہا تھا۔ ایک بار جو اس نے جھٹکا مارا تو دایاں ہاتھ آزاد ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ انسپکٹر جمشید کچھ کر سکتے۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال دیا، لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے منہ سے نکلا:

"ارے! پستول کہاں گیا؟"

دوسرے ہی لمحے انسپکٹر جمشید کا بھرپور مکّا اس کی ٹھوڑی پر لگا۔ مکّا مارنے کا موقع انھیں اس کے چونکنے کی وجہ سے ملا تھا۔ وہ دوسری طرف الٹ گیا۔ انسپکٹر جمشید نے وہیں کھڑے کھڑے اس پر چھلانگ لگائی۔ اور پختہ فرش پر پورے زور سے ٹکرائے۔ کیونکہ رونل پلٹنی کھا گیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ ان پر سوار ہو چکا تھا اور اس کے دونوں ہاتھ ان کی گردن پر جم چکے تھے۔ اور وہ یہ محسوس کر رہے تھے۔ وہ کسی ہزار پا کے شکنجے میں آ گئے ہیں۔

انسپکٹر کامران مرزا سے ٹکرا کر شیلاک پہلے تو گرا پھر بلا کی رفتار سے اٹھا اور ان پر حملہ آور ہوا۔ اس نے کچھ ایسی تیزی سے حملہ کیا کہ وہ سنبھل نہ سکے۔ اور اس کی زد پر آ گئے۔ اس کا پہلا مکّا ان کی ٹھوڑی پر لگا، دوسرا گردن پر اور تیسرا پیٹ میں۔ وہ دھب سے گرے۔

ساتھ ہی شیلاک نے جیب میں ہاتھ ڈال کر پستول نکال لینا چاہا، دوسرے ہی لمحے اس کے منہ سے نکلا:

"ارے!"

اور یہ 'ارے' اسے لے بیٹھا۔ انسپکٹر کامران مرزا جو گرتے ہی ساکت ہو گئے تھے، اس حد تک بھی بے کار نہیں ہو گئے تھے کہ حرکت نہ کر سکتے۔ انھوں نے لیٹے ہی لیٹے اپنا دایاں پیر شیلاک کی پنڈلی پر دے مارا۔ اس کے قدم اکھڑ گئے۔ اتنی مہلت ان کے لیے کافی تھی۔ بجلی کی طرح تڑپ کر وہ اٹھے۔ لیکن اس وقت تک شیلاک بھی سنبھل چکا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔

اس وقت تک اندر کام کرنے والوں کو بھی اس جنگ کی خبر ہو چکی تھی۔ اندر ایک شور مچ گیا اور کام کرنے والے دھڑا دھڑ باہر نکلنے لگے۔

ان میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں کوئی نہ کوئی ہتھیار تھا۔ یہ ہتھیار عجیب و غریب تھے۔ کیونکہ وقتی طور پر پلانٹ سے اٹھائے گئے تھے۔ کسی کے ہاتھ میں کوئی بوتل تھی۔ تو کسی کے ہاتھ میں شیشے کا جار۔ کسی نے سلاخ تھامی ہوئی تھی۔ تو کسی کے ہاتھ میں ٹیڑھا میڑھا

کوئی آلہ۔

"خبردار! اندر والے باہر آ رہے ہیں۔" فاروق نے چلّا کر اپنے ساتھیوں کو خبردار کیا۔

"ان۔ ان کی۔ ان کی کیا مجال کہ یہ ہماری طرف بڑھ سکیں۔" شوکی نے اکڑ کر کہا۔

"ہائیں۔ شوکی بھائی۔ یہ جملہ تم نے کہا ہے؟"

"مم۔ معلوم تو یہی ہوتا ہے۔" شوکی بولا۔ پھر وہ جلدی سے فاروق کے قریب آیا اور بولا:

"آپ کے لیے میرے پاس ایک چیز ہے۔" یہ کہتے وقت اس نے دانت بھی نکال دیے۔

"یہ چیز دینے کا کون سا موقع ہے؟" فاروق نے تلملا کر کہا۔

"اس سے بہتر موقع تو بھئی کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔" شوکی نے مسکرا کر کہا۔

"دماغ تو نہیں چل گیا؟"

"نہیں۔ ابھی نہیں چلا۔ جب چلے گا بتا دوں گا۔ یہ لیجیے وہ چیز۔" یہ کہہ کر اس نے اپنا ہاتھ اس کی آنکھوں کے سامنے کر دیا۔ اس کے ہاتھ میں وہی پستول تھا جو رونل کے ہاتھ سے گرا تھا۔

"ارے۔ وہ مارا۔ بھئی شوکی تم نے تو کمال کر دیا۔" یہ کہتے ہی اس نے پستول جھپٹ لیا اور تیزی سے ان لوگوں کی طرف مڑا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے ان کی طرف نال کا رخ کیا اور ٹریگر دبا دیا۔ لیکن کچھ بھی نہ ہوا۔

"ارے باپ رے۔ یہ پستول تو ہمارے لیے بے کار ہیں۔" فاروق نے گھبرا کر کہا۔

"یہ کسی نہ کسی طرح تو چلتا ہی ہو گا۔" شوکی بولا۔

"ہاں! لیکن اس وقت یہ معلوم کرنے کا وقت کہاں سے لائیں۔" فاروق جل گیا۔

ادھر خان رحمان، منور علی خان، ڈاکٹر محمد عبداللہ، آفتاب، فرحت، اخلاق، اشفاق اور مکھن سب ان دونوں کے پاس پہنچ گئے۔ اب وہ لڑنے والی تینوں پارٹیوں اور آنے والے حملہ آوروں کے درمیان میں آ گئے تھے۔ ایسے میں انسپکٹر کامران مرزا نے شیلاک سے کہا۔

"مسٹر شیلاک۔ اس طرح کیا مزا آئے گا۔ باہر آنے والے سب ساتھیوں سے کہو۔ ایک طرف کھڑے ہو کر لڑائی دیکھیں۔"

شیلاک جلدی سے باہر نکل آنے والوں کی طرف مڑا اور چیخ کر بولا:

"ان سب کے ٹکڑے اڑا دو۔ ان میں سے ایک بھی

ٹکڑے ہونے سے نہ بچے۔"

"بھئی واہ۔ یہ ہوا اعلان تو۔" آفتاب نے منہ بنایا۔

"اگر یہ بات ہے تو پھر ہم بھی ان کے ساتھ مقابلہ کریں گے۔ یہ بھی کیا یاد رکھیں گے۔ کہ کسی رئیس سے ملاقات ہوئی تھی۔" فاروق ہنسا۔

خان رحمان انھیں جلدی جلدی ایک جگہ جمع کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ انھوں نے چیخ کر کہا۔

"شاباش ساتھیو۔ ہم اگرچہ بے سرو سامان ہیں۔ ہتھیار ہمارے پاس نہیں ہیں، لیکن۔ مومن ہیں اور مومن بے تیغ بھی لڑتا ہے۔ ان پر ٹوٹ پڑو اور ان کی تکا بوٹی کر دو۔"

"واقعی۔ تکے بہت دنوں سے نہیں کھائے۔" فرحت نے چٹخارے لے کر کہا۔

"لل۔ لیکن انکل۔ ہم اتنے بہت سے لوگوں کا مقابلہ کس طرح کر سکیں گے۔" ایسے میں اشفاق کی پریشان آواز ابھری۔

"عقل سے۔" فاروق نے بھنا کر کہا۔

"اوہ اچھا۔" اشفاق نے فوراً کہا۔

"میں اور منور علی خان انھیں روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تم لوگ تین تین آدمیوں کا گروپ بن جاؤ۔ ہر گروپ ایک ننھی

سی مثلث کی صورت میں کھڑا ہو جائے۔ اس طرح کہ کندھے ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہوں۔ اس طرح ہم میں سے کسی کی کمر دشمن کی طرف نہیں ہو سکے گی۔" خان رحمان نے جلدی جلدی ہدایت دی۔

"ٹھیک ہے۔ آؤ آفتاب فرحت۔ ہم ایک گروپ بن جاتے ہیں۔" فاروق نے جلدی سے کہا۔

"میں، منور علی خان اور ڈاکٹر ڈومی۔ اوہ۔ معاف کیجیے گا۔ ڈاکٹر محمد عبداللہ دوسرا گروپ بن جاتے ہیں۔"

"ہم۔ ہم۔ چچ۔ چاروں ایک گروپ۔" شوکی نے ہکلا کر کہا۔

"بالکل غلط۔ میں نے کہا ہے۔ تین تین کا گروپ بنے گا۔"

"لل۔ لیکن جناب انکل۔ اس طرح آخری گروپ میں صرف دو آدمی رہ جائیں گے۔"

"پروا نہ کرو۔" خان رحمان بولے۔

"تو پھر ٹھیک ہے جب آپ کہتے ہیں تو ہمیں پروا کی کیا ضرورت ہے۔" شوکی نے کہا اور جلدی سے ان کی طرف مڑے۔

"میں، اشفاق، اور اخلاق ایک گروپ بن گئے۔"

"لل۔ لیکن۔ تم۔ میں۔ میں۔" مکھن نے بوکھلا کر کہا۔

"بیگ۔ کیوں۔ کیا ہوا؟" شوکی نے جلدی سے کہا۔

"میرے ساتھ تو کوئی بھی نہیں بچا۔ آپ تو کہہ رہے تھے۔ آخری پارٹی میں دو آدمی رہ جائیں گے۔"

"ہاں۔ ہم کل سولہ آدمی ہیں۔ انکل انسپکٹر جمشید اور انسپکٹر کامران مرزا رونل اور شیلاک سے بھڑے ہوئے ہیں۔ محمود آصف اور فرزانہ نے ریوٹا کا گھیرا تنگ کر رکھا ہے۔ باقی رہ گئے گیارہ تین تین کے تین گروپ بن گئے۔ باقی دو ہی رہ جائیں گے، ایک نہیں۔" شوکی نے جلدی جلدی کہا۔

"ہاں۔ لیکن رہ صرف میں گیا۔" مکھن نے گھبرا کر کہا۔

"تب پھر ہمارا ایک ساتھی کہاں گیا۔" خان رحمان نے بوکھلا کر کہا۔

"بلکہ زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ وہ ساتھی ہے کون؟"

"ارے۔ پروفیسر انکل کہیں بھی نظر نہیں آ رہے۔" فاروق اچھل پڑا۔

انھوں نے جلدی جلدی میدانِ جنگ کا جائزہ لیا۔ واقعی پروفیسر داؤد کہیں نہیں تھے۔

"حیرت ہے۔ پروفیسر داؤد تو کہیں بھی نظر نہیں آ رہے۔" خان رحمان بڑبڑائے۔

"میں چونکہ بغیر کسی پارٹی کے رہ گیا ہوں۔ اس لیے

کیوں نہ میں ان کی تلاش میں اِدھر اُدھر نکل جاؤں۔" مکھن نے فوراً کہا۔

"لڑائی سے جان نکلی جا رہی ہے شاید۔" فاروق ہنسا۔

"یہ بات ہے تو میں آپ کی جگہ آ جاتا ہوں۔ آپ پروفیسر انکل کی تلاش میں نکل جائیں۔" مکھن نے جل بھن کر کہا۔

"شکریہ۔ میں یہیں ٹھیک ہوں۔"

"ٹھیک ہے مکھن۔ تم انھیں دیکھو۔" خان رحمان بولے۔

"انکل۔ وہ لوگ آ پہنچے۔" فرحت چلائی۔

تین گروپوں کی صورت میں وہ تین مختلف جگہوں پر کھڑے تھے۔ مکھن کو جوں ہی اجازت ملی۔ اس نے مخالف سمت میں دوڑ لگا دی۔ اور دور ہوتا چلا گیا۔ پھر ایک چکر کاٹ کر عمارت کی طرف آیا۔ اس کی طرف کوئی بھی متوجہ نہیں تھا۔ چنانچہ وہ دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا ایک دم اندرونی دروازے میں داخل ہو گیا۔

ادھر مسلح لوگوں نے ان پر حملہ کر دیا۔ ہر گروپ پر کم از کم دس دس آدمی حملہ آور ہوئے تھے۔ اور ان کے پاس سرے سے کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ اگر تھا تو صرف فاروق کے پاس رونل والا پستول۔ لیکن وہ اسے چلانے کا طریقہ نہیں جانتا

ہاں وہ اس کی نالی کسی دشمن کے پیٹ میں یا سر پر ضرور رسید کر سکتا تھا۔ یوں ہی ان کے گروپ پر چاروں طرف سے حملہ ہوا۔ وہ یک دم نیچے بیٹھ گئے۔ وار خالی گئے۔ انھوں نے ہاتھ بڑھا کر دشمنوں کی ٹانگیں کھینچ لیں۔ دس میں سے تین دھڑام سے گرے۔ دوسرے ہی لمحے ان کے ہتھیار ان کے ہاتھوں میں تھے۔ اب ہتھیار سے ہتھیار ٹکرائے۔ اور عجیب سی آوازیں گونجیں۔ کیونکہ تلواروں سے تلواریں نہیں ٹکرائی تھیں۔

دراصل اٹیمی پلانٹ میں ریموٹ کنٹرول توپوں کے سوا کوئی حفاظتی انتظام نہیں تھا۔ کیونکہ انھوں نے اپنے خیال میں ناقابلِ تسخیر گنبد بنایا تھا۔ جس پر توپ کا گولہ بھی اثر نہیں کرتا تھا۔ اور کوئی اس گنبد کے اندر داخل بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ لہٰذا یہاں باقاعدہ ملٹری کے پہرے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی تھی۔ انھیں اپنی سائنسی تیاریوں پر اس قدر مان تھا کہ ایسا کوئی انتظام نہیں کیا۔ یہی وجہ تھی کہ اب یہ جنگ بہت ہی بھونڈی قسم کے ہتھیاروں سے لڑی جا رہی تھی۔ ایسے ہتھیار جو کبھی کسی جنگ میں استعمال نہیں ہوئے ہوں گے ان لوگوں کے ہاتھوں میں زیادہ تر سائنسی آلات تھے۔ جب یہ ٹکرائے تو نہ صرف یہ کہ عجیب سی آواز ابھری۔ بلکہ ان میں سے کئی چھناکے کے ساتھ ٹوٹ بھی گئے۔

ادھر خان رحمان، منور علی خان اور ڈاکٹر محمد عبداللہ پر حملہ ہوا۔ پہلے تو تینوں جھکائی دے گئے۔ پھر پلٹے تو ان کے ہتھیاروں سے بے خوف ہو کر ان کی طرف دوڑ پڑے۔ حملہ آور گھبرا گئے۔ نہتے آدمی ان کے سامنے دوڑنے کی بجائے خود ان کی طرف دوڑ رہے تھے۔ وہ بے چارے بوکھلاتے نہ تو کیا کرتے۔ ان کی بوکھلاہٹ ان کے کام آ گئی۔ اور وہ ان پر ٹوٹ پڑے۔ تاہم ڈاکٹر محمد عبداللہ واجبی سے ہاتھ چلا رہا تھا۔ شاید اس بے چارے کی زندگی میں لڑائی بھڑائی کا موقع پہلی بار آیا تھا، لیکن چونکہ نیا نیا مسلمان ہوا تھا اور انسپکٹر جمشید نے اسے جہاد کے فضائل بھی سُنا دیے تھے۔ اس لیے مجاہدانہ انداز میں لڑ رہا تھا۔ خان رحمان کے کندھے پر ایک دشمن نے لوہے کی سلاخ پوری طاقت سے دے ماری۔ وہ لڑکھڑائے ضرور لیکن سنبھل گئے۔ اور سلاخ پر ہاتھ ڈال دیا۔ زور دار جھٹکا جو دیا تو سلاخ ان کے ہاتھ میں آ گئی۔ بس پھر کیا تھا۔ انھوں نے سلاخ کو تلوار کے انداز میں بجلی کی سی تیزی سے گھمانا شروع کر دیا۔ اور ساتھ ہی قدم جو بڑھایا تو حملہ آور بوکھلا کر پیچھے ہٹے۔ سلاخ سے تلوار کا کام لیتے انھوں نے شاید پہلی بار کسی کو دیکھا تھا۔ دوسرے یہ کہ وہ خود تلوار

بازی سے نابلد تھے۔ اس لیے گھبراتے نہ تو کیا کرتے اور گھبرانے
کے بعد پیچھے نہ ہٹتے تو کیا کرتے۔ پہلے ہی ہلے میں انھوں
نے تین دشمنوں کو ڈھیر کر دیا۔ گرنے والوں میں سے ایک کی
سلاخ منور علی خان نے اور دوسری ڈاکٹر نے اٹھا لی۔ اب وہ
پھر ان کے انداز میں سلاخیں گھمانے لگے۔

شوکی، اخلاق اور اشفاق پر بھی قریب قریب دس آدمیوں
نے حملہ کیا تھا۔ اور ان کے لیے سب سے بڑی مشکل
یہ تھی کہ ہتھیاروں کے مقابلے میں خالی ہاتھ تو تھے ہی۔
لڑائی بھڑائی سے ہمیشہ کوسوں دور بھاگتے رہتے تھے۔ لیکن
آج کوسوں دور بھاگنے کے قطعاً قابل نہیں رہ گئے تھے، کیونکہ
اس عمارت کا رقبہ کوسوں میں نہیں تھا۔

جوں ہی ان پر حملہ ہوا۔ انھوں نے دوڑ لگا دی۔ اور بہت
دور میدان میں جا کر رکے۔ حملہ آور کہاں پیچھا چھوڑنے
والے تھے۔ تعاقب بدستور جاری رکھا۔ اب یہاں ٹیلے یا
درخت تو تھے نہیں کہ وہ ان کا پیچھا کرتے۔ بس اِدھر
اُدھر بھاگ دوڑ کر ہی کچھ کام کر سکتے تھے۔ چنانچہ شوکی
نے دو تین لمبی چھلانگیں لگائیں۔ اخلاق اور اشفاق سے آگے
نکل گیا۔ پھر ان کے راستے سے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ حملہ
آوروں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ اخلاق اور اشفاق

کا تعاقب جاری رکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شوکی ان کے پیچھے آ گیا۔ اس
نے بھی ان کے ساتھ ساتھ دوڑنا شروع کر دیا۔ پھر ہٹ
کر تیزی سے جھکا اور ان میں سے ایک کی ٹانگ
پکڑ لی۔ وہ منہ کے بل گرا۔ اس کے ہاتھ میں لکڑی
کا ایک بڑا سا چمچہ تھا۔ اس نے چمچہ جھپٹ لیا اور
دوسرے کی طرف لپکا۔ چمچہ اس کی کمر پر کس کر مارا۔
لیکن اتفاق سے وہ اس کے سر میں لگ گیا اور اس
زور سے لگا کر وہ گر پڑا۔ شوکی بوکھلا اٹھا:

"م۔ میں نے۔ میں نے اس قدر زور سے تو نہیں
مارا تھا۔" وہ ہکلایا۔

دشمن تیزی سے اس پر جھپٹا۔ وہ بوکھلا کر پیچھے ہٹا۔
نتیجہ یہ کہ دشمن منہ کے بل گرا۔

"ارے، ارے۔ میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا۔"

ادھر اخلاق اور اشفاق کے سروں پر تابڑ توڑ چیزیں
برس رہی تھیں اور ان کے منہ سے گھٹی گھٹی چیخیں نکل
رہی تھیں۔ شوکی نے یہ منظر دیکھا تو ان کی مدد کے
لیے بڑھا اور چمچہ آگے بڑھاتے ہوئے بولا:

"یہ۔ یہ چمچہ لے لو۔"

"لیکن بھائی جان۔ ہم چمچے کا کیا کریں گے۔"

"ارے بھئی۔ چمچہ تو بہت کام کی چیز ہے۔ اگر یقین نہیں تو یہ دیکھو۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی طرف بڑھتے ہوئے ایک دشمن کے سر پر زور سے چمچہ دے مارا۔ وہ تیورا کر گرا۔

"دیکھا۔ ہے نا کام کی چیز؟"

"جی ہاں بے شک، لیکن بھائی جان۔ اگر یہ اتنے ہی کام کی چیز ہے تو اسے اپنے پاس کیوں نہیں رکھتے؟" اخلاق نے ہنستا کر کہا۔

"میں ذرا چمچوں سے گھبراتا ہوں۔" شوکی بولا۔

اسی وقت شوکی کے سر پر کوئی چیز زور سے لگی اور وہ لہراتا ہوا فرش پر آ رہا۔ یہ دیکھ کر اشفاق، اخلاق اور مکھن گھبرا گئے۔ بوکھلاہٹ کے عالم میں اِدھر اُدھر ہو گئے۔ لیکن حملہ آوروں کی تعداد زیادہ تھی۔ وہ جدھر بھی گئے۔ حملہ آور موجود تھے۔ اس صورتِ حال نے ان کے اوسان خطا کر دیے اور ان پر ایک بار پھر چیزیں برسنے لگیں۔ اتنے میں شوکی نے ایک کروٹ لی۔ اور آنکھیں کھول دیں۔ لیٹے لیٹے اس نے ایک دشمن کی ٹانگ پکڑ کر گھسیٹ لی۔ جوں ہی وہ گرا، پاس پڑی ہوئی لوہے کی سلاخ اٹھا کر اس کے سر پر دے ماری۔ ساتھ خود بھی ساکت ہو گیا،

یوں جیسے ہوش میں آیا ہی نہیں تھا۔

"ارے۔ اسے کیا ہوا؟" ایک دشمن نے اپنے بے ہوش ہونے والے ساتھی کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ابھی تو اچھا بھلا لڑائی میں مصروف تھا۔" دوسرے نے کہا۔

"اور اب سر سے خون بہ رہا ہے۔ اوہ۔ شاید اپنے ہی کسی ساتھی کا کوئی ہتھیار اس نے سر پر وصول کر لیا۔" تیسرے کے منہ سے نکلا۔

شوکی یہ جملے سن کر دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ اس کے دونوں بھائی بُری طرح پٹ رہے تھے۔ لیکن ہوش میں آ کر وہ ان کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا کہ وہ بھی ان کے ساتھ پٹنا شروع کر دیتا، چنانچہ اس نے اپنا پروگرام جاری رکھا۔ جوں ہی ایک دشمن کی ٹانگ اس کے قریب آئی۔ اس نے پکڑ کر گھسیٹ لی۔ وہ بھی دھڑام سے گرا۔ شوکی پہلے ہی تیار تھا۔ دوسرے ہی لمحے سلاخ اس کے سر پر لگی۔

"ہائیں۔ اب اسے کیا ہوا؟" ایک نے کہا۔

"کہیں کوئی بھوت تو ان لوگوں کی مدد نہیں کر رہا۔" دوسرے نے گھبرا کر کہا۔

"بھوت نہیں، اللہ کے فرشتے ہماری مدد کر رہے ہیں، بے وقوفو۔" اخلاق چلا کر بولا۔

"کیا بکواس ہے؟" ایک دشمن نے جھنجھلا کر کہا۔

"لیجیے۔ فرشتوں کا نام لے دیا، تو یہ بکواس ہو گئی، اور خود بھوت کا ذکر کر رہے تھے۔" اشفاق نے منہ بنایا۔

اسی وقت اس کے سر پر کوئی چیز زور سے لگی۔ وہ تیورا کر گرا۔ اور گرا بھی شوکی کے نزدیک۔ اس نے اُٹھنے کی کوشش کی ہی تھی، کہ غیر محسوس طور پر شوکی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور لیٹے رہنے کا اشارہ کیا۔ اشفاق وہیں ساکت ہو گیا۔ دشمن اب اخلاق کو گھیرے میں لے کر اس پر تابڑ توڑ ہاتھ مارنے لگے۔

"آپ نے مجھے روک کیوں لیا۔ اور اگر آپ ہوش میں ہیں تو لیٹے ہوئے کیا کر رہے ہیں؟" اشفاق نے سرگوشی کی۔

"میں لیٹے لیٹے کام دکھا رہا ہوں۔ یہ دو دشمن میں نے ہی گرائے ہیں۔ لو دیکھو۔ ایک اور شکار آ رہا ہے۔ یہ سلاخ تم سنبھال لو، جوں ہی گرے، سلاخ اس کے سر پر دے مارنا۔" شوکی نے سرگوشی کی۔

"بہت اچھا۔" اشفاق نے سمجھ جانے والے انداز میں

سر ہلا دیا۔

اسی وقت شوکی کا ہاتھ چل گیا۔ تیسرا دشمن جوں ہی گرا۔ اشفاق نے اپنا کام دکھا دیا۔ سلاخ اس کے سر پر بہت زور سے لگی اور اس کا سر پھٹ گیا۔

اب دونوں اس طرف رینگنے لگے جس طرف اخلاق پھنسا ہوا تھا۔ انھوں نے بیک وقت دو آدمیوں کی ٹانگیں پکڑ کر گھسیٹ لیں۔ لیکن اس بار ان کی حرکت دیکھ لی گئی۔ چنانچہ وہ سلاخیں لے کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور اندھا دھند ہاتھ گھمانے لگے۔ ان کے ہاتھ گھمانے میں کوئی ترتیب نہیں تھی۔ دو تین بار سلاخیں آپس میں ٹکرا گئیں۔ لیکن ان کی اس حرکت سے اتنا ضرور ہوا کہ اخلاق کو موقع مل گیا اور وہ ان کے نرغے میں سے نکل آیا۔

تینوں مل کر بے ہنگم انداز میں ہاتھ پیر چلانے لگے۔ ادھر دشمن ابھی تک تعداد میں ان سے زیادہ تھے۔ لہٰذا مار انھی کو پڑ رہی تھی۔ نتیجہ یہ کہ جلد ہی تینوں ڈھیر ہو گئے۔ ان کے جسموں پر جگہ جگہ زخم موجود تھے، اور ان سے خون رس رہا تھا۔ انھوں نے مکھن کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔ لیکن مکھن پورے میدان میں انھیں کہیں بھی نظر نہ آیا۔ میدان میں جنگ پورے زوروں پر جاری تھی، اور یہ زندگی اور موت

جنگ تھی۔ انھیں گرانے کے بعد دشمن میدان کی طرف بڑھ گئے۔ اور جنگ کرتے ہوئے اپنے ساتھیوں میں شامل ہو گئے۔

"کیسی ترکیب رہی؟" شوکی بڑبڑایا۔

"بہت شان دار۔ ہم رینگتے ہوئے دشمنوں کی پیٹھ کی طرف پہنچ سکتے ہیں اور اپنا کام شروع کر سکتے ہیں؟" اشفاق مسکرایا۔

"اور کیا۔ برابر مار کھانے کا آخر کیا فائدہ۔ ایسی بہادری سے ہم بزدل ہی بھلے۔ بزدلی کے پردے میں اگر دس بارہ دشمنوں کو لے بیٹھے تو یہ بزدلی بھی بہادری کی سرحدوں کو تو چھو ہی لے گی؟" مکھن بولا۔

"تو پھر آؤ۔" شوکی نے کہا۔

تینوں نے لوہے کی سلاخیں اپنے جسم کے ساتھ کر لیں اور رینگنے لگے۔ لمحہ بہ لمحہ وہ نزدیک ہوتے چلے گئے۔ اور پھر دشمن کی کمر پر پہنچ کر انھوں نے غیر محسوس انداز میں سلاخیں چلائیں۔ وہ سلاخیں چلاتے ہی ساکت ہو جاتے۔ ادھر ایک دو دشمنوں کی چیخیں بلند ہوتیں اور وہ ڈھیر ہو جاتے۔ اس بے ہنگم لڑائی میں کب پتا چل سکتا تھا کہ کسی شخص کو کیا چیز لگی اور کس طرف سے آ کے لگی۔

لیٹے لیٹے شوکی کا رخ انسپکٹر جمشید اور رونل کی طرف

ہو گیا۔ وہ کانپ اٹھا۔ اس نے دیکھا۔ انسپکٹر جمشید رونل کے نیچے دبے ہوئے تھے۔ رونل کے دونوں ہاتھ ان کے گلے پر تھے، اور اس نے ان کی ٹانگوں سے خود کو بچانے کے لیے اپنا سر ان کے سر کے اوپر جھکا دیا تھا۔ انسپکٹر جمشید کی دونوں ٹانگیں جس حد تک اس کے سر کی طرف مڑ سکتی تھیں، مڑی ہوئی تھیں۔ لیکن اس کے سر کو نہیں چھو پا رہی تھیں۔ ادھر ان کے دونوں ہاتھ رونل کے گلے پر جمے ہوئے تھے۔ لیکن نیچے دبے ہوئے ہونے کی وجہ سے وہ اس کی گردن پر اس قدر زور نہیں لگا سکتے تھے جتنا کہ وہ۔ یہی وجہ تھی کہ لمحہ بہ لمحہ انھیں اپنا دم گھٹتا محسوس ہو رہا تھا اور رونل کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ شوکی یہ دیکھ کر بے قرار ہو گیا۔ اشفاق اور اخلاق سے کچھ کہے بغیر وہ ان کی طرف گھسٹنے لگا۔ میدانِ جنگ میں مصروف ہر پارٹی ایک دوسرے کی خبر رکھے ہوئے تھی چنانچہ دوسرے لوگ بھی انسپکٹر جمشید کی حالت سے بے خبر نہیں تھے۔ لیکن سب اپنی اپنی جگہ مصروف تھے۔ یوں ان میں سے اگر کوئی ان کی مدد کے لیے آ سکتا تو بھی آ کر کیا کرتا، انسپکٹر جمشید اس قسم کی دخل اندازی کے قائل نہیں تھے۔ لیکن شوکی کو ان کے اس اصول کا علم نہیں تھا، اس

لیے وہ مدد کرنے کی نیت سے آگے سرکتا چلا گیا۔ اچانک اس نے انسپکٹر جمشید کی آواز سنی:

"وہیں رک جاؤ۔ اپنے ساتھیوں کی مدد کرو۔"

اس نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ سوائے اس کے اور کوئی ان کی طرف نہیں بڑھ رہا تھا۔ لہٰذا انھوں نے یہ جملہ اس سے ہی کہا تھا، چنانچہ مجبوراً اسے رُکنا پڑا۔ لیکن وہ اپنے ساتھیوں کی طرف نہ مڑ سکا۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اچانک اس نے محسوس کیا۔ انسپکٹر جمشید کے ہاتھ پیر سست پڑتے جا رہے تھے۔ یہ دیکھ کر اسے اپنے جسم سے جان نکلتی محسوس ہوئی۔ اسی وقت رونل نے پکار کر کہا۔

"لو بھئی۔ انسپکٹر جمشید تو گئے کام سے۔"

سب نے گھبرا کر ادھر دیکھا۔ اور ساتھ ہی رونل کئی ڈیسی میٹر اوپر اچھل گیا۔ شوکی کے منہ سے بے ساختہ قہقہہ اُبل پڑا۔ دوسرے بھی مطمئن ہو گئے۔ انسپکٹر جمشید کی چال کارگر رہی تھی۔ انھوں نے جب محسوس کر لیا کہ اب ان کا کام تمام ہونے کو ہے۔ انھوں نے فوری طور پر ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ دیے۔ رونل یہ سمجھا کہ وہ گئے کام سے۔ چنانچہ اس نے اپنا زور کم کر دیا۔ اور یہی

ان کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ انھوں نے پوری طاقت سے کام لیا اور اچانک اسے اچھال پھینکا۔ یہی نہیں۔ انھوں نے اس کے اوپر چھلانگ لگانے میں بھی دیر نہیں لگائی۔ اور اب وہ اس کے اوپر تھے اور اس کے گلے پر دونوں ہاتھ جمائے پورا زور لگا رہے تھے۔

سب لوگ مطمئن ہو کر پھر اپنے اپنے محاذ پر ڈٹ گئے۔ شیلاک نے ایک چھلانگ لگائی اور انسپکٹر کامران مرزا پر آ کر گرا۔ انسپکٹر کامران مرزا نے چال یہ چلی کہ جب اس نے چھلانگ لگائی۔ اس وقت حرکت کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ لیکن جب وہ حرکت میں آ چکا تو وہ اپنی جگہ سے کھسک لیے۔ اور اسے چھاپ بیٹھے:

"وہ مارا۔" آفتاب کا نعرہ فضا میں گونج گیا۔ ساتھ ہی ایک دشمن کا بھرپور مکّا اس کے جبڑے پر لگا اور اس کا چہرہ گھوم گیا۔

"اپنے اپنے محاذ پر توجہ دو۔ ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔" خان رحمان نے غرّا کر کہا۔

انسپکٹر کامران مرزا شیلاک کی گردن پر برابر زور ڈال رہے تھے۔ وہ بری طرح ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ لیکن اس کی کوئی پیش نہیں جا رہی تھی۔ انسپکٹر کامران مرزا

نے اسے کچھ اس بری طرح جکڑا تھا کہ وہ کچھ بھی نہ کر سکے اور پھر اس کا چہرہ سرخ ہوتا چلا گیا۔ سانس سینے میں اٹکتا محسوس ہونے لگا، پھر ہاتھ پیر سست پڑنے لگے۔ اس کے جسم نے ایک زور دار جھرجھری لی۔ اور وہ ساکت ہو گیا۔

انسپکٹر کامران مرزا ہاتھ جھاڑ کر اس پر سے اُٹھ کھڑے ہوئے:

"لو بھئی۔ شیلاک کو تو میں نے نبٹا دیا۔" ان کی آواز اُبھری۔

انسپکٹر جمشید نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ اور اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے روزنل نے ان کے منہ پر ایک مُکّا جڑ دیا۔ اس سے پہلے اس کے ہاتھ ان کے گلے پر جمے ہوئے تھے۔ لیکن ان کا رخ انسپکٹر کامران مرزا کی طرف ہوتے دیکھ کر اس نے ایک ہاتھ گلے پر سے ہٹایا اور منہ پر دے مارا۔ ان کا سر گھوم گیا۔ ساتھ ہی روزنل نے زور لگا کر انھیں اپنے اوپر سے اچھال دیا۔ پھر بلا کی رفتار سے اٹھا اور اس پر جھپٹا، لیکن اتنی دیر میں انسپکٹر جمشید بھی اُٹھ چکے تھے۔ انھوں نے خود کو روزنل کے وار سے بچتے ہوئے چلا کر کہا:

"نہیں انسپکٹر کامران مرزا۔ شیلاک کے دھوکے میں نہ آیئے گا۔ یہ حبس دم کا ماہر ہے۔"

"کیا!!!" انسپکٹر کامران مرزا کے منہ سے نکلا، لیکن دیر ہو چکی تھی۔ شیلاک کی لات ان کی کمر پر اس زور سے لگی کہ وہ اوندھے منہ گرے۔ ساتھ ہی شیلاک گویا ہوا میں اڑتے ہوئے ان پہ آیا۔ دونوں گڈ مڈ ہونے لگے۔ ایسے میں شیلاک نے ہنس کر کہا۔

"مجھے مارنا اتنا آسان نہیں انسپکٹر کامران مرزا۔"

"کوئی بات نہیں۔ ہم آسان کام کرنے کے اتنے عادی بھی نہیں ہیں۔ عام طور پر ہم مشکل کام کر کے خوش ہوتے ہیں۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"آپ نے بالکل ٹھیک کہا انکل۔ بالکل ایسا ہی ایک مشکل کام اس وقت ہم کر رہے ہیں۔" آصف کی آواز گونجی۔

انھوں نے اچٹتی سی ایک نظر ادھر ڈالی۔ وہ ریوٹا کو درمیان میں لیے ہوئے تھے۔ گویا ریوٹا کے تین طرف موجود تھے۔ ریوٹا بجلی کی سی سرعت سے ان پر حملے کر رہی تھی۔ عام طور پر اپنے اس انداز سے وہ دشمنوں کو تگنی کا ناچ نچا دیا کرتے تھے۔ اور اب تک نہ جانے کتنے دشمنوں کو ڈھیر کر چکے تھے۔ لیکن شاید ریوٹا ان میں سے

نہیں تھی جو تگنی کا ناچ نچانا جانتے ہوں۔ اگرچہ وہ ان
کے درمیان میں تھی۔ لیکن ناچنے کی بجائے الٹا انھیں نچا
رہی تھی۔ آصف پر چھلانگ لگاتی۔ اس پر وار کرتی تو
وہیں سے محمود پر حملہ کر دیتی اور اسے چوٹ پہنچا کر
فرزانہ کا رخ کرتی۔ وہ پھرتیلی اس غضب کی تھی کہ
ابھی تک وہ اسے لاکھ کوشش کے باوجود ایک ہاتھ بھی
رسید نہیں کر سکے تھے۔

"بھئی یوں کام نہیں چلے گا۔" ایسے میں اس نے ان
کے درمیان میں رک کر کہا۔

"تو پھر کیسے کام چلے گا۔" آصف نے بھنّا کر کہا۔

"میں اب تم لوگوں کو نہیں ماروں گی۔" وہ شوخ
انداز میں مسکرائی۔

"اس فیصلے کی وجہ؟"

"مجھے مزا نہیں آ رہا۔" اس نے کہا۔

"تو پھر۔" محمود نے سوالیہ انداز میں کہا۔

"اب تم تینوں مجھ پر وار کرو۔ میں صرف تمھارے
حملوں سے خود کو بچاؤں گی۔ جواب میں وار نہیں کروں گی۔"

"یہ آپ کا یک طرفہ فیصلہ ہے۔ ہماری طرف سے
آپ کو پوری آزادی ہے۔ موقع ملتا ہے تو ہمیں ضرور

چوٹ ماریں۔ ہم بھیک مانگنے کے عادی نہیں ہیں۔"

"نہیں۔ میں ذرا مزا لینا چاہتی ہوں۔ اب جب جنگ
چھڑ ہی گئی ہے تو پھر ہم لڑائی کا مزا کیوں نہ لیں۔"
اس نے ہنس کر کہا۔

"ویسے اس لڑائی کا انھیں قطعاً کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔"
رونل کی آواز سنائی دی۔

"کیوں۔ کیسے؟"

"یہ ہم سے کتنا بھی لڑ لیں۔ ہمیں کتنا بھی نقصان
پہنچا لیں۔ ایٹمی پلانٹ کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔ کیونکہ
ان کے پاس ایسی کوئی چیز نہیں ہے۔ جس سے یہ
پلانٹ کو نقصان پہنچا سکیں۔"

"اور دوسری یہ کہ یہ یہاں سے نکل نہیں سکیں گے۔ نکلنے
کا صرف اور صرف ایک ہی راستا ہے۔ وہی گنبد والا۔
اور گنبد کے ذریعے کوئی اسی وقت جا سکتا ہے جب
گنبد کے اوپر ہیلی کاپٹر موجود ہو۔"

"شاید تم لوگ اس رسی کو بھول گئے۔" انسپکٹر جمشید
طنزیہ لہجے میں بولے۔

"نہیں بھولے نہیں۔ لیکن تم لوگ اس تک پہنچو
گے کس طرح۔ تمھیں سیڑھیوں کا راستا کب معلوم ہے؟"

"فکر نہ کریں۔ ہم معلوم کر لیں گے۔" آصف نے منہ بنا کر کہا۔

"ضرور معلوم کر لینا۔" ریوٹا نے بڑا سا منہ بنا کر کہا۔ "پہلے مجھ سے دو دو ہاتھ کر لو۔"

"آؤ آؤ۔ ہم تمھیں دیکھ لیں گے۔"

"نہیں بھئی۔ اب صرف تم آؤ گے۔"

"اچھا یہ بات ہے۔ خیر۔ ہم آ رہے ہیں۔"

یہ کہہ کر محمود نے اس کی طرف دوڑ لگا دی۔ ادھر سے آصف نے چھلانگ لگائی۔ فرزانہ بھلا کب رکنے والی تھی۔ تینوں نے ایک ساتھ ریوٹا پر چھلانگ لگائی۔ اور یہی ان کی غلطی تھی۔

میدانِ جنگ میں ایک زور دار آواز گونج اُٹھی۔ سب نے بوکھلا کر اس طرف دیکھا اور حیران رہ گئے۔

وہ کہاں ہیں

ریوٹا ان سے قدرے فاصلے پر کھڑی ہنس رہی تھی اور وہ تینوں ایک دوسرے پر ڈھیر زمین پر پڑے تھے۔ یہ آواز ان کے آپس میں ٹکرانے سے پیدا ہوئی تھی۔ کیونکہ ریوٹا تو ان کے درمیان سے اس طرح نکل گئی تھی جیسے کہ مچھلی ہاتھوں میں سے نکل جاتی ہے۔ وہ جلدی جلدی اٹھے اور سر پکڑ کر الگ الگ بیٹھ گئے۔

"بھئی مجھے کب تک انتظار کرنا ہو گا۔" ریوٹا نے شوخ آواز میں کہا۔

"بس۔ ایک آدھ منٹ۔" محمود نے جل کر کہا۔

"اچھا۔ اس ایک آدھ منٹ میں میدانِ جنگ کا لطف اٹھا لو۔" ریوٹا نے کہا اور چاروں طرف دیکھنے لگی۔ پھر چہک کر بولی۔

"بھئی واہ۔ جنگ پورے زور شور سے جاری ہے۔ ابھی تک کسی فریق کا پلّہ بھاری نہیں ہوا۔ دونوں فریق

جان توڑ کر لڑ رہے ہیں۔"

"جان توڑ کر نہ لڑیں تو کیا جان جوڑ کر لڑیں۔" فاروق کی آواز میں جھنجلاہٹ تھی۔

وہ آفتاب اور فرحت اس وقت قریب قریب دس دشمنوں سے بھڑے ہوئے تھے۔ انھوں نے گرنے والے دشمنوں کے ہتھیار اٹھا لیے تھے، اور اب ہتھیار سے ہتھیار ٹکرا رہے تھے۔ فاروق کے ہاتھ میں ایک مڑی تڑی سی لکڑی تھی۔ وہ اسے اپنے سر سے اوپر رکھ کر گھما رہا تھا۔ مڑی تڑی نہ ہوتی تو سامنے رکھ کر بھی گھما سکتا تھا۔ لیکن ٹیڑھے پن کی وجہ سے اسے سر سے اوپر رکھ کر گھمانا پڑ رہا تھا۔ ایسے میں اسے پرانے زمانے کی جنگیں یاد آ رہی تھیں۔ جب تلواروں سے تلواریں ٹکراتی تھیں۔ اور جنگ جو سارا سارا دن تلوار چلاتے تھے۔ اس وقت بھی نقشہ کچھ اسی قسم کی جنگ کا تھا۔ اچانک وہ چونک اٹھا۔ آفتاب کے عین سر پر ایک دشمن وار کرنے والا تھا، اور آفتاب اس کی طرف سے بے خبر اپنے سامنے والے سے نبٹ رہا تھا۔ وہ بجلی کی سی سرعت سے ادھر جھپٹا۔ اسی وقت آفتاب نے خطرہ محسوس کر لیا، وہ مڑا، لیکن وار ہو چکا تھا۔ اس نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن

اسی وقت فاروق کی ٹیڑھی لکڑی دشمن کے ہتھیار کے راستے میں آ گئی۔ اور آفتاب نیچے سے نکل کر دور ہٹ گیا۔ فوراً اس نے کہا:

"شکریہ فاروق۔"

"شکریے کی ضرورت نہیں۔ دشمن کی طرف متوجہ رہنے کی ضرورت ہے۔" فرحت نے بھنا کر کہا اور پورے زور سے ہاتھ گھمایا۔ ایک دشمن چیخ مار کر گرا۔ وہ فاروق پر حملہ آور ہو چکا تھا۔

"شکریہ فرحت۔" فاروق مسکرایا۔

"شاید ہم پر شکریے کا بھوت سوار ہو گیا ہے۔ لیکن اس بھوت کو موقع محل بھی دیکھنا چاہیے۔" فرحت جل بھن کر بولی۔ اسی وقت فاروق کی لکڑی ایک اور دشمن کی خبر لے چکی تھی۔

"تمھاری یہ لکڑی خوب ہے۔ اسے عجائب گھر میں رکھیں گے۔" آفتاب ہنسا۔

"اگر اسے ساتھ لے جا سکے تو۔" فاروق نے منہ بنا کر کہا۔

اور پھر فاروق کو کوئی چمکتی چیز پڑی نظر آ گئی۔ اس نے موقع ملتے ہی ادھر دوڑ لگا دی۔ نزدیک پہنچ

کہ اس پر ہاتھ ڈالا تو وہ ایک پھل کاٹنے والا چاقو تھا۔
غالباً کوئی دشمن اسے اٹھا لایا تھا اور لڑائی کے دوران
یہ یہاں گر گیا تھا۔ اس نے اسے بائیں ہاتھ میں
پکڑ لیا۔ اب اس کے دونوں ہاتھ چل رہے تھے...
اچانک فضا میں دو چیخیں گونجیں۔ فاروق کا چاقو دو
دشمنوں کا کام تمام کر گیا تھا۔

"یہ۔ تم نے ان کے ساتھ کیا کیا فاروق" فرحت
نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک عدد چاقو عطا فرما دیا
ہے" وہ مسکرایا۔

"اوہو اچھا۔ پھر تو مزا آ گیا" آفتاب نے خوش ہو
کر کہا۔

"ابھی کہاں آیا۔ آئے گا" فاروق نے جواب دیا۔

"بھئی تم جنگ کر رہے ہو یا باتیں" ایک طرف
سے خان رحمان کی آواز سنائی دی۔

"کر تو جنگ ہی رہے ہیں انکل۔ ساتھ میں باتیں
بھی کر رہے ہیں" آفتاب نے مسکرا کر ان کی طرف
دیکھا اور ساتھ ہی ایک دشمن کی سلاخ اس کے سر
سے ٹکرا گئی۔ اس کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور وہ

دھڑام سے گرا۔

"آفتاب" فرحت چلائی۔

"نہیں۔ اس کی طرف توجہ دینے کی بجائے۔ دشمن سے
جنگ جاری رکھو" فاروق چیخا۔

فرحت سنبھل گئی۔ اور جم کر لڑنے لگے۔ ادھر فاروق
کا چاقو چل رہا تھا۔ جو بھی اس کی زد میں آیا۔ چاقو اس
کے پیٹ میں پیوست ہو گیا۔ نتیجہ یہ کہ فاروق نے جلد
ہی پانچ آدمیوں کو ٹھکانے لگا دیا۔ باقی پانچ اب اس کی
طرف بڑھتے ہوئے گھبرا رہے تھے۔ وہ فرحت کی طرف
زیادہ توجہ دے رہے تھے۔ لیکن فاروق کہاں رُکنے
والا تھا۔ وہ فرحت کی طرف متوجہ ہوتے اور وہ ان
کے پیچھے سے حملہ آور ہو جاتا۔ اس بوکھلاہٹ نے دشمن
کو خوب نقصان پہنچایا۔ اسی وقت آفتاب نے کروٹ لی
اور آنکھیں کھول دیں۔ اس کے سر سے خون بہ رہا تھا۔ جو بہ
بہ کر اس کے چہرے پر آ گیا تھا۔ خون نے اس کے چہرے
کو بھیانک بنا دیا تھا۔ اس نے ایک سلاخ اٹھا لی اور بلا
کی رفتار سے گھماتا آگے بڑھا۔ فاروق نے یہ دیکھ کر ایک
جھکائی دی اور دشمنوں کے درمیان سے نکل گیا۔ دشمن
آفتاب کی طرف متوجہ ہوئے تو وہ ان کی کمر کی طرف پہنچ

کر اس پر ہاتھ ڈالا تو وہ ایک پھل کاٹنے والا چاقو تھا۔ غالباً کوئی دشمن اسے اٹھا لایا تھا اور لڑائی کے دوران یہاں گر گیا تھا۔ اس نے اسے بائیں ہاتھ میں پکڑ لیا۔ اب اس کے دونوں ہاتھ چل رہے تھے...
اچانک فضا میں دو چیخیں گونجیں۔ فاروق کا چاقو دو دشمنوں کا کام تمام کر گیا تھا۔

"یہ۔ تم نے ان کے ساتھ کیا کیا فاروق" فرحت نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک عدد چاقو عطا فرما دیا ہے" وہ مسکرایا۔

"اوہو اچھا۔ پھر تو مزا آگیا" آفتاب نے خوش ہو کر کہا۔

"ابھی کہاں آیا۔ آئے گا" فاروق نے جواب دیا۔

"بھئی تم جنگ کر رہے ہو یا باتیں" ایک طرف سے خان رحمان کی آواز سنائی دی۔

"کر تو جنگ ہی رہے ہیں انکل۔ ساتھ میں باتیں بھی کر رہے ہیں" آفتاب نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا اور ساتھ ہی ایک دشمن کی سلاخ اس کے سر سے ٹکرا گئی۔ اس کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور وہ

دھڑام سے گرا۔

"آفتاب" فرحت چلائی۔

"نہیں۔ اس کی طرف توجہ دینے کی بجائے۔ دشمن سے جنگ جاری رکھو" فاروق چیخا۔

فرحت سنبھل گئی۔ اور جم کر لڑنے لگے۔ ادھر فاروق کا چاقو چل رہا تھا۔ جو بھی اس کی زد میں آیا۔ چاقو اس کے پیٹ میں پیوست ہو گیا۔ نتیجہ یہ کہ فاروق نے جلد ہی پانچ آدمیوں کو ٹھکانے لگا دیا۔ باقی پانچ اب اس کی طرف بڑھتے ہوئے گھبرا رہے تھے۔ وہ فرحت کی طرف زیادہ توجہ دے رہے تھے۔ لیکن فاروق کہاں رکنے والا تھا۔ وہ فرحت کی طرف متوجہ ہوتے اور وہ ان کے پیچھے سے حملہ آور ہو جاتا۔ اس بوکھلاہٹ نے دشمن کو خوب نقصان پہنچایا۔ اسی وقت آفتاب نے کروٹ لی اور آنکھیں کھول دیں۔ اس کے سر سے خون بہ رہا تھا۔ جو بہ بہ کر اس کے چہرے پر آگیا تھا۔ خون نے اس کے چہرے کو بھیانک بنا دیا تھا۔ اس نے ایک سلاخ اٹھا لی اور بلا کی رفتار سے گھماتا آگے بڑھا۔ فاروق نے یہ دیکھ کر ایک جھکائی دی اور دشمنوں کے درمیان سے نکل گیا۔ دشمن آفتاب کی طرف متوجہ ہوئے تو وہ ان کی کمر کی طرف پہنچ

گیا۔ فرحت نے بھی یہی کیا۔ دونوں ان کی کمر کی طرف سے
حملہ آور ہوئے۔ اِدھر آفتاب بھیانک انداز میں سلاخ چلا
رہا تھا۔ نتیجہ یہ کہ دشمن ان کے درمیان میں آ گئے۔ ایک
طرف سلاخوں نے ان کی خبر لی۔ تو دوسری طرف چاقو اور
اور مڑی تڑی لکڑی نے۔ آن کی آن میں ان میں سے
تین اور ڈھیر ہو گئے۔ باقی دو لگے بھاگنے۔ تینوں ان
کے پیچھے دوڑے۔ ان کا رخ عمارت کے اندرونی دروازے
کی طرف تھا۔ وہ اس رفتار سے بھاگ رہے تھے جیسے
موت کے فرشتے کو دیکھ لیا ہو۔ اور وہ تینوں بھی جان
توڑ کر بھاگ رہے تھے۔ آخر دوڑتے دوڑتے وہ اندرونی
دروازے میں داخل ہو گئے۔ لیکن اس وقت تک تینوں
ان کے سروں پر پہنچ چکے تھے۔ چند سیکنڈ بعد وہ
دونوں بھی زمین پر پڑے دم توڑ رہے تھے۔

"آؤ اب اپنے ساتھیوں کی مدد کریں۔ جس طرف کمزوری
کے آثار نظر آئیں گے، ہم اپنا رخ اس طرف کر لیں گے۔"
فاروق نے کہا۔

تینوں ابھی مڑے ہی تھے کہ ٹھٹک کر رک گئے۔

O

مکھن نے پروفیسر داؤد کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔
وہ انھیں کہیں بھی نظر نہ آئے۔ پھر اس کی نظر، اندرونی
دروازے پر پڑی۔ جنگ اس وقت اس دروازے سے کافی
فاصلے پر ہو رہی تھی۔ اس نے سوچا۔ ہو نہ ہو۔ پروفیسر
صاحب اندر گئے ہیں۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے
دروازے کی طرف کھسکنا شروع کر دیا۔ دوڑ کر جاتا تو
اسے دیکھ لیا جاتا۔ آخر دبے پاؤں چلتا اور کھسکتا وہ
دروازے تک پہنچ گیا۔ پھر سب پر ایک نظر ڈالتے ہوئے اندر
گھس گیا۔ پھر جو دروازہ بھی اسے کھلا نظر آتا گیا۔ وہ اندر ہی
اندر چلتا گیا۔ عجیب و غریب قسم کے آلات والے کمروں سے
گزرتے اس پر دہشت طاری ہو گئی۔ چہرے پر ہوائیاں اڑنے
لگیں۔ اور پھر ایک کمرے میں اس کے قدم رک گئے۔ آنکھوں
میں حیرت دوڑ گئی۔ اسی وقت کمرے میں موجود شخص نے
آواز سن کر اس کی طرف مڑ کر دیکھا:

"ارے مکھن۔ تم؟" پروفیسر داؤد کے منہ سے نکلا۔

"ہاں انکل۔ میں آپ کی تلاش میں نکلا تھا۔"

"بہتر ہوتا کہ تم باہر ہی ٹھہر کر دشمنوں کا مقابلہ کرتے۔
یہاں کوئی نہیں ہے۔ سب کے سب باہر جنگ میں مصروف
ہیں۔"

"مل۔ لیکن۔ آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟"

"میں ذرا ان آلات کا جائزہ لے رہا تھا۔ باہر میرے لیے کوئی کام بھی تو نہیں تھا۔ لڑائی بھڑائی کا مجھے کوئی تجربہ نہیں۔ بس واجبی سا پستول چلانا جانتا ہوں۔"

"تت۔ تو آپ صرف ان آلات کا معائنہ کرنے آئے ہیں ادھر۔" مکھن کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ہاں بھئی۔ اور کیا کروں گا۔"

"مم۔ میرے لیے کیا حکم ہے۔"

"تم واپس میدانِ جنگ میں جاؤ۔" انھوں نے کہا۔

"جی بہت بہتر۔" مکھن نے کہا اور واپس مڑا۔ ابھی اس نے چند قدم ہی اٹھائے ہوں گے کہ کوئی چیز گرنے کی آواز گونجی۔ مکھن چونک اٹھا۔ چلتے چلتے رک گیا۔ پھر واپس مڑا اور دبے پاؤں اس کمرے کی طرف آیا۔ جس میں پروفیسر داؤد موجود تھے۔ جوں ہی اس نے کمرے میں جھانکا۔ سٹی گم ہو گئی۔ اندر ایک شخص ایک بھاری بھر کم پائپ دونوں ہاتھوں میں تولے کھڑا تھا۔ پائپ سر سے بلند تھا اور وہ پروفیسر داؤد کے سر پر گرنے ہی والا تھا۔ پروفیسر داؤد کی آنکھوں میں خون تھا۔ آفتاب کو اور تو کچھ نہ سوجھی۔ اس کی طرف بلا کی رفتار سے دوڑ پڑا اور

سر کی ٹکر اس کی کمر میں دے ماری۔ وہ بے خبر تھا۔ اوندھے منہ گرا۔ پائپ اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ جسے پروفیسر داؤد نے فوراً اٹھا لیا اور اس کے سر پر تان لیا، لیکن مار نہ سکے۔

"انتظار کس بات کا انکل۔ دے ماریے۔ ورنہ یہ ہمارا کام ختم کر دے گا۔"

"مم۔ میں۔ میں نہیں مار سکتا مکھن۔ تم یہ کام کر گزرو۔"

"جی۔ میں۔ آپ کا مطلب ہے میں۔" مکھن نے بوکھلا کر کہا۔

"ہاں میں تم سے ہی کہہ رہا ہوں۔ کسی اور سے کہہ بھی کس طرح سکتا ہوں۔ جب کہ یہاں تمھارے علاوہ کوئی ہے ہی نہیں۔"

"تو پھر لائیے۔" اس نے کانپ کر کہا۔

اسی وقت انھوں نے دشمن کو اٹھتے دیکھا۔ مکھن گھبرا گیا۔ اس نے جلدی سے پائپ لیا اور اندھا دھند اس کے سر پر دے مارا۔ لیکن وہ ہوشیار ہو چکا تھا۔ جلدی سے ایک طرف ہو گیا۔ پائپ فرش پر لگا۔ ساتھ ہی اس نے پائپ پر ہاتھ ڈال دیا۔ اب پائپ کا ایک سرا اس کے ہاتھ میں تھا اور دوسرا سرا دشمن کے ہاتھ میں۔ دونوں

اسے چھیننے کے لیے زور لگانے لگے۔

"کچھ کیجیے انکل"، مکھن نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"مگر۔ کیا کروں؟"

"کوئی چیز اٹھا کر اس کے سر پر دے ماریے۔" وہ بولا

"اچھا۔ اچھا۔" پروفیسر داؤد بولے اور ایسی کسی چیز کی تلاش میں نظریں دوڑانے لگے۔ آخر ایک میز پر رکھی شراب کی بوتل پر ان کی نظر پڑی۔

"یہ بوتل ٹھیک رہے گی مکھن؟"

"ویری گڈ انکل۔ اس سے بہتر تو کوئی ہتھیار اس وقت ہو ہی نہیں سکتا۔ بس یہ اٹھا کر اس کے سر پر دے ماریے۔"

"لیکن بھئی۔ شراب اس کے کپڑوں کو خراب کر دے گی۔" پروفیسر داؤد گھبرا کر بولے۔

"پروا نہ کریں انکل۔" مکھن جلدی سے بولا۔

آخر پروفیسر داؤد نے ڈرتے ڈرتے بوتل اٹھا لی اور دشمن کی طرف بڑھے۔ دشمن بھی ان کی طرف سے ہوشیار ہو چکا تھا۔ جوں ہی انھوں نے بوتل اس کے سر پر ماری، وہ جھک گیا۔ بوتل ہوا میں جھول کر رہ گئی۔ ساتھ ہی اس نے مکھن کو ایک جھٹکا مارا۔ مکھن زور سے لڑکھڑایا۔ لیکن پائپ اس نے پھر بھی نہ چھوڑا اور اتنے میں پروفیسر

داؤد پھر بوتل سنبھال چکے تھے۔ دشمن کا منہ بھی انھی کی طرف تھا اور وہ بوتل کے وار سے بچنے کے لیے پر تول چکا تھا۔

"د د۔ دیکھو بھئی۔ ایک بوتل کھا لو۔ پیتے تو رہتے ہی ہو۔" پروفیسر داؤد نے درخواست کرنے والے انداز میں کہا۔

"انکل۔ جلدی کیجیے۔ پائپ اب میرے ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔" مکھن نے گھبرا کر کہا۔

"اپنی طرف سے تو بہت جلدی کر رہا ہوں۔" یہ کہ کر پروفیسر داؤد نے بوتل پھر اس کے سر پر ماری۔ لیکن اس بار انھوں نے چال چلی تھی۔ انھیں۔ محمود، فاروق اور فرزانہ کی حرکتیں یاد آ گئی تھیں۔ لہٰذا انھوں نے ہاتھ اٹھایا ضرور، دے مارنے کے انداز میں جھکایا بھی۔ لیکن مارا نہیں۔ ادھر دشمن نے خود کو بچانے کے لیے اپنا سر ایک طرف کر لیا۔ اور اسی لمحے پروفیسر داؤد نے بوتل ادھر دے ماری۔ بوتل پورے زور سے لگی۔ پائپ پر سے اس کے ہاتھ ہٹ گئے اور سر کی طرف چلے گئے۔ شراب اس کے کپڑوں پر گر گئی۔ اور وہ نیچے بیٹھتا چلا گیا۔ مکھن نے احتیاطاً ایک پائپ بھی اس کے سر پر رسید کر دیا۔

"اب میرے لیے کیا حکم ہے انکل۔"

"یہ زخمی ہو چکا ہے۔ لیکن یہ میرے لیے مشکلات پیدا کر سکتا ہے۔ یا تو تم اس کے سر پر ایک پائپ ذرا اور زور سے مارو۔ یا پھر یہیں ٹھہرو۔ یہیں ٹھہرنے کی صورت میں میدانِ جنگ میں ہمارا ایک آدمی کم رہے گا۔ اور تمھارے جانے کی صورت میں انھیں ایک آدمی کی مدد حاصل ہو گی اور پھر لوہے کا یہ پائپ بھی بہت کام دے گا۔" انھوں نے جلدی جلدی کہا۔

"بہت بہتر انکل۔" مکھن نے کہا اور پوری طاقت سے ایک بار پھر پائپ اس کے سر پر مارا۔ خون اس کے سر سے تیزی سے بہنے لگا۔ وہ تڑپنے لگا۔ اسے تڑپتا چھوڑ کر مکھن باہر نکل گیا۔ پروفیسر داؤد اندر ہی رہ گئے۔ مکھن جوں ہی بیرونی دروازے کے نزدیک پہنچا۔ اسے ٹھٹک کر رک جانا پڑا۔

"تت۔ تم۔ تم اندر کیا کر رہے ہو۔" اس نے فاروق کی آواز سنی۔

"میں۔ پروفیسر انکل کی تلاش میں نکلا تھا۔" اس نے کہا۔

"بھئی یہ کیوں نہیں کہتے کہ لڑائی سے جان بچاتے پھر رہے ہو۔" آفتاب نے منہ بنایا۔

"یہ بات نہیں۔ انکل خان رحمان نے ہی میری یہ

ڈیوٹی لگائی تھی۔"

"خیر۔ تو پھر۔ کیا پروفیسر انکل مل گئے۔" فرحت نے جلدی سے پوچھا۔

"ہاں مل گئے۔ ہم دونوں کو مل کر ایک دشمن سے مقابلہ بھی کرنا پڑا۔ لہٰذا لڑائی سے جان چھڑانے والی بات بالکل غلط ثابت ہو جاتی ہے۔" اس نے برا مان کر کہا۔

"چلو خیر۔ مان لیا۔ لیکن پروفیسر صاحب کو یہاں تنہا چھوڑ کر کہاں جا رہے ہو۔"

"میدانِ جنگ کی طرف۔ یہ انھی کا حکم ہے۔"

"اور اگر ان کے مقابلے میں کوئی اور دشمن نکل آیا تو؟"

"پوری عمارت میں اب اور کوئی معلوم نہیں ہوتا۔ وہ ایک نہ جانے کس طرح رہ گیا تھا۔"

"ہوں۔ تو پھر ہم بھی میدان کا رخ کرتے ہیں وہاں ہماری زیادہ ضرورت ہے۔"

"بالکل ٹھیک۔" مکھن فوراً بولا۔

"اور یہ پائپ مجھے دے دو۔" فاروق نے کہا۔

مکھن نے پائپ فاروق کو دے دیا۔ اور بولا۔

"شاید آپ کو پائپ میرے ہاتھ میں بھلا نہیں لگ رہا تھا۔"

"نہیں۔ یہ بات نہیں۔ میدانِ جنگ میں میں اس سے زیادہ
کام لے سکوں گا۔"

چاروں پلٹے اور دشمنوں کے عقب میں پہنچ گئے۔ انھوں
نے سارے میدان پر ایک نظر ڈالی اور شوکی، اخلاق اور
اشفاق گروپ کو خاصی کمزور پوزیشن میں پایا۔ وہ مار کھا کھا
کر نڈھال ہوتے جا رہے تھے:

"گھبرانا نہیں بھئی۔ ہم آ گئے ہیں" آفتاب نے بلند آواز
میں کہا۔

اور چاروں نے ایک ساتھ ان پر حملہ کر دیا۔ دشمن ان
تینوں کو بھول کر ان کی طرف مڑے۔ لیکن اتنی دیر میں ہی
ان میں سے تین گر چکے تھے۔ ادھر شوکی، اخلاق اور اشفاق
کمک پہنچنے پر شیر ہو گئے۔ انھوں نے بھی دشمنوں پر تڑاتڑ وار
کیے۔ نتیجہ یہ کہ دشمن درمیان میں آ گیا۔ وہ ادھر مڑتا تب
مصیبت، ادھر مڑتا تب مشکل۔ چند منٹ میں ہی تین اور
گر گئے۔ اب مقابلے میں صرف پانچ رہ گئے تھے۔ فاروق
کا پائپ تیزی سے گردش کر رہا تھا۔ وہ جس کے سر پر
ایک بار لگ گیا، وہ پھر نہ اٹھ سکا۔ آخر دو منٹ بعد
میدان ان کے ہاتھ تھا۔ اب ان دو گروپوں کے سات
آدمی اپنے حصے کے دشمنوں کا صفایا کر چکے تھے۔ انھوں

نے ادھر اُدھر دیکھا۔ اور محسوس کیا کہ ریوٹا محمود، آصف اور
فرزانہ کو چکمہ دے رہی ہے۔ چنانچہ ادھر کا رخ کیا۔
ان کے راستے میں منور علی خان، خان رحمان اور ڈاکٹر
محمد عبداللہ کا گروپ مصروفِ جنگ نظر آیا۔

ان تینوں کی جنگ پندرہ دشمنوں سے شروع ہوئی
تھی۔ اس وقت تک وہ سات دشمنوں کو ڈھیر کر چکے
تھے۔ آٹھ باقی تھے۔ ان تینوں کے ہاتھ تیزی سے چل
رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں ابھی تک ذرا بھی سستی
نہیں آئی تھی۔ تینوں زخمی ہونے سے بھی نہیں بچے
تھے۔ ان کے جسموں پر جا بجا زخم آ چکے تھے اور
ان سے رسنے والے خون نے انھیں رنگین بنا دیا تھا۔

"انکل۔ ہماری مدد کی ضرورت تو نہیں۔"

"نہیں۔ ریوٹا کی طرف جاؤ" خان رحمان فوراً بولے۔
اسی وقت ایک دشمن کا ڈنڈا ان کی پیشانی پر لگا۔
پیشانی کی کھال پھٹ گئی اور اس سے خون نکل آیا۔

"آپ۔ آپ چوٹ کھا بیٹھے انکل" فاروق نے بے چین
ہو کر کہا۔

"پروا نہ کرو۔ محمود وغیرہ کی مدد کو پہنچو۔ ریوٹا ان
کے لیے ٹیڑھی کھیر ثابت ہو رہی ہے۔"

"جی بہتر۔ آپ فکر نہ کریں۔"

وہ تیز تیز قدم اٹھاتے اس جگہ پہنچے جہاں ریوٹا ان تینوں سے لڑ رہی تھی۔

"گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ ہم آ گئے ہیں۔ اور اب مس ریوٹا کی سٹی گم کر کے رہیں گے۔"

"نہیں بھئی۔ یہ تو ان کے ساتھ ناانصافی ہو گی۔" محمود نے فوراً کہا۔

"ناانصافی ہو گی۔ وہ کیسے؟"

"ایک اکیلی سے ہم نو دس مقابلہ کرتے کیا اچھے لگیں گے۔" آصف نے کہا۔

"بالکل ٹھیک۔ فاروق۔ تم لوگ الگ رہو۔ اور جو سائیڈ کمزور نظر آئے۔ ادھر کا رخ کرو۔" فرزانہ نے کہا۔

"مشکل تو یہی ہے۔ سائیڈ یہی کمزور ہے۔" آفتاب نے منہ بنایا۔

"تب پھر انتظار کرو۔ جب ہم بالکل بے بس ہو جائیں۔ اور گر جائیں۔ تو اس وقت تم مقابلے کے لیے آگے آنا۔" محمود بولا۔

"ارے نہیں بھئی۔ ان لوگوں کو بھی شامل ہو جانے دو۔ میں تم سب کے لیے کافی ثابت ہوں گی۔" ریوٹا نے چہک

کر کہا اور زور سے اچھل کر ان کے درمیان سے نکل گئی۔ وہ بالکل کسی مچھلی کی طرح اچھلی تھی۔ تینوں فوراً اس کی طرف مڑے۔ لیکن اتنی دیر میں ریوٹا فاروق کے سر پر لوہے کی سلاخ رسید کر چکی تھی۔ فاروق چکرا کر گرا۔ پائپ اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ آصف نے پائپ اٹھانے میں دیر نہ لگائی اور بلا کی تیزی سے اسے ریوٹا کی طرف گھمایا۔ ریوٹا پھر اچھلی اور پائپ اس کے نیچے سے نکل گیا۔ ریوٹا پھر دور کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اسی وقت خان رحمان کی چہکتی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی:

"ہم بھی فارغ ہو گئے ہیں۔"

"ارے۔ اس کا مطلب ہے۔ ریوٹا، شیلاک اور رونل ہی باقی رہ گئے۔"

"نہیں بے وقوفو۔ ابھی اس عمارت میں بہت لوگ ہیں۔ جو اندرونی حصوں میں کام میں مصروف ہیں۔ انھیں تو ابھی تک خبر ہی نہیں ہو سکی کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔ جوں ہی انھیں خبر ہوئی۔ وہ نیچے آ کر تم لوگوں کی تکا بوٹی کر دیں گے۔" رونل نے گرج دار آواز میں کہا۔ وہ ابھی تک پوری طرح چاق و چوبند ان سے لڑ رہا تھا۔

"جب انھیں ابھی تک پتا نہیں چلا تو پھر اب کیا

چلے گا۔" خان رحمان ہنسے۔

"یہ اطلاع ریوٹا انہیں دے گی۔ بس ریوٹا۔ تم ان کا گھیرا توڑ کر نکل جاؤ۔ اور بالائی منزل میں جنگ کی اطلاع دو۔" رونل نے کہا۔

"او کے سر۔" اس نے کہا اور بھڑک کر بھاگی۔

"خبردار۔" محمود چلایا اور اس کے پیچھے دوڑا۔ اسی وقت ریوٹا دھڑام سے گری۔ فاروق جو چند لمحے قبل زخمی ہو کر گر گیا تھا۔ اس وقت ہوش میں آیا تھا۔ ہوش میں آتے ہی اس نے ریوٹا کو دوڑتے اور محمود کو چلاتے سن لیا۔ بس اس نے لیٹے لیٹے اس کی ٹانگیں پکڑ لیں اور وہ دھڑام سے منہ کے بل گری۔ فاروق نے یہی نہیں کیا کہ اس کی ٹانگیں پکڑ لیں۔ بلکہ وہ ان کے ساتھ چمٹ گیا اور انہیں مضبوطی سے پکڑ لیا۔ ریوٹا نے خود کو چھڑانے کے لیے ایک پلٹنی کھائی۔ ساتھ میں فاروق الٹ گیا۔ لیکن اس نے ٹانگیں پھر بھی نہ چھوڑیں۔

موقع اچھا تھا۔ محمود آگے بڑھا اور ریوٹا کے بال پکڑ لیے۔ اور سر کو ایک زور دار جھٹکا مارا۔ اس کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ وہ اس طرح لہرائی جیسے نشے میں ہو اور پھر جھومتی ہوئی زمین کی طرف چلی۔ یہ دیکھ کر وہ حیران رہ

گئے۔ کیونکہ محمود نے صرف اس کے بالوں کو ایک جھٹکا دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ بے ہوش ہو گئی۔

"ارے۔ یہ ریوٹا کو کیا ہوا۔ خود بخود بے ہوش ہو گئی۔" خان رحمان کے منہ سے نکلا۔

"تم نے اس کے بالوں کو جھٹکا تو نہیں دیا تھا۔" انسپکٹر کامران مرزا کی آواز سنائی دی۔

"ہاں دیا تو تھا۔ معاف کر دیں۔" محمود گھبرا کر بولا۔

"بس۔ اسی لیے یہ بے ہوش ہو گئیں۔ یہ بالوں کا کھینچا جانا برداشت نہیں کر سکتی۔ یوں بڑی سے بڑی چوٹ کو پی سکتی ہے۔"

"اوہ! یہ تو آپ نے بہت اچھا کلیہ بتا دیا۔" آصف نے خوش ہو کر کہا اور پھر ریوٹا کے بال تھام لیے۔

"اب بال کیوں پکڑ رہے ہو؟"

"جوں ہی ہوش میں آنے کی کوشش کرے گی۔ ایک جھٹکا دے دوں گا۔"

"ہوں۔ بات تو ٹھیک ہے۔"

اب وہ سب کے سب انسپکٹر کامران مرزا اور انسپکٹر جمشید کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ان کی شیلاک اور رونل سے ابھی تک جنگ جاری تھی۔

"انسپکٹر جمشید - کیا ہم تمہاری مدد کریں۔"

"نہیں - یہ مقابلہ اسی طرح جاری رہنے دو۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

اس وقت رونل ان سے کافی فاصلے پر موجود تھا۔ اور یہ اس وجہ سے ہوا تھا کہ اس نے ان پر چھلانگ لگائی تھی۔ وہ نیچے بیٹھ گئے۔ رونل ان کے اوپر سے ہوتا ہوا دور جا گرا۔ پھر فوراً ہی اٹھا۔ اب وہ پھر چھلانگ لگانے کی تیاری کر رہا تھا۔ ادھر شیلاک اور انسپکٹر کامران مرزا ایک دوسرے سے بُری طرح بھڑے ہوئے تھے۔

رونل نے پھر ایک بہت لمبی چھلانگ لگائی۔ انھیں یوں لگا جیسے وہ ہوا میں تیرتا ہوا ان کی طرف آیا ہو۔ انسپکٹر جمشید نے بچنے کی پوری کوشش کی۔ لیکن زد میں آئے بغیر نہ رہ سکے۔ رونل کا جسم ان کے جسم سے پورے زور سے ٹکرایا اور وہ اُچھل کر دُور جا گرے۔ انھیں یوں لگا جیسے ان کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی ہو۔ اُٹھنے کی کوشش کی تو ایک بہت زور کا چکر آیا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا آگیا اور وہ گرتے چلے گئے۔

"اب مجھے روک کر دکھاؤ - میں جا رہا ہوں باقی لوگوں کو بُلانے۔"

"لیکن مسٹر رونل - اب اس کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے۔ اگر تم ہم سب کے لیے اکیلے ہی کافی ہو تو پھر آؤ اور ہم سے لڑ لو۔" محمود بولا۔

"بہت چالاک ہو۔" رونل مسکرایا۔ وہ دوڑتے دوڑتے رُک گیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے اس نے کچھ سوچا اور پھر بولا:

"خیر - یُوں ہی سہی - تم لوگ بھی کیا یاد کرو گے۔"

یہ کہ کر وہ ان کی طرف مڑا۔ اس نے پھر ایک لمبی چھلانگ لگائی اور خان رحمان کو لے بیٹھا۔ وہ سب بوکھلا اُٹھے۔ ان کے درمیان ہل چل مچ گئی۔ رونل پھر آ رہا تھا۔ وہ کائی کی طرح پھٹ کر اِدھر اُدھر ہو گئے۔ لیکن رونل منوّر علی خان کو لے بیٹھا۔ اب وہ ایک بار پھر آ رہا تھا۔ لیکن اچانک اس کے جسم کو ایک جھٹکا لگا۔ اس کی پیشانی پر الجھن دوڑ گئی۔ چند لمحے تک وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان سب کو دیکھتا رہا اور پھر اس نے سانپ کی طرح پھنکار کر کہا:

"پروفیسر داؤد کہاں ہے؟"

مقابلہ ہو گا

وہ سب ساکت رہ گئے۔ بہت نازک وقت میں روئل کو پروفیسر داؤد کا خیال آیا تھا۔ جب ان میں سے کسی کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکل سکا تو اس نے پھر کہا:

"میں نے پوچھا ہے، پروفیسر داؤد کہاں ہے؟"

"اگر طاقت ہے تو پھر پوچھ لو ہم سے۔" فاروق نے بلند آواز میں کہا۔ یہ جملہ اس نے کچھ سوچ سمجھ کر کہا تھا۔

"کیا کہا۔ پوچھ لوں تم سے۔ اوہ۔ میں سمجھ گیا۔ یہ۔ یہ بہت بُرا ہوا۔" اس نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

"کیا بُرا ہوا۔ مسٹر روئل آپ کو پہیلیاں بجھوانے کا تو شوق نہیں۔" آصف حیران ہو کر بولا۔

"پروفیسر داؤد ضرور اندر ہے۔ نن۔ نہیں۔ مجھے فوراً اس تک پہنچنا چاہیے۔" وہ چلّایا اور پھر یک دم دروازے

کی طرف دوڑ لگا دی۔

"خبردار۔ یہ دروازے تک نہ پہنچے۔" انسپکٹر کامران مرزا چلّا اُٹھے۔

وہ سب کے سب دروازے کی طرف دوڑ پڑے۔ لیکن روئل ان سے پہلے پہنچ چکا تھا۔ تاہم جُوں ہی وہ دروازے پر پہنچا، دروازہ یک دم بند ہو گیا۔

"خبردار۔ دروازہ کھول دو۔ کس نے بند کیا ہے اسے۔" روئل نے غرّا کر کہا۔

"شش۔ شاید ہمارے فرشتوں نے۔" مکھن بولا۔

"کوئی پروا نہیں۔ یہ دروازہ میرے مقابلے میں کیا ٹکے گا۔" یہ کہہ کر وہ پیچھے ہٹنے لگا۔ اور جوں ہی دروازے کی طرف دوڑنے کے لیے بھاگنے کی پوزیشن میں ہوا۔ خان رحمان نے تیزی سے اس کے نزدیک پہنچتے ہوئے اس کی ٹانگ پکڑ لی۔ وہ دھڑام سے گرا۔ لیکن گرتے ہی اس نے ایک لات خان رحمان کے منہ پر اس زور سے ماری کہ ان کے ناک سے خون بہہ نکلا اور وہ پیچھے کی طرف الٹ گئے۔

اب وہ پھر دروازے کی طرف دوڑنے کے قریب ہوا، لیکن منور علی خان نے ایک چھلانگ لگائی اور اس

کی گردن سے چمٹ گئے، ساتھ ہی وہ غرّائے۔

"نہیں مسٹر رونل۔ تم اندر نہیں جا سکتے۔ پروفیسر صاحب کو اپنا کام کرنے دو۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" رونل نے چلّا کر کہا، اور پھر اپنے جسم کو ایک زور دار جھٹکا دیا۔ منور علی خان دُور جا کر گرے اور اس زور سے گرے کہ اُٹھنا مشکل ہو گیا۔ رونل نے فاتحانہ انداز میں ان کی طرف دیکھا اور پھر دوڑنے کے لیے جُھکا۔ ایسے میں کسی نے اس کی کمر کے گرد ہاتھ ڈال دیے اور جکڑ لیا۔ رونل نے مڑ کر دیکھا تو اسے جکڑنے والا ڈاکٹر محمد عبداللہ تھا۔

"اوہ۔ یہ تم ہو غدار۔" رونل پھنکارا۔

"نہیں۔ میں غدار نہیں ہوں۔ مسلمان ہونے سے پہلے میں نے اس ملک کے خلاف کوئی کام نہیں کیا۔ مسلمان ہونے کے بعد مجھے غدار کا نام نہیں دیا جا سکتا۔" اس نے پُرسکون آواز میں کہا۔

"خیر۔ میں تمہیں ذلّت کی موت ماروں گا۔"

"ہر لمحہ تمہاری شکست کو تم سے نزدیک کرتا جا رہا ہے۔" ڈاکٹر نے ہنس کر کہا۔

"ابھی پروفیسر داؤد اندر موجود ہے۔" رونل بولا۔

"ہم لوگ اپنے وطن کے لیے جان دینا جانتے ہیں، مسٹر رونل۔" فرحت نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو۔ پروفیسر داؤد باہر نکلے گا ہی نہیں۔"

"میں نے یہ نہیں کہا۔

اس کے ساتھ ہی رونل نے اپنے جسم کو پھر ایک جھٹکا دیا۔ اور ڈاکٹر محمد عبداللہ لڑھکتا ہوا دور جا گرا۔ اور پھر وہ دروازے سے جا ٹکرایا۔ پہلی ٹکر نے دروازے کا کچھ نہ بگاڑا۔ وہ پیچھے ہٹتے ہوئے بولا:

"میں حیران ہوں۔ دروازہ اندر سے کس نے بند کیا ہے۔ تم میں پروفیسر داؤد کے سوا ہر کوئی موجود ہے۔ تھوڑی دیر پہلے دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔ گویا یہ کام پروفیسر داؤد کا نہیں ہے۔ تو پھر۔ ارے۔ ان کو تو میں بھول ہی گیا۔"

"کن کی بات کر رہے ہیں جناب۔" فرحت نے حیران ہو کر کہا۔

"خواتین کو۔ وہ تینوں پورے میدان میں کہیں نظر نہیں آ رہیں۔"

"اوہ!" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔ کیونکہ انھیں بھی ان کا خیال اسی وقت آیا تھا۔

"ارے۔ واقعی۔ امّی جان اور آنٹی صاحبان کہاں ہیں؟" آفتاب نے بلند آواز میں کہا۔

"ہم۔ ہم ادھر ہیں۔ یعنی دروازے کے اس طرف۔ جوں ہی رونل کو پروفیسر صاحب کا خیال آیا، ہم دروازے میں داخل ہو گئیں۔ دروازے کا رخ ہم پہلے ہی کر چکی تھیں اس لیے رونل اور آپ سب کو معلوم نہ ہو سکا کہ دروازہ کس نے بند کیا ہے۔" اندر سے بیگم جمشید کی آواز سنائی دی۔

"بھئی واہ۔ آپ نے تو کمال کر دیا۔" آصف بولا۔

"باہر کیا پوزیشن ہے؟"

"ہولناک۔ مسٹر رونل اور مسٹر شیلاک ابھی تک میدان میں ڈٹے ہوئے ہیں۔ اور ہمارے بڑے بڑے ساتھی ادھر اُدھر پڑے ہیں۔"

"اوہ یہ برا ہوا۔ خیر۔ چاہے کچھ ہو جائے۔ ہم دروازہ نہیں کھولیں گی۔" بیگم کامران مرزا بولیں۔

"مناسب بھی یہی رہے گا۔" شوکی نے فوراً کہا۔

"لیکن یہ دروازہ میں بہت جلد توڑ ڈالوں گا۔ اس وقت

تم کیا کرو گے۔" رونل نے منہ بنایا۔

"ہم اس کی نوبت ہی نہیں آنے دیں گے۔ آؤ بھئی۔ آگے بڑھیں۔ ہمیں مسٹر رونل کو روکنا ہے۔" محمود نے پُر جوش انداز میں کہا۔

اور وہ رونل کی طرف لپک پڑے۔

"تم اور مجھے روکو گے۔ اپنے بڑوں کا حشر نہیں دیکھا تم نے۔" رونل ہنسا۔

"ہم روک سکیں گے یا نہیں، روکنے کی کوشش ہر ممکن حد تک کریں گے۔" فاروق نے جل کر کہا۔

اور سب کے سب اس پر ٹوٹ پڑے۔ انھوں نے رونل کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ رونل بجلی کی سی تیزی سے ہاتھ پیر چلانے لگا۔ ادھر وہ اس کی ٹانگیں گھسیٹ لینے کی فکر میں تھے۔ لیکن اس کے ہاتھ پیر اس قدر تیزی سے چل رہے تھے کہ کوئی ٹانگ ان میں سے کسی کے ہاتھ میں نہ آ سکی۔ آخر فرزانہ زمین پر لڑھک گئی۔ اور لیٹے لیٹے دوسروں کی ٹانگوں کے درمیان سے نکل کر رونل تک آ گئی۔ جوں ہی اس نے ایک ٹانگ پر ہاتھ ڈالا۔ اس کے جسم کو ایک جھٹکا لگا۔ وہ آصف سے ٹکرائی۔ دونوں دور جا کر گرے۔

"یہ تم نے کیا کیا تھا فرزانہ" آصف نے حیران ہو کر کہا۔

"تم بھی کر کے دیکھ لو۔ میں نے مسٹر رونل کی ٹانگ پکڑنے کی کوشش کی تھی" اس نے منہ بنا کر کہا۔

"اوہ۔ یہ بہت خطرناک کوشش تھی"

اسی وقت فاروق ان کے اوپر آ کر گرا۔

"تمھیں کیا ہوا؟" فرزانہ جل کر بولی۔

"وہی۔ جو تم لوگوں کو ہوا ہے" فاروق تلملا کر بولا۔

اتنے میں رونل نے اپنی ایڑی پر گھومتے ہوئے ان پر بجلی کی سی تیزی سے مکے برسا ڈالے۔ وہ تڑاتڑ گرے شوکی آفتاب، اشفاق اور اخلاق اس کے ایک ہی حملے میں گر پڑے۔ اس نے اس پر ہی بس نہیں کی۔ اب الٹا گھوما۔ اور ساتھ ہی ہاتھ گھماتا چلا گیا۔ کئی اور گرے۔ اور پھر محمود تنہا اس کے مقابلہ میں رہ گیا۔ اس نے ایک نظر رونل پر اور دوسری انسپکٹر کامران مرزا پر ڈالی۔ ان کی جنگ حد درجے خون ریز ہو چلی تھی۔ دونوں لہو لہان ہو رہے تھے۔ خود انسپکٹر کامران مرزا کی بھی کوشش تھی کہ کسی طرح شیلاک کو گرا کر رونل سے جا ٹکرائیں۔ انھوں نے بھی دیکھ لیا کہ اب صرف محمود رونل کے مقابلے میں رہ گیا ہے۔

"مقابلہ تو تم لوگوں نے خوب کیا۔ افسوس۔ تمھارا بس

نہیں چلا۔" رونل نے ہنس کر کہا۔

"کوئی بات نہیں مسٹر رونل۔ ایسا بھی ہوتا ہے۔ اب آؤ اور مجھ سے دو دو ہاتھ کر لو۔"

"تم اکیلے کب تک ٹکو گے"

"فکر نہ کرنا محمود۔ تم اگر بھی گئے تو کیا ہوا۔ ابھی رونل کے فیصلے میں ہم تینوں سیسہ پلائی دیوار کی طرح ادھر موجود ہیں" اندر سے بیگم جمشید کی آواز گونج اٹھی۔

"فکر کیسا امی جان۔ ہم جو کچھ کر رہے ہیں، اپنے دین ملک اور قوم کے لیے کر رہے ہیں۔ اور اس کوشش میں اگر ہم مر بھی گئے تو شہید ہوں گے"

"اور شہید کبھی نہیں مرتے" اندر سے بیگم کامران مرزا بولیں۔

"شوکی۔ میرے بچو۔ تم کہاں ہو۔ اٹھو۔ محمود کا ساتھ دو"

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں آنٹی۔ انھوں نے دشمن کو پیٹھ نہیں دکھائی۔ بہادری سے مار کھائی ہے" محمود نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

عین اسی وقت رونل محمود پر جھپٹا۔ محمود یک دم سامنے سے ہٹ گیا۔ رونل دروازے سے ٹکرایا۔

"یہ۔ یہ کیا چیز دروازے سے ٹکرائی" اندر سے

شوکی کی والدہ نے کانپ کر کہا۔

"رونل کا جسم۔ لیکن اس بار اس نے ٹکر نہیں ماری تھی۔" محمود نے مسکرا کر کہا۔

رونل پھر اس کی طرف مڑا۔ اور دونوں ہاتھ پھیلا کر اس کی طرف جھپٹا۔ محمود نے بچنے کی لاکھ کوشش کی۔ لیکن اس کے دونوں ہاتھوں سے بچ نہ سکا۔ اب وہ اس کے دونوں ہاتھوں کی گرفت میں تھا۔ عین اسی وقت انسپکٹر کامران مرزا نے شیلاک کو دونوں ہاتھوں پر اچھال پھینکا، وہ کمر کے بل گرا۔ اس کے منہ سے ایک بل دوز چیخ نکلی۔ اور ساکت ہو گیا۔

"گھبراؤ نہیں محمود۔ میں آ گیا ہوں۔" انسپکٹر کامران مرزا نے یہ کہتے ہوئے دوڑ لگا دی۔

رونل ایک لمحے کے لیے ٹھٹکا۔ اسے اور تو کچھ نہ سوجھا۔ دونوں ہاتھوں میں تھامے ہوئے محمود کو، اپنی طرف آتے ہوئے انسپکٹر کامران مرزا پر اچھال دیا۔ محمود اور انسپکٹر کامران مرزا پورے زور سے ٹکرائے۔ دونوں دھڑام سے گرے۔ رونل بھرپور انداز میں ہنسا اور پھر ان کی طرف بڑھا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ ان میں سکت ہے یا نہیں۔ وہ اُٹھنے کی تیاری کر رہے تھے۔ کہ رونل ان کے سر

پر جا پہنچا۔ اس نے تابڑ توڑ وار کر ڈالے۔ دونوں دھپ دھپ کر کے گرے۔ اور ساکت ہو گئے۔

رونل نے پُر غرور انداز میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ اور پھر پکار کر کہا۔

"پورے میدان میں کوئی اپنے پیروں پر نہیں کھڑا۔ سوائے میرے۔ اب کون مجھے دروازہ توڑنے سے روکے گا۔"

"میں روکوں گا۔" ایک آواز ابھری۔

رونل نے چونک کر آواز کی طرف دیکھا۔ اِدھر اُدھر پڑے زخمیوں نے بھی اسی سمت میں دیکھا۔ انسپکٹر جمشید اُٹھ کر کھڑے ہو رہے تھے۔

○

"انسپکٹر جمشید۔ تم۔ تت۔ تم۔" رونل ہکلایا۔

"ہاں۔ کیا تمھارے خیال میں کھڑا ہونے کے قابل نہیں رہا تھا۔"

"نہیں۔ میری اس ٹکر کے بعد کوئی اپنے پیروں پر چل پھر نہیں سکتا۔ ہاں معذوروں کی زندگی ضرور بسر کر سکتا ہے۔"

"لیکن میں تمھاری آنکھوں کے سامنے اپنے پیروں پر کھڑا ہوں۔ اسے تم کیا کہو گے؟" انسپکٹر جمشید بولے۔

"یہ میری زندگی کا حیرت انگیز ترین لمحہ ہے۔ خیر ابھی میرے دم خم وہی ہیں اور میں تمھیں اب بھی انگلی کا ناچ نچا سکتا ہوں۔"

"ہو سکتا ہے۔ ایسا ہو۔ لیکن میں تم پر ایک بات واضح کر دینا چاہتا ہوں مسٹر رونل۔" انسپکٹر جمشید نے پُرسکون آواز میں کہا۔

"اور وہ کیا؟" وہ بولا۔

"یہ کہ ان سب لوگوں نے تمھارا راستا روک کر پروفیسر کے کام میں مدد دے ڈالی ہے۔ اور اب رہی سہی کسر میں پوری کروں گا۔ ہم سب ختم ہو جائیں۔ یہ ہمیں منظور ہے۔ لیکن ان کے کام میں رکاوٹ پڑے، یہ ہمیں منظور نہیں۔"

"ہوں! میں سمجھ گیا۔ تم یہ باتیں کر کے پروفیسر داؤد کو اور مہلت دلوا رہے ہو۔ لیکن میں تمھیں گرانے میں زیادہ وقت نہیں لوں گا۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی اس نے پھر پہلے کی طرح ایک لمبی چھلانگ لگائی۔ انسپکٹر جمشید پوری طرح ہوشیار تھے۔ انھوں نے اور تو کچھ نہ کیا۔ بس نیچے بیٹھ گئے۔ وہ رونل کی اس

اس چھلانگ کی اونچائی کا اندازہ لگا چکے تھے۔ اب یہ ادھر اُدھر ہونے کی بجائے نیچے بیٹھ گئے اور اسی وجہ سے رونل مار کھا گیا۔ اس کا خیال تھا۔ پہلے کی مانند انسپکٹر جمشید خود کو ادھر اُدھر کر کے بچانے کی کوشش کریں گے۔ اور مار کھا جائیں گے۔ لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ وہ اس وقت تک اس کی چھلانگوں کا جائزہ لیتے رہے تھے۔ اور خود میں اٹھنے کی طاقت بیدار کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ نتیجہ یہ کہ رونل گویا اُڑتا ہوا دور جا کر گرا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت چمک اٹھی۔ تاہم اس نے اٹھنے میں دیر نہ لگائی۔

"اس بار سوچ سمجھ کر چھلانگ لگانا مسٹر رونل۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"کیا مطلب؟" رونل چونکا۔

"تمھاری یہ چھلانگ اب میرے لیے بے معنی ہو کر رہ گئی ہے۔ تم اس کے ذریعے مجھے نقصان نہیں پہنچا سکتے۔"

"یہ تمھاری بھول ہے انسپکٹر جمشید۔ شاید تمھارا خیال ہے۔ میں اونچی چھلانگ نہیں لگا سکتا۔ تم دیکھنا۔ اس مرتبہ میں کتنی اونچی چھلانگ لگاتا ہوں۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی اس نے چھلانگ لگا دی۔ اور
واقعی اس بار وہ بہت نیچا آیا۔ انسپکٹر جمشید اس مرتبہ نیچے
نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ چنانچہ جوں ہی وہ ان کے نزدیک پہنچا،
انھوں نے ہائی جمپ کا مظاہرہ کر ڈالا۔ اور رونل ان
کے نیچے سے نکل گیا۔

اس کی آنکھوں میں اُلجھن تیر گئی۔ گرنے کے بعد وہ
اُٹھ کر ضرور کھڑا ہو گیا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے چھلانگ
لگانے کی ہمت اپنے اندر نہ پا رہا ہو۔

"کیا ہوا مسٹر رونل۔ کیا تیسری چھلانگ نہیں لگاؤ گے۔"

"ضرور لگاؤں گا۔ میں نے تمھارا علاج سوچ لیا ہے۔"
رونل بولا۔

"یہ اور بھی اچھی بات ہے کہ تم نے میرا علاج سوچ
لیا ہے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

رونل نے اس بار چھلانگ ضرور لگائی۔ لیکن وہ دھوکے
کی چھلانگ تھی۔ چھلانگ لگاتے ہی وہ رک گیا، اور راستے
میں ہی رہ گیا۔ غالباً پہلے انسپکٹر جمشید کی حرکات نوٹ کرنا
چاہتا تھا، لیکن انھوں نے تو اپنی جگہ سے حرکت کی ہی نہیں
تھی۔ رونل مسکرایا اور بولا:

"بہت چالاک ہو انسپکٹر۔"

"شکریہ۔ اب کیا پروگرام ہے۔"

"مقابلہ ہو گا۔"

"تو پھر آؤ نا۔ رک کیوں گئے ہو۔"

"لو۔ سنبھالو وار۔ آ رہا ہوں۔"

اس نے کہا اور اونچا اچھلا۔ اور عین ان کے اوپر گرا۔
اگر وہ ہوشیار نہ ہوتے تو اس کے پیروں کے نیچے آ گئے
تھے۔ وہ یک لخت گر گئے تھے اور گر کر لڑھک گئے
تھے۔ ان کی یہ ترکیب انھیں بچا گئی۔ پلٹ کر انھوں نے
دائیں ہاتھ کی ہڈی رونل کے منہ پر ماری۔ رونل نے یہ
وار روکنے کے لیے اپنا ہاتھ آگے کر دیا۔ ہڈی سے ہڈی
پورے زور سے ٹکرائی اور ایک آواز پیدا ہوئی۔ انسپکٹر
جمشید نے دایاں پیر اس کے پیٹ میں رسید کیا۔ وہ
کمان کی طرح جھک گیا۔ بایاں ہاتھ انھوں نے اس کی
کمر پر مارا، وہ ترچھا ہو گیا اور اپنا بایاں گھٹنا ان کے پیٹ
میں گھونپ دیا۔ اس وقت وہ اس کے ترچھا ہونے کی وجہ
سے اس کی زد پر آ گئے تھے۔ گھٹنا ان کے پیٹ میں کیا
لگا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا آ گیا۔ وہ لڑکھڑائے۔ لیکن
پھر سنبھل گئے۔ اسی وقت رونل کا مُکا ان کی کن پٹی پر
لگا۔ اس مُکے نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ سر کا زخم

کھل گیا اور انھوں نے گرم گرم خون چہرے پر محسوس کیا۔ جب
ان کا چہرہ بہت بھیانک ہو گیا تھا۔ ان کا ہاتھ سر کی
طرف گیا۔ ہاتھ خون سے تر ہو گیا۔ انھوں نے اپنا ہاتھ رونل
کی طرف جھٹکا دیا۔ خون کے چھینٹے اس کے منہ پر گرے۔
دوسرے ہی لمحے انسپکٹر جمشید تیزی سے گرے اور لڑھک
کر اس کی طرف گئے۔ اچانک ان کی دونوں ٹانگیں رونل
کے سینے پر لگیں۔ وہ اونچا اچھلا اور دروازے سے جا
ٹکرایا۔

"یا اللہ رحم۔ یہ کیا چیز دروازے سے ٹکرائی۔" بیگم
جمشید کی آواز سنائی دی۔

اتنے میں انسپکٹر جمشید پھر رونل پر چھلانگ لگا چکے
تھے۔ وہ ٹھیک اس پر گرے اور چھاپ بیٹھے۔

"مسٹر رونل۔ اب تم اس دروازے کو نہیں توڑ سکو گے۔"
ان کے منہ سے نکلا۔

دوسرے ہی لمحے رونل کا بھرپور مکا ان کی ناک پر
لگا اور وہ چہک کر بولا۔

"ایسی کوئی بات نہیں بے وقوف انسپکٹر۔ تم رونل کی
طاقت کے بارے میں ابھی تک درست اندازہ نہیں لگا
سکے۔ رونل تم جیسوں کی پوری فوج کے لیے کافی ہے۔"

ناک پر مکا لگتے ہی انسپکٹر جمشید دوسری طرف الٹ گئے۔
رونل نے ان کی طرف مڑ کر نہیں دیکھا۔ دوڑ کر دروازے
سے دور ہو گیا، اور پھر بجلی کی طرح دروازے کی طرف دوڑا۔
اس کا جسم زور دار آواز کے ساتھ دروازے سے ٹکرایا۔
اور اس کے قبضے اکھڑ گئے۔ دروازہ دوسری طرف جا گرا۔
ساتھ ہی رونل اندر تھا۔ لیکن اسی وقت وہ دھڑام سے
منہ کے بل گرا۔ اس کی دونوں ٹانگیں چھپے کمزور ہاتھوں میں تھیں۔
اس نے سر گھما کر دیکھا۔ تینوں بیگمات کے چہروں پر عجیب
سی مسکراہٹیں تھیں۔

کیسا دورہ

اس نے اپنے دھڑ کو سیدھا کیا۔ ہنس کر دیکھا اور پُرسکون آواز میں بولا:

"تم نہیں جانتیں۔ تم نے کس کی ٹانگیں پکڑی ہیں۔ ابھی ایک جھٹکا لگے اور لڑھکتی نظر آؤ گی۔"

"ہم بھی یہی چاہتی ہیں۔" بیگم جمشید نے منہ بنایا۔

"کیا چاہتی ہیں؟"

"یہ کہ ہمیں جھٹکا لگے اور ہم لڑھکتی ہوئی دور چلی جائیں۔ مجاہدوں میں ہمارا نام تو ہو جائے گا۔"

"تو پھر یہ لو۔" اس نے کہا اور دونوں ٹانگوں کو زور سے جھٹکا۔

تینوں کے ہاتھوں سے اس کی ٹانگیں نکل گئیں اور وہ دور جا گریں۔ رونل پلٹا اور ٹھٹک کر رک گیا۔ انسپکٹر جمشید ایک بار پھر اس کے سامنے کھڑے تھے۔

"ابھی ہمارا مقابلہ ختم نہیں ہوا۔" وہ مسکرائے۔

"مسٹر انسپکٹر۔ تم بہت سخت جان ہو۔" رونل بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"شکریہ۔ اب وار تم نہیں۔ میں کروں گا۔" انھوں نے عجیب سی آواز میں کہا۔

"کیا مطلب؟" وہ چونکا۔

"مطلب یہ۔" انھوں نے کہا اور یک دم اچھلے۔ ان کی دونوں ٹانگیں رونل کے سینے پر لگیں۔ ساتھ میں وہ بھی گرے۔ لیکن فوراً ہی کھڑے ہو گئے۔ ٹانگیں کھا کر رونل دوسری طرف الٹ گیا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی، لیکن پھر اس کا چہرہ تاریک پڑ گیا۔ آنکھوں میں خون دوڑ گیا:

"مم۔ میں۔ اُٹھ نہیں پا رہا۔ اُف یہ کیا ہوا؟"

"کیا ہوا؟" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ایسا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے میری ریڑھ کی ہڈی پر چوٹ آئی ہے۔ لیکن ابھی یہ ٹوٹی نہیں۔" یہ کہ کر اس نے پھر اُٹھنے کی کوشش کی۔ انسپکٹر جمشید کو خوف محسوس ہوا کہ کہیں وہ اُٹھ ہی نہ کھڑا ہو۔ وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھے۔ اور اس کے سر پر ایک زور دار ٹھوکر رسید کی۔ اس حالت میں بھی اس کے ہوش و حواس قائم تھے۔ اس نے جلدی سے سر کو ایک طرف کر کے اس

وار سے خود کو بچانے کی کوشش کی۔ سر ضرور بچ گیا۔ مگر
کی ٹھوکر کندھے پر لگی۔ لیکن یہاں بھی یہ کوئی کم تکلیف
دہ ٹھوکر ثابت نہیں ہوئی۔ اس کے منہ سے ایک گھٹی
گھٹی چیخ نکل گئی۔ انھوں نے موقع دینا مناسب خیال نہ
کرتے ہوئے ایک ٹھوکر اور رسید کی۔ یہ ٹھوکر اس کے
سر پر لگی۔ سر سے خون بہ نکلا۔ رونل بہت بھرپور انداز
میں مسکرایا۔

"واہ۔ مزا آگیا۔ رونل زندگی میں پہلی بار اتنی شان دار
شکست کھا رہا ہے۔ خیر کوئی بات نہیں۔ انسپکٹر جمشید۔ میرا
تمھارا مقابلہ ابھی پھر ہو گا۔ میں ذرا سانس لے لوں۔"

"گویا تم یہ چاہتے ہو کہ میں تم پر اور وار نہ کروں۔
لیکن مسٹر رونل۔ یہ ملک اور قوم کا مسئلہ ہے۔ میں کوئی
خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ جب تک تم بے ہوش نہیں ہو
جاؤ گے۔ اس وقت تک میں تم پر ٹھوکریں برساتا رہوں
گا۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی ایک زور دار ٹھوکر اس کے
سر پر اور لگی۔ عین اسی وقت فرزانہ کی چلاتی آواز ان
کے کانوں سے ٹکرائی:

"بچیے ابا جان۔ شیلاک آ رہا ہے۔"

انسپکٹر جمشید طوفانی انداز میں مڑے۔ واقعی شیلاک ان

کی طرف دوڑا چلا آ رہا تھا اور اگر فرزانہ خبردار نہ کر دیتی تو
وہ اس کی زد میں آ چکے تھے۔ لیکن ابھی وہ ان تک
نہیں پہنچا تھا کہ منہ کے بل گرا۔ اور انھوں نے انسپکٹر
کامران مرزا کو اٹھتے دیکھا۔

"اسے میں دیکھ لوں گا۔ آپ رونل کی طرف توجہ دیں۔"
ان کی آواز ابھری۔

"زندہ باد انکل۔" فاروق چلا اٹھا۔

"نہیں۔ تم سب نعرے لگانے کے قابل ہو تو لڑتے بھڑتے
کیوں نہیں اٹھ کر۔" خان رحمان کی آواز ابھری۔

"جی بس۔ ایسے ویسے ہی قابل ہیں۔"

انسپکٹر کامران مرزا اور شیلاک آپس میں ٹکرا گئے۔ اسی
وقت ریوٹا نے سر اٹھا کر چاروں طرف کا جائزہ لیا اور
اٹھ کھڑی ہوئی۔

"لیجیے۔ یہ صاحبہ بھی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ اب پھر سے
محنت کرنی پڑے گی۔" فاروق نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

وہ بھی جلدی جلدی اٹھنے لگے۔ اور ریوٹا کے گرد
جمع ہو گئے۔

"نہیں خالہ ریوٹا۔ اگر تم اٹھ سکتی ہو تو ہم کیوں نہیں
اٹھ سکتے۔" محمود مسکرایا۔

"میں تم لوگوں کو وہ مزا چکھاؤں گی کہ یاد کرو گے۔"

"یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے۔ ہم خود بھی مزا چکھنے کے لیے ترس گئے ہیں۔" آفتاب بولا۔

"اور تھوڑی دیر پہلے کیا چکھا تھا۔" مکھن نے جل بھن کر کہا۔

"مزے کا بچہ۔" فاروق مسکرایا۔

"اوہو۔ یہ تو سبھی تیار ہو گئے۔ گویا پھر سے میدان کارزار گرم ہونے والا ہے۔ لیکن اب صورتِ حال مختلف ہو گی۔" انسپکٹر جمشید نے مسکرا کر کہا۔

"جی۔ وہ کیسے؟"

"اس طرح کہ اب رونل کا کام ٹھنڈا پڑ گیا ہے۔ یہ لو۔ میں ایک آخری ٹھوکر مار رہا ہوں۔" اتنا کہتے ہی انسپکٹر جمشید نے ایک زبردست ٹھوکر رونل کے رسید کر دی۔ اس نے ایک جھرجھری سی لی اور پھر ساکت ہو گیا۔

"کک۔ کیا رونل مر گیا۔ انکل۔" فرحت نے پوچھا۔

"نہیں بھئی۔ ابھی صرف بے ہوش ہوا ہے۔ میں ان تینوں کو زندہ گرفتار کر کے اپنے ملک لے جانا پسند کروں گا۔ آخر یہ میرے ملک کے دشمن ہیں۔ میرے ملک کا سونا چرا کر لائے ہیں۔"

"ہوں۔ بات تو ٹھیک ہے۔"

ادھر ریوٹا پھر سے حملہ آور ہو چکی تھی۔ شیلاک انسپکٹر کامران مرزا سے بھڑ چکا تھا۔ لیکن اب ان کی مدد کے لیے سبھی ساتھی فارغ ہو چکے تھے۔ اس لیے انھوں نے ان کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ ایسے میں بھی ریوٹا اور شیلاک کے چہروں پر پریشانی کے کوئی آثار نہیں آئے۔ وہ بدستور ہاتھ پیر چلانے میں مصروف رہے۔ اچانک شیلاک کو ایک زبردست دھکا لگا۔ وہ سیدھا انسپکٹر جمشید کی طرف آیا اور اگر وہ دونوں ہاتھوں سے اسے نہ روک لیتے تو وہ بھی اس کی لپیٹ میں آ جاتے۔ ان کے دونوں ہاتھوں کا دھکا لگتے ہی وہ پھر انسپکٹر کامران مرزا کی طرف آیا۔ اس بار مکا اس کی ٹھوڑی پر لگا۔ وہ پیچھے کی طرف الٹ گیا۔ ایسے میں فرزانہ اچھل کر ریوٹا کی گردن کے ساتھ لٹک گئی۔ ریوٹا نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کے ہاتھ ہٹانے کی کوشش کی۔ فرحت کو موقع مل گیا۔ اب ریوٹا وار نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے اچھل کر سر کی ٹکر ریوٹا کی ناک پر دے ماری۔ ریوٹا کے ہاتھ فرزانہ کے ہاتھوں پر سے ہٹ کر اپنے منہ پر جم گئے۔ ادھر فرزانہ کا دباؤ گلے پر بڑھتا چلا گیا۔ نتیجہ یہ کہ اس کی آنکھیں باہر کو ابل آئیں۔ قدم لڑکھڑانے لگے۔ اور آخر وہ دھب سے اوندھے

مر گئی۔ فرزانہ بھی اس کے ساتھ گری۔ اس نے اب بھی اسے
نہ چھوڑا۔ یہ دیکھ کر انسپکٹر جمشید چلّا اُٹھے:

"نہیں فرزانہ۔ ہم ان تینوں کو زندہ حالت میں اپنے ملک
لے جانا چاہتے ہیں۔"

"اوہ!" فرزانہ نے گھبرا کر کہا اور ریوٹا پر سے ہٹ گئی۔
ریوٹا نے کروٹ لی، اور چت لیٹ گئی۔ اس کی آنکھیں کھلی
تھیں۔ اچانک اس کے چہرے پر ایک مسکراہٹ رینگ گئی۔
عجیب سی مسکراہٹ۔

"تت۔ تم۔ ہمیں زندہ اپنے ملک لے جاؤ گے انسپکٹر۔"

"ہاں۔ اللہ نے چاہا تو۔" وہ بولے۔

"لیکن، میرا خیال ہے، ایسا وقت کبھی نہیں آئے گا۔" اس
نے کہا۔

"دیکھا جائے گا۔"

"اچھا تو پھر تم دوسری دنیا کے سفر پر روانہ ہو جاؤ انسپکٹر
جمشید۔" ریوٹا نے چیخ کر کہا۔

ساتھ ہی اس کا ہاتھ حرکت میں آیا، چاقو کی چمک لہرائی۔
اور پھر ایک چیخ فضا میں گونج اُٹھی۔ لیکن یہ چیخ انسپکٹر جمشید
کی نہیں تھی۔ چاقو ایک اور شخص کے سینے میں لگا تھا۔
اس پر نظر پڑتے ہی وہ دھک سے رہ گئے۔ ڈاکٹر

محمد عبداللہ دھپ سے گرا۔ اور تڑپنے لگا۔

"یہ۔ یہ آپ نے کیا کیا ڈاکٹر۔" انسپکٹر جمشید بھرائی ہوئی
آواز میں بولے۔ کیونکہ اگر ڈاکٹر اچانک ان کے آگے نہ آ
جاتے تو چاقو ان کے سینے کے پار تھا۔

"مم۔ میں نے سوچا۔ آپ مسلمانوں کے لیے زیادہ اہم
ہیں۔ کیوں نہ آپ کی جگہ میں جان دے دوں۔" ڈاکٹر نے بڑی مشکل
سے یہ الفاظ ادا کیے اور پھر اس کی گردن لڑھک گئی۔

"ڈاکٹر۔" وہ چلّا اُٹھے۔

مگر ڈاکٹر محمد عبداللہ اب انھیں جواب کہاں دے سکتا
تھا۔ وہ تو اپنے مالک حقیقی سے جا ملا تھا۔ ان کی آنکھوں
میں آنسو آ گئے۔ عین اسی وقت دوڑتے قدموں کی آواز
سنائی دی۔ یہ آواز اندرونی دروازے کی طرف سے آئی تھی۔
یہاں تینوں بیگمات موجود ہیں۔ وہ بوکھلا کر پلٹے۔ انھوں
نے دیکھا۔ پروفیسر داؤد چلے آ رہے تھے۔ ان کے قدموں
کی آواز نے ریوٹا اور شیلاک کو بھی اس طرف دیکھنے پر مجبور
کر دیا۔ اسی لمحے روزل نے آنکھیں کھول دیں۔

"پروفیسر صاحب آپ آ گئے۔" انسپکٹر جمشید جلدی سے کہا
"یہاں۔ یہ دروازہ بند کر دو۔ اور یہاں سے نکل چلو۔ کوئی
دم میں یہ عمارت پھٹنے والی ہے۔"

"کیسا کہا۔ عمارت پھٹنے والی ہے۔" رونل دھاڑا۔

"ہاں! میں اپنا کام مکمل کر چکا ہوں۔ ٹھیک دو منٹ بعد یہ عمارت ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی۔ اس کے اندر اور باہر موجود سب انسان بھی ٹکڑوں میں بٹ جائیں گے۔ لہٰذا اب ہم یہاں نہیں رک سکتے۔" پروفیسر داؤد نے جلدی جلدی کہا۔

"اوہ!" ان کے منہ سے بوکھلائے ہوئے لہجے میں نکلا۔

"لیکن انکل۔ آپ نے اتنا کم وقفہ کیوں رکھا۔" محمود چلایا۔

"اس صورت میں میرے سیٹ کیے ہوئے بم تلاش کر لیے جاتے۔ اور ہمارا مشن دھرے کا دھرا رہ جاتا۔" انھوں نے جواب دیا۔

"ن۔ نہیں۔ یہ جھوٹ ہے۔ تم لوگوں کے سامان کی ہم نے بہت اچھی طرح تلاشی لی تھی۔ اس میں بم جیسی کوئی چیز نہیں تھی۔" رونل نے چیخ کر کہا۔

"جب مقابلے میں انسپکٹر جمشید کی عقل ہو تو ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔" پروفیسر داؤد مسکرائے۔

"کیا مطلب؟" شیلاک چونک کر بولا۔

"انسپکٹر جمشید نے جب بیگال کا ایٹمی پلانٹ تباہ کرنے

کی تجویز صدر صاحب کے سامنے رکھی تو اسی وقت مجھ سے یہ کہہ دیا تھا کہ چند بم ایسی شکلوں میں بنائے جائیں کہ کوئی بھی انھیں بم خیال نہ کرے۔ اور میں نے ایسا ہی کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ تم نے بہت اچھی طرح تلاشی تو ضرور لی تھی۔ لیکن بم تم پھر بھی نہیں دیکھ سکے۔ اور اب ہمارے پاس ڈیڑھ منٹ رہ گیا ہے۔ اگر ڈیڑھ منٹ کے اندر اندر ہم اس گنبد سے باہر نہ نکل گئے تو پھر کبھی بھی نہیں نکل سکیں گے۔"

"دوڑو۔" شوکی نے چلا کر کہا۔

"لیکن کہاں دوڑو گے۔" رونل زور سے ہنسا۔ "تم لوگوں کو زینے کا راستا معلوم ہی نہیں ہے۔"

"تو کیا تم بھی باہر نکلنے کی کوشش نہیں کرو گے۔ ہمارے ساتھ ہی مرنا پسند کرو گے۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"ہاں۔ کیا حرج ہے۔" رونل بولا۔

"مسٹر رونل۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ ہم ان لوگوں کے ساتھ کیوں مریں۔" ریوٹا نے گھبرا کر کہا۔

"تب پھر۔ ہم کیا کر سکتے ہیں مس ریوٹا۔ تم ہی بتاؤ۔" رونل ہنسا۔

"ہم۔ ہم ان سے پہلے نکل جائیں گے۔" ان کی باندھی
ہوئی رسی کی مدد سے۔" "ظاہر ہے۔ اب ہیلی کاپٹر کیسے
منگوا سکتے ہیں۔"

"ہوں۔ بات ٹھیک ہے۔ تو پھر آؤ۔" لیکن مزا تب
ہے۔ جب یہ لوگ ہماری گرد کو بھی نہ چھو سکیں۔" رونل
نے چیخ کر کہا۔ اور دوڑ لگا دی۔ اس کے پیچھے ریوٹا
اور شیلاک بھی دوڑ پڑے۔

یہ لمحہ بھی عجیب لمحہ تھا۔ وہ تینوں دشمنوں کو آنکھوں
کے سامنے بھاگتے دیکھ رہے تھے، اور انھیں روک
نہیں سکتے تھے، کیونکہ انھیں خود راستے کی تلاش تھی۔ چنانچہ
انسپکٹر جمشید نے پکار کر کہا۔

"آج ہمیں اس قدر تیز دوڑنا ہے کہ زندگی میں کبھی
نہ دوڑے ہوں گے۔"

یہ کہتے ہی انھوں نے ان تینوں کے پیچھے دوڑنا
شروع کر دیا۔ ابھی نظروں سے اوجھل نہیں ہوئے تھے۔
ان کا رخ اسی سبزہ زار کی طرف تھا۔ جہاں ان سے
ملاقات ہوئی تھی۔ انسپکٹر جمشید نے چند ہی لمبی لمبی
چھلانگیں لگائیں اور ریوٹا سے آگے نکل گئے۔ انھوں نے
اچانک مڑتے ہوئے اس کی ایک ٹانگ پر ٹھوکر دے

ماری۔ وہ اوندھے منہ گری۔ انسپکٹر جمشید اس سے آگے
نکل گئے۔ بلکہ انسپکٹر کامران مرزا اور خان رحمان بھی اس
سے آگے نکل گئے۔ وہ جلدی سے اٹھی اور آگے دوڑ پڑی۔
اتنے میں انسپکٹر جمشید شیلاک تک پہنچ گئے تھے۔ انھوں
نے اس کی ٹانگ میں ٹانگ اڑا دی۔ وہ دھڑام سے
گرا۔ اور وہ اس سے بھی آگے نکل گئے۔

"یہ کیا کر رہے ہو جمشید۔" پیچھے سے خان رحمان کی
آواز سنائی دی۔ انسپکٹر کامران مرزا ان سے آگے تھے۔
انھوں نے یہ نہیں پوچھا تھا۔

"اب دو آدمی ہم سے پیچھے ہیں۔ لہٰذا انھیں دروازہ
ہمارے ساتھ ہی کھولنا پڑے گا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ہوں۔ بات تو ٹھیک ہے۔"

ادھر ریوٹا اور شیلاک کی ہر ممکن کوشش یہ تھی کہ
کسی طرح ان سے آگے نکل جائیں۔ لیکن انسپکٹر جمشید نے
یہ سوچ لیا تھا۔ چاہے کچھ ہو جائے۔ انھیں آگے نہیں
نکلنے دیں گے۔

اور پھر سامنے ایک دیوار نظر آنے لگی۔ رونل سیدھا
اس دیوار تک گیا۔ نہ جانے اس نے دیوار میں کیا کیا کہ فوراً
زینہ دکھائی دینے لگا اور رونل اس پر چڑھتا نظر آیا:

یہ کہتے ہی انسپکٹر جمشید اس کے پیچھے زینے چڑھتے چلے گئے۔ ان کے پیچھے کامران مرزا اور خان رحمان چڑھنے لگے۔ پھر شیلاک کے پیچھے منور علی خان تھے۔ اور ان سے پیچھے ریوٹا۔ اس کے بعد دوسرے ساتھی۔ سب سے آخر میں بیگمات تھیں اور ان میں بھی سب سے پیچھے شوکی کی والدہ تھیں۔ وہ بری طرح ہانپ رہی تھیں۔ ایسے میں ان کے منہ سے نکلا:
"مجھ نگوڑ ماری نے ایسے کام کب کیے تھے"۔

آخر وہ اس مینارے تک پہنچ گئے۔ جہاں فاروق کی جنگ ہوئی تھی۔ رسی جوں کی توں بندھی تھی۔ رونل نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ رسی سے لٹک گیا۔

یہاں پہنچ کر انسپکٹر جمشید رک گئے۔ وہ اپنے ساتھیوں سے پہلے رسی پر لٹک سکتے تھے۔

"رک کیوں گئے جمشید۔ یہ رکنے کا وقت نہیں۔" خان رحمان چلائے۔

"پہلے تم جاؤ خان رحمان۔ میں باقی لوگوں کے بعد آؤں گا۔"

"اس کی کیا ضرورت ہے۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"اور پھر رونل کے عین پیچھے بھی ایک آدمی کا ہونا ضروری ہے۔ یہ ادھر پہنچ کر چٹان پر سے رسی کھولنے کی کوشش کرے گا۔" خان رحمان بولے۔

"اوہ ہاں! مجھے یہ خیال نہیں سوجھا۔ تب تو انسپکٹر کامران مرزا آپ فوری طور پر روانہ ہو جائیں۔"

"اچھا۔ چونکہ یہ بحث کا وقت نہیں ہے۔ اس لیے جاتا ہوں۔" انھوں نے کہا اور لٹک گئے۔ اب وہ بلا کی رفتار سے نیچے کی طرف کھسک رہے تھے۔

"خان رحمان۔ تم بھی چلو۔ یہ میرا حکم ہے۔" انسپکٹر جمشید غرائے۔

خان رحمان دم نہ مار سکے اور لٹک گئے۔ اتنے میں شیلاک انسپکٹر جمشید تک پہنچ گیا۔ انھوں نے ایک مکا تاک کر اس کی ناک پر مارا اور وہ جھومنے لگا۔ دوسرا مکا اس کے سر پر مارا۔ وہ نیچے گر گیا، اسی وقت ریوٹا سامنے آ گئی۔ اس کے پیٹ میں ایک ٹھوکر لگی۔ وہ دوہری ہو گئی۔

"چلیے منور علی خان۔ آپ لوگوں کو ادھر جا کر رونل سے لڑنا ہو گا۔ کیونکہ وہ رسی کو چٹان سے کھولنے کی کوشش

کرے گا۔"

"اچھی بات ہے۔" انھوں نے کہا اور لٹک گئے۔

اسی وقت انھوں نے ایک حیرت انگیز منظر دیکھا۔ رونل چلتے چلتے رک گیا اور اپنی طرف بڑھتے ہوئے انسپکٹر کامران مرزا کو دیکھنے لگا تھا:

"کیا بات ہے، مسٹر رونل؟"

"اس رسی پر تھوڑی سی لڑائی کیوں نہ لڑلی جائے؟"

"مجھے تو کوئی اعتراض نہیں۔ تمھارے دو ساتھی البتہ مارے جائیں گے۔" انسپکٹر کامران مرزا ہنس کر بولے۔

"وہ کیسے؟"

"اس لیے کہ انسپکٹر جمشید ان دونوں کو سب سے آخر میں آنے کی اجازت دے سکتے ہیں۔ دیکھ لو۔ ابھی تک وہ رسی پر لٹک نہیں رہے۔"

"اوہ!" رونل کے منہ سے نکلا اور پھر وہ تیزی سے پھسلنے لگا۔ شاید لڑائی کا بار، اس کے دل سے نکل گیا تھا۔

ادھر پروفیسر داؤد کے بعد چھوٹی پارٹی رسی پر لٹکنا شروع ہو گئی تھی۔

"منور علی خان۔ یہ رسی اتنے آدمیوں کا وزن برداشت

کرے گی؟"

"ہاں! فکر نہ کریں۔ یہ رسی ہاتھیوں اور گینڈوں سے بھی نہیں تڑائی جا سکتی۔" وہ بولے۔

"مل۔ لیکن ابا جان وہ مینارہ بھی تو اکھڑ سکتا ہے۔"

"اوہ ہاں۔ لیکن اب ہم کر ہی کیا سکتے ہیں۔ بم پھٹنے میں صرف نصف منٹ رہ گیا ہے۔"

اتنے میں رونل چٹان تک پہنچ گیا۔ اس کے صرف دو سیکنڈ بعد انسپکٹر کامران مرزا اترے اور رونل کی طرف دوڑ پڑے۔ وہ چٹان پر اس جگہ پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا جہاں رسی باندھی گئی تھی۔

"مسٹر رونل۔ اس طرح مس ریلوٹا اور شیلاک نہیں آسکیں گے۔" انسپکٹر کامران مرزا طنزیہ لہجے میں بولے۔

"ہاں! میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ کیا کروں؟"

"انسپکٹر جمشید کا بھی جواب نہیں۔ اگر وہ ریلوٹا اور شیلاک کو نہ گراتے تو اس وقت یہ تینوں سب سے پہلے یہاں پہنچ چکے تھے۔ اور پھر رسی کھولنے میں انھیں کوئی ہچکچاہٹ نہ ہوتی۔" خان رحمان خوش ہو کر بولے۔

"بالکل۔ اس لیے تو میں اس وقت کچھ نہیں بولا تھا۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"اچھا تو پھر انسپکٹر کامران - میں چلا - پھر ملاقات ہو گی۔" یہ کہہ کر رونل نے جانے کے لیے دوڑ لگا دی۔

"ایسے نہیں بھئی۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے اور اس کے پیچھے چھلانگ لگا دی۔ دونوں ایک دوسرے سے ٹکرائے۔ اور دھڑام سے گرے۔ انسپکٹر کامران مرزا اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئے۔

"لیکن انسپکٹر کامران مرزا۔ آپ اسے کیوں روک رہے ہیں؟" خان رحمان بولے۔

"اگر یہ نکل گیا۔ تو پھر ہمارے راستے بند ہو جائیں گے۔" انھوں نے جواب دیا۔

"اوہ!" ان کے منہ سے نکلا اور وہ بھی منور علی خان کے ساتھ رونل کے نزدیک پہنچ گئے۔ وہ انسپکٹر کامران مرزا کی گرفت سے نکلنے کے لیے زور لگا رہا تھا۔

اتنے میں پروفیسر داؤد اور محمود بھی اس طرف آ گئے۔ ایک ایک کر کے وہ وہاں پہنچ گئے۔ اب صرف انسپکٹر جمشید، تینوں بیگمات، ریوٹا اور شیلاک رہ گئے تھے۔ پھر انھوں نے بیگم جمشید کو آتے دیکھا۔ ان کے بعد بیگم کامران مرزا آئیں۔ اور پھر شوکی کی والدہ۔ مارے خوف کے ان کے منہ سے گھٹی گھٹی چیخیں نکل رہی تھیں۔

"گھبرائیں مت۔ نیچے جال تنا ہوا ہے۔ اگر آپ گر بھی

گئیں۔ تو بھی چوٹ نہیں آئے گی۔" انسپکٹر جمشید نے انھیں حوصلہ دلانے کے لیے کہا اور خود بھی لٹک گئے۔

ریوٹا اور شیلاک ابھی تک نیم بے ہوش تھے۔ جب وہ رسی کے قریب پہنچ گئے تو انھوں نے شیلاک اور ریوٹا کو اس سے لٹکتے دیکھا۔ ایسے میں انسپکٹر جمشید کی نظریں گھڑی پر پڑیں۔ صرف پندرہ سیکنڈ باقی تھے۔ انھوں نے تیزی سے سرکنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ شوکی کی والدہ کے نزدیک پہنچ گئے۔

"ذرا جلدی کریں۔" وہ پُرسکون آواز میں بولے۔

"لگ۔ کیوں؟"

"اس لیے کہ دیر کرنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔"

آخر وہ دوسری طرف اتر گئے۔ رونل اور انسپکٹر کامران مرزا کی جنگ ابھی تک جاری تھی۔ اتنے میں شیلاک اور ریوٹا بھی اتر گئے۔

"میں تمھارے استقبال کے لیے تیار ہوں۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"پروا نہیں۔ ہار ماننا ہم نے بھی نہیں سیکھا۔" شیلاک نے کہا اور انسپکٹر جمشید پر جھپٹا۔ انھوں نے بچنے کے لیے جھکائی دی۔ لیکن شیلاک کا تو پروگرام ہی کچھ اور تھا۔

رات صاف دیکھتے ہی اس نے دوڑ لگا دی۔ یہ اور بات ہے
کہ زیادہ دور تک نہ جا سکا۔ کیونکہ محمود نے اچانک سامنے
آکر اپنی ٹانگ اڑا دی۔ وہ اوندھے منہ گرا اور اُٹھ
نہ سکا۔ شاید چوٹ شدید آئی تھی۔ اُدھر منور علی خان
نے ریوٹا پر اچانک حملہ کر دیا تھا۔ وہ ان کی طرف
سے بے خبر تھی۔ مُکا اس کی کن پٹی پر لگا اور وہ
لڑکھڑا گئی۔ ادھر انسپکٹر کامران مرزا اپنی جگہ سے اچھلے
اور رونل پر گرے۔ رونل زبردست دھکا کھا کر لڑھک
گیا اور پھر انھوں نے اسے ایک گہری کھائی میں گرتے
دیکھا۔ گر کر وہ اٹھا اور کھائی سے نکلنے کی کوشش کرنے
لگا۔ لیکن کھائی گہری تھی۔ نکل نہ سکا۔ البتہ اس کی کوشش
اب تک جاری تھی۔

"خس کم جہاں پاک۔" محمود نے ہاتھ جھاڑے۔

"جمشید۔ ان لوگوں کو ساتھ لے جانے میں ہمیں بہت
دقت پیش آئے گی۔ ہماری رفتار بھی کم ہو جائے گی۔ کیوں
نہ ان کا کام تمام کر دیا جائے۔"

"ہوں۔ بات تو ٹھیک ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ارے!" اچانک فرزانہ نے چیخ کر کہا۔

"ارے!" محمود بھی چلایا

"ارے!" شوکی بولا۔

"کیا تم لوگوں پر ارے کا دورہ پڑ گیا ہے۔" فاروق
نے بوکھلا کر کہا۔

"وہ۔ وہ۔ پروفیسر انکل وہ۔" شوکی نے گھبرا کر کہا۔

"لیجیے۔ ارے کے بعد وہ کا دورہ شروع ہو گیا۔" آفتاب
نے منہ بنایا۔

"کہنا ہم یہ چاہتے ہیں کہ آپ کے دو منٹ پورے ہو
چکے ہیں۔ اور بم ابھی تک نہیں پھٹا۔"

"اوہ!" ان سب کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

پھر وہ سب کے سب پروفیسر داؤد کی طرف گھوم گئے۔

سہرا

"یہ کیا ہوا انکل۔ کہیں کوئی کسر تو نہیں رہ گئی؟" فاروق نے کانپتی آواز میں کہا۔

"اگر ایسا ہوا تو ہماری تو ساری محنت ضائع ہو گئی۔" مکھن نے کہا۔

"اور اس صورت میں ہمیں پھر پلانٹ میں جانا ہو گا۔" فرحت بولی۔

انھوں نے دیکھا۔ پروفیسر کے چہرے پر ایک بھرپور مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔ آخر وہ بولے:

"نہیں بھئی۔ ہمیں پھر وہاں نہیں جانا پڑے گا۔" وہ بولے۔

"جی کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ بم ضرور پھٹیں گے۔"

"لیکن کب۔ آپ نے تو کہا تھا۔ دو منٹ رہ گئے ہیں اور اب اڑھائی منٹ ہونے کو ہیں۔"

"یہ میں نے رونل، شیلاک اور ریوٹا کو سنانے کے لیے

سنانے کے لیے کہے تھے۔ اگر میں ان سب سے یہ کہہ دیتا کہ پانچ منٹ بعد بم پھٹنے والا ہے تو وہ ادھر کی بجائے اندر کی طرف دوڑ پڑتے اور بم کی تلاش شروع کر دیتے۔ دو منٹ کی خبر سنا کر میں نے ان کے پیروں تلے سے زمین نکال دی۔ اور وہ بھاگ نکلنے پر تیار ہو گئے۔" انھوں نے جلدی کہا۔

"بھئی واہ۔ یہ تو آپ نے بالکل جاسوسی داؤ کھیلا۔" فرزانہ خوش ہو کر بولی۔

"کیا کروں۔ تم لوگوں کے ساتھ رہتے رہتے کچھ جاسوسیت پیدا ہو گئی ہے۔" وہ مسکرائے۔

"اس کا مطلب۔ بم پھٹنے میں ابھی اڑھائی منٹ باقی ہیں۔"

"ہاں۔ دعا کرو۔ اندر جو لوگ موجود ہیں، انھیں حالات کی خبر نہ ہو۔"

"آمین۔" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"انکل۔ بم کس شکل میں تھے؟" آصف بولا۔

"بھئی۔ عقل سے بھی کام لیا کرو۔" انسپکٹر کامران مرزا نے مسکرا کر کہا۔

"اوہ۔ ہاں۔ میں سمجھ گیا۔"

"اگر تم سمجھ گئے ہو تو پھر یقیناً ہم بھی سمجھ گئے ہیں۔" فاروق نے فوراً کہا۔

"ارے ۔ مسٹر رونل کھائی میں نظر نہیں آ رہے ہے۔" ایسے میں فرزانہ نے چلّا کر کہا۔

"کیا !!!" وہ بھی چلّائے اور کھائی کی طرف دوڑے ۔

بم کے ذکر نے انھیں رونل کی طرف سے غافل کر دیا تھا۔ کھائی کے نزدیک پہنچ کر انھوں نے دیکھا۔ رونل واقعی اس میں نہیں تھا۔

"حیرت ہے ۔ وہ کس طرح نکل گیا۔"

"اور اب کہیں ریوٹا اور شیلاک نہ نکل جائیں۔" فرحت نے بلند آواز میں کہا۔

وہ واپس مڑے اور پھر دھک سے رہ گئے۔ شیلاک اور ریوٹا بھی وہاں نہیں تھی جہاں تھوڑی دیر پہلے گرے تھے۔

"لو بھئی۔ وہ بھی نکل گئے۔" انسپکٹر کامران مرزا نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

ان تینوں کی تلاش میں انھوں نے چاروں طرف دیکھا۔ لیکن ہر طرف چٹانوں کی موجودگی کی وجہ سے وہ انھیں کہیں بھی نظر نہ آئے۔

"اب ہمارا یہاں اور رکنا خطرناک ہو گا۔ رونل فوری

طور پر فوج کو اس جزیرے کی طرف بھیجے گا۔ جس کے کنارے ہمارا جہاز کھڑا ہے۔ اور پھر ہمارے لیے فرار کا راستا بند ہو جائے گا۔ ابھی ہمیں جزیرے سے سونا جہاز پر بھی لادنا ہے۔ لہٰذا آیئے چلیں۔ آبنائے کے کنارے پر لانچ ضرور موجود ہو گی۔ اوہ۔ کہیں رونل وغیرہ بھی اس لانچ کی طرف تو نہیں گئے۔ باپ رے۔ دوڑو۔"

وہ سر پر پیر رکھ کر بھاگے۔ انسپکٹر جمشید اور انسپکٹر کامران مرزا کے تو گویا پر نکل آئے تھے۔ اور پھر وہ آبنائے تک پہنچ گئے۔ عین اسی وقت انھوں نے دوسری طرف سے دوڑتے قدموں کی آواز سنی۔ انھوں نے دیکھا۔ رونل، شیلاک اور ریوٹا دوڑتے چلے آ رہے تھے۔

"ہمارا اندازہ درست ہی تھا۔ اور اگر ہمیں ایک منٹ کی تاخیر ہو جاتی تو یہ لوگ لانچ لے گئے تھے۔ اب ہمیں انھیں روکنا ہے۔ میں ایک پتھر اٹھا رہا ہوں۔ انسپکٹر کامران مرزا اور منور علی خان بھی ایک ایک پتھر اٹھا لیں۔ پتھر ان کے سروں پر لگنے چاہییں۔"

انھوں نے ایسا ہی کیا۔ جوں ہی وہ زد پر آئے۔ انھوں نے اوٹ میں رہ کر تین پتھر پھینک دیے۔ نشانے ٹھیک لگے اور وہ تینوں چیخ مار کر گر پڑے۔

"انھیں ہماری طرف سے اس مہم کے آخری پتھر خیال
کرنا مسٹر رونل۔" انسپکٹر جمشید ہنس کر بولے۔

اب وہ آبنائے کے دوسرے کنارے پر پہنچے۔ تھوڑا
فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ لانچ تک پہنچ گئے۔ عین اسی
وقت انھوں نے کان پھاڑ دینے والے کئی دھماکے سنے۔
پھر ایٹمی پلانٹ کی جگہ سے آگ اور دھواں بلند ہوتے دیکھا۔
گویا پروفیسر داؤد کا کام مکمل تھا۔

اب وہ لانچ پر بیٹھے جزیرے کی طرف اڑے جا رہے
تھے۔ انھیں سمت کا ایک اندازہ تھا۔ اور وہ اس اندازے
کے مطابق سفر کر سکتے تھے۔ آخر جہاز دکھائی دینے لگا۔
جزیرے پر اتر کر وہ اس جگہ پہنچے جہاں سونا اور خزانہ چھپایا
تھا۔ اسے جلدی جلدی جہاز پر لوڈ کیا گیا۔ اس دوران لانچ
کے ذریعے مسافروں کو جہاز تک لے آیا گیا۔ اس کام میں
کافی وقت لگ گیا۔ اور آخر وہ جہاز پر بیٹھ گئے۔ انسپکٹر
جمشید نے جہاز چلانا شروع کر دیا۔

سمت کا مسئلہ پریشان کن تھا۔ لیکن فی الحال وہ بیگال
کی حدود سے نکل جانا چاہتے تھے۔ آخر اللہ اللہ کر کے
وہ حدود سے نکل گئے۔ تیسرے دن ایک دوست ملک
کے جہاز سے ملاقات ہوئی اور انھوں نے سمت بتانے

والا ایک آلہ انھیں دے دیا۔ سمت بھی بتائی۔ اس طرح وہ اپنے
ملک کی طرف روانہ ہو سکے۔

صبح کا سورج طلوع ہونے والا تھا۔ وہ عرشے پر نماز ادا کر
چکے تھے۔ بیگمات باورچی خانے میں ناشتا تیار کر رہی تھیں۔
انسپکٹر جمشید بھی جہاز کو درست سمت میں لگا کر ان کے
پاس آ بیٹھے:

"اس کا مطلب ہے۔ اس مرتبہ وہ لمحات ہمیں اب میسر
آئے ہیں۔" فاروق نے بڑبڑانے کے انداز میں کہا۔

"کون سے لمحات۔" خان رحمان نے مسکرا کر پوچھا۔

"جن کا ہمیں اس پوری مہم کے دوران شدت سے
انتظار رہا۔ جو کئی بار ہمیں چھو چھو کر گزر گئے۔ لیکن مکمل
طور پر میسر نہیں آئے۔ میرا مطلب ہے۔ باتوں کی جنگ
نوک جھوک کا دنگل۔ اور محاورات کے داؤ پیچ کے لمحات
سے ہے۔ صاف ظاہر ہے۔ اب تمام بڑوں میں سے کسی
کو بھی کسی بھی قسم کا کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔ گویا
ہم پوری طرح آزاد ہیں۔ اس حد تک آزاد، شاید ہی ہم
کبھی ہوئے ہوں گے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟" فاروق نے
شوخ آواز میں کہا۔

"میرے خیال میں بات کسی حد تک ٹھیک ہی ہے۔"

انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"جی انکل۔ کسی حد تک۔ حد ہو گئی۔ ان حالات میں یہ حد کہاں سے ٹپک پڑی۔" فاروق بوکھلا کر بولا۔

"چلو بھئی۔ تم ہر حد تک سمجھ لو۔" منور علی خان ہنسے۔

"فاروق۔ کہیں تم حد کے پیچھے پڑنے کا ارادہ تو نہیں رکھتے۔" فرزانہ نے منہ بنایا۔

"پڑ بھی جائے تو تمھارا کیا نقصان۔" فرحت نے کہا۔

"کیا تم فاروق کا ساتھ دینا چاہتی ہو۔"

"ساتھ کا کیا ہے۔ اس وقت تو ہم بھی سب کا ساتھ دے رہے ہیں۔ یہاں تک کہ آنٹی صاحبان بھی ہمارا ساتھ دے رہی ہیں۔ مطلب یہ کہ سب کے لیے ناشتا تیار کر رہی ہیں۔ کسے معلوم تھا۔ ہمیں سمندر میں بھی گھر کا ناشتا ملے گا۔" فرحت جلدی جلدی بولی۔

"توبہ ہے تم سے۔ بات کی کھال اتارنے بیٹھ جاتی ہو۔" فرزانہ نے بڑی بوڑھیوں کے انداز میں جل بھن کر کہا۔

"یہ ہمارا ذکر کس سلسلے میں آیا تھا۔" بیگم جمشید نے باورچی خانے میں سے نکلتے ہوئے کہا۔ اور وہ ہنس دیے۔

"ساتھ دینے کے سلسلے میں۔"

"ساتھ۔ کس کا ساتھ۔" انھوں نے حیران ہو کر کہا۔

"جی۔ ایک دوسرے کا۔ اس پوری مہم میں ہم نے ایک دوسرے کا بھرپور ساتھ دیا ہے۔ یہاں تک کہ آپ تینوں نے بھی۔ حد یہ ہے کہ اب آپ ناشتا تیار کر کے بھی ساتھ دے رہی ہیں۔ ٹھیک ہے نا۔" فرحت جلدی جلدی بولی۔

"پتا نہیں۔ تمھاری تم ہی جانو۔" انھوں نے منہ بنا کر کہا اور پھر باورچی خانے میں داخل ہو گئیں۔

"بُری بات ہے فرحت۔ تم نے امی جان وغیرہ کو ناراض کر دیا۔ اب شاید ہمیں ناشتا نہیں ملے گا۔" فاروق نے اُسے گھورا۔

"میں نے ناراض کر دیا۔ تمھارا دماغ تو نہیں چل گیا۔" فرحت تنک کر بولی۔

"دماغ چل گیا ہو گا آصف یا آفتاب کا۔ میرا بالکل ٹھیک ہے۔"

"اے۔ کیا کہہ رہے ہو۔ اللہ کی مہربانی سے ہمارے دماغ بالکل درست ہیں۔" آصف نے اسے للکارا۔

"گارنٹی سے یہ بات کس طرح کہی جا سکتی ہے۔" محمود بولا۔

"کیوں نہیں کہی جا سکتی۔" آصف تنک کر بولا۔

"اس لیے کہ کسی کی دماغی حالت کے بارے میں تو

ڈاکٹر بھی سو فی صد درست اندازہ نہیں لگا سکتے۔ اور یہ بات مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ تم ڈاکٹر نہیں ہو۔" فاروق نے کہا۔

"میں سمجھ گیا۔ دراصل تمہارا پروگرام لڑائی بھڑائی کا ہے۔ حالانکہ نہ جانے کس قدر لڑائیوں اور بھڑائیوں سے ہم بڑی مشکل سے تو فارغ ہوتے ہیں۔" آصف نے کہا۔

"جی نہیں۔ مجھے بدنام کرنے کی ناکام کوشش نہ کرو۔ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔"

"ارادہ ہو نہ ہو۔ لڑائی ہوتے کیا دیر لگتی ہے۔" شوکی نے منہ بنایا۔

"کہیں تمہارا بھی تو لڑنے کو جی نہیں چاہ رہا۔" آصف اس کی طرف مڑا۔

"ہمیں تو بس معاف ہی رکھیے۔ ہم تو لڑائی بھڑائی سے کئی کلومیٹر دور بھاگتے ہیں۔" مکھن نے فوراً کہا۔

"حیرت ہے۔ لڑائی بھڑائی کا کلومیٹروں سے کیا تعلق۔" محمود نے حیران ہو کر کہا۔

"کم از کم یہ تعلق چولی دامن کا تو ہو نہیں سکتا۔" آصف مسکرایا۔

"مجھے تو ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے اب یہاں

جوتیوں نہ دال بٹے گی۔" انسپکٹر جمشید بول اُٹھے۔

"ہوشیار۔ خبردار۔" فاروق چلّا اٹھا۔

"کس بات سے ہوشیار اور خبردار کہہ رہے ہو۔" خان رحمان نے حیران ہو کر کہا۔

"اب بڑے بھی ہماری گفتگو میں شریک ہونے چلے ہیں۔ ہمارا اللہ ہی حافظ ہے۔"

"کیا بات ہے بھئی۔ خیر تو ہے۔" اچانک بیگم کامران مرزا کی باورچی خانے کے دروازے سے آواز آئی۔

"آپ کس بات کے بارے میں پوچھ رہی ہیں۔"

"یہ ہوشیار اور خبردار سن کر چونکی تھیں ہم۔ کیا کوئی دشمن جہاز نظر آ گیا ہے۔"

"جی نہیں۔ امّی جان۔ یہاں تو دال اور جوتیوں کی جنگ ہو رہی ہے۔" آفتاب نے منہ بنایا۔

"دال اور جوتیوں کی جنگ۔ آفتاب تمھارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔" انھوں نے بوکھلا کر کہا۔

"جی نہیں۔ اب دماغ بے چارہ خراب ہو کر کیا کرے گا۔" اس نے مایوسانہ انداز میں کہا۔

"کیوں کیوں۔ خیر تو ہے۔" فاروق بولا۔

"۔۔۔ تو ہم اس مہم سے فارغ ہو چکے ہیں۔ اب دماغ

کیوں خراب ہو گا۔"

"اس کا مطلب ہے۔ مہم کے دوران آپ لوگوں کا دماغ خراب ہو جاتا ہے۔ ہائیں۔" شوکی گھبرا کر بولا۔

"بھئی تم بھی۔ ہم میں شامل ہو۔"

"گفتگو کا یہ اونٹ کسی کروٹ بیٹھتا نظر نہیں آرہا۔"

انسپکٹر کامران مرزا نے برا سا منہ بنایا۔

"تو آپ بٹھا دیں نا انکل۔" فاروق نے درخواست کی۔

"میں کیسے بٹھا دوں۔ اس کی مہار تو تم لوگوں کے ہاتھوں میں ہے۔"

"تب تو اس اونٹ کا اللہ ہی حافظ ہے۔" مکھن نے گھبرا کر کہا۔

"لیکن تم اونٹ کے اندیشے میں کیوں دبلے ہو رہے ہو۔" آفتاب نے جل کر کہا۔

"اونٹ نہ ہوا۔ شیر ہو گیا۔" فرزانہ چہکی۔

"میں تو صرف ایک بات جانتا ہوں۔ اور وہ یہ کہ ہماری یہ گفتگو اونٹ کے منہ میں زیرے کے برابر ہے۔ مطلب یہ کہ ہم مسلسل ایک دن اور ایک رات باتیں کریں۔ تب کہیں جا کر پیٹ بھرے گا۔" فاروق نے کہا۔

"ارے باپ رے۔ اتنا لمبا مقابلہ۔" منور علی خان

گئے۔ وہ رات کو قطعاً نہیں جاگ سکتے تھے۔
"تو کیا ہوا انکل۔ جن حضرات کو نیند آتی جائے۔ وہ سوتے جائیں۔" فاروق نے فوراً کہا۔
"یہاں تک کہ آخر میں صرف فاروق بھائی رہ جائیں گے اور اس وقت یہ جہاز کی دیواروں سے باتیں شروع کر دیں گے۔ صاف ظاہر ہے۔ جہاز کی دیواروں کے بھی کان ہوتے ہوں گے۔" مکھن بولا۔
"ہاں ہوتے ہیں۔ کیا تمہیں کوئی اعتراض ہے۔" فاروق مسکرایا۔
"نن نہیں تو۔ میں کون ہوتا ہوں اعتراض کرنے والا جہاز سے پوچھ لیں۔" اس نے ڈرے ڈرے انداز میں کہا۔
"جہاز سے کیا پوچھ لوں۔" فاروق نے اسے گھورا۔
"یہی کہ اس بے چارے کی دیواروں کے کان ہیں یا نہیں۔"
"لیکن جہاز بے چارہ کس طرح ہو گیا۔" آفتاب نے جلدی سے کہا۔
"بے چارہ نہیں تو اور کیا ہے۔ ہم جیسوں کو اپنے اوپر سوار کیے لے جا رہا ہے۔"
"باتیں خالص اوٹ پٹانگ ہو چکی ہیں۔" خان رحمان نے گویا انھیں خبردار کیا۔
"چلیے۔ کوئی چیز تو خالص ہوئی۔" منور علی خان ہنسے۔

"سنا ہے۔ اس زمانے میں زہر تک خالص نہیں ملتا۔" خان رحمان بولے۔

"اور ادویات تو بالکل خالص نہیں ملتیں۔ جعلی دواؤں کا کاروبار زوروں پر ہے۔" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"لیجیے۔ ہم باتوں سے دواؤں پر آ گئے۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"دواؤں پر آتے دیر ہی کیا لگتی ہے۔ اور اس مہم میں تو یوں بھی تھوڑا بہت ہی کوئی زخمی ہوا ہے۔ لہٰذا سبھی کو دواؤں کی ضرورت ہے۔" محمود بولا۔

"بالکل غلط۔ ہم ذرا بھی زخمی نہیں ہوئے۔" اندر سے شوکی کی والدہ نے چلا کر کہا۔

"اوہ سوری آنٹی۔ معاف کر دیجیے۔" آصف نے فوراً کہا۔

"معافی کی بھی ایک ہی رہی۔ بھئی اس میں معافی مانگنے والی کون سی بات ہے۔"

"اچھا۔ اگر نہیں ہے تو پھر نہ کریں معاف۔" فاروق نے خوش ہو کر کہا۔

"ناشتے میں کتنی دیر ہے امی جان۔" محمود نے بے چین ہو کر کہا۔

"کیوں۔ کیا بہت بھوک لگی ہے۔"

"ہاں! بہت سے بھی دو ہاتھ آگے۔" محمود نے کہا۔

"کل کو تو کہو گے۔ بہت سے بھی دو ہاتھ پیچھے۔ یہ کیا بات ہوئی۔" آصف نے منہ بنا کر کہا۔

"ہر بات کا ہونا بھی ضروری نہیں۔" فرزانہ نے جلدی سے کہا۔

"بھئی واہ۔ جنگ زوروں پر ہے۔" خان رحمان نے خوش ہو کر کہا۔

"آپ بھی ذرا جم کر حصہ لیں نا انکل۔"

"بھئی میں سننے کی حد تک بھرپور حصہ لے رہا ہوں فکر نہ کرو۔" وہ شوخ آواز میں بولے۔

"اور کبھی کبھی جملہ بھی بول دیتے ہیں۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"وہ تو لقمہ دیتا ہوں۔"

"ہاں انکل۔ اس وقت لقموں کی ضرورت بھی بہت ہے۔" محمود بولا۔

"بھئی تم ایسا کرو کہ باورچی خانے میں چلے جاؤ۔ کوئی چیز تو تیار ہو ہی گئی ہو گی۔ بس اس میں سے چکھ کر آؤ۔" خان رحمان نے اسے ترکیب بتائی۔

"بہت خوب انکل۔ یہ ترکیب پہلے کیوں نہیں بتائی۔" محمود بولا۔

"مجھے نہیں معلوم تھا۔ تم اس حد تک بھوک محسوس کر رہے ہو۔"

"تو پھر میں چلا۔"

"ایک دو لقمے میرے لیے بھی لیتے آنا۔" آصف بولا۔

"کوشش کروں گا۔"

یہ کہہ کر محمود تیز تیز قدم اٹھاتا باورچی خانے میں گھس گیا۔ اور پھر فوراً باہر نکل آیا۔

"کیوں خیر تو ہے۔ آنٹی نے دھکا تو نہیں دے دیا۔" آصف ہنسا۔

"نہیں۔ حیرت نے دھکا دیا ہے۔"

"ارے۔ تو حیرت صاحبہ باورچی خانے میں ہیں۔ میں بھی کہوں۔ ان باتوں پر ہم سے کوئی حیران کیوں نہیں ہو رہا۔" فاروق نے حیران ہو کر کہا۔

"تم کیا کہنا چاہتے ہو محمود۔" انسپکٹر جمشید جلدی سے بولے۔

"یہ کہ امی اور آنٹی صاحبان تو ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی ہیں۔"

"تت۔ تمہارا مطلب ہے۔ وہ ناشتا تیار نہیں کر رہیں۔" انسپکٹر کامران مرزا گھبرا گئے۔

"جی بالکل نہیں۔"

"لیکن کیوں۔ ہم تو اس خیال میں تھے کہ وہ ناشتا تیار کر رہی ہیں۔"

"اس بات کا جواب تو وہی دے سکتی ہیں۔"

"ہاں بالکل۔ کیوں نہیں۔ ہم ناشتا اس لیے تیار نہیں کر رہیں کہ تیار کر چکی ہیں۔" بیگم جمشید بولیں۔

"کیا کہا بیگم۔ ناشتا تیار کر چکی ہیں۔ تو پھر دیا کیوں نہیں۔" ان کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ہم آپ لوگوں کی بات چیت کے ختم ہونے کا انتظار کر رہی تھیں۔" بیگم کامران مرزا بولیں۔

"کیا کہا بیگم۔ بات چیت کے ختم ہونے کا انتظار۔" انسپکٹر کامران مرزا چلائے۔

"ہاں۔ بالکل۔"

"تب تو آج مل چکا ہمیں ناشتا۔ ان کی باتیں بھی بھلا ختم ہو سکتی ہیں۔ میرا خیال ہے ہم ان سے درخواست کر دیکھتے ہیں۔ کہ یہ ناشتے تک اپنی باتوں کو روک لیں۔"

"آپ نے بالکل ٹھیک مشورہ دیا انکل۔" محمود نے خوش ہو کر کہا۔

"تو پھر ناشتا شروع کر ہی لیا جائے۔" خان رحمان

بولے۔

"محمود۔ اُدھر سے جاؤ۔" اندر سے بیگم جمشید کی آواز اُبھری۔

"اس سے پہلے کہ ہم ناشتا کریں۔ ایک بات کا فیصلہ ہو جانا چاہیے۔" فاروق نے بلند آواز میں کہا۔

"فیصلہ۔ کیسا فیصلہ۔ کس بات کا فیصلہ۔ یہ فیصلہ کہاں سے ٹپک پڑا۔"

"اس بات کا فیصلہ کہ اس مہم کا سہرا کس کے سر رہا۔ یعنی مین آف دی مہم کون رہا۔"

"اوہ ہاں۔ یہ بات تو رہ ہی گئی۔" آصف بولا۔

"وہ تو پہلے گئی تھی۔ اب تو یاد آ گئی ہے۔" محمود بولا۔

"ہاں تو ابا جان۔ اس بات کا فیصلہ کون کرے گا۔" فاروق نے کہا۔

"میں یہ فیصلہ منور علی خان پر چھوڑتا ہوں۔"

"یہ۔ ٹھیک نہیں۔" منور علی خان بوکھلا اُٹھے۔

"کیا ٹھیک نہیں۔"

"یہی کہ یہ فیصلہ میں کروں۔ میرا خیال ہے۔ یہ فیصلہ پروفیسر صاحب کو کرنا چاہیے۔ ہم سب میں بزرگ یہ ہیں۔"

"یہ بات بھی ٹھیک ہے۔ چلیے پروفیسر صاحب۔ آپ فیصلہ دیں۔"

"بھئی۔ یہ فیصلہ ویصلہ دینا میرے بس کی بات نہیں۔" پروفیسر داؤد نے گھبرا کر کہا۔

"اب تو آپ کو دینا ہی ہو گا انکل۔" فاروق بولا۔

"اچھا خیر۔ مجھے کچھ سوچنے کی مہلت تو دو۔"

"ہاں ضرور۔ اس میں کوئی حرج نہیں۔"

"تو پھر ایسا کرتے ہیں۔ ناشتہ شروع کر لیا جائے۔ اس دوران میں غور کرتا رہوں گا۔"

"بالکل ٹھیک۔" محمود بولا۔

آخر ناشتا شروع کیا گیا۔ فارغ ہونے کے بعد وہ سب پھر پروفیسر صاحب کی طرف گھوم گئے:

"آپ کسی نتیجے پر پہنچ گئے ہیں یا نہیں۔"

"ہاں! پہنچ چکا ہوں۔"

"تو پھر اپنا فیصلہ سنا دیں۔ ہم منتظر ہیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

پروفیسر صاحب نے ایک نظر ان سب پر ڈالی اور پھر بولے:

"میں اس مہم کا سہرا ڈاکٹر محمد عبداللہ شہید کے سر باندھتا ہوں" انھوں نے کہا۔

ان کے چہرے چمک اُٹھے۔ آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔ اور جہاز ان کے ملک کے ساحل سے نزدیک ہوتا چلا جا رہا تھا:

ISHTIAQ AHMED

ISHTIAQ AHMED

ANDAZ BOOK DEPOT